معالم القرآن

جلد دوازدہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

شیخ القرآن حضرۃ العلام **مولانا محمد علی** الصدیقی کاندھلوی

کی تصانیف

تفسیر معالم القرآن

جلد اوّل	۱۰۰/=	جلد ہفتم	۱۰۰/=
جلد دوم	۱۲۰/=	جلد ہشتم	۱۰۰/=
جلد سوم	۱۲۰/=	جلد نہم	۱۰۰/=
جلد چہارم	۱۲۰/=	جلد دہم	۱۰۰/=
جلد پنجم	۱۲۰/=	جلد یازدہم	۱۲۰/=
جلد ششم	۱۰۰/=		

امام اعظم اور علم حدیث ۱۰۰/=

اسلام کا نظامِ اذکار ۶۰/=

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی
۱۷- اردو بازار - لاہور

ملکیّت ——— ادارہ تعلیماتِ قرآن دارالعلوم الشہابیہ

طابع ——— حافظ محمدؐ یوسف بٹ

تزئین و آرائش ——— السیّد انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— سجاد احمد سہالوی تلمیذ محمدؐ جمیل مرزا نگھوڑ سیالکوٹ

ناشر ——— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ———

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۹۲ء

مطبع ——— عرفان افضل پریس ۔ لاہور

قیمت ——— ۱۷۵/- روپے

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیماتِ قرآن ۔ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی ۔ ۱۷ اردو بازار ۔ لاہور

انتساب

میں معالم القرآن کی بارھویں جلد کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے، اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکتی انسانیت کے فکری، اخلاقی، مالیاتی، معاشی، سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی ایمان ہے۔ قابل صد احترام فضیلت مآب الحاج حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی دریا دلی سے یہ بارھویں جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبہ خیر کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے۔

(آمین)

قاری عبدالرحمٰن ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم شہابیہ۔ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

یہ معالم القرآن کی بارہویں جلد ہے۔

گیارہویں جلد جنوری ۱۹۹۱ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اربابِ سواق کے سامنے آئی تھی۔ اب پورے ایک سال سات ماہ کے بعد بارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ تاخیر کی وجہ مؤلف کی بیماری ہے دو اپریشن ہوئے اور الحمدللہ دونوں کامیاب رہے۔ علاج کے لیے میں ڈاکٹر تسلیم کے لیے دِل کی پنہائیوں سے دعاگو ہوں۔ آپ نے جس فدیہ خیرسگالی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مَیں اور میرے رفقائے کار آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ بیماری کا عرصہ اچھا خاصا دراز بھی تھا اور تشویشناک بھی۔ لیکن الحمدللہ ثم الحمدللہ صحت یابی کی نعمت سے مالامال ہوا۔ اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے معالم القرآن کی جلد دوازدہم کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا اور مجھ گنہگار کو یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ بارہویں پارے کے مطالب پیش کر کے اپنے نامۂ اعمال کو دھونے کے لیے رحمت کے چند قطرے مہیا کر دوں۔ اب یہ جلد دوازدہم مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس جلد میں جو عرق ریزی کی گئی ہے اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ قلم جادۂ حق سے نہ ہٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے دُوری ہوئی نہ ہو۔

الحمدللہ اس جلد میں سارا کام دارالعلوم ہی میں ہوا ہے اور جنوری ۱۹۹۱ء سے شروع ہو کر یہ جلد جولائی ۱۹۹۲ء کو مکمل ہوئی۔

اس جلد میں جن گرامی قدر علمی گہواروں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر
الوصف	محمد بن عبداللہ العاقولی
منہاج السنہ	حافظ ابن تیمیہ
المنتقیٰ	حافظ شمس الدین الذہبی

عقیدۃ الاسلام	السید انور شاہ کشمیری
فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی
التحریر والتنویر	علامہ محمد طاہر بن عاشور
الجامع الاحکام القرآن	علامہ قرطبی
مدارک التنزیل	لنسفی
تفسیر سورہ کہف	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
ترجمان القرآن	مولانا آزاد ابوالکلامؒ
قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن

اس سورت میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو نہایت لطیف انداز میں یہ بات سمجھائی ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے۔ یہ دراصل ایک مہلت ہے جو اللہ سبحانہٗ اپنے فضل سے تمہیں عطا کر رہا ہے اس مہلت سے اگر تم نے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ عذاب آئے گا۔ جو کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا۔ اور اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمہاری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ یہ بات قریش مکہ سے براہ راست نہیں کہی بلکہ سمجھانے کے لیے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم مدین اور قوم فرعون کے واقعات سے کام لیا گیا ہے۔

ان واقعات سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے قوانین میں ہم آہنگی اور یکسانیت ہے یعنی یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون کام کر رہا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو دوسرے سے ذرا بھی الگ ہو۔ بلاشبہ قومیں الگ الگ ہیں زمانے متفرق جگہیں الگ الگ ہیں۔ یہیں بہت ہیں نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے جونہی پردے ہٹتے ہیں۔ اصلیت کی بے لاگ وحدت سامنے آجاتی ہے۔ جب پوری کائنات میں وحدت قانون کام کر رہی ہے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ قوموں کے اعمال اس سے باہر ہوں اور وہاں کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ گوشہ ہی دوسرے گوشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے۔ جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں ہے اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں کارفرما ہیں۔ اگر عالم مادی میں آگ کا خاصہ جلانا ہے ایسا ہی عالم معنے میں بھی

ہے یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں اور خواص ونتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے۔ اسی کی طرف سورت کے آخر میں رہنمائی ہے۔

وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فوادک

واضح کردیا کہ گزشتہ رسولوں اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا مقصد کیا ہے۔

۱۔ تاکہ تیرے دل کو تسکین ہو۔

۲۔ یہ سرگزشتیں حق کو واضح کردیتی ہیں۔ ان میں حقیقت کی دلیلیں اور روشنیاں ہیں یہ بتلاتی ہیں کہ اس بارے میں اللہ کا ایک مقررہ قانون ہے۔ اور اس میں کبھی تبدیلی ہونے والی ہیں۔

مقدمہ

اللہ سبحانہٗ کے اپنے بندوں سے تعلقات دو طرح کے ہیں ایک حاکمیت کے دوسرے محبوبیت
کے حاکمیت میں اللہ کا رسُول اللہ کی بہتات کرتا ہے اور اللہ کی سیاست مثبت معاشرتے سے تعلق
رکھنے والی ہدایات کو بندوں میں نافذ کرتا ہے۔ اسی کے لیے لوگوں پر اللہ کے رسُول کی اطاعت فرض کی
گئی ہے اور اسی کی خاطر ان سب لوگوں پر اطاعت فرض کی گئی ہے جو رسُول کی رہنمائی میں اللہ کی ہدایات
کو لوگوں پر نافذ کرتے ہیں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم اسی کو خلافت کہتے ہیں۔

اللہ سے بندوں کے تعلقات کی دوسری قسم محبوبیت سے اور محبّت کے لیے اللہ نے رسُول کی اتباع
کی شرط لگائی ہے یعنی اللہ کی محبّت کا ہر دعوٰی بے جان ہے اگر رسُول کی اتباع نہ ہو ان کنتم
تحبون اللہ فاتبعونی۔ اسی لیے اس کو آیت محبّت کہتے ہیں۔

پہلی قسم میں لوگوں کا امتحان نعمتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ نعمتیں دے کر دیکھا جاتا ہے کہ ان کو
رب کی مرضی میں استعمال کرتے ہیں یا اپنی چاہتوں میں۔ حضرت سلیمان فرماتے ہیں ھذا من فضل
ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر حکومت کی نعمت، جاہ کی نعمت کاروبار میں وسعت اولاد
اور اس قسم کی دوسری نعمتوں سے ان لوگوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔

حاکمیت ہی میں مقابلہ کو کفر جحود مشاقہ اور محادہ کہتے ہیں وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسھم ظلما
وعلوا الخ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی الخ اور ان الذین یحادون
اللہ ورسولہ الخ اور اسی میں نافرمانی اور بغاوت کو طغیان، عدوان کہتے ہیں اور اسی کی پاداش میں انبیاء
کی قوموں پر عذاب آیا ہے۔

اس سورت میں پوری تاریخی ترتیب کے سیاستدان قوموں کا ذکر کیا ہے جو برسر اقتدار نہیں، اور
جنہوں نے اقتدار کے نشہ میں نبوّت کی دعوت کا مقابلہ کیا قوم نوح ہو یا قوم ہود یا قوم صالح یا قوم شعیب

اور آخر میں حضرت موسیٰ مخاطب فرعون ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اہل مکہ ہوں۔ سب پر غور کرو ایک ہی حقیقت ابھرتی نظر آئے گی وہ کیا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ پوری سورت کا مطالعہ کرو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہر جگہ ہی استدلال کام کر رہا ہے۔ البتہ ہر مقام پر ایک طرح کا بیان نہیں ہے اور نہ ایک ہی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کسی مقام پر شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہیں قوموں کا ذکر کیا گیا۔ کہیں وقائع کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جس میں وقائع کو پوری تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام سرگذشتوں پر نظر ڈالو جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت سے شروع ہوتی ہوئی ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے ذکر پر ختم کر دی جاتیں ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دعوت میں، اعلانات میں تذکیر و موعظت میں احوال و ظراف میں اور قبول میں نوعیت وحیثیت میں اور ہر تقریری نتیجہ میں کامل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور کس طرح حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی ایک حقیقت کام کر رہی ہے۔ مخاطب ایک سے زیادہ ہیں مگر دعوت سب جگہ ایک ہے ان کی پکار کیا تھی اور پکار کی نوعیت کیا تھی ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا۔ ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کار بند رہے اور پھر ان کے اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا وہ کس قسم کا تھا۔ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی سب نے کہا یاقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ لوگو اللہ کی بندگی کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں۔ سب نے کہا ظلم و بد عملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے بہرحال شان حاکمیت میں اللہ سے عابدانہ تعلقات کا نام بندگی ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی دوسری شان محبوبیت ہے۔ سب نبیوں نے اس کی دعوت دی ہے۔ سب نے یاد الٰہی پر زور دیا ہے اس کی انابت اس پر توکل کی راہ بتاتی ہے۔ اسی کا نام ولایت ہے۔ شان محبوبیت میں اللہ سے عابدانہ تعلقات کا نام پرستش ہے۔ محبت کا امتحان رحمتوں سے ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ سورہ یوسف میں ملے گی ترجمین قرآن نے شان محبوبیت کو بتانے کے لیے ما لکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے۔ شانِ محبوبیت کو اجاگر کرنے کے لیے حضور اقدس کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے اور اسی کے نتیجہ میں آپ کو اسوہ حسنہ دیا گیا ہے۔ اسی کو سنت کہتے ہیں

بہرحال بتانا یہ ہے کہ سورہ ہود میں اللہ سبحانہٗ کی شان حاکمیت سے بغاوت کرنے والوں کی داستانیں بیان ہو رہی ہیں۔ تاریخی استقرار کی روشنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ

حضرت نوح علیہ السلام بشارت و انذار کے ساتھ اپنی قوم کے پاس رہے بعینہٖ اسی انذار و بشارت کے ساتھ آپ بھی قریش مکّہ کے سامنے اللہ سبحانہٗ کی شانِ حاکمیت کا بول بالا کرنے آئے ہو حضرت نوح کی قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ نے بھی اسی طرح کی باتیں بنائی تھیں جس قسم کی باتیں قریش کا برسرِ اقتدار طبقہ بنا رہا ہے بالآخر ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ آخر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کر کے بشارت دی گئی ہے فاصبر ان العاقبۃ للمتقین اس کے بعد قوم ہود کی سرگذشت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی گئی اور بتایا کہ انہوں نے حضرت ہود کا اللہ کی شانِ حاکمیت میں مقابلہ کیا اور وہی روش اختیار کی جو قریش مکّہ حضور کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس داستان کے سنانے سے مقصود قریش کو تاریخ کے آئینے میں ان کا چہرہ دکھانا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ حضرت لوط اور حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کی داستان بھی اسی پس منظر میں پیش کی گئی ہے۔

سورہ ہود میں شخصیتوں اور قوموں کا ذکر کر کے تمام سرگزشتیں ایک ہی مقام پر جمع کر دی ہیں اور ان سب سے بحیثیت مجموعی استدلال کیا ہے تاکہ استدلال کے سارے پہلو آشکارا ہو جائیں۔

یہ پہلی قومیں جو یکسر ہلاک ہو گئیں تو صرف اس لیے ہوئیں کہ ان میں اہلِ خیر و صلاح معدوم ہو گئے تھے کوئی شر و فساد سے روکنے والا نہیں رہا تھا۔ اگر ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے موجود ہوتے تو کبھی اس نتیجہ سے دوچار نہ ہوتے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کو عذاب کی گرفت میں ایسی حالت میں پکڑ لیا جائے کہ قوم میں اصلاح کرنے والے کام کر رہے ہوں۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اگر آپ اپنی راہ پر جمے رہے اور ایک گروہ داعیانِ حق کا پیدا ہو گیا تو یہ سزائیں عذابِ استیصال سے محفوظ رہے گی۔

اصطلاحاتِ قرآنی

اُحکمت احکام سے ماضی مجہول کے صیغہ واحد
مؤنث غائب ہے مضبوط کی گئی تاب کی گئی
احکام علامہ مجدالدین فیروزآبادی بعصا
ترمذی التمیری لکھتے ہیں کہ اس مادے کی
اصلی معنے اصلاح خیز روک کے ہیں اسی سے
عربی میں حکمہ لگام کے اس رنبی حصہ کو
کہتے ہیں جو گھوڑے کے منہ میں سولاہے
احکمت الدابۃ کے معنے ہیں گھوڑے
کے منہ میں لگام لگادیا اور حکمت الدابۃ
کے معنے ہیں لگام کے ذریعے اسے
روک لیا اسی سے حکمت ہے جس کے ایک
سے معانی ہیں عدل علم، حلم نبحت قرآن
انجیل دین میں سمجھ، دین پر عمل ناختیبہ پرہیز
عقلی، بات کی درستگی اور کردار میں تفکر۔
اسی معنے کی رعایت حکیم ہیں۔ روک ہی
حمایت سے مضبوط بنانے کے احکمت لیانہ
کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ قرآن کی آیات
کو مضبوط بنا دیا ہے دوسرے یہ کہ آیاتِ
قرآنی حکمت والی ہیں

یثنون مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ثنی
یثنی ثنیا موڑنا اور ثنی کے معنے دوسرا
ہونا ہیں اس کے اصل معنے موڑنے کے ہیں
اسی سے ثانی عطفہٗ سے پہلو موڑنا۔ اسی سے
مثانی جسے بار بار کہا جائے موڑ فاتحہ مثانی
اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کا نمازوں میں تکرار
ہوتا ہے۔

عرش عرش، تخت شاہی امام ابوبکر سجستانی نزہتہ
القلوب میں فرماتے ہیں۔ عرش کے معنے تختِ
شاہی کے ہیں آیات ذیل میں عرش سے
مرادیہی ہے ورفع ابویہ علی العرش
اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر
المسکن لعرشہ کیا تیرا تخت
بھی ایسا ہی ہے۔ اور امام راغب اصفہانی
مفرداتِ القرآن میں رقم طراز ہیں۔ عرش
اصل میں سقف چیز کو کہتے ہیں اس کی جمع
عروش ہے وھی خاویۃ علی عروشھا
اور اسی اعتبار سے عرشت الکرم کے انگور
کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں بنانے کے ارشاد
ہے معروشات وغیر معروشات اور بادشاہ
کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش

کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ورفع ابویہ علی العرش اور کبھی عرش عزت غلبہ اور سلطنت کیلئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور خداوند قدوس کے بارے میں انسان کو نام کے سوا کچھ معلوم نہیں ہے۔ حقیقت تک انسان کی رسائی نہیں ہے۔ عوامی ذہن اس موضوع جو کچھ سمجھتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں عرش ذات باری کا حامل ہوگا نہ کہ محمول حالانکہ ذات باری اس سے بالاتر ہے کہ کوئی چیز اسے اپنائے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے ان یمسک السماوات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکہما من احد من بعدہ اور یہ ارشاد وکان عرشہ علی الماٗ اس میں تنبیہ ہے کہ عرش جب سے وجود میں آیا ہے پانی کے اوپر ہی رہا۔ اور ذو العرش المجید اور رفیع الدرجات ذو العرش نیز اس طرح کی جو آیات ہیں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی سلطنت و مملکت کی طرف اشارا ہے اور اس کے مستقر کا بیان نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات عالی اس سے بالا ہے۔ اور امام ابوبکر احمد بن الحسین البیقھی اپنی کتاب الاسمائو الصفات میں لکھتے ہیں کہ مفسرین

کے اقوال بھی ہیں کہ عرش سے مراد تخت ہی ہے اور یہ ایک جسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ اسے اٹھائے رکھیں اور اس کی تعظیم اور طواف کے ذریعہ اللہ کی عبادت بجالائیں۔ اور جس طرح سے زمین میں ایک گھر پیدا فرمایا اور نبی آدم کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں اور نماز میں اس کی طرف منہ کریں —— اور امام عبدالوہاب شعرانی الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر میں ارقام فرماتے ہیں اگر تم یہ سوال کرو کہ عرش کو عظیم کریم اور مجید تین ناموں سے موسوم کرنے کی کیا حکمت ہے کیا ان میں ترادف ہے؛ جواب یہ ہے کہ یہ ترادف نہیں ہیں بلکہ عرش کو اس کے احاطہ کی حیثیت سے عظیم کہا ہے کیونکہ سب اجسام سے بڑا ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کو سب پر فوقیت ہے وہ کریم ہے اور اس حیثیت سے کہ کوئی اور جسم اس کا احاطہ کر سکے اس سے وہ بالا ہے وہ مجید ہے۔

امۃ جماعت، مدت، طریقہ، دین، ہر وہ جماعت جس میں کوئی رابطہ اشتراک موجود ہو اسے امت کہا جاتا ہے۔ خواہ یہ اتحاد مذہبی وحدت کی بنا پر ہو، یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے ہو اور خواہ اس رابطہ میں امت کے اپنے اختیار کو دخل ہو یا نہ ہو۔ اخفش نے تصریح کی

ہے کہ اُمت باعتبار لفظ کے واحد سے اور باعتبار معنے کے جمع نیز حیوان کی ہر جنس ایک اُمت ہے قال النبی فی العمدہ ابن درستویہ کا بیان ہے کہ جہاں بھی اُمت کے معنے مدت کے ہوں گے وہاں اس کا مضاف محذوف ہوگا اور مضاف الیہ مضاف کے قائم مقام ہوگا واد کو بعد امة میں لفظ زمن یا حین محذوف ہے گو اصل میں یوں ہوگا۔ الی زمن امة معدودة اور بعد حین امة زمن اور حین کو حذف کرکے مضاف الیہ کو یعنی لفظ اُمۃ کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے۔ اُمت کے مجازی معنے طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں عرب والے بولتے ہیں فلان لا اُمة : یعنی فلاح کا کوئی دین اور طریقہ نہیں ہے کذا فی عمدة القاری

ضائق ضاق یضیق سے اسم فاعل ہے۔ ضیق سعۃ وسعت اور کشادگی کی ضد ہے اور ضیق بھی بولا جاتا ہے۔ ضیقۃ کا استعمال فقر، بخل، غم اور اسی قسم کے معنوں میں ہوتا ہے ارشاد ہے ضائق به صدرك اور تنگ ہوگا تیرا سینہ یضیق صدری رُک جاتا ہے میرا سینہ ضاق بهم ذرعًا یعنی ان سے عاجز ہوگیا۔ ضیقا حرجا تنگ بے نہایت تنگ لاتك فی ضیق اور تنگ مت ہو یہ سب غم و حزن کی تعبیریں ہیں۔

امام پیشوا، مقتدا، رہنما، وزن فعال اسم سے اَمّ یوم سے جس کے معنے ہیں جس کا قصد کیا جائے چونکہ مقتدا اور رہنما کی طاعت کا قصد کیا جاتا ہے اس لیے اس کو امام کہتے ہیں بغرض جس کی پیروی کی جائے وہ امام ہے۔ حق میں پیروی ہو یا ناحق میں اور خواہ جس کی پیروی کی جائے وہ انسان ہو کہ اس کے قول و فعل کی پیروی کریں یا کتاب ہو کہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کیا جائے جمع ائمہ آتی ہے اور جمع کے موقعہ پر لفظ واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔

عوج کجی، ٹیڑھا پن، یہ عوج یعوج سے بنا ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج کے لیے ہوتا ہے اسم ہے ابو زید نے جو لغت کے مشہور امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے اس کے لیے عین کے زبر کے ساتھ عَوَج ہے اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آئے اس کے لیے عوج

عُمّیت وہ چھپا دی گئی۔ وہ نگاہوں سے اوجھل کر دی گئی۔ معتبر ہے جس کے معنے اندھا کر دے اور چھپا دینے کے ہیں۔ عمی مادہ ہے علامہ فیومی نے مصباح المنیر میں لکھا ہے عمی الخبر کے معنے ہیں خبر کا پوشیدہ ہونا اور امام راغب فرماتے ہیں ـــــ عمی غلبہ کے معنے میں کسی چیز کا ایسا مشتبہ ہو جانا کہ وہی اس کے لحاظ سے اندھا ہو جائے اور وہ چیز اسے بالکل سجھائی نہ دے ارشاد ہے فعمیت علیهم الانباء یومئذٍ نیز و آتانی رحمة من

عندہ فعمیت علیکم اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے بس وہ تمہاری نظروں سے اوجھل کر دی گئی۔

عصبۃ جماعت، گروہ، یہ عصبت سے بنا ہے جس کے معنے جمع ہونے اور گھیرنے کے ہیں۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں "عصبۃ اور عصابۃ دس اور دس سے زیادہ اشخاص کو کہتے ہیں اور بعض چالیس تک بتاتے ہیں وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اتنے اشخاص سے سب کاموں میں قوت ہوتی ہے اور وقت پڑنے پر لوگ کافی ہوتے ہیں اور امام ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ نفر اور رھط کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا۔ اور مصباح میں ہے کہ عصبۃ مردوں کی جماعت ہے اور اس کی جمع عُصَب ہے جیسے غرفہ کی جمع غرف۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں عصبۃ وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کی پشتیباں ہو۔ ارشاد ہے لتنوء بالعصبۃ اور نحن عصبۃ یعنی ہماری بات ایک ہے اور ہم ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں۔ عصبہ کتنے افراد کی جماعت اس کے بارے میں علامہ ابو حیان اندلسی نے تفسیر البحر المحیط میں ایک سے زیادہ قول لکھے ہیں۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں الخبر شیخ سے ناقل ہیں۔ اصل میں تو دس کے معنے مطلق جماعت کے ہیں پھر عرف میں ایک خاص تعداد کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ بعد کو عرف بھی مختلف ہو گئے۔

عصیب سخت بھاری عصب سے ہے جس کے معنے سخت کسنے کے ہیں، بر وزن فعیل صفت مُشبہ کا صیغہ ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں قمطراز ہیں۔ قرآن میں ہے ھذا یوم عصیب یہ دن بڑا سخت ہے۔ فرار کہتے ہیں یوم عصبصب اور یوم عصیب کے معنے سخت گرم دن یا سخت دن کے۔ یہی معنے لیلۃ عصیب کے ہیں اور لیلۃ عصیبۃ نہیں بولتے ہیں فرار نے کہا ہے کہ عصبت الشئ سے ماخوذ ہے جس کے معنے باندھنے کے ہیں لیکن یہ مشہور نہیں ہے ازہری کہتے ہیں کہ یہ عصب القوم امر لعصبھو عصبًا سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں کسی سخت بات کا پیش آ کر لوگوں کو جمع کر دینا۔

امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں یوم عصیب میں عصیب بمعنے شدید ہے اور یہ فاعل کے معنے میں بھی ہو سکتا ہے اور مفعول کے معنے میں بھی۔

اوّاہ نرم دل۔ بہت آہ کرنے والا اوّاہ ہے جس کے معنے آہیں بھرنے کے ہیں۔ مبالغہ کا صیغہ فعّال۔ قرآن عزیز میں اوّاہ سے کیا مراد ہے اس بارے میں مصنف سے یہ اقوال منقول ہیں

۱۔ بہت زیادہ دعا کرنے والا۔
۲۔ مومن
۳۔ فقیہ
۴۔ رحمدل

۵۔ مومن تواب
۶۔ تسبیح من سبحانہ میں مشغول رہنے والا
۷۔ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا
۸۔ کتاب اللہ کی بہت زیادہ تلاوت کرنیوالا
۹۔ خشیت الہٰی کی بنا پر بہت زیادہ آہ آہ کرنیوالا
۱۰۔ دربار الہٰی میں خشوع وخضوع کرنے والا
۱۱۔ حبشی زبان میں مومن کو کہتے ہیں
۱۲۔ معلم خیر
۱۳۔ وعدہ کو پورا کرنے والا
۱۴۔ گناہوں کو یاد کرتے وقت استغفار کرنیوالا
۱۵۔ شفیق
۱۶۔ ہر بات سے ہٹنے والا ۔(البحر المحیط)

علامہ شوکانی لکھتے ہیں ۔

لغت کے اعتبار سے اواہ کے یہ معنے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں کہ اواہ وہ ہے جو اپنے گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرے مثلاً یہ کہے کہ آہ میرے گناہ آہ مجھے اس پر کیا سزا دی جائے گی ۔قرا کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے امام ابوجعفر ابن جریر طبری فرماتے ہیں ۔

ان سب اقوال میں اول اس شخص کا قول ہے جو اس کے معنے بہت زیادہ دعا کرنے والے کے بیان کرتا ہے سیاق قرآنی کے بھی یہی معنے مناسب ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا کہ اپنے باپ کے لیے ان کی طلب مغفرت ایک وعدے کی بنا پر کی تھی ۔اس سلسلے میں اپنے باپ سے انہوں نے کہا تھا اب چونکہ حضرت ابراہیم بہت زیادہ دعا کرتے ہیں نیز جو آپ کو ستاتا اور تکلیف دیتا اب اس کے ساتھ بردباری سے پیش آتے تھے ۔بدین وجہ باپ کی طرف سے آپکو شدید اذیت پہنچنے پر آپ نے اس لیے استغفار کیا ۔

ربّ : پروردگار ، مالک ، صاحب ، یہ اصل میں رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لیے عدلٌ کی طرح بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا قول ہے کہ بَرٌّ کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے ۔امام راغب کا بیان ہے کہ ربّ مصدر ہے جو فاعل کے لیے مستعار ہے ۔تربیت کی تعریف امام موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ھوا نشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حد کمال تک پہنچ جائے ،اس معنیٰ کے اعتبار سے امام حلیمی نے جو ربّ کی تعریف کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ،امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں ،۔

حلیمی رحمۃ اللہ نے ربّ کے معنیٰ میں فرمایا ہے کہ رب وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد تک پہنچا دیتا ہے

کہ جو حد اس چیز کے لیے اس نے مقرر فرمادی ہے، پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا، پھر اس کو پھٹکی بناتا پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی سے ہڈیاں پیدا کرتا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا پھر ان میں جان ڈالتا اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے نکال کھڑا کرتا اور برابر اس کو نشوونما کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو پورا مرد کر دیتا ہے اور ابتدا رحال میں وہ جوان ہوتا ہے پھر اس کو ادھیڑ پھر بوڑھا بنا دیتا ہے اور جو چیز بھی اس نے پیدا کی اس کا یہی طور ہے پس ربّ وہ ہے جو اس کا نگراں اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا ہو جو حد کہ اس کے لیے اس نے مقرر کی اور اس کی نہایت و مقدار قرار دی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ ربّ کے معنیٰ لغت میں سید اور مالک کے ہیں۔

امام بیہقیؒ کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابیؒ سے ناقل ہیں کہ

بہت سے مفسرین سے یہ آیۂ کریمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر میں مروی ہے کہ ربّ کے معنی سید (سردار) کے ہیں

اور یہ معنیٰ اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہم عالمین کے معنیٰ جماد کو چھوڑ کر ممیزین یعنی ذوی العقول کے قرار دیں کیونکہ جس طرح سید الناس کہا جاتا ہے اس طرح سیّد الشجر والجبال وغیرہ کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنیٰ میں ارشاد الٰہی ہے۔ ارجع الیٰ ربک فسئلہ ما بال النسوۃ الّٰتی قطعن ایدیھن (پھر جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے پوچھ کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے) کہ یہاں رب بمعنیٰ سید (آقا، خاوند) ہے اور بعض کا قول ہے کہ ربّ بمعنیٰ مالک ہے اور اس اعتبار سے اضافت بر بنا دے عموم درست ہے اور بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ اسم عالم تمام کائنات کے لیے بولا جاتا ہے، اور ان کا استدلال اس آیت کریمہ سے ہے۔ قال فرعون و ما رب العلمین ہ قال رب السموٰت والارض وما بینھما ان کنتم موقنین (بولا فرعون کیا معنیٰ جہان کا صاحب۔ موسیٰؑ نے کہا صاحب آسمان اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو)

امام راغب نے لکھا ہے کہ

ربّ مطلقاً (یعنی جب بغیر کسی شرط کے استعمال ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کے جو مصالح موجودات کا کفیل ہے اور کسی کے لیے نہیں بولا جاتا چنانچہ ارشاد ہے بلدۃٌ طیبۃٌ و ربٌّ غفورٌ (دیس ہی پاکیزہ اور رب ہی گناہ بخشتا) اور اسی طرح اللہ کا قول ہے۔ ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبین اربابا

(اور نہیں لائق کہ تم کو حکم کرے کہ ٹھہراؤ
فرشتوں کو اور نبیوں کو رب) یعنی انہیں معبود
قرار دو اور خالق اور مسبب الاسباب اور
بندوں کی مصلحتوں کا کفیل سمجھو۔
اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی
بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لیے بھی آتا ہے
جیسے ارشاد ہے۔ رب العلمین (سارے
جہان کا صاحب) اور ربکم و ربُّ
اٰبائکم الاوّلین (صاحب تمہارے اگلے
باپ دادوں کا) اور ربّ الدار (گھر والا) اور
ربّ الفرس (گھوڑے والا) ان دونوں کے
مالک کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی معنیٰ میں
ارشاد الٰہی ہے۔ اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ
فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (میرا ذکر
کیجیو اپنے بادشاہ کے پاس سو بھلا دیا شیطان
نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے)
اور ارشاد ہے اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ
(پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس)
آیت کریمہ (قال معاذ اللہ انہٗ ربّیٓ
اَحْسَنَ مَثْوَایَ (اس نے کہا۔ خدا کی پناہ
وہ مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو)
میں بعض کا قول ہے کہ رب سے اللہ تعالیٰ
مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ مراد
ہے جس نے ان کی تربیت کی تھی۔ اور حضرت
یوسف علیہ السلام کے قول کے زیادہ مناسب
پہلے معنیٰ ہیں۔

سوٓء: برائی، آفت، گناہ، بُرا کام، عیب، سوء
سے اسم ہے علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے
کہ یہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے امام
راغب فرماتے ہیں۔
سوٓءٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے
خواہ دنیوی امور میں سے ہو یا اخروی امور سے
احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ میں سے
یا ان حالات میں سے ہو کہ جو جاہ و مال کے
چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے
سے پیدا ہوتے ہیں۔
قرآن مجید میں اس کا استعمال جن معانی میں
ہوا ہے امام سیوطیؒ نے ان کو تفصیل کے
ساتھ قلم بند کیا ہے۔ فرماتے ہیں
سوٓء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے
(۱) شدت کے لیے۔ یسومونکم سوٓء
العذاب (وہ کرتے تھے تم پر سخت
عذاب)
(۲) کونچیں کاٹنے کے لیے ولا تمسوھا
بسوٓء (اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح یعنی
ناقہ کی کونچیں نہ کاٹ ڈالنا)
(۳) زنا کے لیے ما جزآءُ من اَرَادَ
بِاَھلک سوٓءً (اور کچھ سزا نہیں ہے
ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی
یعنی زنا)

(۴) برص کے لیے بیضاء من غیر سوٓء
(سفید بغیر عیب یعنی برص کے)
(۵) عذاب کے لیے إن الخزی الیوم
والسوٓء علی الکفرین.
(بے شک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں
پر ہے)
(۶) شرک کے لیے ما کنا نعمل من
سوٓء (ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی یعنی
شرک)
(۷) گالی گلوچ کے لیے لا یحب اللّٰہ
الجہر بالسوٓء (اللہ پسند نہیں کرتا
کسی بری بات کو یعنی کسی کی دشنام طرازی کو)
والسنتھم بالسوٓء (اور (کھولیں) اپنی
زبانیں بُرائی کے ساتھ)
(۸) گناہ کے لیے یعلمون السوٓء
بجھالۃ (کرتے ہیں بُرا کام جہالت سے)
(۹) بئس (برا ہے) کے معنیٰ میں ولھم
سُوٓء الدار (اور ان کے لیے ہے بُرا گھر
(۱۰) ضرر کے لیے ویکشف السُوٓء
(اور دُور کر دیتا ہے سختی) وَمَا مَسَّنِیَ
السُّوٓء (اور مجھ کو بُرائی کبھی نہ پہنچتی)
(۱۱) قتل و ہزیمت کے لیے لَمْ یَمْسَسْھُمْ
سُوٓءٌ (نہ پہنچی ان کو کچھ آنچ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ ہود

موضوع ۔ اس سورت کا موضوع انسانی زندگی میں رذائل کا خاتمہ اور پھر بھرپور اور سیر حاصل تنقید ہے ۔ رذائل وہ برائیاں جن کو اللہ سبحانہ ناپسند کرتا ہے ۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں ۔ جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا ہے اور جن کی بدولت شہریوں کی خانگی ۔ معاشرتی ، سیاسی اور روحانی زندگی تباہی کا نشانہ بن جاتی ہے ۔ رذائل اگرچہ بہت ہیں مگر بنیادی یہ ہیں ۔ شرک ، فاحشہ ، بغی ، عدوان ، اثم

جیسے فضائل میں توحید راس الطاعات ہے ایسے ہی رذائل میں شرک ام الرذائل ہے ۔ قرآن انسانی زندگی میں سو گونہ مقاصد لے کر آتا ہے ۔

ایک فضائل کی ترغیب جن سے انسانی زندگی میں صلاح ، آراستگی اور حسن وجمال آتا ہے ۔ دوسرے رذائل سے ترہیب ہے جن سے انسانی زندگی فساد ، بگاڑ اور خرابی کا گہوارہ بنتی ہے ۔

فضائل سمیٹنے کا نام عبادت وطاعت اور رذائل سے بچنے کا نام تقویٰ ہے مکی زندگی میں زیادہ زور رذائل سے بچنے پر ہے اور یہی سورت کا موضوع ہے حضرت نوح ، حضرت ہود اور حضرت صالح کی تقریریں شرک کی تردید میں ہیں جب کہ حضرت لوط کی تقریر کا خلاصہ فواحش کے خلاف اعلان ہے ۔ حضرت شعیب مالیاتی مسائل میں بغی پر ملامت کر رہے ہیں اور حضرت موسیٰ فرعون کے عدوان وفساد کے خلاف اعلان بغاوت کر رہے ہیں ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکی زندگی میں شرک ، فاحشہ ، بغی اور عدوان کے سارے نمونے موجود ہیں ان سب کو مٹانا نبوت محمدیہ کا نصب العین ہے ۔

نبوت کے کام کا آغاز رذائل کے خلاف پر مبنی دعوت سے ہوتا ہے ۔ ہے بھی یہ عقلی بات پہلے برتن کی منجھائی اور صفائی ہو ۔ قلعی کے ذریعے اس میں چمک اور دمک ہو ۔ منجھائی کا نام تخلیہ ہے جبکہ چمک اور دمک کا نام تحلیہ ہے اسی کی فقہا نے معاملات میں رعایت رکھی ہے اور یہ قانون بتایا ہے کہ

درأ المفاسد اولی جلب المصالح

مفاسد کا دور کرنا مصالح کے حصول سے زیادہ اچھا ہے

اور اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بیعت برائیوں کے چھوڑنے پر لیتے تھے اور آج بھی مشائخ کا یہی معمول ہے۔

بہر حال سورت کا موضوع انسانی زندگی سے رذائل کو مٹانا ہے۔ قرآن نے رذائل اور ان کے نتائج کے بارے میں اس سورت میں ایک مکمل تاریخی دستاویز تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کی ہے۔

قرآن نے یہ تاریخی واقعات موضوع کے لیے بطور دلائل پیش کیے ہیں کیونکہ قرآن نے خود واقعات کے پیش کرنے کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ یہ وہ حقائق ہیں جن کا دلوں میں یقین واذعان ہونا چاہیئے اور یہ سرگزشتیں ان حقائق کے لیے دلیلیں ہیں حجتیں ہیں براہین ہیں۔ سورہ ہود میں یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس دنیا میں ایک حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے یہ کہ اعمال اور نتائج عمل کا قانون ایک ہے یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے بلاشبہ اعمال کے مظاہر اور قوالب مختلف ہیں اور نام بھی الگ الگ ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں جاندار کے لیے موت و حیات ہے۔ پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے۔ بہتر دن کے لیے بننا اور بگڑنا ہے۔ اجزاء کے لیے ملنا اور بکھرنا ہے قوالب بہت ہیں۔ نام متعدد ہیں مگر حقیقت ایک اور صرف ایک ہے۔ وہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات ہے۔ نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہے۔ اسی طرح پوری کائنات کے ہر گوشہ میں قانون کی بنیاد وہی اصل کام کر رہی ہے۔ جب صورت حال یہ ہے۔ تو اعمال انسانی اس سے الگ کیونکر ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے۔ جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے۔ اور یہاں بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے مواقع پر ہیں۔ مثلاً عالم مادی میں اگر آگ کا خاصہ جلانا ہے۔ تو عالم انسانی میں بھی اعمال کے یہی خواص ہیں۔ جیسے آگ اگر روشن ہو تو اس کا خاصہ جلانا ہے۔ اعمال میں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ مادیات کے خواص کی طرح عالم انسانی میں معنویات کے بھی خواص ہیں۔ اور خواص و نتائج کا ایک ہی قانون کام کر رہا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کے بعد اتنی بات اور سمجھ لیجیے کہ جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہٗ کے قوانین میں وحدت ہے۔ ایسے ہی جماعتوں اور قوموں کی سعادت شقاوت اور حیات و موت کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جیسے اللہ سبحانہٗ کے سارے قوانین میں یکسانی اور ہم آہنگی ہے عالمگیری اور ہمہ گیری ہے۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ سے ایک طرح کے

یہی نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام سنۃ اللہ ہے۔

زمانۂ نزول

سورہ یونس اور سورہ ہود اگاڑی پچھاڑی نازل ہوئی ہیں دونوں کے مباحث میں ہم آہنگی ہے۔ اس قدر ہم آہنگی ہے کہ اگر کہا جائے کہ سورہ ہود اس اجمال کی تفصیل ہے۔ جو سورہ یونس میں ہے۔ تو کوئی مبالغہ نہیں۔ موضوع دونوں کا ایک ہے۔ یہ سورۃ بہت ہی پُر آشوب حالات میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں نبوت کی دعوت کی مخالفت کا بہت بڑا طوفان تھا۔ اور حالات میں اس قدر سنگینی تھی کہ ان کا مقابلہ کرنا بہت بڑے جگر کا کام تھا۔ حالات کی سنگینی کا اس حدیث سے ہی اندازہ ہوتا ہے۔ جو ترمذی میں بحوالہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بسند حسن کتاب التفسیر میں آئی ہے۔ جس میں تصریح ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا۔ شیبتنی سورۃ ہود واخوا تھا۔ مجھے سورۃ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا بنا دیا ہے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کا زمانہ کیسا سخت ہوگا۔ جبکہ قریش کی چیرہ دستی اور مظالم انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔

سورۃ کا نام

حدیث کی ساری کتابوں اور تفسیروں میں سورہ ہود کا نام سورہ ہود ہی ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں ہے۔ حضرت ہود کا نام اس سورۃ میں پانچ بار آیا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ جمہور کی رائے میں ساری سورۃ مکی ہے۔ بعض روایات میں کچھ آیات کے استثناء کی طرف اشارا ہے۔ لیکن ان کی روایتی حیثیت کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے۔ نزول سور کی ترتیب میں سورۃ ہود کا نمبر ۵۲ ہے۔

یہ سورۃ منجملہ ان سورتوں کے ہے جس میں حضرت نوحؑ سے بات شروع ہوئی اور حضرت موسیٰؑ پر ختم ہوئی۔ یہ تاریخی داستان تاریخی ترتیب کے مطابق ہے۔ اس اعتبار سے اس سورۃ کو

خاص اہمیت حاصل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے۔ کہ ان واقعات میں، داعیوں کی آوازوں میں، تذکیر و موعظت میں، احوال و ظروف میں، مخاطبوں کی جانب سے رد و قبول میں، نوعیت و حیثیت میں اور پھر آخری نتیجہ میں، یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور کس طرح ان کی ہم آہنگی کھل کر سامنے آئی ہے اسی یکسانی اور ہم آہنگی کی طرف قرآن نے ان لفظوں میں اشارا کیا ہے۔

كلا نقص عليك من انباء الرسل

سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ (١١) (٥٢) اٰیاتھا ١٢٣ رکوعاتھا ١٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ
خَبِيْرٍ ﴿١﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ
وَّبَشِيْرٌ ﴿٢﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ
مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ
فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿٣﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤﴾

الف۔ لام۔ را۔ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے۔ جس کی آیات باعتبار دلائل مضبوط اور باعتبار مطالب مفصل ہیں۔ اُس کی جانب سے ہیں۔ جو حکمت و دانائی والا اور باخبر ہے۔ اس کتاب

کا اعلان ہے۔ کہ اللہ کے سوا عابدانہ تعلقات کسی سے نہ رکھو۔[۲]

بلاشبہ میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے تمہیں خبردار کرنیوالا اور خوشخبری دینے والا ہوں[۲] ۔ اور یہ کہ تم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو۔ اور آئندہ کے لیے اس کی طرف پلٹ آؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمہیں ایک وقت مقررہ تک اچھا سامان زندگی دے گا۔ اور عمل میں زیادہ کرنے والے کو اس کی مزید کوشش و محنت کا اجر دے گا[۴]۔ اور دیکھو اگر تم نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور وہ قادر مطلق ہے۔[۵]

آیات قرآنی کی ایک اور تقسیم

ان آیات میں قرآن کی دعوت کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان لاتعبدوا الا اللہ۔ یہ اوّل دن سے تمام دعوتوں کا اعلان رہا ہے۔ اور یہی قرآن کی دعوت ہے۔ قرآن میں لفظ عبادت چار طرح استعمال ہوا ہے۔ اوّل یہ کہ کسی کے ساتھ پرستش کا رویہ اختیار کرنا اس کی عبادت ہے کیونکہ مشرکین اپنے بتوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے ہیں۔ اسے قرآن میں عبادت کہا گیا ہے۔

قالوا نعبد اصناما

دوسرے یہ کہ کسی کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت کرنا ہے۔ قرآن کی اس آیت والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا میں اسی طرز عمل کو عبادت کہا گیا ہے۔ جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی

یں اختیار کرتے ہیں. طاغوت کے لفظی معنے حد سے نکل جانے والے اور بڑے سرکش کے ہیں. اور قرآن کی زبان میں طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے. جو اللہ کی بندگی سے نکل جائے. یا نکل جانے کا ذریعہ ہو. اسی طرح اگر شیطان اور بُت طاغوت ہیں. تو وہ حکمران، قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا بھی طاغوت ہی ہیں. جو خوف خدا سے بے بہرہ اور ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہوتے ہیں.

سوم: وہ اطاعت بھی عبادت ہے. جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑی ہو. مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چوں وچرا کی جا رہی ہو. جیسے بنی اسرائیل فرعون کی عبادت کر رہے تھے. انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون اور ایسے ہی تلک نعمة تمنھا علیّ عبدت بنی اسرائیل. ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی غلامی کو فرعون کی عبادت کہا گیا ہے.

چہارم: یہ کہ کسی کی غیر شعوری اطاعت کاملہ بھی عبادت ہے. کیونکہ شیطان کی عبادت سے قرآن میں منع کیا گیا ہے. یاابت لاتعبد الشیطان اور یا بنی ادم ان لاتعبدوا الشیطان وہ لوگ جن کے بارے میں یہ بات فرمائی گئی ہے. ان کا معاملہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا. کہ ان کے عقائد و اعمال ٹھیک ویسے ہی تھے. جیسے کہ شیطان چاہتا ہے. ورنہ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے. ان میں سے کوئی بھی شیطان کو سجدہ نہ کرتا تھا. کوئی اس سے دعائیں نہ مانگتا تھا.

قرآن عزیز کے ان چاروں انداز استعمال میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ کہنا درست نہیں کہ اس میں مجاز کا اندازِ بیاں اختیار کیا گیا ہے. عبادت کی یہ چاروں صورتیں قرآن کے مطالبے ان لاتعبدوا الا اللہ میں داخل ہیں. اس کی تفصیل بھی آپ سورہ ہود میں پڑھیں گے[1]. یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے. جس کی آیات باعتبار دلائل کے مضبوط اور باعتبار مطالب کے مفصل ہیں. اُس کی جانب سے جو حکمت و دانائی والا اور باخبر ہے. یعنی قرآن حکیم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے. جس کی آیتیں لفظی اور معنوی حیثیت سے نہایت جچی تلی، باوزن تولہ پاؤ رتی ہیں. نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت و واقع کے خلاف ہے. نہ باعتبار معجزات فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے. جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا گیا ہے محال ہے. کہ اس سے بہتر تعبیر ہو سکے. الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے اور نہ تنگ. جن اصول و فروع میں اخلاق و اعمال اور قیمتی پند و نصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں. اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لیے استعمال کی گئی ہیں. وہ سب علم و حکمت کے کانٹے میں

تلی ہوئی ہیں۔ قرآنی حقائق و دلائل ایسی مضبوط اور محکم ہیں۔ کہ زمانہ کتنی ہی پلٹنیاں کھائے ان کے بدلنے اور غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کرکے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات وحوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح مائدہ قرآنی کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ جو تناول کرنے والوں کے لیے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب ہے۔ ان تمام حکیمانہ خوبیوں کے باوجود یہ نہیں کہ اجمال وابہام کی وجہ سے کتاب معمہ اور چیستاں بن کر رہ جاتی بلکہ معاش و معاد کی تمام شبہات کو خوب کھول کر سمجھایا ہے اور موقع بموقع دلائل توحید احکام، مواعظ، قصص ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینے سے الگ الگ رکھی ہے۔ اور تمام ضروریات کا کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ نزولی حیثیت میں بھی یہ حکمت مرعی رہی ہے۔ کہ پورا قرآن ایک دم نہیں اُتارا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع و مصلحت کے لحاظ سے علیحدہ آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآن میں ان تمام باریکیوں کو مجتمع دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ مگر حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر حکیم مطلق اور خبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی۔ تو اور کس کے کلام میں توقع کی جاسکتی ہے[1]

اس میں قرآن کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں دو باتیں کہی گئی ہیں

ایک یہ کہ قرآن کی آیات میں احکام ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات میں تفصیل ہے۔

نبوت کے ذریعے انسان کی زندگی کی ساری ضروریات کی پا بجائی اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت کا اہم تقاضا ہے۔ انسانی ضرورتیں دو طرح کی ہیں جسمانی اور روحانی۔ یہ کتاب وحی کے ذریعے نازل شدہ ایسی کتاب ہے۔ جو زندگی میں انسان کے لیے ہدایت و سعادت کی راہ کھولتی ہے۔ اس کتاب کے احکام میں احکام بھی ہے اور تفصیل بھی۔ اُحکمت احکام سے بنا ہے۔ احکام کا مادہ حکم ہے۔ حکم کے اصلی معنے روکنے کے ہیں۔ اسی سے حکمۃ الفرس گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے فرمانروا کو حاکم بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے۔ اور اسی سے احکام کے معنے پختہ کرنے کے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی پائیداری کی وجہ سے اپنے کو تباہی سے روکتا ہے۔ اسی سے احکام کے معنے عمدہ کرنے اور شاندار بنانے کے ہیں۔ کیونکہ اس کی شان و شوکت نگاہوں کو روکتی ہے۔ اسی سے دانائی کی بات اور کام کو حکمت کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حماقت اور بیوقوفی کے لیے رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ احکام کے تین معنے ہیں

مضبوط بنانا۔ شاندار بنانا اور حکمت والا ہونا۔

قرآن میں احکام دوسرے مواقع پر تشابہ کے مقابلے پر آیا ہے ۔آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات۔ اور کہیں منسوخ کے مقابلہ پر آیا ہے۔ فینسخ الله مایلقی الشیطان ثم یحکم الله آیاته ۔ اور یہاں احکام کی تفصیل کے مقابلہ پر آیا ہے۔ احکمت آیاته ثم فصلت ۔ حافظ ابن تیمیہ الاکلیل فی المتشابه والتاویل میں فرماتے ہیں۔

محکم ہونے کی تین صورتیں ہیں ۔ اول یہ کہ قرآن کے القاء میں محکم ہوں ۔ اس کے مقابلے میں القاء شیطان سے یعنی محکم وہ القاء رحمانی ہے ۔ جو القاء شیطانی سے بالکل محفوظ ہے۔ دوم یہ کہ قرآن کے ابقاء میں محکم ہو یعنی منسوخ نہ ہو۔ سوم یہ کہ معانی میں محکم ہو۔ یعنی اپنے معانی کے لحاظ سے حقائق کو بتاتا ہو۔

علامہ شاطبیؒ الموافقات میں لکھتے ہیں ۔

قانون سازی کے لیے مجتہدین کے غور وفکر کی قانونی دلائل ہوتے ہیں ان میں باہم ربط ونظم کا ہونا ضروری ہے ۔ احکمت آیاته میں اس کی طرف اشارہ ہے ۔

اس لیے احکام کی آیات کا مطلب یہ ہے ۔ کہ قرآن کے بیان کردہ وہ اصولی کلیات جن کی پشت پر دلائل کی قوت ہو۔ اور جو بالکل بدیہی ہوں۔ اور ان کے معانی کو دلائل ہر قسم کی تاویل سے روک رہے ہوں ۔ وہ اپنی جگہ اس قدر مضبوط ہوں ۔ کہ زمانوں، مکانوں اور قوموں کی کوئی تبدیلی ان پر اثر انداز نہ ہو ۔ اسی لیے ہم نے احکمت آیاته کا ترجمہ کیا ہے۔ کہ جس کی آیات باعتبار دلائل مضبوط ہوں۔ قاضی بیضاوی نے بھی اس تفسیر کو شرف پذیرائی یہ کہہ کر فرمایا۔

احکمت بالحجج والدلائل

قرآن میں احکام آیات تین مواقع پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موقعہ تو وہ ہے جس میں آیات محکمات کا متشابهات سے مقابلہ کیا گیا ہے ۔ دوسرا موقعہ وہ ہے۔ جہاں القاء شیطان کے مقابلے میں احکام آیات کا ذکر ہے ۔ فینسخ الله مایلقی الشیطان ثم یحکم الله آیاته ۔ اور ایک تیسری جگہ یہ ہے کہ تفصیل آیات کے مقابلے میں احکام آیات کا ذکر ہوا ہے ۔ بلیغانہ انداز میں تعبیرات مختلف ہیں ۔ بات ایک ہے۔ کہ وہ قرآن کے احکام جن کی پشت پر دلائل کی بھرپور طاقت ہو ۔ اور ہمارے احساسات اور ادراک سے ماورار

نہ ہوں. محکمات ہیں. علماء نے محکم کی حقیقت بتاتے ہوئے. جو داد تحسین دی ہے. اس کا خلاصہ بھی تعبیری اختلاف کے باوجود یہی ہے کہ احکام اس حقیقت کا نام ہے. جہاں بالکل پختگی ہو. صحیح وصواب اور حسن اس میں واضح اور صاف ہوں مطالب مقرر ہوں. معانی واضح اور صاف ہوں. کسی دوسرے معنے کا ان میں احتمال نہ ہو. اسی قسم کی آیات ام الکتاب ہیں. یہی آیات مجتہدین کے اجتہاد میں فکری جولانگاہ ہیں. مجتہدین محکمات کی پشت دلائل کی قوت کے ذریعے ہی استنباط و اجتہاد کرتے ہیں. محکمات ہی کا زبان نبوت میں نام بیّنات ہے. آیات قرآنی کے احکام اصول و کلیات کے لحاظ سے. علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں.

قرآن نے اکثر قوانین کلی طور پر بیان کیئے ہیں. جزئیات کو اصلاً بیان نہیں کیا.

اور یہ بھی علامہ شاطبیؒ نے لکھا ہے کہ

قرآن میں آیات محکمات کی کثرت ہے.

یہی قرآن کی جامعیت ہے. دین دراصل ان ہی قوانین کلیہ کا نام ہے. ان قوانین کلیہ سے نبوت کی تبیین اور اہل ایمان کی تفکر کا تعلق ہے. چونکہ قرآن اللہ سبحانہٗ کا آخری اور ابدی قانون ہے. اور ایسی کتاب کے لیے ضروری ہے. کہ وہ زیادہ تر زور قانون کے کلی اور ابدی اصول ومبادی پر دے. علامہ شاطبیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے.

قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے اور اس کی جامعیت یہی ہے کہ اس میں اصول وکلیات بتائے گئے ہیں.

بتانا یہ چاہتا ہوں. کہ احکام سے مقصود یہ ہے. کہ قرآن میں بیان شدہ ضوابط وقواعد اور کلیات دلائل کی ایسی مضبوط اور پائیدار چٹان ہے. کہ زمانے کی کوئی تبدیلی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی. شیخ الاسلام نے یہ بات کہہ کر اسی طرف اشارا کیا ہے.

قرآن کے حقائق اور دلائل ایسے مضبوط ومحکم ہیں. کہ زمانہ کتنی ہی پلٹنیاں کھائے انکے بدلنے اور غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے.

قرآنی آیات میں تفصیل

آیئے اب دوسری بات کی طرف ارشاد ہوا ہے. ثم فصلت. پھر ان آیات کی

تفصیل کی گئی ہے۔ یہ بھی احکام کی طرح آیات قرآنی کی صفت ہے۔ آیات قرآنی کی یہ صفت قرآن میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ مثلاً قد فصلنا الایات لقوم یعلمون ۹۷۔ انعام کذالک نفصل الآیات ۵۵۔ انعام۔ وکذالک نفصل الایات لقوم یعلمون ۲۲۔ الاعراف۔ کذالک نفصل الآیات لقوم یتفکرون ۲۴ سورہ یونس کذالک نفصل الآیات لقوم یعقلون۔ ۲۸ سورہ روم۔ ان آیات میں علم، تفکر، عقل کو تفصیل کا متعلق بنایا ہے۔ یعنی قرآن کی آیات میں تفصیل اہل علم، اہل فکر، اور اہل عقل کی خاطر کی گئی ہے۔ اس میں اشارا ہے۔ کہ قرآن کی آیات صرف دلائل و براہین کی ہی قوت سے مالا مال نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں جامعیت بھی ہے۔ کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ علامہ بقاعیؒ نے اسی ہمہ گیری کے پیش نظر تفصیل کی یہ تشریح کی ہے۔

والتفصیل لجمیع العلوم الشریفة وعقلیها ونقلیها

یعنی اس میں تمام اچھے علوم کی تفصیل ہے۔

اصل میں یہ لفظ الشریفہ نہیں ہے۔ الشریعہ ہے۔ سہو کاتب سے الشریفہ ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر قانونی علوم ہیں۔ خواہ وہ عملی ہوں۔ یا نقلی ان کی قرآنی آیات میں تفصیل ہے علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے بھی تفصیل کی تشریح التبیین بانواعہٖ سے کی ہے۔ یعنی قانون کی ساری انواع کی تفصیل ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں حافظ ابن حزم ظاہری کی حوالے سے یہ کہہ کر آیات قرآنی کی اسی تفصیل کی طرف اشارا کیا ہے۔ کہ قانون کے تمام موضوعات میں کوئی بھی موضوع ایسا نہیں جس کی اصل قرآن کی آیات میں نہ ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔ کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ سوائے موضوع قراض کے کہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم نہیں ہوتی ہے یہ حافظ ابن حزم کی رائے ہے ورنہ حافظ ابن القیم اور علامہ شاطبیؒ کا نقطہ نظر حافظ ابن حزم سے مختلف ہے ان کا دعویٰ ہے کہ قراض کی اصل بھی قرآن میں موجود ہے۔

قرآن میں تفصیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ وہ توضیح و تشریح کا محتاج نہیں اگر ایسا ہوتا تو قرآن میں تفصیل کے مواقع پر لقوم یعلمون۔ لقوم یعقلون۔ لقوم یتفکرون کی قید نہ ہوتی، بلکہ قرآن کے مفصل ہونے کا یہ اور صرف یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات میں بنیادی عقائد۔ اور ایمانی صفات سے لے کر اجتماعی زندگی کے دور دراز کے گوشوں سے تعلق رکھنے والی ایسی ہدایات موجود ہیں۔ جن میں اہل علم، اہل فکر اور اہل عقل کے اشارات موجود

ہیں۔ احکامات کی ہمہ گیری جزئیات کی بلکہ اصول وکلیات کی ہے۔ کہ اس میں منتشر اور مختلف حوادث کا جواب کلیات کی صورت میں موجود ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

کہ قرآن حکیم محکم ہونے کے باوجود جامع ہے۔ اور اس کی جامعیت یہی ہے کہ اس میں اصول وکلیات بتائے گئے ہیں۔ اسی لیے اس کی تفصیلات کی آغوش میں زندگی کے سارے بکھرے ہوئے سوالات کا بھرپور جواب ہے۔

قرآنی آیات زمین کی طرح پھلوں اور پھولوں کا گہوارہ ہیں۔ جس سے زمین میں پھلوں اور پھولوں کے عجائبات نت نئے رنگوں میں کھلتے رہتے ہیں۔ مگر زمین ایک ہی رہتی ہے۔ اور جس طرح سمندر سے انواع واقسام کے موتی اور جواہرات نکلتے رہتے ہیں مگر سمندر ایک ہی رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے اصول وکلیات سے جزئیات اور مسائل قیامت تک نکلتے رہیں گے۔ مگر اصول وکلیات ایک ہی رہیں گے۔

اس بنیاد پر آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہ انسانیت کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قرآنی آیات کے دائرے سے باہر ہو۔ وہ ایک ایسی دستاویز ہے۔ جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے۔ اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن ایسی جامعیت کی شان رکھتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کے فکری، اعتقادی، اخلاقی، روحانی، معاشی، سیاسی، عائلی، معاشرتی، اجتماعی اور قانونی گوشوں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ پھر اس طرح جیسے کہ ہوا کا کرّہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ من لدن حکیم خبیر شارحین قرآن نے اس کی بلیغانہ لطافت پر دل کھول کر داد تحسین دی ہے۔ آیئے آپ بھی اس گلزار سے استفادہ کیجیے

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔ یہ تعبیر موقع پر اور دلیل میں آئی ہے ھو تقدیر لاحکامھا وتفصیلھا، یعنی من لدن حکیم خبیر میں بتایا گیا ہے۔ کہ آیات قرآن کے احکام کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ آیات ایسی ذات کی جانب سے ہیں۔ جو حکیم ہے۔ اور آیات کے مفصل ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ کی ذات علم والی اور باخبر ہے۔ اور علامہ زمخشری نے انداز کلام میں لف ونشر بتایا ہے۔ اور پورے فقرے کی اس طرح نشاندہی کی ہے۔ کہ احکمت آیاتہ وفصلھا خبیر فرق دونوں میں یہ ہے۔ کہ قاضی صاحب کی نظر فقرے

کی معنویت پر ہے جبکہ زمخشری کی رسائی تعبیر کی ظاہری سطح پر ہے۔ علامہ طیبی نے زمخشری کی بات کو یہ کہہ کر جاندار بنا دیا۔ کہ یہ تعبیر اور انداز یسبح لہ بالغدو والاصال رجال کے قبیل سے ہے۔ جبکہ یسبح فعل مجہول ہو۔ یعنی یہ گویا اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ اور علامہ بقاعی نے اس موقع پر تشریح کا انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا اور منفرد ہے۔ فرماتے ہیں۔

> احکام اور تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد آیت کا خاتمہ کس قدر شاندار ہے۔ من لدن حکیم خبیر یعنی یہ آیات محکمہ اور مفصلہ نازل ہوئی ہیں۔ اور ان کے نزول کا مبدأ اللہ کی ذات ہے۔ جس کی بارگاہ تمام بارگاہوں سے اعلیٰ ہے۔ اور جو حکیم و خبیر ہے۔ اور نزول کا منتہیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

علامہ قاشانی کے حوالے سے شام کے مشہور علامہ قاسمی نے جو بات لکھی ہے وہ بھی اس لائق ہے کہ پڑھی جائے۔ فرماتے ہیں۔ کہ

> اللہ سبحانہ نے اپنے علم و حکمت پر مبنی یہ کتاب نازل کی ہے کہ اس سے زیادہ اچھی کتاب احکام کے اعتبار سے ممکن ہی نہیں۔ وہ اس کتاب کی تفاصیل سے خوب واقف ہے۔ اور جانتا ہے کہ قانونی نظام میں تقدیر، فوقیت، ترتیب کیسے ہونی چاہیئے۔

آیت قرآنی پر ایک جامع نظر

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے۔ آیئے اس پر ایک جامع نظر ڈال لیجیئے۔

احکام کے معنے لغت کی زبان میں روکنے اور مضبوط بنانے کے ہیں۔ احکام اپنے دونوں معنے کے لحاظ سے اپنا متعلق چاہتا ہے۔ جب آپ کہیں گے کہ اس کی آیات کو روک دیا گیا ہے تو ذہن میں یہ سوال خود بخود اُبھر آئے گا۔ کہ کہاں سے روکا گیا ہے۔ ایک جواب تو وہی ہے۔ جو شارحین قرآن کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ لیکن آیت کے لفظوں میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ کہ آپ سوال کرنے والے سے کہیں کہ زمانے کی ساری کروٹوں اور قوموں کی ساری ترقیوں کے باوجود یہ کتاب الٰہی ہر طرح کی لفظی تحریف اور تصرف سے محفوظ رہے گی۔ یہ گویا اس آیت میں قرآن

کی قیامت تک حفاظت کا اعلان ہے۔ اور اس اعلان کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر محفوظ نہیں رہی۔ لاکھوں انبیاء میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب بدلتا رہا۔ اس لیے قرآن کے بارے میں یہ وعدہ کیا گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا۔ ہر قسم کی تحریف و تصرف کو اس سے روک دیا گیا ہے۔ یہی بات قرآن میں دوسری جگہ صراحتاً بتائی گئی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون

احکام کے دوسرے معنے مضبوط بنانے کے ہیں۔ احکمت آیاتہ کے معنے یہ ہیں کہ آیات قرآنی کو مضبوط بنا دیا گیا ہے۔ تو آپ کے ذہن میں یہاں بھی یہ سوال ابھر آئے گا۔ کہ کس طرح مضبوط بنایا گیا۔ ایک جواب تو آپ قاضی بیضاوی کے حوالے سے سن رہے ہیں۔ کہ دلائل و براہین کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ حکمت کے ذریعے مضبوط بنایا گیا۔ تو اس میں زیادہ لطافت ہے۔ کیونکہ قرآن نے کتاب کے ساتھ بار بار حکمت کا ذکر کیا ہے۔ اور وہ بھی تعلیم کے موضوع پر۔ من یعلمهم الکتاب والحکمۃ۔ یہ اور اس قسم کی آیات میں بتایا گیا ہے۔ کہ پیغمبر کا کام کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا ہے کتاب کی تعلیم کے معنے تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد آپ کا پہلا اور اہم کام یہ تھا۔ کہ کتاب کے مشکل مطالب کو حل کریں۔ مجمل معانی کو سمجھائیں۔ اور اپنی گفتار اور اپنے کردار سے اس کی شرح و تفصیل کریں۔ اسی کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے۔ جس کا قرآن میں بار بار ذکر ہوا ہے۔ اسی کی خاطر قرآن کا نزول بتدریج ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ تو حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ جبکہ سینۂ قرآن کی ابلی ہوئی صدا یہی ہے۔

وقرآنا فرقناه لتقرأه علی الناس علی مکث

اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے پیش کیا تاکہ تو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پیش کرے۔

گویا آہستہ آہستہ نزول کی وجہ یہ ہے۔ کہ احوال و واقعات کے موافق ہدایات آئیں۔ اس طرح ان تیئیس ۲۳ سالہ پیش پا افتادہ حالات و وقائع کا نام یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

تیئس ۲۳ سالہ شب و روز میں قرآن ہی کی ہدایات پر اُٹھی ہوئی ۔ عادتوں، باتوں، کاموں اور حالتوں کا نام حکمت ہے ۔اسی کو اصلاحی زبان میں سُنت کہا جاتا ہے ۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک کتاب دوسری کتاب کی ہدایات پر اٹھی ہوئی نبوت کی محسوس وسری زندگی ان دونوں میں وہی تعلق ہے ۔جو نقش ونقاش میں نظریہ اور عمل میں پروردگار اور پروردگاری میں معمار اور عمارت میں نظم اور ناظم میں ہوتا ہے ۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے ۔ تو پھر حکمت کو کتاب سے یا سُنت کو قرآن سے کیسے جدا کر سکتے ہیں ۔کتاب کو چراغ اور حکمت کو اس کی روشنی کہہ دیجئے ۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین

فرق صرف یہ ہے کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب ہے ۔ اور اس وحی کی راہنمائی میں بنے ہوئے نقشہ عمل کا نام حکمت ہے ۔ امام شافعیؒ نے حکمت کا نام سُنت بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ۔ کہ

> آپ کی سُنت وہ حکمت ہے ۔جو آپ کے قلب میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ڈالی گئی ہے ۔ (الرسالہ ص۴۸)

ایک اور مقام پر امام موصوف لکھتے ہیں ۔

> میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو میں پسند کرتا ہوں ۔ یہ سُنا ہے کہ حکمت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کا نام ہے ۔ الرسالہ (۱)

(۱) **الرسالہ:** یہ امام شافعیؒ کی اصول فقہ میں کتاب ہے ۔ شاہ ولی اللہ انصاف میں رقمطراز ہیں "مختلف نصوص میں مطابقت کے لیے قواعد نہ تھے ۔ اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا ۔حضرت امام شافعیؒ نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا ۔ و ھذا اول تدوین فی اصول الفقہ ۔ دراصل یہ کتاب امام شافعیؒ نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے ۔چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد ابوثور کے حوالہ سے نقل کیا ہے ۔ کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعیؒ کو ایک خط لکھا اور درخواست کی ۔ کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں ۔ اور جس میں اخبار و احادیث کی قسمیں اجماع اور کتاب و سُنت کے ناسخ و منسوخ کو تذکرہ ہو ۔ امام ابوثور فرماتے ہیں ۔فوضع لہ الرسالہ

اس درخواست کے مطابق امام شافعیؒ نے الرسالہ لکھا، دیکھو تاریخ بغداد ۲ صـ۶۵ ـــــ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے توالی التاسیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھا ہے۔

کتب عبدالرحمٰن بن مہدی الی الشافعیؒ وھو شاب ان یصنع لہ کتابا فوضع لہ کتاب الرسالہ صـ۵۵

یہ صرف حضرت امام شافعیؒ کی رائے نہیں کہ قرآن میں حکمت مصداق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ہے۔ خود امام شافعیؒ نے ایک مناظرے میں اسے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور جب ان سے دریافت کیا گیا۔ کہ قرآن کی جن آیات میں حکمت کا ذکر آیا ہے۔ وہاں حکمت سے کیا مراد ہے۔ آپ نے جواباً فرمایا۔ کہ

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا کہ اس کا بھی امکان ہے۔ کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ اور خاص طور پر حکمت کی اور حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہوں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے لیسے ہی بیان کرتا ہے۔ جیسے اس نے ان کے سامنے فرائض، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو بیان کیا ہے۔ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر یہی مطلب ہے۔ تو پھر اس کا علم بغیر جزئی کے کیسے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ارشادات کی ضرورت ہو گی۔ سائل بولا اگر کتاب و حکمت دونوں سے ایک چیز مراد ہو۔ اور کلام میں صرف تکرار ہو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا یہ آپ ہی بتایئے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے۔ کتاب و حکمت دونوں ایک ہوں یا دونوں الگ الگ ہوں۔ سائل نے جواب دیا۔ کہ دونوں کا احتمال ہے۔ چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہو۔ جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے۔ کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہو۔ اور اس پر قرآن میں شہادت ہے۔ سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے۔ امام شافعیؒ نے جواب میں یہ آیت تلاوت کی۔

واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ۔ [1]

بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ کتاب کو حکمت کے ساتھ اور قرآن کو سُنت کے ذریعے مضبوط اور مستحکم بنا دیا۔ کتاب اگر نظریہ ہے۔ تو حکمت اسی نظریے کی اساس پر اُٹھی ہوئی ایک شاندار عمارت ہے۔ کتاب کو حکمت کے ذریعے مضبوط بنا کر کتاب کو لوگوں کی فکری آوارگی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اسی لیے کتاب کو حکمت والی کتاب کہا گیا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں۔ کہ اگر کتاب الٰہی اپنی آغوش میں حکمت لے کر آئی ہے۔ تو حکمت کا ظہور وجود کیسے ہوا۔ اس کا جواب خود قرآن نے دیا ہے۔ کہ اس کا ظہور دو طریقے سے ہوا ہے ایک نبوت کی تبیین پر مبنی فتویٰ۔ دوسرے اللہ سبحانہٗ کی ارارت کے مطابق نبوت کے فیصلے۔

یہ بات کہ کتاب اللہ کے بیان وشرح کی طاقت اور اس کا اختیار اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نبوت کو عطا ہوا تھا۔ قرآن نے کھول کر بتائی ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبیّن للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون

بیان وتبیین کے لفظی معنے کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں۔ اور اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک اعلان واظہار کے ذریعے دوسرے توضیح وتفسیر کے ذریعے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اس آیت گرامی میں بیان کس طرح ہوا۔ اظہار واعلان کے ذریعے یا توضیح وتشریح کے ذریعے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہاں اعلان واظہار کی بجائے۔ توضیح وتشریح کے ذریعے اعلان ہوا ہے غور وفکر کے لیے توضیح وتشریح مناسب ہے۔ نہ کہ اعلان واظہار۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت کی رُو سے کتاب کا جو بیان جو توضیح وتشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب بتایا گیا ہے۔ وہ بھی حکمت ہے۔ اور اسی کا نام محدثین کی زبان میں سُنت ہے۔ اور اس بیان وتشریح کا فیضان بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔ جیسے فرمایا ہے۔

"وانزلنا علیك الکتاب والحکمۃ"

اور اس کا اتباع بھی اللہ کے حکم کی پیروی ہے۔ کیونکہ اسی بیان وتشریح کو قرآن کی سورۃ

---

[1] کتاب الام جلد ۷ صفحہ ۲۵۱

قیامہ میں اللہ سبحانہٗ نے اپنا بیان قرار دیا ہے۔ لیجیے سورہ قیامہ کی آیت پڑھ لیجیے

ان علینا جمعہٗ وقرآنہٗ فاذا قرانٰہ فاتبع قرآنہٗ ثم ان علینا بیانہٗ

بلا شبہ اس قرآن کو جمع کر دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اور اس کو پڑھانا بھی ہمارا کام ہے۔ لہذا جب ہم پڑھیں۔ تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر اس کا بیان کرنا بھی ہمارا کام ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ثم ان علینا بیانہٗ کی تشریح یہ کی ہے۔ کہ

ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانہ میں ہم ایک جماعت کو لغوی تشریح اور اس کے شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے۔ تاکہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مصداق بیان کریں۔ اور یہ بات یاد کرنے اور تمہاری تبیین کے بعد ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے مبین ہیں[1]

چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کے مبین ہیں۔ اس لیے اس کا بیان بھی حکمت ہے۔ اور اس بیان میں نزول کتاب کے بعد بھی حالات و واقعات میں تراخی ہوتی ہے۔ اس لیے ثم ان علینا بیانہٗ میں ثم لے کر آئے ہیں۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت۔ اس کتاب کی آیات کو حکمت والا بنایا گیا۔ پھر اس حکمت کو نبوت کی توضیح و تشریح کے ذریعے کھول دیا گیا۔ یہ تفصیل چونکہ نزول آیات کے بعد نبوت کے ذریعے ہوئی۔ اس لیے ثم فصلت میں ثم تراخی کے لیے لائے۔ پھر جیسے جمع قرآن ہوا۔ ایسے ہی یہاں نبوت کے بعد جمع و ترتیب، تدوین و تہذیب کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فتاویٰ ظہور میں آئے۔ جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآنی کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کیے۔

حکمت کے ظہور کا دوسرا ذریعہ ارادت ہے۔ انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں ہے۔

---

[1] ازالۃ الخفاء جلد ۲

کہ ان کے ذریعے سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے۔ جو ایک طرف تو اختلاف فہم سے محفوظ رہے۔ اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو۔ کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف سے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں۔ گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس اختلاف فہم کے نقصان کو کم کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے یہ کیا کہ فتاویٰ میں اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور پر اس کی تشریح کرا دی اور قضایا میں قرآن نے خود یہ ضابطہ بتایا ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

اے پیغمبر ہم نے سچائی کے ساتھ تجھ پر کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ نے سمجھایا ہے اس کے ذریعے فیصلہ کرے۔

اس آیت میں روزمرہ کے پیش پا افتادہ حالات و معاملات کے لیے یہ صورت رکھی گئی ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ واقعات و مقدمات پیش ہوتے اور آپ کتاب اللہ کے اصول و کلیات کے تحت اپنی خداداد نور بصیرت سے ان کے فیصلے فرماتے۔ یہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا کہلاتے ہیں۔ آیت میں کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے۔ کہ نبوت کتاب کے احکام و قوانین لے کر اس فہم کے ذریعے جو اللہ نے نبوت کو عطا فرمائی ہے۔ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ گویا حکمت نام ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و توضیح اور بیان و تشریح کا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کی ارادے کے مطابق فیصلوں کا۔ اسی کا نام محدثین کی زبان میں سُنت ہے۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ آیات قرآن کی عمارت کو حکمت کے بند کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ اگر آیات قرآن کو سنت و حکمت کے بند کے ذریعے مضبوط نہ بنایا جاتا۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ جو جس کے جی میں آتا قرآن سے سمجھ لیتا اور جس قسم کا فیصلہ چاہے کر لیتا۔ اللہ اللہ اگر اس کی اجازت دے دی جاتی اور آیات قرآنی کے لیے سُنت کا پشتارہ نہ ہوتا۔ تو جس طرح ہر شخص کی صورت بلکہ ہر شخص کی آواز دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر مسلمان کا مذہب دوسرے مسلمان سے مختلف ہوتا۔ گویا ۷ کروڑ مسلمانوں کی نمازیں ستر کروڑ شکلوں میں ہوتیں۔ اتنے سخت نظم کے بعد بھی جب اختلافات کا یہ حال ہے۔ تو قرآنی آیات کی پشت پر اگر حکمت و سُنت کا طاقتور بند نہ ہوتا تو پورا

دین فکری آوارگی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ للہ ۔
بہر حال آیات قرآنی کی پشت پناہی کے لیے حکمت کی پائیدار طاقت کا جو سرمایہ نبوت نے بیان و تبیین کے ذریعے فتاویٰ کی صورت میں اور ارارت خداوندی کے ذریعے قضایا کی شکل میں چھوڑا تھا۔ اس کو خلفائے راشدین نے خلافت راشدہ میں قضایا اور فتاویٰ میں ماخذ قرار دیا ۔ اور اسی کو بعد کے فقہاء و مجتہدین نے اختیار کیا ۔ اسی مجموعے کا نام آج فقہ یا قانون اسلامی ہے ۔

۲ "توحید عبادت وحی کا اولین مقصد ہے"

اس کتاب کا اعلان ہے ۔ کہ اللہ سبحانہ کے علاوہ کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو ۔ یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بڑا مقصد یہ ہے ۔ کہ دنیا کو صرف خدار واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جائے ۔ اور اس کے طریقے سیکھائے جائیں ۔ اسی عظیم و جلیل مقصد کے لیے پہلے انبیاء تشریف لائے ۔ یہ آیات پڑھیئے ۔

وما ارسلنا قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا الٰه الا انا فاعبدون ۔ الانبیاء ۔ ۲۵

اور نہیں بھیجا ہم نے تیرے سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو بھی حکم بھیجا کہ بات یہی ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے لہذا میری ہی بندگی کرو ۔

اور

ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت النمل ۔ ۳۶

اور ہم نے روزانہ کیے ہیں ۔ ہر امت میں رسول کہ لوگو بندگی کرو اللہ کی اور بچو ہڑ دنگے سے ۔ [1]

آیئے سب سے پہلے اس فقرے کی تشریح شارحین قرآن کی زبانی سُن لیجیے ۔

شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں جو کچھ لکھا ہے ۔ اس کی لطافت قابل داد ہے ۔ لیکن

---

[1] ۔ افادات شیخ الاسلام : ہڑ دنگا وہ ہے ۔ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے ۔ کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں ۔ افادہ شیخ عبدالقادر فی الموضح

اردو زبان کے تمام شارحین قرآن نے اس فقرے کو اپنی تشریحات میں اس طرح نظرانداز کر دیا ہے گویا اس میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہی فقرہ اپنی گہری معنویت کی وجہ سے پوری سورۃ کے مضامین کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔

آیئے عربی تفاسیر سے استفادہ کریں۔ علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس آیت کی پیوندکاری پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ یہ فقرہ پہلے فقرے احکمت آیاتہ ثم فصلت کی علت بن کر آیا ہے۔ اصل فقرہ ئلا تعبدوا الا اللہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس کتاب الٰہی کی آیات میں احکام اور پھر تفصیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ تمہارے اللہ کے سوا اور کسی سے عابدانہ تعلقات نہ ہوں۔ صرف اللہ سبحانہٗ سے تمہارا عابدانہ تعلق ہو۔ قرآن میں احکام و تفصیل کی پکار بھی یہ ہے۔ کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور صرف اس سے عابدانہ تعلقات قائم کرو۔ اور پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ساری کی ساری اطاعتیں اس کی اور صرف اس کی ہوں۔ زمخشری کے کشاف میں بیضاوی نے تفسیر میں اور دوسرے مفسرین نے بھی اسی پیوندکاری کو اولیت کا مقام دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اسی کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ استیناف کی حد تک سارے شارحینِ قرآن کی علامہ آلوسی کو ہمنوائی حاصل ہے۔ لیکن علامہ بقاعی کو نظم الدرر میں استیناف کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ

> یہ جملہ مستانفہ احکمت آیاتہٗ ثم فصلت کی علت نہیں بلکہ اس کا جوڑ فعل محذوف کے ساتھ ہے۔ پوری بات اس طرح ہے۔
>
> (ہم نے آپ کو یہ اس لیے روانہ کیا ہے۔ کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ لوگو اللہ کے سوا کسی سے کسی قسم کا عابدانہ تعلق نہ رکھو۔[1])

اس فقرے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ یہ سب نبیوں کی دعوت اور پکار ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اسی عظیم وجلیل مقصد کے لیے پہلے انبیاء تشریف لائے ہیں۔ اسی دعوے کو دلائل سے ثابت کرنے کے لیے سورت میں تاریخی واقعات کو استشہاد میں پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] نظم الدرر

یہاں ان لا تعبدوا الا اللہ لا کر بتایا ہے۔ کہ قرآن کے نزول کا مقصد اس
کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کو

۱۔ توحید عبادت کے منافع بتائے۔

۲۔ عبادت میں شرک کے مفاسد سے آگاہ کرے۔

کیونکہ عبادت وہ چیز ہے۔ جو انسانی روح کو پاکیزگی اور بلندی عطا کرتی ہے۔ اور اس طرح اسے اللہ سبحانہ کی خوشنودیوں اور کرم بخشیوں کا سزاوار بناتی ہے۔ یہ ہے وہ تصور جو عبادت کے بارے میں سب رکھتے ہیں۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ ایک ایسا تصور ہے جسے قرآن ایک واضح ترین حقیقت قرار دیتا ہے اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ کسی نبی کی دعوت اس کے سوا کچھ تھی بھی نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ وضاحت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اسے انسان تو پیدا ہی صرف اس کام کے لیے کیا گیا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری
عبادت کریں۔ ذاریات ۵۶۔

یعنی عبادت ہی وہ چیز ہے۔ جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کو مبعوث بھی کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جس کام کے لیے انسان کو پیدا کیا ہے۔ نبوت کے آنے کا مقصد بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

عبادت کا مفہوم

عبادت کا لفظ جب قرآن و حدیث میں آتا ہے۔ تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اور اس کی حدیں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں ہر اس چیز پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جو اس بارے میں کچھ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اور عبادت کا مفہوم مقرر کرنے میں سند کا مقام رکھتی ہو۔ آئیے پہلے زبان و ادب کے شاہکاروں سے اس کے معنے کی تحقیق کریں۔ آئیے سب سے پہلے لغت قرآن کے محقق امام راغب سے معلوم کریں۔ کہ عبادت کے کیا معنے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

عبادت کے معنے انتہائی حد تک پست ہونے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اور اس
کا استحقاق سوائے اس ذات عالی کے جس کے افضال و انعامات بے پایاں

ہیں۔ اور کسی کو نہیں ہے۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں عبادت کے معنے اطاعت کے بتائے ہیں۔ اور بصائر ذوی التمییز میں علامہ موصوف ہی نے عبادت کے معنے یہ لکھے ہیں۔

عبادت کے معنے اطاعت کے ہیں۔ لیکن یہ عبودیت سے بلیغ تر ہے۔ کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ اس کا مستحق افضال وانعام والے کے سوا کوئی نہیں اور وہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے۔

علامہ ابن الاثیر کے نہایہ میں یہ الفاظ ہیں۔ لغت میں عبادت نام ہے۔ اس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیر کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ راغب اصفہانی اور مجد الدین فیروز آبادی نے اس کے صرف ایک جز کو بیان کیا ہے۔ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر فتح القدیر میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے عبادت کی شرعی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

شریعت میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محنت، فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔

علامہ مرتضٰی زبیدی تاج العروس شرح قاموس میں لکھتے ہیں۔

کچھ آئمہ اشتقاق کا بیان ہے۔ کہ عبودیت کی اصل عاجزی اور فروتنی ہے۔ اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں۔ کہ عبودیت کے معنے ہیں۔ رب جو کرے اس پر راضی رہنا اور عبادت کے معنے ہیں وہ کام کرنا جس سے رب راضی رہے اور زیادہ محنت، مشقت کا کام ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔ کہ عبادت عالم آخرت میں ساقط ہو جائے گی۔ مگر عبودیت بدستور باقی رہے گی۔ کیونکہ عبودیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ دونوں جہاں میں اللہ کے سوا کسی کو متصرف نہ سمجھے۔

اس عبادت کو نقل کر کے علامہ زبیدی فرماتے ہیں۔

ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ عبادت کے معنے ہیں صوفیانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ لفظ عبادت کی لغوی ساخت کو اس تشریح میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ لغت اور ادب کی زبان میں عبادت ہے۔ بظاہر یہ معانی ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہیں۔ مگر فی الواقع مختلف نہیں۔ بلکہ ان میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ ان لغوی وضاحتوں کو اگر سامنے رکھا جائے۔ تو عبادت کا دینی اور اسلامی تصور بہت کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ ان سے بڑی آسانی سے

یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ عبادت الہی کا اصلی جوہر کیا ہے۔ اور اللہ کی عبادت کرنے والا کون ہوتا ہے۔ اور کیا ہوتا ہے؟

عبادت کا اصل اور بنیادی مفہوم اگر آخری درجہ کی فروتنی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ یہی فروتنی اللہ سبحانہ کا اصلی جوہر ہے۔ پھر چونکہ اللہ سبحانہ انسان کے حقیقی فرماں روا بھی ہیں اور اس کے حقیقی محسن بھی۔ اس لیے انسانی عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ اس آخری درجہ کی فروتنی کا نتیجہ اطاعت اور پرستش نہ ہو۔ یہ بات کچھ ایسی ہی ناممکن ہے۔ کہ آگ تو بھڑک رہی ہے۔ مگر اس میں گرمی نہ ہو۔ غرض اللہ سبحانہ کے سامنے انسان کی فروتنی کی جو فطری نوعیت ہو سکتی ہے۔ اس کا قطعی تقاضا یہی ہے۔ کہ عبادت الہی میں تینوں چیزیں موجود ہوں۔ انتہائی تذلل بھی، اطاعت بھی اور پرستش بھی۔

عبادت کے ان معانی کو پیش نظر رکھ کر آپ ذرا اس پر غور فرمائیے کہ انبیاء علیہم اسلام نوع انسانی کی ہدایت کے لیے تشریف لائے۔ ان بزرگوں نے لوگوں کو جس بات کی ہدایت کی وہ واضح اور قطعی لفظوں میں یہ کہ اعبدوا اللہ اللہ سبحانہ کی عبادت کرو اور ظاہر ہے یہی دعوت ہونی چاہیئے۔ اگر انسان اللہ سبحانہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ انبیاء علیہم اسلام کو جو ہدایت دے کر روانہ کیا جاتا۔ وہ اس سے مختلف ہوتی۔

قرآن میں لفظ عبادت مختلف صیغوں کی شکل میں بے شمار مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ منتخب آیتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیجیئے۔

اولاً۔ کسی کے ساتھ پرستش کا رویہ اختیار کرنے کو عبادت کہا گیا ہے۔ مثلاً

ماتعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم

اور

قالوا نعبد اصناما فنظل لھا عاکفین

یہ آیات ببانگ دہل علی روس الاشہاد کہہ رہی ہیں۔ کہ مشرکین اپنے بتوں کی جو پرستش کرتے تھے۔ وہ عبادت ہے۔

ثانیاً۔ کسی کو مطاع مطلق سمجھ کر اپنے ارادے اور مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت ہے۔ مثلاً

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا

الی اللہ لھم البشری

اس آیت میں واضح طور پر اس طرزِ عمل کو عبادت کہا گیا ہے۔ جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کی جاتی ہے۔ طاغوت کے معنے جیسا کہ شاہ عبد القادر کی زبانی سُن چکے ہو۔ ہر زور آور ناحق سرداری کا دعویٰ کرے۔ اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہ ہو۔ یعنی ہر وہ مخلوق جو اللہ کی بندگی سے نکل گئی ہو یا نکل جانے کا ذریعہ ہو۔ اس طرح اگر شیطان اور بت طاغوت ہیں تو وہ حکمران، سردار اور وہ قومی لیڈر بھی طاغوت ہی ہیں۔ جو خوفِ خدا سے بے بہرہ اور ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر اپنی رائے اور مرضی کو وقت کا قانون سمجھتے ہیں۔

ثالثاً۔ صرف وہی اطاعت عبادت نہیں جس کے پیچھے ارادۂ دل کی آمادگی اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو اسکے بارے میں بے قید اطاعت کے مستحق ہونے کا خیال موجود ہو۔ بلکہ وہ اطاعت بھی عبادت ہے۔ جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑ رہی ہے۔ مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چون و چرا کی جا رہی ہو۔ اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو۔ وہ خود کو کسی بالاتر قانون کا پابند نہ سمجھتا ہو۔ مثلاً

فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون

اور جیسے

وتلك نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل

ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی غلامی کو قبطیوں کی عبادت کرنا کہا گیا ہے۔

رابعاً۔ کسی کی غیر شعوری اطاعت کاملہ بھی عبادت ہے۔ مثلاً یا ابت

لا تعبد الشیطان

اس آیت میں شیطان کی عبادت کرنے سے روکا گیا ہے۔ حالانکہ شیطان کی عبادت اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ ان کے عقائد و اعمال بالکل ویسے تھے جیسا کہ شیطان چاہتا تھا۔

قرآن کا اہل ایمان سے مطالبہ

اللہ سبحانہٗ نے اپنی جس عبادت کو انسان کا مقصد وجود قرار دیا ہے۔ اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں۔ وہ کوئی ادھوری، آدھی، تہائی قسم کی عبادت نہیں ہے۔ نہ صرف وہ پرستش تک محدود ہے۔ نہ صرف اطاعت تک، قرآن کا اہل ایمان سے مطالبہ یہ

ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کی پرستش اور اس کی اطاعت دونوں ہی چیزیں یکساں طور پر کرو۔ وہ جہاں یہ کہتا ہے۔ کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو۔ اسی کی نذر مانو، اسی سے دعا مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو دہائی دو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعتراف نعمت کرو۔ وہیں یہ بھی کہتا ہے۔ کہ اللہ ہی کی بے قید اطاعت کرو اور اسی کو بلاشرط حقیقی فرمانروا مانو۔ اسی کو مستقل اور بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اور اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ۔ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا فرمایا گیا ہے۔ جو ہر نبی کی دعوت سرعنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے۔ لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہو گا۔ جس میں پرستش اور اطاعت دونوں شامل ہیں۔

اسی لیے قرآن میں عبادت کا مقابل اور ضد استکبار آیا ہے۔ ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین۔

اس قسم کی اور آیات بھی قرآن میں ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور استکبار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے اگر استکبار کے معنے اللہ کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے اپنی ہستی کو بھی کوئی جاننا اور اللہ سبحانہٗ کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنے کے ہیں تو عبادت کے معنے اللہ سبحانہٗ کے سامنے اپنی عاجزی فروتنی کا اظہار اور بندگی میں اس کے احکام و قوانین کے سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے۔ اس بنا پر عبادت بندہ کا ہر وہ کام ہے۔ جس سے مقصود اللہ سبحانہٗ کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے قوانین و احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی شخص بظاہر کیسے ہی اچھے کام کرے۔ لیکن اس سے مقصود اپنی فروتنی کا اظہار اور اللہ سبحانہٗ کے حکم کی اطاعت نہ ہو۔ تو وہ عبادت نہیں ہے۔

اس بحث سے قرآن کی مطلوبہ عبادت ان لا تعبدوا الا اللہ کا مفہوم و مدعا بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کا دل بھی اللہ کے حضور بچھا ہوا ہو۔ اور اس کے اعضاء و جوارح بھی جھکے ہوئے ہوں۔ وہ اس کی والہانہ اطاعت میں سرگرم رہے اور اسی اطاعت کے اولین تقاضے کی حیثیت سے اس کی مخلصانہ پرستش بھی کرے۔ یہاں تک کہ اس کے باطن کے کسی جذبے، رجحان اور ظاہر کے کسی قول و عمل سے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ اس کے اندر اپنے اللہ کے سوا کسی اور کی عظمت و کبریائی موجود ہے۔ یا کسی دوسرے کے لیے

یہی ظاہر یا باطن کا جھکاؤ خضوع پایا جاتا ہے۔

(۳) نبوت انسانیت کیلئے بشیر و نذیر ہے

بلاشبہ میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے تمہیں خبردار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ یعنی جو کتاب کو ماننے اور شرک چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرے اسے فلاح دارین کی خوشخبری سناتے ہیں۔ جو نہ ماننے اور کفر و شرک اختیار کرے اس کو عذاب الہٰی سے ڈراتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے یہی مطلب بتایا ہے۔ جو شیخ الاسلام نے لکھا ہے۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن نے اس موضوع پر جو داد تحسین دی اس سے بھی استفادہ فرمالیجئے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

بلاشبہ میں تمہیں عذاب سے آگاہ کرنے والا ہوں۔ اگر تم میری پیش کردہ دعوت کی مخالفت کرو گے اور تم اس دعوت کو مان کر اطاعت کا رویہ اختیار کرو گے۔ تو میں اس پر ثواب کی تمہیں بشارت دینے والا ہوں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر گئے اور خاندان کے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر پکارا۔ لوگ آواز پر جمع ہو گئے۔ فرمایا کہ اسے قریش تمہاری کیا رائے ہے اس میں کہ اگر تمہیں یہ بتاؤں کہ ایک گھوڑے سواروں کا دستہ تم پر شب خون مارنے والا ہے۔ کیا تم میری بات کا یقین کرلو گے۔ قریش نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ کیوں نہیں ضرور مانیں گے۔ آپ کے متعلق ہمارا جھوٹ کا کوئی تجربہ نہیں اچھا لو سنو! خاص کر تمہیں ایک سخت ترین عذاب سے آگاہ کر رہا ہوں۔

بنیادی طور پر نبوت لوگوں کی ہدایت کے لیے آتی ہے۔ اور ہدایت کی گاڑی انسانی زندگی میں دو طرح سے چلائی ہے۔ ایک انذار دوسرے تبشیر۔ انذار یہ کہ وہ اعمال بد سے روکتی ہے۔ اور اس کے نتائج سے آگاہ اور خبردار کرتی ہے۔ اسی معنے کے اعتبار سے نبی کو نذیر کہا جاتا ہے اور اسی کا نام قرآنی زبان میں تقویٰ اور نہی عن المنکر ہے۔ یعنی رذائل اور برائیوں سے بچنا اسی کو محدثین کے یہاں ترہیب کہتے ہیں۔ اسی کو قانون کی زبان میں دفع مفاسد کو دور کرنا اور صوفیا

لہ افادات شیخ الاسلام

کی اصلاح میں تخلیہ کہتے ہیں۔ تبشیر یہ کہ نبوت اعمال صالحہ اور امر بالمعروف کی دعوت دیتی ہے ان کے فضائل بیان کرتی ہے۔ ان کے اچھے نتائج کی خوشخبری دیتی ہے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں عبادت واطاعت اور امر بالمعروف کہتے ہیں۔ محدثین کی اصلاح میں ترغیب اور قانون کی زبان میں جلب مصالح اور صوفیاء کی اصلاح میں تخلیہ ہے۔

یہاں نذیر پہلے آیا ہے۔ اور بشیر بعد میں یہ سورۃ مکی ہے۔ اور زمانہ دعوت کا آغاز ہے۔ عام شہری زندگی میں منکرات اور رذائل شاہراہ عام پر ہیں۔ اس لیے نذیر لاکر اشارا کر دیا کہ رذائل کے خلاف آواز بلند کرنا مقدم ہے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ برتن کو چمکدار بنانے کے لیے پہلے میل اور زنگ اتارا جائے پھر قلعی کی جائے۔ قانون دان محققین نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے کہ مفاسد کو پہلے دور کیا جائے مصالح بعد کی بات ہے۔

ہاں جب شہری زندگی میں برائیاں دبی ہوئی ہوں۔ رذائل شاہراہ عام پر نہ ہوں۔ وہاں دعوت کا رُخ فضائل کی طرف ہوگا۔ قانون مصالح سے بحث کرے گا۔ مکی اور مدنی سورتوں میں آپ کو یہ صرف نمایاں نظر آئے گا۔ مکی سورتوں میں لفظ نذیر پہلے آئے گا۔ جبکہ مدنی سورتوں میں بشیر سے آغاز کیا جائے گا۔ مدنی سورتوں میں بھی وہ سورتیں جو مدنی زندگی کے دور آغاز میں ہیں۔ ان میں نذیر پہلے آیا ہے۔ یہ احوال وظروف کی رعایت پر مبنی فرق ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے تذکار میں قرآن نے جو تبشیر کو مقدم کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے۔ کہ اصل فطرت انسانی میں نیکی ہے بدی اور رذیلہ ایک اضافی چیز ہے۔ جیسے اصل اللہ سبحانہٗ میں رحمت ہے۔ اور تبشیر رحمت ہی کا تقاضا ہے۔ اور غضب ایک اضافی چیز ہے۔ اور غضب ہی کا نتیجہ ہے۔

آیات قرآنی کا اس فکر کے ساتھ مطالعہ کیجئے۔ تو آپ پر قرآنی مخاطبات کی بلاغت کے دروازے کھل جائینگے۔

اس سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ داعی کو دعوت میں احوال وظروف کی رعایت ضروری ہے۔ اگر داعی اس کی رعایت نہ کرے گا تو داعی کی دعوت حکمت پر مبنی نہ ہوگی۔

(۴) نبوت کی دعوت میں فلاح دنیا کی ضمانت

اور یہ کہ تم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف پلٹ آؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمہیں ایک وقت مقررہ تک اچھا سامان زندگی دے گا۔ اور عمل میں زیادتی کرنے

والے کو اس کی مزید محنت و کوششیں کا اجر دے گا۔ یعنی جو پچھلی تقصیرات معاف کرائے گا۔ اور آئندہ کے لیے اللہ سبحانہ، کی طرف رجوع ہو۔ تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے گی۔ کیونکہ مومن قانت خواہ کسی حال میں بھی ہو مگر اللہ سبحانہ، کے فضل وکرم کی بڑی بڑی امیدیں رکھتا ہے۔ اور وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور مستقبل کی عظیم الشان خوشحالی کے تصور میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی سختیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ جب خیال کرتا ہے۔ کہ اپنی زندگی کے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہا ہوں۔ جس کا صلہ مجھ کو ضرور ایک دن عرش والی سرکار سے ملنے والا ہے۔ تو اپنی کامیابی اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد کرکے اس کا دل جوشِ مسرت سے اُچھلنے لگتا ہے۔ اسے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں وہ سکون قلب اور راحت باطنی نصیب ہوتی ہے۔ جو بادشاہوں کو بے شمار سامانوں اور اموال وخزائن سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ بعض اوقات یہاں کی چند روزہ تکلیفوں اور سختیوں میں وہ لذت پاتے ہیں۔ جو اغنیاء وملوک اپنے عیش وتنعم میں محسوس نہیں کرتے۔ ایک محب وطن سپاہی قیدی کو اگر فرض کیجیے یقین ہو جائے کہ میری اسیری سے ملک اجنبیوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اور جسے قید سے نکلتے ہی ملک کی جمہوریہ کا صدر بنایا جائے گا تو کیا اس کو جیل خانہ کی بند کوٹھڑی میں سرور و اطمینان کی کیفیت اس بادشاہ سے زیادہ حاصل نہ ہوگی۔ جس کے لیے ہر قسم کے عیش و طرب فراہم ہیں مگر اندیشہ لگا ہوا ہے۔ کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر نہایت ذلت کے ساتھ تخت شاہی سے اتارا جانے والا ہے اسی پر دنیا کے جیل خانہ کو قیاس کر لو۔ پھر جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا۔ اسی قدر اللہ سبحانہ، کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا۔ آخرت میں اجر وثواب اور دنیا میں مزید طمانیت حاصل ہوگی۔[1] یہاں اہم اور ضروری باتیں غور طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ غور کرو قرآن کے ایک ایک لفظ میں کیسی دقیق مناسبتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ آیت انني لكم منه نذير و بشير میں پہلے نذیر آیا ہے۔ اس کی مناسبت سے۔ ان استغفروا آیا ہے۔ انذار چونکہ رذائل اور منکرات کے نتائج سے آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ان رذائل سے جو کر چکے ہو معافی طلب کرو۔ یہ رذائل پوری زندگی میں ہیں۔ ان کی معافی کی پہلے جناب الٰہی میں درخواست کرو۔ ان رذائل میں ام الرذائل شرک ہے۔ اس میں ساری شہری زندگی مبتلا تھی۔ حافظ ابن جریرؒ نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الاستغفار استغفار من الشرک

شرک سے معافی مانگنا مراد ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ کہ شرک کی موجودگی میں کوئی عمل اللہ کے لیے نہیں ہو سکتا ہے۔ اور بشیر کی رعایت سے ثم توبوا الیہ لائے ہیں۔ بشیر اعمال صالحہ کے نتائج کی خوشخبری دینے والی کہتے ہیں۔ اس لیے اس کی مناسبت سے فرمایا۔ ثم توبوا الیہ۔ پھر اپنے اللہ کے لیے انابت پیدا کر دیعنی اعمال صالحہ کرو۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔ کہ

توبہ نام ہے۔ الرجوع الی العمل بطاعۃ اللّٰہ۔ اللہ کی فرمان برادری پر مبنی عملی زندگی کا۔

اس طرح نذیر کے ساتھ استغفار اور بشیر کے ساتھ توبہ کی پیوندکاری سے از روئے بلاغت اس میں لف ونشر ہے۔

دوسرے یہ کہ علامہ آلوسی استغفار، تمتیع اور توبہ وابتار فضل میں بھی لف ونشر بتایا ہے یہ اگرچہ ان کی اپنی رائے نہیں۔ بلکہ صیغہ تمریض سے پیش کی ہے۔ جو خود ان کے یہاں بھی اس کے کمزور ہونے کی نشانی ہے۔ اور ہے بھی یہ بات بے پر کی اور ہوائی ان میں باہم کوئی پیوند نہیں ہے

تیسرے یہ کہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اس آیت کے معانی ومطالب کا جماعت سے ہٹا کر افراد کو محمل بنا دیا۔ اور مطالب کا رُخ دنیا سے ہٹا کر آخرت کی طرف کر دیا۔ حالانکہ آیت قرآنی اپنے مطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے آیئے پہلے شارحین قرآن کی زبانی تشریحات سُنیئے۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ، مشرکین کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ گزشتہ گناہوں اور رذائل کی جناب الہی میں معافی مانگو اور آئندہ کے لیے گناہوں سے باز رہنے اور اللہ کی مخلصانہ اطاعت کا عہد کرو۔ جب تم یہ کام کر لو گے۔ تو اللہ سبحانہ، تم پر دنیا فراخ کر دے گا۔ اور تمہیں دنیا میں شان وشوکت سے نوازے گا۔ اور تمہاری عمروں میں برکت دے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

میں تمہیں گزشتہ گناہوں سے معافی مانگنے کا حکم دیتا ہوں۔ اور مستقبل میں تمہیں اطاعت گزاری کی اور اس پر دوام کی ہدایت کرتا ہوں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ

تم کو اس دنیا کی زندگی میں متاع حسن دے گا۔ ایک مقررہ مدت تک ۔

علامہ قرطبیؒ یمتعکم متاعاً حسناً کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ تمہیں وسعت رزق اور مزیدار زندگی کے منافع سے مالا مال کرے گا۔ اور تمہاری بیخ کنی نہیں کرے گا۔ عذاب کے ذریعے جیسا کہ تم سے پہلوں کے ساتھ ہو چکا ہے ۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں ۔

تمہیں امن و راحت کی زندگی سے نوازے گا۔ مقررہ مدت تک یا تمہیں عذاب استیصال کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھے گا ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں ۔

گزشتہ گناہوں سے معافی مانگو اور آئندہ زندگی اللہ کی اطاعت میں گزارنے کا عہد کرو۔ اللہ سبحانہٗ تمہیں اس دنیا میں امن و راحت والی شاندار زندگی عطا کرے گا کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی نافرمانیاں مصائب اور بلیات کو جنم دیتی ہیں ۔

علامہ بقاعی نظم الدرر میں فرماتے ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ تمہاری لذت والی زندگی کو دراز کرے گا اور یہی مزیدار زندگی زمانہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں صحابہ کرام کو عطا کی گئی اس میں دنیا کی وسعت اور راحت و آرام کی فراوانی تھی ۔

مولانا صدیق الحسن قنوجی فتح البیان میں لکھتے ہیں ۔

امتاع کے معنے لمبا کرنے کے ہیں۔ اسی سے امتع اللہ بک بولا جاتا ہے۔ آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے ۔کہ اللہ سبحانہٗ دنیا کی زندگی میں تمہاری نفع اندوزیوں کو اچھے اور شاندار منافع کے ذریعے طویل کرے گا۔ زندگی اچھی پسندیدہ ہوگی۔ رزق میں فراخی اور راحت و آرام میں بہتات ہوگی ۔

علامہ محی السنۃ ابو محمد حسن بن مسعود بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں۔

استغفار کرو اور آئندہ کے لیے اطاعت گزاری کا عہد کرو۔ تو اللہ سبحانہٗ تمہیں اس دنیا میں اچھی آرام و راحت والی زندگی کا انعام دے گا جس میں امن وچین بھی اور رزق کی فراوانی بھی ہوگی ۔

مشہور صوفی علامہ علاؤ الدین علی بن محمد لباب التاویل میں لکھتے ہیں ۔

جب تم استغفار و توبہ کی پا بجائی کرلوگے۔ اور تمہاری عابدانہ زندگی میں اللہ کے
لیے اخلاص ہو جائے گا۔ تو اللہ دنیا کی زندگی میں دنیا کے دھانے کھول دے
گا۔ اور رزق کی راہوں میں وسعت دے گا۔

یہ ہیں عربی میں ارباب تفسیر میں منقول اور معقول تفسیری سرمائے کے اہل علم۔ آیئے ذرا ان لوگوں سے خوشہ چینی کریں جنہوں نے اردو زبان میں تفسیر پر داد تحقیق دی ہے۔ چند شارحین قرآن کی تشریحات ہدیہ ناظرین ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔

تم لوگ اپنے گناہ شرک و کفر وغیرہ اپنے رب سے معاف کراؤ یعنی ایمان لاؤ اور
پھر ایمان لاکر اس کی طرف عبادت سے متوجہ رہو۔ یعنی عمل صالح کرو پس ایمان و
عمل صالح کی برکت سے وہ تم کو وقت مقررہ تک دنیا میں خوش عیشی دے گا۔ اور
آخرت میں ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب ملے گا۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے معارف القرآن میں تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے۔ اور خلاصہ یہ لکھا ہے۔ کہ

اسی لیے آیت مذکورہ میں متاع حسن کی تفسیر بھی اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و
توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے
گا۔ اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اور حیات دنیا کا ایک
روز ختم ہو جانا لازمی ہے۔ اور اس کی عیش و راحت قانون قدرت میں دائمی نہیں
ہوسکتی۔ اس لیے الی اجل مسمّٰی فرما کر ہدایت کردی کہ دنیا میں پاکیزہ زندگی اور
عیش کی سہولتیں ایک خاص معیاد یعنی موت تک حاصل رہیں گی۔ آخر کار موت ان
سب چیزوں کا خاتمہ کردے گی۔

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

تم اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو یعنی ایمان لے آؤ۔ پھر آئندہ
کے لیے اس کی طرف رجوع ہو جاؤ یعنی ہمہ تن اس کی اطاعت اور اعمال صالحہ
کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم کو ایمان و عمل صالح کی برکت سے دنیا
میں ایک وقت مقررہ تک اچھا بہرہ مند بنائے گا۔ یعنی تمہارے رزق میں برکت
ہوگی۔ اور سکون و اطمینان کی زندگی بسر کروگے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سارے شارحین قرآن میں سے کسی ایک نے بھی شیخ الاسلام کی ہمنوائی

نہیں کی ہے۔ اور تو اور شاہ عبد القادر کی بھی موضح القرآن میں شیخ الاسلام کو ہمنوائی حاصل نہیں ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

یعنی ایمان لاؤ تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے اور کوئی اس سے زیادہ قدم رکھے وہ زیادہ درجہ پائے۔

غالباً شیخ الاسلام کے پیش نظر کچھ صوفیا رکرام کے عارفانہ واردات ہیں۔ ان ہی سے متاثر ہو کر آیت قرآن کی یہ تشریح فرما رہے ہیں۔ مثلاً سہل بن عبد اللہ اس کی تشریح کرتے ہوئے۔ یوں گوہر فشاں ہیں کہ

متاع حسن سے مراد یہ ہے۔ کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے۔

یا جیسا کہ قرطبی نے بعض بزرگوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

متاع حسن یہ ہے۔ کہ انسان موجود پر قناعت کرے۔ مفقود کے غم میں نہ پڑے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے یہ تشریح اس وقت ٹھیک ہے۔ جب فرد کی انقلابی آیت قرآنی کا محمل ہو۔ لیکن آیت قرآنی میں قرآن کا مخاطب فرد نہیں بلکہ اجتماع ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے زجاج سے نقل کیا ہے۔

والخطاب لجميع الامة بقطع النظر عن كل فرد فردٍ ی

دراصل صوفیا رکی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ قرآن کی اپنے احوال وظروف کے مطابق تشریح کی جائے چونکہ تصوف کی ساری تگ و دو فرد کی انفرادی زندگی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ قرآن کی آیات کی تشریح بھی اپنے تصورات کے تحت کرتے ہیں۔ ان کا مقصود و منتہائے نظر فرد کی جمعیت ہے۔ امت کی اجتماعیت نہیں ہے۔ صوفیا رپر اسی جمعیت کی وجہ سے تفرد غالب ہوتا ہے۔ اور جس دین کی اساس عشق الہی ہو۔ اس کے لازمی تقاضے یہی ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید عشق الہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اس عشق الہی کے آثار میں سے ایک تفرد ہے۔ یعنی یہ کہ انسان محبوب کے سوا باقی سارے علائق سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے رنگا رنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوئے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے۔ اور طرح طرح کے نظم و انصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی

جماعت کا اجتماعی انتظام، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حق دار المزہ کے حقوق کی بجاآوری وغیرہ امور سے سخت انقباض ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ نکاح سے جو تمام علائق کی بنیاد ہے۔ اسے حد درجہ نفرت ہوتی ہے۔ لے

بہر حال صوفیا رکرام کی کیفیات قلبی اور واردات پر قرآن کی تفسیر نہیں ہو سکتی ہے قرآن کی تشریح و تفسیر کے لیے راہ نبوت راہنما ہے۔ نہ کہ راہ ولایت۔

یہ امر واقعہ ہے۔ کہ جہاں تک انفرادی فلاح کا تعلق ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اور انفرادی فلاح کی حد تک بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ "نسبت صوفیا غنیمتے است کبری" ہر مومن اس کا ضرورت مند ہے۔ لیکن صرف اگر انفرادی فلاح ہی اگر راہ ولایت ہے۔ تو انفرادی اور اجتماعی فلاح راہ نبوت ہے۔ اسلام دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔

سورہ ہود مکی سورۃ ہے۔ مکی زندگی کا دور ایک تاریک دور ہے۔ قرآن نے اس تاریک دور میں ان لوگوں سے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ خطاب کر کے کہا۔ استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمیً۔ اس آیت میں ایمان کی دعوت قبول کرنے اور مخلصانہ اطاعت والی زندگی اپنانے پر اللہ سبحانہ نے نبوت کی وساطت سے بتایا ہے۔ کہ تمہیں دنیوی فلاح ملے گی۔ اور یہ صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہی کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس غرض کے لیے جب ہم انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ کہ جس نبی نے بھی یہ دعوت دی۔ اپنی قوم کو یہ یقین دلاتے ہوئے دی۔ کہ میری دعوت کو قبول کرنا تمہیں آخرت کی ہی نہیں دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال وبنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انهارا سورۃ نوح ۱۰ - ۱۲

اپنے رب سے معافی مانگو بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے اگر ایسا کرو گے تو وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا۔ تمہیں دولت اور اولاد عطا فرمائے

لے صراط مستقیم صد۱۱

گا۔ شاداب باغ مہیا کرے گا۔ اور نہریں جاری کرے گا۔

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے الفاظ یہ تھے۔

یا قوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یرسل السماء علیکم مدرارا ویزدکم قوۃ الی قوتکم۔ سورہ ہود۔ ۵۲

اے میری قوم اپنے رب سے معافی مانگو اور پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا۔ اور تمہاری طاقت میں برابر افزونی عطا کرتا رہے گا۔

انبیاء کی دعوتوں کی یہ متفقہ شہادتیں قرآن میں موجود ہیں۔ ان سے اللہ سبحانہ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ اور فیصلے کا پتہ چلتا ہے بہ قطعی طور پر یہی ہے۔ کہ اپنی اطاعت اور بندگی کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ پھر یہی شہادتیں یہ بھی بتاتی ہیں۔ کہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت وبندگی کی یہ راہ اپنائی۔ اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔ اور وہ جن کی آخرت سنور رہی تھی۔ ان کی دنیا بھی باغ وبہار ہی بنی رہی ہے۔

قرآن دنیاوی فلاح کی ضمانت دیتا ہے

کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور امت مسلمہ کے بارے میں اللہ سبحانہ کا یہ ضابطہ اور فیصلہ بدل جاتا۔ چنانچہ وہ نہیں بدلا۔ اور دنیاوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا۔ جیسے پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی کیا گیا۔ اور مدینہ کے پُرخطر دور میں بھی۔ پیش نظر آیت قرآنی جس کی تشریح ہو رہی ہے۔ اس میں مشرکین مکہ سے ایمان وعمل کی دعوت پر یہ یقین دلایا گیا۔ یمتعکم متاعا حسنا آگے چل کر ایمان لانے والوں سے خطاب کرکے فرمایا۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات یستخلفنھم فی الارض سورہ نور۔ ۵۵

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ وعدہ ہے۔ کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار ضرور عطا فرمائے گا۔

ایمان اور عمل صالح کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کیسے پورے ہوئے اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہوسکتا ہے۔

۵ دو جزاؤں کا مقابلہ دو سزاؤں سے

اور دیکھو اگر تم نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے۔ تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا۔ یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اور وہ قادر مطلق ہے۔ یعنی میری بات نہ مانو گے تو قیامت کا عذاب یقینی ہے۔ باقی یہ فرمانا کہ میں ڈرتا ہوں اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام شفقت اور ہمدردی وخلائق کا اظہار ہے۔[۱]

عام شارحین قرآن کا رجحان بھی یہی ہے کہ یوم کبیر میں عذاب سے مراد قیامت میں سزا ہے۔ جیسا کہ شیخ اسلام کے افادے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سوچنے کی بات ہے۔ کہ دو حکم دیئے گئے۔ استغفروا اور توبوا ان دونوں کی جزائیں بتائی گئیں۔ ایک دنیا میں یمتعکم متاعا حسنًا اور دوسری آخرت میں ویؤت کل ذی فضل فضلہ انداز بلاغت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ سزائیں دو ہوں۔ ایک دنیا میں دوسری آخرت میں پہلی دنیا میں سزا۔ انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر کے ذریعے بتائی گئی ہے۔ دوسری آخرت میں سزا الی اللہ مرجعکم جمیعا وھو علی کل شئ قدیر۔ کے ذریعے سنائی گئی ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ دنیوی سزا کیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میری سوچ یہ ہے کہ دنیا میں ان پر سزا بدر کی صورت میں آئی۔ مجھے اس میں کچھ شارحین کی ہمنوائی بھی حاصل ہے۔ اگرچہ بدر والی بات کو شارحین نے بصیغہ تمریض سے ذکر کیا ہے۔

جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف قسم کے عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اس کے لیے غزوۂ بدر عذاب ہلاکت تھا۔ ہجرت سے پہلے قریش مکہ پر قحط کا عذاب آیا۔ جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ قریش کی درخواست پر حضور صلی اللہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

علیہ وسلم کی دعا سے یہ بلا دور ہوئی ۔ مگر اس کے بعد پھر قریش کی سرگردانی کا وہی حال ہوگیا۔ تو ان کے لیے عذاب ہلاکت کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا ۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بطشۂ کبری ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی ۔ قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں یہ اعلان سنا دیا تھا ۔

یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ انا منتقمون ۔ ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون ۔

ان آیات میں بتا دیا ہے کہ بطش اکبران روسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے ۔ جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی ۔

سورۃ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے ۔ اس میں اللہ سبحانہ نے یہ ظاہر کر دیا ہے ۔ کہ یہی وہ فیصلے کا دن تھا ۔ جس کا موت سے انتظار تھا ۔

کدأب آل فرعون والذین من قبلھم کذبوا بآیاتنا فاخذھم اللہ بذنوبھم ۔

یہ ویسا ہی ہوا جیسا کہ آل فرعون اور ان سے پہلوں کے ساتھ ہوا ۔ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تھی ۔ تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا ۔

بہرحال بدر قریش کے عذاب کا دن تھا ۔ یہاں اس آیت میں اسی بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ نبوت کی زبان سے ظاہر کیا ہے ۔ بدر میں ہونے والی پکڑ قرآن کی زبان میں اگر بطشۂ کبری ہے تو بطشۂ کبری بپا ہونے والا دن بلا ریب یوم کبیر ہے ۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے ۔ تو بطشہ کبری کے بڑے دن سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ بڑا دن اس کو ہولناکی کی وجہ سے کہا ہے یعنی عذاب کی سنگینی کی وجہ سے ۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری دعوت سے روگردانی کرو گے تو تمہیں دو عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ ایک دنیوی جو بڑے دن میں بڑی پکڑ کی صورت میں رونما ہو ۔ دوسرا قیامت میں اخروی جو اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے وقت اعمال کے محاسبہ کے بعد ہوگا ۔

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ
صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

یاد رکھو یقیناً یہی وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے سینے موڑ کر چلتے ہیں، تاکہ اس سے اوجھل ہو جائیں۔ سن لو اور آگاہ رہو۔ کہ یہ لوگ جس وقت کپڑوں کو لپیٹ کر لیٹتے ہیں۔ اللہ سبحانہ، ان کو پوشیدگی اور ظاہری حالت میں خوب جانتا ہے۔ وہ تو اُن کے سینوں کی باتوں اور وسوسوں سے واقف ہے۔ ۶

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی علم کے سہارے وہ ہر جاندار کو زمین میں رزق پہنچا رہا ہے[۶] اور ہر جاندار کے مستقر اور سپردگی کے مقام کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کتاب الٰہی میں محفوظ ہے[۸]۔

مفردات کے معانی

یثنون ثنی سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ ثنی یثنی باب ضرب ہے اس کے معنے پھیرنے موڑنے، لپیٹنے کے آتے ہیں۔ آدمی جب کسی بات کو سننا نہیں چاہتا تو رُخ موڑ کر چل دیتا ہے۔ اسی سے تثنیہ آتا ہے۔ جس کے معنے ایک کو ایک پر موڑ دینا۔ یعنی دو ہو جانا۔ ایک ہی چیز کے دو بار بننے کو ثنی کہتے ہیں۔ اور وہ عورت جس کے دو بچے پیدا ہوں۔ وہ بھی ثنی کہلاتی ہے۔ اسی سے ثانی بے رُخی کرنے والے اور پہلو موڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اسی سے مثانی ہے جس کے معنی دوبار ہونے اور دہرائے جانے کے ہیں۔ اسی سے ثنیہ پہاڑ کی گھاٹی یا راستہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے اوپر اور نیچے دو دانت والے جانور کو ثنی کہتے ہیں۔

یستغشون ۔ یہ استغفار سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا مادہ خفی ہے۔ باب سمع سے چھپنے کے معنے میں آتا ہے۔ اسی سے باب استفعال استخفار ہے۔ اس کے معنے چھپنے کو چاہتا ہیں۔ یا سین تاکید کے لیے۔ اور معنے میں خوب چھپ جاتے ہیں۔ اسی سے اخفار، اعلار کے مقابلے میں آتا ہے۔

یستغشون ۔ باب استفعال سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ مادہ غشی ہے۔ معنے ڈھانپ دینا اسی سے باب افعال اغشار اور باب تفعیل تغشیہ آتا ہے۔ غشار اور غشاوہ اسی سے پردے کو

کہتے ہیں۔ استغشار، بار کے صلے کے اور بغیر صلے کے استعمال ہوتا ہے۔

علم الٰہی کی پنہائیاں

اللہ کے علم کا مسئلہ قرآن کے ان اہم مسائل میں سے ہے۔ جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے۔ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے پیرو بھی ان کے بارے میں غلط فہمیوں کے شکار تھے۔ قرآن نے علم کے بارے میں ان کے ان تمام فاسد خیالات کو باطل ٹھہرایا۔ ان کے غلط عقیدوں کی تردید کی۔ اور ربانی ہدایت کے نور سے جس طرح حقیقت کو روشن کیا۔ وہ قرآن کا عظیم الشان کارنامہ ہے

قرآن نے بتایا کہ اللہ سبحانہٗ کا علم کامل گنتی اور شمار کی حد سے باہر اور بے نہایت ہے۔ اور اس کی پنہائیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے علمی کمالات لامحدود ہیں۔ جتنا علم انسانی ضرورت اور ظرف واستعداد کے مطابق بتلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معلومات سے اس کو اتنی بھی نسبت نہیں ہے۔ جتنی سمندر کے قطرے کو سمندر سے یا ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر پورے سمندر کا پانی روشنائی بن جائے جس سے اللہ سبحانہٗ کی معلومات لکھنی شروع کی جائیں اس کے بعد دوسرا اور تیسرا سمندر بھی اس میں روشنائی کا شامل کر لو۔ تو سمندروں کا ختم ہونا ممکن ہے لیکن معلومات الٰہیہ کا ختم ہونا محال اور ناممکن ہے۔

ارشاد ہے۔

لو کان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا

اگر اللہ سبحانہٗ کی باتیں لکھنے کے لیے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں۔ تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا۔ مگر اللہ سبحانہٗ کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لیے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کر دیں۔ جب وہ کافی نہ ہوں۔

سورۃ لقمان میں اسی بات کو سمجھانے کے لیے اور بلیغ انداز اختیار کیا ہے۔

لو ان مافی الارض من شجرۃ اقلام۔ والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر مانفدت کلمات اللہ۔ ان اللہ عزیز حکیم

اگر زمین میں جس قدر درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

دراصل علم الٰہی ایک صفت قدیم ہے۔ جو ازل سے ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی کے حق میں جہل ہونا امر محال ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ آئندہ ہو گا۔ اسے سب معلوم ہے۔ اس کے علم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر بات اور ہر حرکت کو جانتا ہے۔ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا ہو گا۔ سب اس کے علم میں ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

(۹۱) اللہ کی دسترس سے باہر کوئی نہیں

یاد رکھو یقیناً یہی لوگ ہیں۔ جو اپنے سینے موڑ کر چلتے ہیں۔ تاکہ اس سے اوجھل ہو جائیں۔ سن لو اور آگاہ رہو کہ یہ لوگ جس وقت کپڑوں میں لپٹ کر لیٹتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ان کو پوشیدہ اور ظاہری حالت میں خوب جانتا ہے۔ وہ تو ان کے سینوں کی باتوں اور وسوسوں سے واقف ہے۔ سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ مجرم حاضر ہو۔ حاکم سزا دینے کی پوری قدرت اور کامل اختیار رکھتا ہو۔ مجرمین کی ساری کاروائیاں اس کے علم میں ہوں۔ الیہ مرجعکم میں بتلا دیا کہ مجرم اور غیر مجرم سب کو اللہ سبحانہٗ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ وھو علی کل شیٔ قدیر۔ میں قدرت و اختیار کا عموم بیان فرمایا۔ اور الا انھم یثنون صدورھم سے بذات الصدور تک اس کے علم محیط کی وسعت کو ظاہر کیا کہ اللہ سبحانہٗ ہر کھلی اور چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے۔ حتیٰ کہ دلوں کی تہہ میں جو خیالات ارادے اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان پر بھی مطلع ہے۔ پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو کس طرح اس سے مخفی رکھ سکتا ہے[۱]

اس آیت گرامی کے اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر مطالب و معانی بالکل واضح اور صاف ہیں۔ یعنی مکی زندگی کے پُرآشوب دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں نبوت کے مخاطبوں کا معاندانہ رویہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ دعوت کی مخالفت میں اپنی بیزاری کا اظہار اس حد تک کرتے تھے۔ کہ آپ کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ بے رُخی اور اعراض کی تمام صورتیں اختیار کرتے۔ اس آیت میں ان کی اسی بے رُخی کی ایک نہیں دو صورتیں بیان کی ہیں۔

ایک یہ کہ نبوت کو کسی مقام پر دعوت پیش کرتے دیکھتے تو بڑے طنطنے سے سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتے اور اپنے اس طرز عمل سے سمجھتے کہ ہم بچ گئے۔ گویا حقیقت کو حقیقت سمجھتے ہوئے اس کا سامنا کرنے سے گریز پائی اختیار کرتے۔ اور سمجھ لیتے کہ اگر یہ خدا ہی کا پیغام ہے تو اس سے چھپ کر بچنے کی تدبیر بھی ہمارے پاس ہے۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع پر آدمی بے رُخی کو ظاہر کرنے کے لیے کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتا ہے۔ اور منہ پر پلا لے لیتا ہے۔ تاکہ نبوت کی دعوت سننی نہ پڑ جائے۔

ان ہی دو قسم کے لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارا ہے۔ کہ یہ لوگ حق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے ایسا کرنے سے اب حقیقت ہی ناپید ہو چکی ہے۔ حالانکہ نبوت کی پکار ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔ اور اپنی جگہ موجود ہے۔

دراصل یہ رویہ بے وقوف لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ اس کردار کے ذریعے حق کا سامنا کرنے سے بچ جائیں گے۔

اللہ سبحانہ نے ان کے دونوں کردار پیش کر کے بتایا ہے۔ کہ خوب کان کھول کر سُن لو۔ کہ جیسے اللہ سبحانہ کی قدرت کاملہ کی دسترس میں سے کوئی چیز باہر نہیں ایسے ہی اللہ سبحانہ کی علمی پہنائیوں سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔ وہ ان کے ان تمام اعمال کو خوب جانتا ہے۔ جو وہ تنہائیوں میں رازداری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ اپنی جلوتوں اور مجلسی زندگی میں کرتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ جو باتیں وہ سینوں میں ارادوں، خیالوں اور وسوسوں کے درجے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ بھی اللہ سبحانہ کے علم کی گرفت میں ہیں۔ یہ تو ہے آیت کا وہ مطلب جو قرآن کے سیاق و سباق کا تقاضا ہے

یہ صرف دعوت محمدیہ کے مخاطبوں کا ہی کردار نہیں بلکہ دوسرے انبیاء کے مخاطبوں کا بھی ان کی دعوت کے مقابلے میں یہی کردار رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہی رویہ قرآن نے ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم

میں نے جب بھی ان کو دعوت دی اس لیے دی کہ ان کے لیے تیری بخشش کے دروازے کھل جائیں۔ ان کا رویہ یہ رہا ہے۔ کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور اپنے کپڑوں کو اپنے پر لپیٹ لیا۔

یہ کانوں میں انگلیاں دے لینا استعارہ بات نہ سننے سے ہے یعنی وہ میری بات سُننا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ اور کپڑوں کو ڈھانپ لینا بھی بے رُخی اور اعراض کے لیے بلیغ تعبیر ہے۔ یہی بات اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کے بارے میں پیش کی جا رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے اعراض اور بے رُخی کی نمائش کبھی سینہ موڑ کر اور رُخ بدل کر کرتے ہیں۔

اور کبھی کپڑے لپیٹ کر کرتے ہیں۔ بات ایک ہے مگر انداز تعبیر مختلف ہے۔

آیت میں قابلِ غور دو فقرے ہیں۔ یثنون صدورھم اور یستغشون ثیابھم ان میں دو ہی احتمال ہیں ایک یہ کہ الفاظ کے حقیقی معنے ہوں۔ اور عربی زبان میں ان کے جو معنے ہیں وہ مراد ہوں دوسرے یہ کہ مجازی معنے ہوں اور ان کی نفسیاتی حالت کو محسوس حالت سے تشبیہ دے کر بات پیش کی جا رہی ہو۔

اگر پہلی بات ہے یعنی الفاظ کے حقیقی معنے مراد ہیں تو اس صورت میں آیت میں مشرکین کی جہالت اور نادانی پر حیرت اور تعجب کیا جا رہا ہے۔ کہ عجیب حماقت ہے کہ اللہ کی صفات کو انسانوں کی صفات کے پیمانے سے ناپ رہے ہیں۔ اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایسا کر لینے سے اللہ کو علم نہ ہوگا۔ روایات میں ان کے اِس ذہن کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

ایک شخص گھر میں جاتا۔ کمرے میں داخل ہو کر پردے چھوڑ لیتا اور کپڑوں میں لپٹ کر کہتا کہ کیا اللہ میرے دل کے اندر کی بات جانتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالہ سے ہے کہ

خانہ کعبہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی جمع تھے۔ پیٹ دونوں کے بڑے تھے۔ لیکن بے سمجھ تھے۔ ایک بولا کہ بتاؤ جو باتیں ہم کر رہے ہیں کیا اللہ سنتا ہے دوسرا بولا کہ اگر ہم باآواز بلند باتیں کریں تو اللہ سنتا ہے لیکن آہستہ والی بات نہیں سنتا۔

زمانہ جاہلیت میں ساری گمراہیوں کی اساس اسی قسم کا فکر فاسد ہے، نظری اعتبار سے ان کے موقف میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ وہ عالم غیب کے حقائق کو اپنے عرف و عادت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔

دوسرے احتمال کی صورت میں مخاطبوں کی طبعی نفسیات کو دعوت نبوت کے سامنے استعارے کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ دعوت سے ان کی دشمنی اور عناد کی اس انداز میں عکاسی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ توحید عبادت سے نفرت میں اس قدر گر گئے تھے۔ کہ اس کے بارے میں کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی اسی نفسیاتی افتاد کے لیے قرآن نے ولوا علی ادبارھم نفورا اور اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالاخرہ کی بلیغ تعبیر بھی اختیار کی ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا تھے وہ یہ تھی کہ وہ الوہیت کو اللہ کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے بلکہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اوروں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ ان کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ عبادت کے موضوع پر صرف اللہ کا نام لیا جائے۔ اسی توحید سے بیزاری اور شرک میں ان کے استغراق کا یہ آیت ان کی نفسیاتی

حالتوں کی پوری تصویر پیش کر رہی ہے ۔

آئیے اب ذرا شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے ۔ اور غور فرمایئے کہ انہوں نے آیت قرآن کو کس انداز سے پیش کیا ہے ۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں ۔

یہ ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے ۔ سابقہ ترغیب و ترہیب سننے کے بعد قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ پھر قرآن کے مخاطبوں کا اس دعوت کے بارے میں کیا رویہ تھا ۔ کیا ان میں کچھ پذیرائی کے جذبات پیدا ہوئے یا اعراض و روگردانی کی صورت حال ویسی باقی رہی ۔ حرف تنبیہ لاکر جواب دیا کہ اس کے بعد مخاطبوں کا رویہ بڑا ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز رہا ہے ۔

امام قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں رقم طراز ہیں ۔

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ان مشرکین کے عناد اور عداوت پر مبنی رویہ کو بتایا ہے ۔ جن کا خیال تھا کہ ہمارے طرز عمل کا اللہ سبحانہٗ کو علم نہیں ہے ۔

شان نزول کے سہارے تفسیر

کچھ شارحین قرآن نے شان نزول پر مبنی روایات کے حوالہ سے اس آیت کی تشریح کی ہے حافظ ابن جریرؒ ، حافظ ابن کثیر ، امام بغوی ، علامہ شوکانی ، امام رازی اور دوسرے اکابر نے آیت کی تشریح میں ان روایات کا سہارا لیا ہے ۔ جن میں اس آیت کا پس منظر بتایا ۔ ان روایات میں تاریخی حیثیت سے سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جگہ دی ہے ۔ اور جسے حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں درج کیا ہے ۔ آیئے پہلے یہ روایت شیخ الاسلام کے افادے میں پڑھیئے ۔

صحیح ترین روایت ابن عباسؓ کی بخاری میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیا کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا ۔ کہ استنجا یا جماع وغیرہ ضروریات بشری کے وقت کسی بھی حصہ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے ۔ کہ آسمان والا ہم کو دیکھتا ہے برہنہ ہونا پڑتا تو غلبہ حیا سے جھک جاتے اور ستر گاہ کو چھپانے کے لیے سینہ دوہرا کر لیتے ۔

یہ روایات صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے۔ شیخ الاسلام نے اس روایت اور آیت قرآنی میں اپنے ذوق کے مطابق مفاہمت کے لیے فرماتے ہیں کہ

اس طرح کے آثار کبھی کبھی غایت تأدب مع اللہ اور غلبہ حیا سے ناشی ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے لوگ صوفیا کی اصطلاح میں مغلوب الحال کہلاتے ہیں۔ چونکہ صحابہ رضی اللہ عنھم کا کسی مسئلہ میں غلو اور ایسا تعمق آئندہ امت کو ضیق میں مبتلا کر سکتا تھا۔ اس لیے قرآن نے الا انھم یثنون صدورھم سے ان کی اصلاح فرمادی یعنی اگر بوقت ضرورت بدن کھولنے کے لیے اللہ سے حیا آتی ہے اس لیے جھکے جاتے ہو۔ تو غور کرو کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا اللہ سبحانہٗ کے سامنے نہیں ہے۔ جب انسان اس سے کسی وقت نہیں چھپ سکتا پھر ضروریات بشریہ کے متعلق اس قدر غلو سے کام لینا ٹھیک نہیں ہے۔

یہ مفاہمت قرآن کی آیت اور روایت ابن عباسؓ میں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور روایت بھی عبداللہ بن عباسؓ کی محمد بن عجلانؒ کے حوالہ سے صحیح بخاری میں موجود ہے۔ پہلی روایت اگر حجاج اور ابن جریج کی وساطت سے محمد بن عباد بن جعفر تک پہنچی ہے تو دوسری روایت ابراہیم بن موسیٰ ہشام اور ابن جریج کی وساطت سے محمد بن عباد بن جعفر تک پہنچی ہے۔ مرکزی راوی محمد بن عباد بن جعفر ہیں۔ اور دونوں روایتیں ابن عباس کے حوالہ سے ہیں۔ مضمون کی روح دونوں کی ایک ہے مگر تھوڑا سا اختلاف ہے روایت یہ ہے کہ

عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت کو اس طرح پڑھا ہے۔ یثنونی صدورھم میں نے دریافت کیا کہ سینوں کا مڑنا کیسے ہے عبداللہ بن عباسؓ نے بتایا کہ ایک حالت جماع میں شرمانا خلوت میں ہوتا تو برہنگی سے شرماتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس صورت میں یثنونی باب افعیعال سے مضارع ہے۔ اثنونی یثنونی بروزن اعشوشب، یعشوشب یہ وزن فعل لازم میں مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں صدورھم مرفوع ہے۔ اور فاعل ہے اور معنے یوں ہوں گے۔

خبردار ہو جاؤ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کے سینے خوب مڑ جاتے ہیں۔

ان دونوں روایتوں کے آخر میں ہے۔ کہ صحابہ کا یہ کردار آیت قرآنی کے نزول کا سبب ہے۔ اس واقعہ

کو اگر نزول آیت کا سبب قرار دیا جائے تو قرآنی آیت کے مطالب کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے سب سے اہم اور بنیادی تبدیلی یہ ہوگی کہ آیت قرآن کا خطاب معاندین اور دشمنوں سے ہٹ کر صحابہ اور محبوبوں کی طرف ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ

اولاً۔ اس آیت میں مشرکین کو نہیں بلکہ صحابہ کو مخاطب بنا کر کہا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علم کی پنہائیاں کس قدر ہیں ۔

ثانیاً۔ آیت اپنے منطوق میں بتا رہی ہے اور استعارے کی زبان میں مشرکین کو دعوت حق سے اعراض اور روگردانی کی داستان سنا رہی ہے اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے کہ یہ استعارے کی زبان نہیں بلکہ حقیقت میں صحابہ شرم سے سینے دوہرے کرتے تھے ۔

ثالثاً۔ آیت قرآنی مشرکین کے ایک سنگین جرم دعوت حق سے اعراض پر ان کو سخت دھمکی دے رہی ہے ۔ اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے ۔ کہ محض ادب کی بنا پر کسی مغلوب کی حرکت پر یہ دھمکی آئی ہے ۔

رابعاً۔ آیت قرآنی علم باری کے بارے میں مشرکین کی جہالت اور حماقت کا ماتم کر رہی ہے ۔ اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے ۔ کہ آیت قرآنی صحابہ کی مغلوبانہ تاریب پر نوحہ کر رہی ہے

خامساً۔ صحابہ کا خلوت میں اس خیال سے سینہ کو دوہرا کرنا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے ۔ کہ معاذ اللہ صحابہ کا ذہن صفات باری کے بارے میں صاف نہیں تھا۔ اور وہ سمجھ رہے تھے ۔ کہ ایسا کرنے سے وہ اللہ سے چھپ جائیں گے ۔ ابن عباسؓ کی روایت کے بارے میں علامہ آلوسی نے یہ بتانے کے لیے کہ

> یہ روایت اس موضوع پر سب سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ صحت میں دوسری روایات اس کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچتی ہیں ۔

لکھا ہے ۔ کہ اس روایت کی روشنی میں آیت کے مطالب میں بے حد دشواری پیش آگئی اور آیت کی تشریح کا مسئلہ بڑا مشکل ہو گیا ۔ وجہ یہ بتائی ہے ۔

> کیونکہ اگر مسلمان خلوت میں شرم کی وجہ سے ستر نہ کھولے ۔ تو اس کا منشا صرف اظہار ادب مع اللہ ہو سکتا ہے ۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں ۔ اس کے عقیدے میں یہ بات ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے حیا میں یہ کردار نہ قابل مذمت ہے اور نہ قابل گرفت ۔ اور یہ کہنا کہ مسلمانوں کا حیا کے

موضوع پر یہ عمل صفات الٰہی سے بے خبری کی وجہ سے تھا۔ اور وہ کسی درجے میں یہ سمجھتے تھے۔ کہ کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اللہ نے اس آیت کے ذریعے اصلاح فرما دی۔ یہ ایسی بات ہے۔ جس کو کوئی مان ہی نہیں سکتا۔

اور آخر میں فرماتے ہیں۔

اس روایت پر آیت کے مطالب کی تعمیر اشکال سے خالی نہیں ہے اور سب کچھ کہنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے کہ

سیاق قرآنی کا تقاضا یہی ہے۔ کہ آیت قرآنی کا روئے سخن مکہ میں مشرکین کی طرف ہے۔

بہر حال آیت قرآنی اپنے معانی و مطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے اسے کسی روایت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیئے ذرا اردو میں شارحین قرآن سے بھی استفادہ کریجیے۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں۔

یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کیئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں۔ تاکہ خدا سے اپنی باتیں چھپا سکیں یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ اور جس کو اعتقاد ہو گا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے۔ اور آپ کا صاحب وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے بس وہ اخفار کی یہ تدبیریں کبھی نہ کرے گا۔ پس یہ تدبیر کرنا گویا بدلالت حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے۔ سو یاد رکھو کہ وہ لوگ دوہرے ہو کر اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں وہ اس وقت بھی سب کچھ جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں۔ کیونکہ بالیقین وہ تو دلوں کی باتیں جانتا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے بھی حضرت مولانا اشرف علیؒ کی معارف القرآن میں ہمنوائی کی ہے۔ اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔ جدید شارحین قرآن نے بھی آیت کی تشریح میں کوئی جدت پیدا نہیں کی بلکہ بزرگوں ہی کے قدم بقدم چلے فرق صرف تعبیر کا ہے۔ یہاں جدت ہے وہاں

قدامت ہے ۔مولانا ابوالاعلےٰ مودودی صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں ۔

مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا ہوا ۔ تو بہت سے لوگ وہاں ایسے تھے ، جو مخالفت میں تو زیادہ سرگرم نہ تھے ۔ مگر آپ کی دعوت سے سخت بیزار تھے ۔ ان لوگوں کا رویہ یہ تھا ۔ کہ آپ سے کتراتے تھے ۔ آپ کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھے ۔ کہیں آپ کو بیٹھا دیکھتے تو اُلٹے پاؤں پھر جاتے ۔ دور سے آپ کو آتا دیکھ لیتے رُخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے ۔ تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے ۔ اور آپ انہیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں ۔

اور مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں ۔

اِس آیت میں تصویر ہے اس رویہ کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں متکبرین قریش اختیار کرتے تھے ۔ کہ عزور سے سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتے اور اس طرح اپنے زعم میں گویا خدا اور اس کے انذار سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ۔ انسان کی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ بھی ہے ۔ کہ وہ ایک حقیقت کا مواجہہ کرنے سے گریز کرتا ہے ۔ اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ حقیقت حقیقت نہیں رہی ۔ حالانکہ کسی کے گریز کرنے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

(۷) علم الٰہی کی وسعت اور رزق کی ضمانت

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی علم کے سہارے وہ ہر جاندار کو زمین میں رزق پہنچا رہا ہے ۔ پہلے علم الٰہی کی وسعت بیان ہوئی تھی ۔ یہ اسی مضمون کا تکملہ ہے ۔ یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج ہو ۔ اس کو روزی پہنچانا اللہ سبحانہ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے ۔ جس قدر روزی کی جس قدر مقدار جس کے لیے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی ۔ جو وسائل واسباب بندہ اختیار کرتا ہے وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں ۔ اگر آدمی کی نظر اسباب وتدابیر اختیار کرتے وقت سبب الاسباب پر ہو ۔ تو یہ توکل کے منافی نہیں ہے البتہ اللہ سبحانہ کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور ومقید نہ سمجھا جائے ۔ وہ گاہ بگاہ سلسلہ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا یا کوئی اور کام کر دیتا ہے ۔ بہر حال جب جانداروں کی حسب استعداد غذا و معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضروری ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے

کرے گا۔[1] بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم کی پنہائیوں ہی کی یہ کارفرمائی ہے۔ کہ ایک ایک پرندے کے آشیانے اور سارے حشرات الارض کے بلوں کا حال اسے معلوم ہے۔ اور وہ اس کو اس کے مقام پر زندگی کا سامان پہنچا رہا ہے۔ اور جسے ہر لمحہ یہ علم ہے کہ کون سا جانور کہاں رہتا ہے اور اس کو بقائے حیات کے لیے کس قدر سامان کی ضرورت ہے علم الٰہی کی پنہائی تو اس آیت کا مدلول ہے لیکن آیت کا منطوق ہر جاندار کے لیے رزق کی ضمانت ہے۔ قرآن نے اسی منطوق کو دوسرے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

وکاین من دابۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقھا وایاکم

کتنے ہی جاندار ہیں۔ جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھر رہے ہیں۔ روزی دینا اللہ کی ذمہ داری ہے ان کو بھی دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے۔

یعنی اس زمین میں کتنے جاندار ہیں۔ جو اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے ہیں۔ ان کا رب ان کو رزق بہم پہنچاتا ہے۔ یہ سب کے لیے رزق کی ضمانت کا اعلان ہے۔ اور یہ ضمانت محض اللہ کے فضل وکرم کی وجہ سے ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے۔

اللہ سبحانہ نے ساری مخلوقات کے رزق کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔

یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر کیڑے کے لیے سامان رزق کی فراہمی کے اسباب پیدا کیئے ہیں۔ اب یہ بندے کا کام ہے کہ جن راہوں سے رزق آرہا ہے ان سے رزق تلاش کرے رزق کی ضمانت اور کفالت کا یہ مطلب نہیں کہ انسان تلاش معاش سے غافل اور بے خبر ہو جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب پر تکیہ نہ کرے۔ ان اسباب کا مبدأ و مرجع اللہ سبحانہ کو سمجھے۔ یہاں قاضی بیضاویؒ نے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی کہ۔

الا علی اللہ، میں لفظ علی آیا ہے۔ اور یہ عربی زبان میں وجوب کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتلانے کے لیے کہ یہ رزق کی ضمانت اور کفالت جو اللہ نے لی ہے وہ ضرور پوری ہوگی۔ اور یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب پر ہونا چاہیئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ محمود آلوسیؒ نے یہ بات یہاں خوب بھی ہے۔ کہ

اسباب کی پابجائی اور رزق کی تلاش وجستجو توکل کے منافی نہیں ہے۔ بشرطیکہ اسباب کو اسباب سمجھے۔ اور اعتماد و توکل کا مرکز اللہ سبحانہ کو سمجھے۔

آیت گرامی کا منشا یہ بتانا ہے کہ اللہ سبحانہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ کوئی اس سے بھاگ یا چھپ نہیں سکتا ہے۔ کیونکہ جو ذات گرامی ہر جاندار کو وہ جہاں بھی ہو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو یا سمندروں کی تہوں میں، گھنے جنگلوں میں، یا آباد شہروں میں ہو۔ رزق پہنچا رہی ہے۔ اس کا علم سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کیا اس سے کوئی چیز مخفی رہ سکتی ہے۔

یہاں علامہ بقاعیؒ نے یہ لطیف نکتہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ کہ یہ آیت قرآنی ان استغفروا کے نتیجہ میں یہ بتا رہی ہے۔ کہ اللہ سے مخلصانہ عبادت میں تعلقات استوار کرو۔ اور رزق کی تلاش میں لگ کر عبادت سے بیگانگی اختیار نہ کرو۔ فی الارض کی قید لگا کر اشارہ کر دیا کہ سوال سے استغفادہ زمین کے مکینوں کا کام ہے۔ اور یہ بھی جتا دیا کہ زمین کی ساری مخلوق کی کفالت اللہ نے لی ہے۔ اور ان سب کا علم اللہ کو ہے۔ علامہ بقاعی لکھتے ہیں۔

میں نے سمندر کے کنارے ایک سفید پتھری کو توڑ کر اس کے اندر دیکھا کہ ایک کیڑا ہے اور اس کے پاس کھانے کی چیز ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مجھ سے جناب عزالدین محمد بن احمد تاجر کتب نے بتایا ہے۔ کہ میں نے متعدد بار ان پتھروں کے اندر جو پہاڑوں سے کاٹے جاتے ہیں کہ کیڑے کے لیے پتھر میں سبز گھاس اور پینے کے لیے پانی موجود ہے۔

(۸) اللہ کا علم سارے جہانوں کو محیط ہے

اور ہر جاندار کے مستقر اور سپردگی کے مقام کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کتاب الٰہی میں موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مستقر جہاں ٹھہرتا ہے۔ بہشت و دوزخ اور مستودع جہاں سونپا جاتا ہے۔ اس کا قبر ہے۔ وما من دابۃ دنیوی زندگی کا ذکر تھا۔ یہاں برزخ اور آخرت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ابتدا سے انتہا تک تمہاری ہستی کے تمام درجات کا علم رکھتا ہے۔ مستقر و مستودع میں مفسرین قرآن کے بہت اقوال ہیں۔ اس سے پہلے سورہ انعام میں بھی ہم کچھ لکھ چکے ہیں۔

عبداللہ بن عباسؓ ـــــــ اس زندگی میں جہاں رہے مستقر اور موت کے بعد جہاں دفن کیا جائے مستودع ہے۔

امام مجاہدؒ ـــــــ مستقر سے رحم مادر اور مستودع صلب پدر مراد ہے۔

عطاء بن رباحؒ ـــــــ مستقر سے صلب پدر اور مستودع سے رحم مادر مراد ہے۔

ابن کثیرؒ ـــــــ زمین میں جہاں تک چلے پھرے اس کے منتہائے سیر کو مستقر اور چل پھر کر جس جگہ آئے اسے مستودع کہتے ہیں ـــــــ زمین میں حیوانات کا جو مسکن بالفعل ہے اسے مستقر کہتے ہیں۔ اور وجود نسلی سے پہلے جن مواد و مقار میں رہ کر آئے اسے مستقر کہتے ہیں۔

یعنی اللہ سبحانہٗ ان تمام مختلف مواد، اطوار، ادوار کا عالم ہے جن میں سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ ہیئت کذائی تک پہنچا ہے۔ وہ بھی اپنے علم محیط سے ہر مرتبہ وجود اس کی استعداد کے مناسب وجود و کمالات وجود عطا کرتا ہے۔[1]

مستقر و مستودع لغت کے اعتبار سے جائے قیام اور عارضی ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور شارحین قرآن کے اس موضوع پر متعدد اور متنوع خیالات ہیں۔ لیکن ہمیں شاہ عبدالقادر کی بات زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ اول سپرد ہوتا ہے۔ ماں کی پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے پھر آکر ٹھہرتا ہے دنیا میں اور پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں مطلب یہ ہے کہ مستقر دو ہیں اور مستودع بھی دو۔ مستقر اول دنیا ہے اور پھر آخرت جنت یا دوزخ ہے۔ اور مستودع اول ماں کا پیٹ ہے اور پھر قبر کا پیٹ ہے۔ ماں کے پیٹ میں رہ کر عالم دنیا میں یعنی مستقر میں آنے کی تیاری کرتا ہے۔ اور قبر کے پیٹ میں رہ کر آخرت میں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مستقر سے مراد وہ جگہ ہے۔ جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا ہے اور مستودع سے مراد وہ جگہ جہاں مرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے۔ اتنے دن وہ گزارتا ہے۔ اور جو رزق اس کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ اس سے استفادہ کرتا ہے۔ اس کا جینا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے استفادہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ وہ اللہ کی نگرانی اور اس کے

[1] افادات شیخ الاسلام

علم میں ہے۔ بس بتانا یہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہ' ہر انسان کے مستقر کو بھی جانتا ہے۔ اور اس کے مستودع کو بھی جانتا ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کی امانت میں دیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد مستودع کی تعبیر میں یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب وہ مر گیا تو بس وہ فنا ہو گیا۔ وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کی گود میں بطور امانت دیا جاتا ہے۔ اور ایک دن آئے گا کہ جب یہ زمین اللہ سبحانہ' کی امانت اللہ کے سپرد کر دے گی۔

ہر جاندار کا رزق ہو مستقر ہو مستودع ان کا تعلق علم محیط کے لازوال سرچشمہ سے ہے۔ علم کا وہی ابدی سرچشمہ جس سے نہ غائب پوشیدہ ہے اور نہ حاضر مستقبل میں بھی جو کچھ پیش آنے والا ہے پیش آنے سے پہلے وہ جانا ہوا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ ہے اس پر بھی اور باطن کی گہرائیوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس پر بھی علم کی یہ لازوال طاقت حاوی ہے۔ اور اس طرح حاوی ہے جس سے کسی چیز اور کسی بات کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے۔ اور جس کے جھٹلانے کی قوت انسان کے دل سے سلب ہو چکی ہے۔

اس آیت کے ذریعے قرآن نے یہی یقین دلایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ
كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَىٕنْ
قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَلَىٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ
الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّیَقُوْلُنَّ مَا یَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا یَوْمَ
یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا[۹]
جبکہ اس کا تختِ اقتدار پانی پر تھا[۱۰] تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے
کس کے کردار میں خوبصورتی ہے[۱۱] اور اے پیغمبر اگر آپ ان سے کہیں
کہ تمہیں مرنے کے بعد ضرور اٹھایا جائے گا۔ تو منکرین کہیں گے۔
اس پیغمبر کی دعوت تو نرا جادو ہے[۱۲]۔ اور البتہ اگر ہم ان کو یعنی آپ
کے مخاطبوں کو مہلت کی خاطر ان پر آنے والی پاداش کو کچھ عرصہ
کے لیے مؤخر کردیں۔ تو یہ آوازہ کسیں گے۔ عذاب کے لیے

رکاوٹ کیا ہے۔ سُن لو جس روز ان پر ان کے اعمال کی پاداش رونما ہوگی۔ تو یہ ان سے ہٹائی نہ جائے گی۔ اور جس چیز کا وہ مذاق کرتے رہے ہیں۔ وہ ان کو گھیرے میں لے لے گی[۳]

مفردات کے معانی

عرش: امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ عرش دراصل سقف کو کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع عروش آتی ہے۔ ارشاد ہے۔ وھی خاویۃ علی عروشھا۔ (وہ اپنی چھتریوں کے بل گرا ہوا تھا) اور اسی سے عرشت الکرم اور عرّشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹہنیاں اور چھتریاں لگانے کے ہیں۔ ارشاد ہے۔ معروشات وغیرہ معروشات ٹہنیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے ـــــ اور بادشاہ کے تحت کو بھی اسی لیے عرش کہتے ہیں۔ کہ وہ بلند ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں اسی معنے میں ہے۔ ورفع ابویہ علی العرش اور ایکم یاتینی بعرشھا۔ نکروا لھا عرشھا اھکذا عرشک اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں کہ کبھی عرش عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنے میں آتا ہے۔ محاورہ ہے فلان ثل عرشہ اس کی عزت خاک میں مل گئی۔ حضرت عمرؓ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ سبحانہٗ کا آپ کے ساتھ کیا معاملہ رہا جواب میں فرمایا لولا ان تدارکنی اللہ برحمتہ لثل عرشی اگر اللہ کا میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ ہوتا تو بس میری عزت ختم تھی۔ اور اللہ سبحانہٗ کے عرش کے متعلق انسان کو نام کے سوا کچھ معلوم نہیں ہے۔ عوامی ذہن اس بارے میں جو کچھ سوچتا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں عرش ذات باری کا حامل ہوگا۔ نہ کہ محمول۔ حالانکہ ذات باری اس سے برتر ہے۔

انسانی زندگی ابتدائی ہے۔

انسانی زندگی خیر و شر، راحت و رنج، مفلس اور امیری غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف،

صحت اور بیماری جیسی اضداد کا گہوارہ ہے۔ اس میں بھی انسان کی آزمائش کی جارہی ہے۔ تاکہ معلوم کیا جائے کہ اچھے حالات میں متکبر ظالم اور خدا فراموش بندہ نفس کون ہے۔ اور بُرے حالات میں پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے کون اختیار کرتا ہے۔ خیر و شر، حسنات و سیئات، تبیض و بسیط، جبر و اختیار زندگی میں امتحانی پرچے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ زندگی کا کوئی رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے۔ یہ امتحان کیا ہے۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسان میں دوراہوں خیر و شر، ہدایت و ضلالت، ایمان و کفر، سعادت و شقاوت سے کسی ایک کو انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی ہے۔ درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبے کی دوسری تعبیر یہ ہے۔ کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف جو ابتلا کی نسبت کی گئی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ جن باتوں کو نہیں جانتا ان کو امتحان لے کر جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے۔ اسی وقت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلا، و امتحان ہے۔

⑨ اللہ کی بے پایاں قدرت

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ یہ علم کے بعد قدرت کا ذکر ہے۔ اس کی تفسیر سورہ اعراف پارہ ۸ کے ساتویں رکوع میں آچکی ہے [۱] یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ عالم کی پیدائش کے پہلے دن سے وہ دن مراد نہیں ہو سکتا جو عالم کی پیدائش کے بعد ۲۴ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد چھ حالتیں یا چھ مختلف دور ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش ایک ایسے مادے سے ہوئی جسے قرآن دخان کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ دخان کے معنے دھوئیں کے ہیں۔ یا ایسی بھاپ جو اوپر چڑھتی ہو۔ ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا۔ الگ الگ نہ تھا۔ مراد مادے کی وہ ابتدائی حالت ہے۔ جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان اسی کو سحابیئے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے اسی دخانی شکل میں منتشر تھا۔

یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں الگ نہ تھا۔ پھر اس کے حصے ایک دوسرے سے جُدا کیے

[۱] افادات شیخ الاسلام

گئے۔ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا هما ۔رتق کے معنے ہیں یک جا ہونا ۔اکٹھا ہونا،ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا ،متصل اور متلاصق ہونا ۔اور فتق کے معنے پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں ۔اس سے بات سمجھ میں آتی ہے ۔وہ یہ ہے کہ ابتدائی شکل ایک ملی جلی چیز کی تھی ۔بعد میں اس کو الگ الگ کیا گیا ۔اور اس سے اجرام سماویہ زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے ۔یہ تمام کائنات یکبارگی ظہور میں نہیں آئی ۔بلکہ اس پر تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے ۔یہ دور چھ تھے ۔ان ربکم اللہ الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام میں ان ہی چھ دوروں کو چھ دن سے تعبیر کیا ہے ۔ظاہر ہے کہ چھ دنوں سے ہمارے یہ دن مراد نہیں ۔بلکہ خدائی دن مراد ہیں ۔جن میں ہر دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے ۔ان یوما عند ربك کالف سنۃ ۔ہم اُن کو ادوار کہہ سکتے ہیں ۔یہ کائنات کا چھ دوروں میں درجہ بدرجہ ظہور میں آنا اور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے ۔کہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ان کے خالق نے ارادہ ،اسکیم ،ترتیب اور حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے ۔

⑩ اللہ سبحانہٗ کی حکومت پانی پر تھی

جب اس کا تخت اقتدار پانی پر تھا ۔یعنی آسمانوں اور زمین سے پہلے یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے بھی پہلے پانی مخلوق ہوا جو آئندہ اشیاء کا مادہ حیات بننے والا تھا ۔وجعلنا من الماء کل شئ حیی ۔اس وقت عرش خداوندی بھی اسی کے اوپر تھا ۔جیسے اب سماوات کے اوپر ہے ۔گویا یہ ایک صورت تھی جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی ۔کہ کائنات کا مادہ اور ذریعہ حیات بالکلیہ رب العرش کے تصرف وتسلط اور قبولیت مطلقہ کے ماتحت ہے[۱] مطلب یہ ہے کہ اس کرہ زمین کی خشکی سے پہلے یہ سارا کرہ پانی تھا ۔اور اللہ سبحانہٗ کی حکومت اس پر تھی ۔پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی ۔اور زندگی کے مختلف النوع انواع ظہور میں آئیں ۔اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالم ہستی آباد ہوا ۔دوسری جگہ فرمایا ۔کہ ہم نے تمام زندہ اجسام پانی سے پیدا کیے ۔وجعلنا من الماء کل شئ حیی ۔اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر ایک ابتدائی دور گزر چکا ہے ۔جبکہ پانی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

تھا یا ایسی چیز تھی جسے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ اور قوانین الٰہی اس میں کام کر رہے تھے۔ وکان عرشہٗ علی الماء کی تعبیر جیسے عرش کی تخلیق کو کائنات اور زمین سے پہلے ہونے کو بتا رہی ہے۔ ایسے ہی یہ بتا رہی ہے۔ کہ پانی کی تخلیق بھی پہلے ہوئی تھی۔ اور اس کی یہی نشان دہی ہو رہی ہے کہ عرش پانی کو احاطہ میں لیے ہوئے تھا۔ یا پانی پر عرش کا دباؤ تھا۔ یہاں علامہ بقاعی کی تشریح نظم الدرر قابل دید ہے۔

> کائنات کی تخلیق سے پہلے عرش پانی پر تھا۔ پانی پر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پانی سے ملاصق تھا۔ عرش پانی پر ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ اب آسمان زمین پر ہے اس انداز تعبیر سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے۔ کہ زمین کی تخلیق سے پہلے کوئی تخلیقی کارنامہ تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ قدرت الٰہی کے اس کی عظمت کے اعتبار سے درجات لامتناہی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے۔ کہ یہاں توحید خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے۔ اس سے پہلے احاطۂ علم اور قدرت کاملہ سے استدلال تھا۔ پھر رزق رسانی سے توحید عبادت پر استدلال کیا۔ اب توحید خالقیت اور توحید اقتدار اعلٰی سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔

قرآن حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہے۔ جس کے لیے چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اثبات مدعا کے لیے شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں۔ بلکہ ہمیشہ تلقین کا قدرتی اور سیدھا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب و بیان و خطاب مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے۔ کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے۔ کوئی ایک لفظ ایسا بول دیتا ہے۔ کہ اس کی تعبیر میں اس کی دلیل بھی ہوتی ہے۔ اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا۔ اس کی واضح مثال اسی آیت میں خلق اور عرش کا استعمال ہے۔ خالقیت کو بتانے کے لیے خلق لائے تو اس کائنات کے ظہور میں آنے سے پہلے حکومت و اقتدار بتانے کے لیے لفظ عرش آیا ہے۔ اور وہ لفظ لا کر بتا دیا کہ اگر خلق اس کا کام ہے تو حاکمیت بھی اسی کا کام ہے۔ اور اشارا کر دیا۔ جیسے پرستش کی اس کی ذات مستحق ہے۔ بندگی کی بھی وہی مستحق ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ سبحانہ، اور مخلوق کے تعلقات کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تروہ الفاظ، اصطلاحات اور استعارات انتخاب کیئے گئے ہیں جو سلطنت اور بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر واضح ہے کہ کوئی شخص جو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہو۔ اسے محسوس کیئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ کچھ عقل سے محروم ناقدین نے اس سے یہ بات سمجھی ہے۔ کہ قرآن مجید جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام مسلط تھا۔ حالانکہ قرآن جس دائمی اور ابدی حقیقت کو پیش کررہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے۔ کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات بے ہمتا کی ہے۔ اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے۔ وہ اللہ سبحانہ، کے لیے خاص ہے۔ اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے۔ جس میں تمام اختیارات کو وہی ذات استعمال کر رہی ہے۔

(۱۱) تخلیق کائنات کی قرآنی توجیہہ

(۱۱) تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے کردار میں خوبصورتی ہے یعنی اس سارے نظام کی تخلیق و تربیت سے مقصود تمہارا یہاں بسانا اور امتحان کرنا ہے کہ کہاں تک اس عجیب وغریب نظام اور سلسلہ مصنوعات میں غور کر کے خالق اور مالک کی صحیح معرفت حاصل کرتے اور مخلوقات ارضی وسماوی سے منتفع ہو کر محسن شناسی اور سپاس گزاری کا فطری فرض بجالاتے ہو۔ یہ مقام تمہاری سخت آزمائش کا ہے۔ مالک حقیقی کو دیکھنا ہے۔ کہ تم میں سے کون ساغلام صدق واخلاص اور سلیقہ مندی سے اچھا کام کرتا ہے۔ اور فرائض بندگی انجام دیتا ہے [۱]

یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔ افسوس کہ ہمارے شارحین قرآن نے اس کی اہمیت کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ قرآن عزیز نے اس کا تذکرہ ایک سے زیادہ تعبیروں میں کیا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے۔

ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدہ ولکن لیبلوکم
فیما اتاکم

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا

---

۱ افادات شیخ الاسلام

اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں تمہیں آزمالے۔

مطلب یہ ہے۔ کہ اے انسانو! کہ اگر اللہ سبحانہ، تمہیں ایک شریعت والی امت بنانا چاہتا تو بنا دیتا اس طرح کہ تمام انسانوں کو روز اوّل ہی سے ایک ہی طرح کی طبیعت، ایک ہی طرح کی استعداد اور ایک ہی طرح کی فکری اور عملی حالت پر بنا دیتا، اخلاق ایک ہوتے، اطوار معیشت ایک ہوتے، ہر زمانہ کے انسانوں کے احوال وظروف میں یکسانی اور ہم آہنگی ہوتی۔ اور اس طرح ہر زمانہ میں شریعت وقانون بھی ایک ہی ہوتا لیکن اللہ سبحانہ، نے ایسا نہیں کیا اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہوا کہ انسان تمام مخلوقات میں ممتاز نوع ہو جو اطوار حیات میں بتدریج ترقی کرے اسی تنوع واستعداد کے نتیجے میں ارتقار کا تنوع رونما ہو۔ اسی ارتقار کا نتیجہ ہے۔ کہ انسانی زندگی کے مختلف اطوار ہیں۔ مختلف شریعتیں آتی رہی ہیں۔ انسانیت کے بچپنے میں جو شریعت تھی وہ یقیناً انسانیت کے لڑکپن میں نہ تھی اور جو لڑکپن کے زمانہ میں تھی وہ انسانیت کی جوانی میں نہیں ہے۔ ارشاد میں لیبلوکم کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہ، تمہارا امتحان لے رہا ہے۔ یعنی پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہیں بین الاقوامی ذمہ داری اس لیے دی ہے۔ کہ اس میں تمہارا امتحان مقصود ہے۔ کہ تم کہاں تک اس میں پورے اترتے ہو۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن میں ہے۔

وھوالذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض
درجات لیبلوکم فیما اتاکم

اور وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا زمین میں جانشین بنایا ہے
اور تم میں سے کچھ کو کچھ پر برتری دی تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے۔ اس میں تمہیں آزمائے

مطلب یہ ہے کہ یہ پوری زندگی اپنی بوقلموں نعمتوں کے ساتھ ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی اللہ سبحانہ، نے دیا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ کہ اس نے اللہ سبحانہ کی امانت میں تصرف کیا۔ کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت اور ناقابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے۔ کہ زندگی کا خاص پہلو نہیں بلکہ پوری زندگی ابتلائی ہے۔ آیت کا منشار یہ ہے کہ زمین اور زمین کی پیداواروں پر غلبہ دے کر مدارج اور مراتب کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ دیا ہے۔ اسی لیے دیا ہے۔ کہ وہ جانچنے اور آزمائے۔

ایک اور جگہ قرآن میں ہے۔

خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا

اللہ نے موت وحیات پیدا کیں تاکہ جانچنے تمہیں کہ تم میں سے عمل میں کون اچھا ہے۔

اور اسی قسم کی تعبیر سورہ کہف میں آتی ہے۔

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا۔

ہم نے بنایا ان ساری چیزوں کو جو زمین پر ہیں زمین کے لیے زیب وزینت تاکہ ہم جانچ لیں کہ ان میں عملاً سب سے اچھا کون ہے؛

ان آیات کی روشنی میں جو بات سمجھ میں آرہی ہے۔ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو حسن اوصاف و کمالات کا مجموعہ بنایا ہے۔ اور ان میں جو اضداد کی ہمہ گیری رکھی ہے۔ اگر صفات کے تفاوت کا یہ تماشا نہ ہوتا تو ان گنت، طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے یہ دنیا خالی ہوتی۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کرلیتا۔ انسان پر صفات کے تفاوت کے تناظر میں غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ ایک ہی باپ کے دو بچے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں پیدائشی صفات وکمالات کے لحاظ سے تفاوت اور اتنا تفاوت ہوتا ہے۔ کہ ان میں سے ایک کو انسان کہا جاسکتا ہے۔ تو دوسرے پر شاید حیوان کا اطلاق ہی مشکل سے صحیح ہو ویسے بظاہر دونوں انسان ہیں۔ اور دونوں انسانی چہرے رکھتے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی وبیرونی، ظاہری و باطنی کمالات وصفات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو آپ کو پتہ لگے گا۔ کہ ایک اگر آسمان پر ہے تو دوسرا پاتال میں ہے۔ ایک خوبصورت ہے تو دوسرا بدصورت ہے۔ ایک غبی ہے تو دوسرا ذہین ہے۔ ایک چست وچالاک ہے تو دوسرا کاہل و سُست، ایک فرشتہ خصلت ہے، دوسرا شیطان سیرت، ایک کو شاعری سے لگاؤ دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی کاروبار کرنے کو چاہتا ہے۔ اور کوئی کتابوں کا دلدادہ ہے۔ افراد انسانی میں اندرونی و بیرونی، ظاہری وباطنی، اعتبار سے کمالات وصفات اور ان کی قدروقیمت میں جو تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی سے زندگی کے ہر شعبہ میں ان میں مدارج کا اختلاف رونما ہوگیا مدارج ومراتب کا یہ اختلاف افراد انسانی میں ان کمالات وصفات کے تفاوت ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی فرق مراتب کو جو فرق صفات و کمالات کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ قرآن نے رفع درجات اور تفضیل سے تعبیر کیا ہے۔ ورفعنا بعضھم فوق درجات اور فضلنا بعضھم علی بعض۔

آئیے اس صفاتی اور کمالاتی تفاوت کو پیش نظر رکھ کر ادھر دیکھئے کہ الارض کو خیر و شر حسنات و سیات، اتحاد و انتشار، تبیض و بسیط، جبر و اختیار کا گہوارہ بنا دیا - اور ان کو انسان کی صفات و کمالات کے لیے پرچہ امتحان بنا دیا۔ اور اعلان کر دیا۔ نبلوکم بالشر و الخیر۔ لیبلوکم فیما اٰتٰکم اس کارگاہ زندگی میں امتحان یہ ہے۔ کہ ایکم احسن عملا۔ یعنی زندگی کا کوئی خاص پہلو اور خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسانی فطرت میں دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی ہے۔ فی الواقع قدرت کے اسی تقاضے کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف ابتلا و امتحان کے جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ جن باتوں کو اللہ سبحانہٗ نہیں جانتا امتحان لے کر انہی کو جاننا چاہتا ہے۔ بلکہ انسانی فطرت میں اختیار و اقتدار کی جو قوت رکھی گئی اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء و امتحان ہے۔

اہل علم نے لیبلوکم کے لام کو تعلیل کے لیے بنا کر لکھا ہے۔ کہ یہ خلق کے متعلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں و زمین کی تخلیق کی علت انسان کی زندگی کا ابتلا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ

> اللہ سبحانہٗ نے آسمانوں و زمین اور اس میں جو کچھ اور جتنی مخلوقات ہیں۔ ان کو پیدا کیا۔ اور ان میں تمہارے بقا کی خاطر ساری ضروریات ترتیب دی ہیں۔ تاکہ تمہارا امتحان لے۔

اس کا مطلب اس کا سوا کیا ہے۔ کہ محاسن و کمالات کے لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسان میں ہیں۔ ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ انسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات کے ساتھ ربط پیدا کرے اور اعمال کے حسن و قبح بھلائی برائی کا واحد معیار اس کی رضا کو بنائے یہی مطلب ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ کا کہ

(۱۲) امتحانی نتائج کا ظہور ناگزیر ہے۔

(۱۲) اور اگر آپ ان سے کہیں کہ تمہیں مرنے کے بعد ضرور اٹھایا جائے گا تو منکرین کہیں گے۔ کہ اس پیغمبر کی دعوت تو نرا جادو ہے۔ جب یہ امتحان و آزمائش کی جگہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کے

بعد مجازات انعام وانتقام کا سلسلہ ہو تاکہ شاکرین وکافرین کو اپنے اپنے کیئے کا پھل ملے اسی لیے یہاں بعث بعد الموت کا ذکر کیا یعنی کفار مکہ کو یقین نہیں آتا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور اپنے جرائم کی سزا بھگتیں گے۔ جب وہ قرآن یا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بعث بعد الموت کا نہایت مؤثر بیان سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا یہ بیان کھلا جادو ہے۔ جس نے بہت سے لوگوں کو مسحور اور مرعوب کر لیا مگر یاد رکھیئے کہ ہم پر یہ جادو چلنے والا نہیں۔ (ابن کثیر)[1]

اس آیت میں چند ضروری باتیں تشریح طلب ہیں۔

اول: آیت کی پیشانی پر لگا ہوا واؤ حالیہ ہے۔ اور اس کا ذوالحال خلق کی ضمیر فاعل ہے۔ یعنی سن چکے ہو کہ کائنات کی تخلیق چھ روز میں ہوئی اور یہ بھی معلوم کر چکے ہو کہ انسانی زندگی ابتلائی ہے۔ اس کے باوجود حال یہ ہے۔ کہ تم قیامت کا انکار کرتے ہو۔

دوم: آیت میں دو باتیں، بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تم مانتے ہو کہ تخلیق کا آغاز ہوا ہے۔ اور بالفعل تخلیقات موجود ہیں۔ یہاں بقائے حقیقت کا قانون ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے۔ تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ انسان وجود میں آکر مطلقاً نابود ہو جاتا ہے۔ اور اس کی کوئی حقیقت جوہری باقی نہیں رہتی۔ اللہ سبحانہٗ کا جو قانون وجود دنیا کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ وہ انسانی زندگی اور روح کے لیے کیوں معطل ہو جائے۔ جو کرہ ارضی کی تمام مخلوقات کا ماحصل اور سلسلہ تخلیق کا مقصود ہے۔ یہاں کوئی ہستی بھی جو وجود میں آجاتی ہے۔ ناپید محض نہیں ہو سکتی تم درخت کو چیر کر تختہ بنا لیتے ہو۔ اب درخت معدوم ہو گیا۔ تختہ پیدا ہو گیا۔ اب تختہ جلا دو تختہ نابود ہو گیا راکھ پیدا ہو گئی۔ راکھ ہی اڑا دو منتشر ذرات پیدا ہو گئے اگر تم منتشر ذرّوں کا تعاقب کر سکتے ہو تو کر لو۔ صورت بدلتی جائے گی حقیقت کبھی ناپید نہ ہو گی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جو ہستی بھی وجود کا لبادہ پہن لیتی ہے۔ نابود محض نہیں ہوتی۔ بلاشبہ صورت مٹ جاتی ہے مگر حقیقت نہیں مٹتی۔ اس کی صورت پر ہزار تبدیلیاں آجائیں مگر بالآخر کوئی نہ کوئی حقیقت جوہری باقی رہے گی۔ ایک دانہ تخم ہو یا ایک نطفہ پیدائش وہ کسی نہ کسی حالت میں ضرور موجود رہتا ہے۔ پھر جب اعادے کا وقت آئے گا۔ اور زندگی کا صور پھونکا جائے گا۔ ہر انسانی زندگی اس سے نمودار ہو کر کھڑی ہو جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح نطفہ پیدائش سے شکم مادر میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔

سوم: یہ زندگی ابتلائی ہے۔ ابتلا کا مقتضا ہے۔ کہ اعادہ حیات ہو۔ محسن کو احسان کی جزا اور مجرم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو اجرام کی سزا لیے تخلیق کی علت ہی یہ ہے ۔ اگر جزا و سزا نہ ہو۔ تو حکمت تخلیق ناتمام رہ جائے گی۔
اسی کو قرآن نے یوں تعبیر کیا ہے ۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین یا دوسرے موقعہ پر ہے۔

وما خلقنا السماء والارض باطلا ذالك ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار۔ ام نجعل الذین آمنو وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار

اور ہم نے آسمانوں و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں ۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا دوزخ کی ہلاکت ہے ۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں گے ۔ یا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح بنا دیں گے ۔

یہ ابتلائی زندگی کا لازمی تقاضا ہے ۔ کہ نتائج کے حوالہ سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام ہوں ۔ کامیاب ہونے والوں کا اعزاز ہو اور ناکامیاب رسوائیوں کا نشانہ ہوں ۔ اگر جزا و سزا کے تناظر میں ابتلا نہ ہو۔ تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ کہ ایمان و کفر، ارتقار و فجور کا تفاوت ختم ہو کر رہ جائے۔ اور کامیاب ناکامیاب ایک ہی نتیجہ سے دوچار ہوں ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ایک حکیم و رحیم اور قادر و عزیز ذات کے بارے میں تصور ہی نہیں ہو سکتا ہے ۔

چہارم ، یہ کہ ان ہذا الاسحر مبین یہ تو کھلا جادو ہے یہ کا اشارا اگر کہنے کی طرف ہے ۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ بات تو بالکل غلط ہے ۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے ۔ بے حقیقت ہے اس صورت میں یہ تشبیہ بلیغ ہے ۔ اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ یہ کا اشارا قرآن کی طرف ہے ۔ اور مطلب یہ ہے ۔ کہ نظریہ قیامت پر مبنی جب آپ ان کے سامنے قرآن پیش کرتے ہیں ۔ تو منکرین اور ناقدرے کہتے ہیں کہ یہ قرآن کھلا جادو ہے ۔ یعنی یہ منکرین ایک طرف تو قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں ، دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے ۔ کہ یہ شخص اوروں کی طرح نہیں ہے ۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ۔ پھر جب کوئی توجیہہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تو کہتے کہ ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے ۔ ان کا یہ کہنا قرآن کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی شہادت ہے ۔ یعنی اس کا اثر اس قدر نمایاں اور کھلا تھا ۔ کہ باوجود دشمنی اور عناد کے ان کے لیے ماورائے انکار نہ تھا ۔ اس لیے وہ اسے جادو کہنے پر مجبور تھے ۔

⑭ معاندین کا تاخیرِ عذاب پر سوال

اور البتہ اگر ہم آپ کے مخاطبوں کو مہلت کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کر دیں۔ تو یہ آوازہ کسیں گے۔ کہ عذاب میں رکاوٹ کیا ہے۔ سُن لو! جس روز ان پر ان کے اعمال کی پاداش رونما ہوگی۔ یہ ان سے ہٹائی نہ جائے گی اور جس چیز کا وہ مذاق کر رہے ہیں۔ وہ ان کو گھیرے میں لے لے گی۔ یعنی جب ان کی شرارتوں پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے مگر اللہ سبحانہ کی حکمت ایک مقررہ مدت تک عذاب کو روکے رکھتی ہے۔ تو تکذیب و استہزار کے طور پر کہتے ہیں۔ کہ وہ عذاب کہاں ہے۔ آخر آتا کیوں نہیں؟ کس چیز نے اسے پکڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں کیا مذاق کرتے ہیں۔ وقت مقررہ پر جب آئے گا تو کسی کے ٹلانے نہ ٹلے گا۔ اور ہر طرف سے گھیر کر تباہ و برباد کر کے چھوڑے گا[1]

معاندین نے کس عذاب کی تاخیر کے بارے میں ما یحبسہ؟ اسے کس چیز نے روک رکھا ہے قیامت میں ہونے والے عذاب کے بارے میں یا دنیا میں ہونے والے عذاب کے بارے میں شارحین قرآن کا میلان دونوں طرف ہے۔ لیکن قرینہ ہے کہ عذاب سے وہ عذاب مراد ہے۔ جس کا نبوت کی زبان سے قرآن نے یہ کہہ کر انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ہم بتاتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے لیے یوم کبیر بدر کا دن ہے۔ اسی کو قرآن نے البطشۃ الکبریٰ اور اسی کو یوم الفرقان کہا ہے۔ جس طرح دوسری قوموں پر مختلف قسم کے عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو کر آئے اس کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے قحط کا عذاب آیا۔ جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیر چھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔ یوم تاتی السماء بدخان مبین یغشی الناس ھذا عذاب الیم۔ بعض روسائے قریش نے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگردانی کا وہی عالم ہو گیا۔ تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا اور کوئی طریقہ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشہ کبری پیش آیا۔ قرآن نے مکی سورتوں میں ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلان سنا دیا تھا کہ قحط کا عذاب، ہٹایا جا رہا ہے۔ لیکن تم پھر وہی کچھ کرنے والے ہو۔ اب بطشہ کبری کا انتظار کرو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون یوم نبطش البطشۃ الکبری انا منتقمون۔

ہم تھوڑے عرصہ کے لیے عذاب ہٹا رہے ہیں۔ لیکن تم پھر وہی کچھ کرو گے۔ اس دن کا انتظار کرو جب بڑی پکڑ پکڑیں گے۔

مکی زندگی میں اسی کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اور اسی کے بارے میں انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر۔ سُن کر کہتے تھے۔ ما یحبسہ؟ اس کے آنے میں رکاوٹ کیا ہے۔

عذاب میں تاخیر کی حکمت

عذاب اس وقت تک نہیں آتا۔ جب تک ہدایت کے ذریعہ قوم کے تمام صالح اجزا ان کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے۔ اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر الگ نہیں ہو جاتے۔ اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعاً مایوسی نہیں ہو جاتی حضرت نوحؑ نے ایک لمبا عرصہ دعوت دی۔ اور اس کے بعد نا امید ہو کر دعا کی رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کے ایمان سے مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم۔ اس موقع پر اسی قسم کی دعائیں اور انبیاء نے بھی کی ہیں۔

اس وقت پھر رسول کو اپنی امت کو لے کر کافروں سے علیحدگی کا حکم ہوتا ہے۔ سورہ یونس میں یہ قانون بالتفصیل پڑھ چکے ہو۔

ہدایت کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو غیبی نشانات صادر ہوتے تھے۔ ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوت تاثیر، استجابت دعا، تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا۔ اسی غیر معمولی تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکتے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات موجود ہیں قرآن عزیز کی یہ آیت کافروں کے اس باطنی انحراف کا آئینہ ہے۔ لا تسمعوا لھذا القرآن۔ قرآن کے اثر ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ اسے سحر مبین کہتے ہیں۔ الغرض ہدایت کے بہت سے نشانات تھے جو مکہ میں کفار کو اس لیے دکھائے گئے۔ کہ اُنکو دیکھ کر قبول حق کی صلاحیت رونما ہو۔ تیرہ۱۳ سال تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں کو دعوت دیتے رہے۔ اور کہتے رہے۔ انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر۔ مگر وہ اس اندیشہ سے متاثر ہونے کی بجائے اس کا مقابلہ کرتے۔ اس کا مذاق اڑاتے، آوازے کستے متی ھذا الوعد؟ کفار کو معجزہ عذاب

دیکھنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ اندیشہ افسانہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے بتایا کہ جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں عذاب میں تاخیر ہوتی رہے گی۔

بالآخر قانون الٰہی کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا کی۔

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔

اے میرے رب مجھے خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے مجھے ایک مددگار طاقت دے۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی جاء الحق وزھق الباطل بس یہی وجہ عذاب کی تاخیر میں حکمت زبانی کر رہی تھی اسی کو وہ کہہ رہے ہیں مایحبسہ ؟ عذاب کو روکنے والی چیز کیا ہے جواب میں فرمایا ہے۔

الا یوم یاتیھم لیس مصروفا عنھم وحاق بھم ماکانوا بہ یستھزؤن۔

مطلب یہ ہے کہ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں عذاب آکر رہے گا۔ عذاب آنے کے سارے عوامل فراہم ہو چکے ہیں۔ سوال کو بنانے کے لیے قرآن نے اس کی تمہید بڑی لطیف قائم کی ہے یعنی اگر ہم عذاب کو ایک عرصہ مقررہ کے مؤخر کر رہے ہیں تو کہنے والے ضرور کہیں گے۔ اصل ارشاد میں امۃ معدودۃ ہے حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

قرآن وسنت میں لفظ امۃ ایک سے زیادہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مدت اور عرصہ کے معنے میں جیسے واذکر بعد امۃ اور اس جگہ الی امۃ معدودۃ امام ومقتدا کے معنے میں جیسے ان ابراہیم کان امۃ ملت اور دین کے معنے میں جیسے انا وجدنا آباءنا علی امۃ جماعت کے معنے میں جیسے وجد علیہ امۃ من الناس۔

سوال یہ تھا کہ عذاب کے آنے میں کیا رکاوٹ ہے جواب میں صرف یہ فرمایا کہ عذاب جب آئے گا وہ اس کا دفاع نہ کر سکیں گے۔ کسی طرح بھی۔ عذاب کے لیے ان کی جلد بازی چونکہ استہزائی رنگ میں تھی۔ اس لیے فرمایا کہ وحاق بھم ماکانوا بہ یستھزؤن۔ وہ عذاب ان کو اپنے گرداب میں لے لے گا۔ جس کو یہ دل لگی سمجھ رہے ہیں۔ اور جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا
مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ
مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ
اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

اور البتہ اگر ہم انسان پر اپنی جانب سے رحمت نچھاور کرتے ہیں۔ پھر اس رحمت کو اس سے ہٹا دیتے ہیں۔ تو انسان مایوسیوں اور ناشکریوں کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے[۱۴]۔ اور البتہ اگر ہم انسان کو اس تنگ حالی کے بعد جس کا وہ شکار ہو گیا تھا۔ خوشحالی سے دوچار کرتے ہیں تو وہ ضرور بالضرور چہکنے لگتا ہے۔ کہ میری بدحالیاں ختم ہو گئی ہیں۔ یقیناً اب وہ اتراہٹ اور گھمنڈ کا پیکر بن جاتا ہے[۱۵]۔ ہاں وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو صبر کا دامن تھامے ہوئے اور اعمال صالحہ کے خوگر ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور اللہ سبحانہٗ کی مغفرت اس کا

استقبال کرتی ہے ؎

مفردات کے معانی

یئوس: یہ فعول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ یئس ییٔس باب سمع سے آتا ہے۔ اس کے معنے آس چھوڑ بیٹھنا اردو میں اسی سے مایوس استعمال ہوتا ہے۔

کفور: کاف کے زبر کے ساتھ فعول کے وزن پر مبالغہ ہے۔ اور کاف کے پیش کے ساتھ کفور مصدر ہے۔ اس کے تین مصدر کفر، کفور، کفوران، کفران زیادہ ناشکری کے لیے بولا جاتا ہے۔ کفر انکار کے معنے میں آتا ہے۔ اور کفور دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کفر سے کفار مبالغہ آتا ہے۔ اس میں زیادہ زور ہے۔ کل کفار عنید اسی سے ہے۔

نعماء: نعم ینعم سے اسم ہے۔ خوش حالی کے معنے میں اچھے کھانے کو طعام ناعم کہتے ہیں۔ نعمۃ، نعمی اور نعماء تینوں ایک ہیں۔

ضراء: ضر یضر سے اسم مؤنث ہے۔ سختی اور تنگی کے معنے میں اس کا مذکر نہیں آتا۔ تنگ حالی کے معنے میں ہے۔

فرح: یہ فعل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کثیر الفرح بہت زیادہ اترانے والے کو کہتے ہیں۔ باب سمع سے آتا ہے۔ ان اللہ لا یحب الفرحین۔

فخور: یہ فخر یفخر سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنے مال وجاہ پر گھمنڈ کرنے والے کے ہیں۔ فاخر، فخور اور فخر اسی معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ نفیس اور عمدہ کو بھی فاخر کہتے ہیں۔

انکار حق کا سرچشمہ نفسیاتی رذائل ہیں

جب انسان نفسیاتی رذائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ رذائل تو بہت ہیں۔ یہاں صرف ان رذائل کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو انکار حق کا باعث ہوتے ہیں۔ مایوسی، ناشکری، فرح، فخور، یاس رجار کی ضد اور کفران شکر کی ضد ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ کہ صحت کے ملنے کے بعد، عزت سے دوچار ہونے کے بعد جب بیماری اور ذلت کا شکار ہوتا ہے۔ تو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے اور اللہ کے انعامات و احسانات کو طاق نسیان بنا کر ناشکری اور کفران نعمت کا علمبردار ہو جاتا ہے پوری

زندگی اس طرح گزارتا ہے۔ کہ صحت نہیں ملتی تو مایوسیوں کو اپنا لیتا ہے مل جاتی ہے کہ تو ناشکر گزاری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی مایوسی سے نہیں۔ صبر سے اور ناشکری اور کفران سے نہیں شکر گزاری سے چلتی ہے۔ یہی دو پہیے ہیں جن کے ذریعہ زندگی کی گاڑی تیز رفتاری سے چلتی ہے۔ اور جہاں صبر کی جگہ مایوسیاں آجاتی ہیں۔ اور شکر کی جگہ کفران آجاتا ہے۔ وہ زندگی کبھی حالات کی ناسازگاریوں کا سامنا نہیں کر سکتی ہے۔ حالات میں خواہ کیسی سنگینی ہو۔ مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ انہ لاییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون دامن صبر کو تھام کر رکھنا چاہیئے۔ اور اس کے برعکس حالات خواہ کیسے ہی خوشگوار ہوں خوشگواری میں منعم کو نہ بھولنا چاہیئے۔ شکر کرنا چاہیئے۔ حوادث میں صبر اور انعامات برعکس سے انسان زندگی میں اور اس دنیا میں بے غم اور بے خوف ہو جاتا ہے۔

آیئے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے۔ بدحالیوں کے بعد انسان خوشحالیوں سے ہمدوش ہوتا ہے صرف بدحالیوں کے اختتام کے نعرے ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس موقعہ پر اس میں اتراتا اور ہم حیثیوں اور کم تر لوگوں کے مقابلے میں فخر و مباہات کی تصویر بن جاتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے۔ کہ انسان کے ان رذائل کا یہاں ذکر کیوں کیا ہے؟ ایک نہایت اچھوتے انداز میں اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج نبوت کی زبان سے انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر کا اعلان سُن کر مذاق کر رہے ہو۔ اور سمجھتے ہو کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ہمارا کیا بگڑے گا۔ نبوت کے جواب میں تمہارا یہ استہزا اس ذلیل صفت کا ذلیل مظاہرہ ہے۔

(۱۴) اور البتہ اگر ہم انسان پر اپنی جانب سے رحمت نچھاور کرتے ہیں۔ پھر بعد ازیں اس رحمت کو اس سے ہٹائے دیتے ہیں۔ تو انسان مایوسیوں اور ناشکریوں کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ یعنی اب تو کہتے ہیں کہ عذاب کہاں ہے؟ کیوں نہیں آتا۔ لیکن آدمی بودا اور تھڑدلا اتنا ہے۔ کہ اگر اللہ سبحانہٗ چند روز اپنی مہربانی سے عیش و آرام میں رکھنے کے بعد تکلیف میں مبتلا کر دے تو پچھلی مہربانیاں بھی بھلا دیتا ہے۔ اور نا امید ہو کر آئندہ کے لیے آس توڑ بیٹھتا ہے۔ گزشتہ پر ناشکری اور آئندہ سے مایوسی یہ ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ عام انسانی طبیعت اور فطرت یہی ہے۔ کہ تکلیف و مصیبت سے دوچار ہوتا ہے۔ تو ماضی کو بھول کر مستقبل میں مایوسیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی میں جو انعامات کیئے ان کے لیے اس میں شکر کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اور حال میں حالات کی سنگینی کی وجہ سے دامن صبر ہاتھ سے چھوڑ کر مایوسیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔

شارحین قرآن نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس سے بھی استفادہ فرمالیجئے۔ حافظ ابن

فرماتے ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ نے انسان اور اس کی بُری نفسیات کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے ۔ کہ جب انسان پر خوش حالی کے بعد تنگ حالی آتی ہے تو جیسے وہ مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کا شکار ہو جاتا ہے ۔ ایسے ہی نعمتوں سے بھرپور ماضی کے لیے اس میں جحود و انکار کو اپنا لیتا ہے ۔ ایسا ہوتا ہے جیسے پہلے سے گویا اس پر کبھی کوئی انعام ہی نہیں ہوا ہے ۔

حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ

اگر ہم انسان کو زندگی میں فراخی اور معاش میں بسط کی حالت دیتے ہیں ۔ تو دنیا کی ساری فراخیوں کو مصائب کا چکر آنے کے بعد انسان مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کی آماجگاہ بن جاتا ہے ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر اس کی دی ہوئی نعمتوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے ۔

امام محی السنۃ ابو محمد بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ بتا رہے ہیں کہ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ مصائب میں مایوس اور انعامات میں کفور ہو جاتا ہے ۔ معاش کی خوشحالی میں ناشکرا اور تنگ حالی میں یاس و قنوط کا پتلا بن جاتا ہے ۔

امام فخر الدین رازی مفاتیح الغیب میں فرماتے ہیں ۔

انسان پر دو حالتیں آتی ہیں ۔ ایک حالت میں وہ نعمتوں کا گہوارہ ہوتا ہے ۔ اور ایک حالت میں وہ مصیبتوں کے چکر میں ہوتا ہے ۔ نعمتوں سے جب ہمدوش ہوتا ہے تو منعم کو فراموش کر دیتا ہے ۔ اور انعام کا شکر کرنے کی جگہ کفران کرتا ہے اور مصیبتوں میں پھنستا ہے ۔ تو سراپا شکوہ و شکایت بن جاتا ہے ۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں فرماتے ہیں ۔

جب ہم انسان کو صحت ، امن ، اور مال کی نعمت دیتے ہیں ۔ تو وہ ناشکر گزار ہوتا ہے جب دی ہوئی نعمت کو چھین لیتے ہیں ، وہ مایوسیوں سے دوچار ہو جاتا ہے ۔

قاضی بیضاویؒ اپنی تفسیر میں اس طرح تشریح فرماتے ہیں ۔

اگر ہم انسان پر نعمتوں کی نوازش کرتے ہیں ۔ پھر حالات کے تحت نعمت اس سے

چھین لیتے ہیں۔ تو انسان کی کمزوری یہ ہے۔ کہ وہ ماضی میں کیئے گئے انعامات سے آنکھیں بند کر کے ناشکرا اور شکوہ و شکایت کرنے لگتا ہے۔ اور مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کا رویہ اپنا لیتا ہے۔

اور علامہ شوکانی تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ بندہ کو صحت اور مال کی نعمت دیتے ہیں اور پھر یہ نعمت زحمت سے بدل جاتی ہے۔ تو اس وقت انسان کا ماضی اور مستقبل کے بارے میں رویہ عجیب ہو جاتا ہے۔ ماضی میں نعمتوں کے لیے اس میں شکر کی جگہ کفران اور مستقبل میں رجاء کی جگہ مایوسی آجاتی ہے۔

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں۔

جب انسان کو صحت، امن و عافیت اور مال و دولت کی نعمت عطا کرتے ہیں بعد ازیں اس سے نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ تو چھن جانے کے بعد ایک طرف اگر وہ مستقبل میں خوشحالی سے مایوس ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ماضی میں کی گئی نعمتوں کے لیے بہت زیادہ ناشکر گزار ہو جاتا ہے۔

اصل مقصد اس ارشاد کے ذریعے یہ سمجھانا ہے کہ عذاب کے بارے میں تاخیر پر مشرکین و منکرین یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔ کہ عذاب میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی طبیعت کی یہ فطری کمزوری ہے کہ راحت اور خوشحالی میں وہ کفور ہوتا ہے۔ اور مصائب کے ہجوم میں وہ مایوس بن کر رہ جاتا ہے۔ یعنی اس میں صبر و شکر کی صفتیں نہیں بلکہ یاس و کفر کے رذائل ہیں۔ اور یہ دو بُری عادتیں انسان کو عذاب نہ ہونے کی حالت میں اب بجائے شکر کے کفران پر اُبھار رہی ہیں۔ وہ عذاب نہ آنے پر اور امن و عافیت پر اللہ کا شکر نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس کی اس نعمت کی ناقدری کرتا ہے۔ اور ان کے اعمال کے نتیجے میں اور نبوت کے اندیشہ کے مطابق عذاب آجائے گا۔ تو یہ مایوسیوں کے شکار ہو جائیں گے منشا یہ ہے کہ انسان میں کمال صبر و شکر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کا یہ طبقہ صبر و شکر کے فضائل سے عاری ہے۔ یاس و کفران جیسے رذائل کی آماجگاہ ہے۔ ان رذائل کی موجودگی میں ان کا یہ سوال کہ عذاب میں دیری کیوں ہے۔ تعجب خیز نہیں۔

(۱۵) فرح و فخر بدترین صفات ہیں۔

اور البتہ اگر ہم انسان کو اس تنگ حالی کے بعد جس کا وہ شکار ہو گیا تھا۔ خوشحالی سے دوچار کرتے

ہیں۔ تو وہ مغرور با مغرور چہکنے لگتا ہے کہ میری بدحالیاں ختم ہوگئی ہیں۔ یقیناً اب وہ اتراہٹ اور گھمنڈ کا پیکر بن جاتا ہے۔ یعنی مصیبت کے بعد اگر اللہ سبحانہٗ آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا اب ہمیشہ کے لیے مصائب و تکالیف کا خاتمہ ہوچکا۔ پچھلی کیفیت لوٹ کر کبھی آنے والی نہیں اس وقت غافل و مغرور ہو کر شیخیاں مارتا اور اتراتا پھرتا ہے۔ حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا۔ اور اس کے احسان کے سامنے جھک جاتا[1]

یہ ان اخلاقی رذائل کی تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب خاص طور پر مبتلا تھے۔ تصویر کا پہلا رُخ صبر و شکر سے بیگانہ ہو کر یاس و کفران جیسے رذائل میں مبتلا ہونا تھا۔ دوسرا تصویر کا رُخ فرح اور فخر کی بیماری ہے۔ اور یہ تینوں رذائل قبول حق میں سنگ راہ ہیں۔ یہ وہ رذائل ہیں جن سے اعراض عن الحق کا استہزا حق کے علمبرداروں کی تحقیر جیسے روگ جنم پاتے ہیں۔ ان ہی سے آدمی خود بینی، خود نمائی، حسد، فحش گوئی، نمائش، ظلم، غیظ و غضب، بے ایمانی، جھوٹ، بدگمانی، حرص و طمع، بہتان، خیانت اور بدگوئی جیسے جرائم پروان چڑھتے ہیں۔

آیت قرآنی خوشحالی کے لیے اذاقت اور بدحالی کے لیے مساس کی تعبیر بلیغ ہونے کے ساتھ لطیف بھی ہے۔ بلاغت تو یہی ہے کہ نعماء خوش حالی کا مد مقابل ضرار بدحالی کا ذکر کیا ہے مگر لطافت یہ ہے کہ خوشحالی کی مقصدیت اور اس کی پشت پر ارادہ اور محنت ہونے کی وجہ سے اذاقت سے تعبیر کیا۔ جبکہ ضرار اور بدحالی چونکہ وقتی اور غیر ارادی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو مساس سے ظاہر کیا۔ اس میں یہ بھی اشارا ہے۔ کہ رحمت غضب سے پہلے ہے کیونکہ رحمت اصل ہے۔ اور کچھ اہل علم نے لفظ اذاقت کی تعبیر سے یہ بھی سمجھا ہے کہ آخرت کی دائمی اور لامحدود نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زندگی میں جو کچھ بھی مل رہا ہے۔ اس کی حیثیت کھانے اور استعمال کرنے کی نہیں صرف چکھنے کی ہے۔ اور یہ گویا آخرت کی نعمتوں کا ایک اُرنگا ہے۔ حیرت ہے کہ صرف نمونہ ہاتھ میں آنے پر انسان اترا رہا ہے اور گھمنڈ کھا رہا ہے

اصل بات پہلے بتائی گئی تھی۔ کہ خوشحالی کے بعد تنگ حالی آتی ہے۔ صحت کے بعد بیماری آتی ہے۔ غنا کے بعد فقیری آتی ہے۔ عزت کے بعد ذلت آتی ہے۔ تو انسانی عادت رذیلہ یہ ہے کہ ماضی کی خوشحالیوں کی طاق نسیاں بنا کر مستقبل میں یاس و قنوط کا رویہ اپنا لیتا ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ بدحالیوں کے بعد اگر خوش حالی بیماری کے بعد صحت، فقیری کے بعد امیری اور ذلت کے بعد عزت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آتی ہے۔ تو یہی جو پہلے مایوسیوں کی تصویر بنا ہوا تھا۔ فرح وفخر کا پیکر بن جاتا ہے۔ خوشحالی پر اُتراتا ہے۔ اور لوگوں کے سامنے قسم قسم کی ڈینگیں مارتا ہے۔

حافظ ابن الکثیرؒ فرماتے ہیں۔

نعمت کی جگہ جب نعمت آتی ہے تو کہتا ہے کہ اب میری ساری مصیبتیں کافور ہوچکیں ہیں اب اس کے بعد میں کسی افتاد کا شکار نہ ہوں گا۔ موجود نعمت پر اتراتا ہے۔ اور دوسروں کے سامنے فخر کرتا ہے۔

آیت میں فرد کی موجودگی کا قانون بتایا جارہا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقوام کا بھی یہی قانون ہے۔ فرد کی مثال قرآن میں قارون کی ہے۔ اور سورہ کہف میں ان دو شخصوں کی ہے جن کے دو باغ تھے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ کہف ہی میں آپ پڑھیں گے۔

اب سوچیں اس موقعہ پر ان رذائل کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں یہ بات دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

اولاً: اس لیے کہ منکرین حق اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عذاب کی خبر سُن کر ہنسی اڑاتے تھے۔ اور اہل ایمان پر مصیبت کی گھڑیاں شاق گزرتی تھیں۔ بتایا کہ منکرون کی یہ حالت کوئی غیر معمولی حالت نہیں ہے۔ انسان خوشحالیوں میں پڑکر اسی طرح غافل ہوجاتا ہے اور ڈینگیں مارنے لگتا ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ ایک نہایت لطیف انداز میں منکرین حق کو آگاہ کرنا ہے۔ کہ آج مطمئن زندگی میں نبوت تمہیں خبردار کررہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کی نافرمانیوں کا نتیجہ عذاب ہے۔ اور تم نبوت کی بات کا استہزار کررہے ہو۔ اور اس میں مگن ہو کہ ہماری خوشحالیوں میں عذاب کی بات بے وقت کی راگنی ہے تو نبوت کی بات پر تمہارا یہ استہزار اسی رذیل صفت کا ایک ذلیل کردار ہے۔

(۱۶) پسندیدہ لوگوں کی روش

ہاں وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو صبر کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور اعمال صالحہ کے خوگر ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کی مغفرت ان کا استقبال کرتی ہے۔ یعنی جو حال اوپر عام انسانوں کا بیان ہوا۔ اس سے اللہ کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جو تکلیف ومصیبت کا مقابلہ صبر واستقامت سے کرتے تھے۔ اور امن وراحت کے وقت شکر گزاری کے ساتھ عمل صالح میں مستعدی دکھاتے ہیں۔ ایسے اولوالعزم وفاداروں کی جماعت ہی عظیم الشان بخشش وانعام

کی مستحق ہے[1] افراد کی زندگی میں سب سے نازک موقعہ وہ آتا ہے۔ جب وہ بدحالی کے بعد کسی کامیابی اور خوشحالی سے ہمدوش ہوتے ہیں۔ اس وقت پر نفس کو قابو میں رکھنا اور ضبط سے کام لینا دشوار ہوتا ہے۔ مگر یہی ضبط نفس کا اصل موقعہ ہوتا ہے۔ اور اسی سے اشخاص میں سنجیدگی، متانت، وقار اور سیرت کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت میں ہم آہنگی ہے ان دونوں حالتوں میں آدمی کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت و خوشی کے نشے میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو۔ اور غم و تکلیف میں وہ اداس نہ ہو۔ دل کے ان دونوں عیبوں یا سیرت کے ان رذائل کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے۔ اس آیت میں اسی راز کو منکشف کیا گیا ہے۔ کہ پُروقار، متین اور صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے وقت کی ہر گردش سے متاثر ہو کر بدلتا نہ جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویے پر قائم رہے۔ اگر حالات میں سازگاری ہو اور اقتدار مل جائے تو بڑائی کے نشے میں مخمور ہو کر بہک نہ جائے اور اگر نکبتوں اور نوازل میں پھنس جائے تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں پامال نہ ہونے دے۔ ابتلا اللہ سبحانہ کی جانب سے نعمتوں کی صورت میں ہو یا زحمتوں کی شکل میں دونوں صورتوں میں ضابط، متین اور باوقار رہے۔ اور اپنے آپ کو کسی حال میں بھی قابو سے باہر نہ ہونے دے۔

علامہ آلوسیؒ نے کشف کے حوالہ سے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ

> یاس میں صبر نہ ہونے اور کفران میں شکر نہ ہونے کے معنے تھے۔ اس لیے استثنا کے موقعہ پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جو ان رذائل کی جگہ صبر و شکر کے فضائل سے آراستہ ہیں۔

گویا یہاں محبوبوں کے ذکر میں کنائی زبان میں فضائل کا ذکر کیا۔ جبکہ معاندین کے ذکر میں رذائل کی تصریح کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو کسی آزمائش و مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس اور دل شکستہ ہونے کی بجائے اس کی رحمت کی امید پر دامن صبر ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور جب اس کے فضل و نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو اکڑنے اور مغرور ہونے کی جگہ اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اور عمل صالح کرتے ہیں۔ مصائب ان میں ضبط، وقار اور متانت پیدا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتے ہیں ۔ اور نعمتیں ان میں شکر اور تواضع کی راہیں کھولتی ہیں ۔
جناب قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں یہ بات خوب لکھی ہے کہ

وہ اہل ایمان جو نعمتوں کے چھن جانے پر یاس اور کفران کی تصویر نہیں ہوتے بلکہ اللہ سے امیدوار رحمت ہوتے ہیں اور اس کی موجود اور سابق نعمتوں کے سراپا شکر ہوتے ہیں نہ اتراتے ہیں نہ گھمنڈ کرتے ہیں اور نہ لوگوں کے سامنے فخر کرتے ہیں ۔ بلکہ اللہ سبحانہ کے شکر گزار ہوتے ہیں ۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ۔ اولٰئک لھم مغفرۃ واجر کبیر اس میں صبر کی تلخیوں کو مٹانے کی ایک تدبیر بتائی ہے ۔ اور صبر کو ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی خوشخبری دی ہے کہ ان کے لیے عظیم مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے بلکہ فرمایا ہے ۔ ان اللہ مع الصابرین جن کو اللہ کی رفاقت و معیت کی دولت مل جاتی ہے ۔ اگر اللہ کی طرف سے ان پر مغفرت اور اجر کبیر کا نزول ہو ۔ تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ۔ آخر اللہ سبحانہ ہی جس کے ساتھ ہو گیا ہو تو سوچیئے کہ اور اجر کبیر کے سوا اور کسی دوسری بات کا امکان ہی کیا ہے ۔

یہاں الذین صبروا جملہ خبریہ ہے ۔ اور مقام مدح میں ہے ۔ اس کا انداز بتا رہا ہے ۔ کہ جن کے بارے میں یہ بات بتائی جا رہی ہے ۔ انہوں نے موجودہ زندگی کے مصائب کا صبر سے مقابلہ کیا اور صبر کو خوشگوار بنانے کے لیے مذکورہ بالا قرآنی تدبیر سے فائدہ اٹھایا ۔ جن نتائج کا وعدہ صبر پر کیا گیا ہے اس سے قلب کو قوی رکھتا اس عہد کے مسلمانوں کے دماغ کی منطق ٹھیک قرآنی منطق بن گئی تھی ۔ یقین نہیں آتا تو حضرت عمرؓ کے اس ارشاد گرامی کو پڑھیئے جو ازالۃ الخفاء میں شاہ ولی اللہؒ نے پیش کیا ہے ۔

میں جب بھی کسی معیبت میں مبتلا ہوتا ہوں تو اپنے اندر چار نعمتوں کو محسوس کرتا ہوں ۔ اول یہ کہ معیبت میرے دین میں نہیں ہے دوم یہ کہ اس سے بڑی معیبت میں مبتلا نہیں سوم یہ کہ اس کی وجہ سے رضائے الٰہی سے محروم نہیں ہوں چہارم یہ کہ اس معیبت پر ثواب کا امیدوار ہوں ۔

ہر معیبت میں چار نعمتوں کا آپ کے دل میں بیدار ہونا ہے اور وہ نعمتیں کیا ہیں ۔ یہ کہ اسلام محفوظ رہ گیا ۔ یہ کہ اس سے بڑی معیبت سے محفوظ ہوں ۔ یہ کہ قانون الٰہی کی مخالفت کے جرم سے محفوظ ہوں ۔ یہ کہ الحمد للہ احتساب کی نعمت مالا مال ہوں ۔

یہ احساس قرآن کے اس حیرت انگیز اثر کی دلیل ہے ۔ جو قرآن نے اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا تھا ۔

البقاعیؒ لکھتے ہیں ۔ سیاق قرآنی صحابہ کرامؓ کی مدح میں ہے اس لیے یہاں اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے ۔ کہ جن کے چہرے مذکورہ اوصاف وفضائل کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں ۔ ان کا مقام کیا ہے ۔ جواب میں ارشاد ہوا ہے ۔ اولائك یعنی ان کو ان کی کوتاہیوں کے نتائج سے محفوظ رکھا جائے گا ۔ اور ان کے صبر و شکر کی ان کو بہت بڑی جزا ملے گی ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ ان اوصاف وفضائل کی وجہ سے یہی اس مغفرت اور اجر کبیر کے مستحق ہیں ۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ

بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ

مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ

يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ

ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّاۤ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

تو کیا آپ غالباً کچھ وہ باتیں جن کی وحی آپ کی طرف اللہ سبحانہ کی جانب سے کی جارہی ہے چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ جی میں تنگ ہوں گے۔ صرف اس لیے کہ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ اس پیغمبر پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ یا اس کی ہمرکابی میں فرشتہ کیوں نہیں آیا، یاد رکھیئے کہ آپ صرف لوگوں کو اعمال کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ذمہ داری آپ کی نہیں، وہ تو اللہ کی ہے۔ (ہاں بلکہ) کیا وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ اللہ کی وحی نہیں بلکہ اس

مدعی نبوت کی ساختہ وپرداختہ ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر صورت حال یہی ہے۔ تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو۔ اگر تم سچے ہو۔ مسلمانو! اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کریں۔ تو جان لو کہ قرآن اللہ کی وحی اور اس کے علم سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں بولو کیا تم سب کہا مانو گے؟[۱۸]

مفردات کے معانی

ضائق ضاق یضیق سے اسم فاعل ہے۔ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں ضیق وسعت وکشادگی کی ضد ہے۔ مکان کی تنگی کے لیے ضاق المکان بولا جاتا ہے۔ اسی سے تضایق اور تضیق آتے ہیں۔ ضیق بالکسر اور بالفتح اور ضیقۃ فقیر، رنج وغم، اور بخل کے معنے میں استعمال ہوتے ہیں اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں، ضیق ضَیق اور ضیقۃ کا استعمال فقر، بخل اور غم اور اسی قسم کے معنوں میں ہوتا ہے۔ ضاق بہم ذرعًا ان سے تنگ ہوگیا۔ ضائق بہ صدرک، تیرا جی اس سے تنگ ہو رہا ہے۔ یعنی تو غمگین ہو رہا ہے۔ یضیق صدری، میرا جی تنگ ہو رہا ہے مجھے غم ہو رہا ہے۔ ضیقا حرجًا، تنگ اور بے حد تنگ۔ ضاقت علیہم الارض بما رحبت زمین ان پر ساری کشادگیوں کے باوجود تنگ ہوگئی۔ ضاقت علیہم انفسہم وہ بے حد غمگین ہوگئے۔ لاتک فی ضیق، تنگی میں نہ ہو۔ یہ سب رنج وغم کی تعبیریں ہیں۔

لم یستجیبوا ـــــ یہ مضارع مجزوم کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا مادہ جوب ہے۔ اس کے معنے قطع کرنے کے آتے ہیں۔ اسی سے جواب ہے چونکہ فضا کو قطع کر کے کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ اس لیے جواب کہتے ہیں۔ اسی سے اجابت اور استجابت آتے ہیں۔ دونوں کے معنے ماننے اور قبول کرنے کے ہیں۔ اجیبوا داعی اللہ اللہ کی طرف

دعوت دینے والے کی بات مان لو۔ اور قبول کرلو۔ اور اجیبت دعوتکما تمہاری مانگ مان لی گئی اور قبول ہوگئی ادعونی استجب لکم مجھ سے مانگو میں ضرور قبول کروں گا۔ اور اجیب دعوۃ الداع اذا دعان، میں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا۔ اصل معنے دونوں کے جواب دینے کے ہیں۔ اسی سے ان کے معنے ماننے اور قبول کرنے کے ہوگئے، مگر استجابت میں بہ نسبت اجابت کے ذرا زور اور تاکید ہے استفعال کا سین طلب کے لیے نہیں تاکید کے لیے ہے۔

ناسازگار حالات میں داعی کو تسلی

فاء تفریع کے لیے ہے۔ یہ تفریع ان حالات کی نشاندہی کر رہی ہے جن حالات میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ سرزمین مکہ ایک ایسے قبیلہ کے صدر مقام ہے۔ جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے۔ عین اس حالت میں جبکہ یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں۔ اس بستی میں ایک شخص اٹھ کر علی الاعلان کہتا ہے کہ جس نظام عبادت کی تم امامت کر رہے ہو۔ وہ سراسر گمراہی ہے۔ جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ بالکل بودا ہے۔ اللہ کا عذاب تمہارے کردار کے نتیجے میں تم پر آنے والا ہے۔ اور تم اس کی گرفت سے کسی بھی تدبیر سے بچ نہیں سکتے، بچنے کی صورت ایک ہی صورت ہے کہ اس نظام صالح کو قبول کرلو۔ جو میں اللہ سبحانہ کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔ اس شخص کے پاس اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے علاوہ کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے تمام لوگ اسے اللہ کا فرستادہ سمجھیں۔ اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تمدن کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری علامت نہیں ہے۔ جو نزول عذاب کی نشاندہی کر رہی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں علامتیں بھی ظاہر کرتی ہیں کہ ان لوگوں پر اللہ سبحانہ کا اور ان کے عقیدے کے مطابق ان کے دیوتاؤں کا بڑا فضل ہے۔ اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ اور اس کا سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ چند نہایت صحیح الدماغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوا پوری کی پوری آبادی اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ کوئی متعصبانہ ظلم و ستم سے دبانا چاہتا ہے کوئی جھوٹے الزامات اور اوچھے اعتراضات لے کر اس کے منہ آتا ہے۔ کوئی شخصیات بے رخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے کوئی مذاق اڑا کر آوازے کس کر اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ یہ استقبال جو ایک دن یا ایک ہفتہ اور ایک ماہ نہیں کئی سالوں تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا ہے۔ جب کچھ دل شکن اور مایوس کن ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ تو بس یہی صورت حال ہے۔ جس میں اللہ سبحانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہمت بندھانے کے لیے تلقین فرماتا ہے۔ کہ ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعہ وحی منکشف کی گئی ہے۔ اس کے اظہار و اعلان میں قطعاً کوئی باک نہ ہونا چاہیئے۔ تمہارے خیال میں یہ بات ہرگز نہ آئے۔ کہ فلاں بات کیسے کیوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

(۱۷) تو کیا آپ غالباً کچھ وہ باتیں جن کی وحی آپ کی طرف اللہ سبحانہٗ کی جانب سے کی جارہی ہے۔ چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ جی میں صرف اس لیے تنگ ہوں گے۔ کہ کہنے والے کہہ رہے ہیں۔ کہ اس پیغمبر پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ یا اس کی ہمرکابی میں فرشتہ کیوں نہیں آتا۔ یاد رکھیئے کہ آپ صرف لوگوں کو ان کے اعمال کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ذمہ داری آپ کی نہیں وہ تو اللہ کی ہے۔ مشرکین شرک و بت پرستی کی تردید سے بہت غیظ کھاتے تھے۔ مشرکانہ خرافات پر جس قدر ان کی تحقیق اور تجہیل کی جاتی۔ اس قدر ان کے غصے کی آگ بھڑکتی تھی۔ کبھی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو اس معاملے میں ذرا ڈھیلا کر دیں۔ اور اس سب سے بڑے اور بنیادی مسئلہ کی تبلیغ میں نرمی اور تساہل برتنے پر آمادہ کریں۔ جب ادھر سے مایوس ہوتے۔ تو محض دق کرنے کو عجیب بیہودہ فرمائشیں کرنے لگتے۔ مثلاً یہ کہ آپ سچے ہیں اور منصب رسالت پر مامور ہو کر آئے ہیں۔ تو آپ کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کے یہاں سے مال و دولت کا بڑا خزانہ آنا چاہیئے تھا یا آسمان سے ایک فرشتہ آتا جو آپ کے ہمراہ تصدیق کے لیے ہر طرف جاتا گویا جب آپکے منوانے کے لیے نہ مادی طاقت ساتھ ہے نہ روحانی پھر ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ آپ ان بیہودہ فرمائشوں سے سخت مغموم اور دلگیر ہوتے تھے۔ ممکن ہے کبھی ایسا خیال بھی آتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے۔ تردید کی جائے مگر فی الحال نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ مفید اور مؤثر ہو۔ یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں ان کی ضد بھی کسی حد تک پوری کر دی جائے۔ تو کیا عجب ہے کہ مسلمان ہو جائیں بہرحال وہ ایسا نازک اور پُرخطر وقت تھا۔ کہ پوری دنیا باطل پرستی کے شور سے گونج رہی تھی۔ صرف ایک مقدس ہستی تھی جس کے حلقوم سے حق کی آواز نکل کر باطل کے قلعوں میں زلزلہ ڈال رہی تھی۔ آپ چاروں طرف سے موذی دشمنوں کے نرغے میں گھر رہے تھے کوئی جھٹلاتا کوئی طعن کرتا کوئی مذاق اُڑاتا۔ اس ماحول کا تصور اور اس مبلغ اعظم کی قوت قلب اور ہمت مردانہ کا اندازہ لگاؤ جس کا تمام تر اعتماد و اتکال ظاہری اسباب سے ہٹ کر اللہ سبحانہٗ کے وعدوں پر تھا۔ آپ جب محزون و دلگیر ہوتے تو صرف اپنے پروردگار کی آواز سے ہی تسلی پاتے۔ اور دنیا کے مقابلے میں تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں جن کا حاصل یہ ہے۔ کہ

ان لوگوں کی بیہودہ خرافات اور فرمائشوں کی وجہ سے اس قدر فکرمند اور غمگین نہ ہوں نہ اپنے دل میں ان لوگوں کی مراعات کا خیال لائیں۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ وحی الہٰی نے جو چیزیں آپ کو سکھلائی ہیں اور جس بے خوف وخطر تبلیغ کا آپ کو حکم دیا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو ان لوگوں کی خرافات سے تنگ دل ہو کر چھوڑ بیٹھیں۔ جب یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ پیغمبرانہ عصمت اور اولوالعزمی مانع ہے۔ تو تنگ دل ہونے سے کیا فائدہ؟ آپ کا کام صرف بھلے بُرے سے آگاہ کر دینا۔ ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں اللہ سبحانہ جس کے سپرد ہر چیز ہے۔ ان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد کیجیے۔ اور صبر واستقامت کے ساتھ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ثابت قدم رہیے۔[۱]

یہ ہیں حضرت شیخ الاسلام کے افادات۔ آیئے دوسرے شارحین قرآن نے جو یہاں واد تشریح دی ہے۔ اس سے بھی استفادہ کر لیجیے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ سبحانہ اپنے رسول کو پرشورش حالات کی سنگینی میں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے میدان میں دوچار تھے۔ تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ ان مخالفین کی باتوں سے آپ کو غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ ان کی یہ باتیں دعوت میں رکاوٹ ہونی چاہئیں شب وروز آپ کا دعوت کا کام جاری رہنا چاہیئے۔ آپ تو اللہ کی جانب سے انذار کا فرض انجام دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ سے پہلے آپ کی برادری کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا ہے۔ ان کی تکذیب کی گئی۔ ان کو تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بالآخر اللہ کی مدد آگئی۔

حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ سبحانہ اپنے رسول سے فرما رہے ہیں۔ کہ کیا آپ کچھ وہ باتیں جن کی تبلیغ کا حکم آپ کو ہوا ہے چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ اس لیے سنجیدہ ہو رہے ہیں۔ کہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ کہ اس کے پاس خزانہ کیوں نہیں۔ یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آپ کا کام پیغام الہٰی لوگوں تک پہنچانا ہے کیونکہ آپ اللہ کی جانب سے نذیر ہیں۔ آپ کا کام ڈرانا ہے۔ ان کا آیات کا مطالبہ پورا کرنا آپ کا کام نہیں۔ یہ اللہ کا

---

[۱] افادات از شیخ الاسلام

کام ہے جب چاہے گا نزول آیات فرمائے گا۔

یہ تو ہیں ارباب تفسیر، آئیے ارباب تاویل کی زبانی بھی آیت کی کہانی سن لیجیئے۔ کہ ان کے انداز تشریح کیا کہتے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں۔

منکرین حق عناد کی وجہ سے آیات کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کا پیش نہاد راہ حق کی تلاش نہیں تھا۔ اگر راہ حق کی تلاش ان کے پیش نظر ہوتی۔ تو اس کے لیے ایک ہی معجزہ کافی ہوتا قرآنی اعجاز ان کے سامنے تھا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی آیات کو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کا مطالبہ تھا۔ لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک، قلب مبارک ان کے اس رویہ سے غمگین تھا کہ دعوت کو صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ کھلم کھلا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس موقع پر اللہ سبحانہ نے فرض رسالت ادا کرنے کی تلقین کی اور بتایا کہ ان کے مذاق استہزاء، اور آیات کے مطالبہ کو نظر انداز کر دیجئے۔ اور اپنا وہ فرض ادا کیجئے جس کے لیے آپ کو روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اگر نہیں مانتے تو آپ پر ان کی ذمہ داری نہیں۔ معاملہ کو اللہ کے سپرد کیجئے۔

اسی کی تائید میں علامہ طیبیؒ نے الکشف میں یہ انکشاف کیا ہے جیسے علامہ آلوسیؒ نے روح میں نقل کیا ہے

اگر آیت پر پورا غور کرو گے۔ تو یہ حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آجائے گی کہ سورت کا موضوع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو طریق دعوت بتانا ہے۔ آغاز سورت سے انجام تک یہی انداز ہے۔ اس راہ میں آپ کو جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ تسلی کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے سلسلے میں جو حالات پیش آ رہے تھے بتایا ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو جائیے اور اعلان حق میں ذرا بھی تامل نہ کیجئے کیونکہ تم صرف نذیر ہو۔ ان پر نگہبان بنا کر نہیں روانہ کیے گئے ہو کہ ان کے مان لینے کی ذمہ داری بھی تم پر ہو۔ تدبیر کی حیثیت پر زور دے کر یہ بات بھی واضح کر دی کہ نبی و رسول اس لیے نہیں آتے۔ کہ خزانے بانٹتے پھریں یا طرح طرح کے عجائبات دکھائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہونا چاہیئے کہ انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دیں۔ اور سچائی کی راہ دکھائیں۔

دراصل آیت کا روئے سخن نبوت کے مخاطبوں کی طرف ہے۔ اور ان کی نبوت کے بارے میں غلطیوں کی اصلاح ہے۔ قرآن ان کو سمجھا رہا ہے۔ کہ نبوت اور معجزات میں کوئی تلازم نہیں۔ اور یہ آثار و

دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار اور تعلیم ہے۔ اسی لیے جب بھی معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے۔ تو اللہ سبحانہ نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی لیے محققین نے لعل کو ترجی کے لیے مان کر توقع کا مرکز مخاطبوں کو بتایا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے۔ کہ

ان کے سامنے دعوت پیش کرنے میں آپ اس قدر جان تنگ کر چکے ہیں کہ اب آپ کے مخاطب آپ سے کچھ باتوں میں ترکِ تبلیغ کی توقع رکھتے ہیں۔ (عناية القاضي)

اس لیے بنیادی بات نبوت کے بارے میں لوگوں کے ذہن کی اصلاح ہے چونکہ عام ذہن انبیاء کے بارے میں یہ تھا۔ کہ وہ براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ اسی ذہنی تحفظ کی وجہ سے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ لولا انزل علیه کنز او جاء معه ملك. قرآن نے یہاں اجمالاً اور دوسری آیات میں تفصیل سے بتایا ہے۔ کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں۔ بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور مشیت سے ہوتے ہیں۔ اگر ان کے مطالبے پر آسمان سے خزانہ آجاتا یا فرشتہ آپ کی ہمرکابی اختیار کر لیتا تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور پیش آجاتی۔ بدعقیدگی سے دب جاتے تو کہہ دیتے کہ جادوگر ہے۔ اور اگر عقیدت کا اظہار کرتے تو آپ کو مافوق البشر مان لیتے۔ دونوں باتیں منشاء الٰہی کے خلاف ہوتیں۔ اس لیے سرے سے ان کے اس جاہلانہ مطالبے کو رد کر دیا۔ اور مطالبہ کی شناعت اور رکاکت کی وجہ سے ان کو قابل خطاب نہیں سمجھا۔ بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان کو سمجھایا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدم ایمان کی وجہ سے نفس پیغام و دعوت کے اصول کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی ہے۔ بہر حال آیت قرآنی کا مدعا یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کے رویہ سے دل برداشتہ اپنے فرض کی ادائیگی پوری ہمت سے کیجئے۔ اگر آپ کے مخاطب آپ کو رسول ماننے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ آپ کسی خزانے کے مالک ہوں۔ یا کوئی فرشتہ آپ کی رسالت کی گواہی دینے کے لیے آپ کے ساتھ ہو تو ان کے ان احمقانہ مطالبوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں۔ آپ کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ منوانا نہیں ہے۔ اگر وہ اس قسم کے احمقانہ مطالبات پیش کر کے حقیقت سے روگردانی کرنا چاہتے ہیں تو معاملہ کو اللہ کے حوالہ فرمائیے۔ یہاں علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں علامہ قاشانی سے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں نے دعوت قبول کرنے کی جگہ دعوت کا استہزاء اور عناد سے مقابلہ کیا۔ اور آپ کے سامنے غلط مطالبات رکھ دیئے۔ اس سے آپ کو انقباض ہوا اور دعوت پیش کرنے میں انبساطی حالت نہ رہی کیونکہ سامعین

کی بات کو سننا متکلم میں نشاط اور امنگ پیدا کرتا ہے۔ اور جب متکلم کو محسوس ہوتا ہے کہ ذہن میں صلاحیت نہیں ہے تو اس کا بات کرنے کو جی نہیں چاہتا اس پر ایک بے چینی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر دلیری دی کہ آپ تو نذیر ہیں۔ انذار کیجئے اس کے دو گونہ فائدے ہیں۔ مان لیں گے اور نہیں مانیں گے تو ان پر حجت تمام ہو جائے گی۔ اتمام حجت کے بعد یہ لوگ ملزم ہوں گے ملزم کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

(۱۸) اعجاز قرآن کا انکار

ہاں کیا وہ یہ کہتے کہ یہ اللہ کی وحی نہیں ہے۔ بلکہ اس مدعی نبوت کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو۔ بلا لو۔ اگر تم سچے ہو۔ مسلمانو! اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کریں تو جان لو کہ قرآن اللہ کی وحی اور اس کے علم سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے۔ بولو کیا تم سب فرماں بردار بنو گے۔ یعنی فرمائشی معجزات طلب کرتے ہیں جن کا دیا جانا مصلحت نہیں ہے۔ اور یہ جو سب سے بڑا معجزہ قرآن ان کے سامنے ہے۔ اسے مانتے نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ تو معاذ اللہ تمہاری بنائی ہوئی گھڑنت ہے۔ اس کا جواب دیا کہ تم بھی آخر عرب ہو فصاحت و بلاغت کا دعویٰ رکھتے ہو سب مل کر ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کر دو اور اس کام میں مدد دینے کے لیے ساری مخلوق کو بلکہ ان معبودوں کو بھی بلا لو جنہیں خدائی میں شریک سمجھتے ہو اگر نہ کر سکو اور کبھی نہ کر سکو گے تو سمجھ لو کہ ایسا کلام خالق ہی کا ہو سکتا ہے۔ جن کا مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز رہ جائے۔ تو یقیناً یہ وہ کلام ہے جو اللہ سبحانہٗ نے اپنے علم کامل سے پیغمبر پر اتارا ہے۔ بے شک جس کے کلام کا مثل نہیں ہو سکتا اس کی ذات وصفات میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ ایسا بے مثال کلام اسی بے مثال خدا کا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ کیا ایسے واضح دلائل کے باوجود مسلمان ہونے اور اللہ سبحانہٗ کا حکم بردار بننے میں کسی چیز کا انتظار ہے۔[1]

قرآن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ خود قرآن ہی نے بتایا ہے۔ کہ

---

[1] افادات از شیخ الاسلام

قرآن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الٰہی سے معجزہ عطا ہوا ہے۔ اہل مکہ نے جب معجزے کا مطالبہ کیا۔ تو اللہ سبحانہٗ نے ان کے اس مطالبہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

اولم یکفہم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیہم

کیا ان کو یہ معجزہ کافی نہیں ہے۔ کہ ہم نے آپ پر وہ کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسرے نبیوں کے معجزات کے مقابلے میں اپنی اسی آسمانی وحی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے۔ انبیاء میں سے ہر نبی کو اللہ سبحانہٗ نے اس قدر معجزات دیئے ہیں۔ جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے ہیں۔ لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا ہے وہ قرآن ہے۔ جو مجھے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ روزِ قیامت میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر نبی کو معجزہ عطا ہوا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ قرآن ملا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اول سب نبیوں کے معجزات عملی تھے۔ جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علمی تھا۔ دوسرے سب نبیوں کے معجزات وقتی اور عارضی تھے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علم یعنی قرآن عزیز قیامت تک دنیا قائم اور باقی رہے گا۔ تیسرے چونکہ دوسرے انبیاء کے معجزے وقتی اور عارضی تھے۔ اس لیے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا۔ برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے۔ اس لیے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

چوتھے یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے معجزات میں سے صرف قرآن کا معجزہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کی اللہ سبحانہٗ نے کائنات کو تحدی کی ہے۔ اور اعلان عام کیا ہے۔ کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے۔ اور پھر خود ہی یہ پیشن گوئی بھی کردی ہے۔ کہ پوری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز رہے گی۔

اس موقعہ پر سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ نے جو فکر انگیز بات لکھی ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ اسے جی لگا کر پڑھا جائے۔

غور کیجئے کہ ایک اُمی شخص جو اُمیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا۔ اس نے ہوش

سنبھالا تو گرد و پیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی۔ جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا۔ وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے ناآشنا تھا۔ گزشتہ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کا ایک حرف بھی اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علماء اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اپنائی۔ اصول، قانون، مبادی، اخلاق، محاسن اعمال کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم و حکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اس کا گزر نہیں ہوا۔ اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دور پورے کرتا ہے۔ کہ دفعتہً غار حرا سے نکل کر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ بن جاتا ہے ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ اصول قانون، مبادی اخلاق اور محاسن علم و عمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزم کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلام ربانی کے پردہ میں علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس سے زیادہ اعجاز قرآن کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

دنیا میں صرف قرآن ہے۔ جو قانون و شریعت بھی ہے۔ اور اخلاق و موعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے۔ اور دیگر کتب اربعہ کی صفات کا حامل بھی ہے۔ خطابت بھی ہے۔ اور استدلال و فکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے۔ اور حکمت و سزا ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف و تفسیر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکے ہیں۔ اس کی بقا و حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس بعد بھی اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کا محتاج نہیں۔ کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں وہ اسی زبان، انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے۔ جس میں دست قدرت نے اسے ڈھالا تھا۔ اور جبرئیل امین ؑ نے اسے اتارا تھا۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ کیا یہ اعجاز نہیں ہے؟

یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔ کہ قرآن عزیز اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی کوئی دوسری آسمانی کتاب حریف نہیں بن سکتی ہے۔ کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معانی کے لحاظ سے وحی ہیں چنانچہ نہ خود ان کتابوں کو اور نہ ان کتابوں کے ماننے والوں کو اس

کا دعویٰ ہے ۔ اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبادت کے لحاظ سے معجز کہا ہے ۔ اسی لیے یہ وہ اصل الفاظ اور جس کے قالب میں وحی موسوی تورات اور عیسوی انجیل نے ظہور کیا تھا ۔ مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہوگئی ۔ تورات کی اصل زبان عبرانی زبان تھی ۔ وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی ۔ اور اس نے آرامی اور سُریانی زبانوں کا قالب اختیار کر لیا ۔ اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیرؑ نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا ۔ انجیل کے متعلق ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی ۔ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی ۔ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے ۔ مگر ظاہر ہے یہ وہ یونانی نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین میں بولتے تھے ۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا کیسے دعویٰ ہو سکتا ہے ۔ برخلاف اس کے کہ دنیا میں وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے ۔ چنانچہ قرآن عزیز کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہ بھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا ۔ وہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک ہے ۔ اس لیے اس کے الفاظ ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں ۔ اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی [1]

بہر حال قرآن عزیز نبوت محمدیہ کا معجزہ ہے ۔ اور معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دعویٰ نبوت کی دلیل ہے ۔ مخالفوں کے سامنے یہ دلیل اس طرح پیش کی گئی ہے کہ میں اللہ کا نبی ہوں ۔ اور یہ میرے پاس اللہ کی کتاب ہے ۔ یہ میری ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ وحی کے ذریعے اللہ کی روانہ کردہ ہے یہ میرا علم نہیں بلکہ تمہارا اپنا علم ہے ۔ اور تم اللہ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو ۔ ام یقولون افترٰہ یعنی وہ صرف خزانہ ہونے اور فرشتہ کی ہمرکابی ہی کا معجزہ طلب نہیں کر رہے ۔ بلکہ وہ تو اعجاز قرآن کا بھی یہ کہہ کر انکار کر رہے ہیں کہ یہ اللہ سبحانہ کا کلام نہیں اس شخص نے قرآن کو اللہ کا کلام کہہ کر اللہ پر بہتان باندھا ہے ۔ یہ تو خود اسی کا ساختہ و پرداختہ ہے ۔ یہ انداز تعبیر اظہار تعجب کے لیے ہے ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساختہ و پرداختہ بتانا ایک نہایت عجیب بات ہے ۔ بالخصوص ان لوگوں کی جانب سے جو عربی ہوتے ہیں ، عربی زبان میں ، وطن اور زمانہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ کے ہم وطن ہم زبان اور ہم زمانہ ہوں بلکہ کتابت ، قرأت ، شعر گوئی ، خطابت اور انداز سخن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے زیادہ ہوں - ان کی زبان پر اس بات کا آنا بڑا ہی عجیب ہے ۔ اس لیے فرمایا کہ اگر صورت حال یہی ہے کہ قرآن اللہ سبحانہ کی وحی نہیں ہے ۔ بلکہ میری گھڑنت ہے ۔ تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔ اس کا فیصلہ خود تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ آؤ تم بھی فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات دس سورتیں گھڑ کے لے آؤ ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا ۔

یہ تحدی قرآن میں ایک طرح نہیں کئی طرح ہوئی ہے ۔

سب سے پہلے مکہ میں سورۃ الاسرا میں یہ تحدی پورے قرآن کے بارے میں ہے ۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا

آپ اعلان کر دیجئے کہ اگر انسان اور جن سب چاہیں کہ اس قرآن کی مانند کوئی کلام پیش کریں تو کبھی پیش نہ کر سکیں گے ۔ اگرچہ باہم ایک دوسرے کی مدد کریں ۔

یہ سورت مکی ہے ۔ اس کے آغاز میں اسرار کا واقعہ ہے ۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے پہلے پیش آیا ۔ لیکن آغاز وحی کے بعد کس حال میں پیش آیا ۔ اس کے بارے میں حتماً کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عرب میں اسلام سے قبل تاریخ اور تدوین کا کوئی وجود نہ تھا ۔ ہجرت سے ایک، دو، تین، چار یا پانچ سال پہلے پیش آیا ۔ امام بخاری نے الجامع الصحیح میں اگرچہ کوئی تاریخ نہیں بتائی لیکن ترتیب میں بیعت عقبہ سے متصلاً پہلے واقعہ معراج کو بیان کیا ہے ۔ اور سب جانتے ہیں ۔ کہ بیعت عقبہ پہلے اعلان نبوت سے گیارہویں سال اور دوسری بارہویں سال ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ معراج اس سے پہلے ہوا ۔ اور سورۃ الاسراء نزول معراج کے بعد ہوا ۔ اس میں منکرین حق کے سامنے قرآن کے بارے میں یہ تحدی پیش کی گئی ۔ کہ قرآن وہ عظیم کتاب ہے ۔ کہ اس کی مثال پر جن وانس کی مجموعی قوت بھی قادر نہیں ہے ۔

پھر مکی زندگی میں سورہ ہود نازل ہوئی ۔ اس میں پورے قرآن سے ہٹ کر دس سورتوں کی تحدی پیش کی گئی ۔ فأتوا بعشر سور مثلہ ۔

اس کے بعد مکی زندگی ہی میں سورہ یونس نازل ہوئی زمانہ نزول کے بارے میں روایت تو کوئی نہیں ملی ہے ۔ مگر سورۃ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے ۔ اس میں دس سورتوں سے ہٹ کر ایک سورۃ کی تحدی پیش کی گئی ہے ۔

اس کے بعد سورہ طور میں اس سے کم تر درجہ کی آخری تحدی ہے جو اہل مکہ کے سامنے آئی وہ یہ ہے فلیأتوا بحدیث مثلہ

پھر اس کے بعد بقرہ میں اس تحدی کو مدنی زندگی میں پوری قوت سے مشرکین، یہود اور عیسائیوں کے سامنے دہرایا گیا۔ اور پیشین گوئی کی گئی ہے۔ کہ اس کا جواب ممکن ہی نہیں ہے۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا۔ اور ہے بھی یہ عقلی بات۔ کیونکہ اگر خالق کائنات ہے اور رب الارباب ہے تو جیسے تکوین و تخلیق میں پوری انسانیت مل کر ایک مکھی نہیں بنا سکتی تو تشریع میں اس کی کتاب جیسی کتاب بھی نہیں ہو سکتی ہے۔

فرمایا کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ قرآن اللہ سبحانہٗ کی وحی نہیں ہے۔ بلکہ میری بنائی ہوئی ہے۔ تو اس جیسی تم بھی صرف دس بنا کر لے آؤ۔ اور وادعوا من استطعتم من دون اللہ۔ اللہ سے ورے جن کو اس معاملہ میں اپنی امداد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو ان کنتم صادقین اگر تم اپنے اس دعوے میں صداقت رکھتے ہو۔ کہ یہ میری ساختہ و پرداختہ ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ فان لم یستجیبوا لکم۔ یہاں ضمیر مخاطب جمع لے کر آئے ہیں۔ یا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کی خاطر لائے اور یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ کو اور صحابہ کرام کو مخاطب کیا ہے۔ کہ اگر یہ منکرین حق آپ کی بات نہ مانیں۔ اس میں اشارا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس معاملہ میں نبوت کا ساتھ ایسے ہی دینا چاہیئے جیسے دین کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کا یہ طرز عمل ان کے ایمان میں رسوخ کا فائدہ دے گا۔ اور کچھ نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے۔ کہ لم یستجیبوا لکم میں ضمیر غائب کا مرجع وہ ہیں جن کو اس معاملہ میں مدد کے لیے اور ہاتھ بٹانے کے لیے کہا ہے۔ یعنی من استطعتم۔ اس صورت میں منکرین حق مخاطب ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اگر وہ لوگ جن کو تم اس کام میں مدد کے لیے بلاؤ گے۔ تمہاری بات کو پذیرائی نہ دیں تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا تمہاری عبادتوں کا مستحق کوئی نہیں اب بتاؤ کیا تم اسلام کو اپناؤ گے۔

آیت قرآنی کی تشریح کا ایک انداز یہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے۔ تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیئے۔ لہذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے خود اسے تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ تم ایک ایسی کتاب کی دس سورتیں تصنیف کرکے دکھاؤ لیکن اگر چیلنج کے باوجود بھی تم سب مل کر اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ یقیناً بالکل صحیح ہے۔ کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں، بلکہ انزل بعلم اللہ۔ اللہ کے علم کی آغوش میں نازل ہوئی ہے۔ اور میری یہ دعوت بھی بالکل درست ہے کہ لا الہ الا ھو۔ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بتاؤ کیا اس امر واقعی

کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو۔

پوری آیت پر ایک جامع نظر

آئیے اب پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔ کیا آپ حالات کی پُر آشوبی، رنگینی کی وجہ سے منکرین کی طرح اس توقع کو پورا کریں گے، قرآن کے کچھ حصے کو چھوڑ دیں گے۔ پھر کیا آپ اس لیے غمگین اور فکر مند ہیں کہ آپ کے مخاطب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ کے پاس خزانہ ہو یا آپ کے ساتھ فرشتہ ہو تو یاد رکھیئے کہ آپ اللہ کی جانب سے صرف نذیر بن کر آئے ہیں۔ یعنی آپ کا کام ان کو ان کے اعمال کے نتائج سے خبردار کرنا ہے۔ یا آپ اس لیے غمگین ہیں کہ وہ قرآن کو اللہ کی وحی نہیں مانتے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ یہ تو آپ کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ اگر غم یہ ہے تو اس کا علاج یہ ہے۔ کہ آپ ان کے دفاع کی فکر نہ کیجئے۔ بلکہ ایک حملہ آور کی حیثیت سے ان سے مطالبہ کیجئے۔ فأتوا بعشر سور مثله مفتريات کہ اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ یعنی اگر میں نے بنائی ہے تو تم بھی بنا کر لے آؤ اور اس معاملہ میں جن کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو۔ بلا لو۔ اگر وہ آپ کے مطالبہ کو پورا نہ کریں گے تو نتیجہ میں دو یا تین کہہ کر سامنے آجائیں گے۔ اول یہ کہ کتاب علم الٰہی ہے۔ اور جب علم الٰہی ہے تو آپ کی رسالت ہی برحق نہیں، بلکہ رسالت کی دعوت ان لا تعبدوا الا اللہ۔ یہی ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا
لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا
النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتے ہیں۔ تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دیتے ہیں۔ اس میں ان کو گھاٹے میں نہیں رکھا جاتا ہے[۱۹] یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کے لیے آخرت والی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے یہاں کاریگری کی ہے سب اکارت ہو جائے گی اور جو اعمال وہ کرتے رہے ملیامیٹ ہو جائیں گے[۲۰]

مفردات کے معانی

نوف یہ توفیہ سے مضارع مجزوم ہے۔ اس کا مادہ وفی ہے اس کا معنے پورا ہونے کے ہیں۔ اور توفیہ کے معنے آہستہ آہستہ پورا کر دینے کے ہیں۔ اس سے ثلاثی مزید کے چند باب آتے ہیں۔ باب تفعیل توفی، توفیا باب افعال اوفی، یوفی، ایفار باب مفاعلہ وافی، یوافی، موافاۃ باب تفاعل توافی، یتوافی،

توانی آتے ہیں۔ توفیہ کے معنے پورا پورا دینا جیسے کہ یہاں ہے نوف الیھم اعمالھم یا دوسری جگہ توفون ہے استیفار کے معنے پورا پورا چاہنا جیسے اذاکتالوا علی الناس یستوفون اور توفی کے معنے پورا پورا لینے کے ہیں۔ موت اس کے معنے نہیں بلکہ اس کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ تین طرح ہونا۔ ہوش چھین لینا، روح کھینچ لینا، روح اور جسم دونوں لے لینا۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ توفی کے معنے ہیں۔ کسی چیز کو پورا پورا لے لینا اور موت اس کی ایک قسم ہے۔ علامہ ابوالبقا کلیات میں رقم طراز ہیں۔ توفی یعنی موت کے معنے میں، یہ عام لوگوں کا محاورہ ہے۔ اور امام راغبؒ فرماتے ہیں موت اور نیند کو بھی توفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انھوں نے انداز تعبیر میں وقد عبر بولا ہے اور اس لیے بولا ہے کہ موت اور نیند کو کوئی توفی کے معنے نہ سمجھے۔ بہرحال یہاں باب تفعیل سے نوف آیا ہے۔ اس کے معنے پورا دینا ہیں۔ قرآن میں ہے ووفیت کل نفس۔ ہر جان کو پورا پورا دیا جائے گا۔

ایک اہم سوال کا جواب

پیچھے پڑھ آئے کہ دنیا کی زندگی پوری کی پوری ابتلائی ہے۔ یہاں رزق میں بسط اور قبض دونوں کے ذریعے ابتلاء ہو رہا ہے منکرین حق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی کو آپ کی رسالت کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ لولا انزل علیہ کنز سے معلوم ہو رہا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ چونکہ دنیوی وسائل کے اعتبار سے ہم ان سے برتر ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے یہاں بھی ہمارا مرتبہ ان سے اونچا ہے۔ پھر ہمیں اللہ کے عذاب سے کیوں ڈرایا جاتا ہے۔ دولت وثروت کا یہ انعام اللہ کے یہاں ہماری مقبولیت کی نشانی ہے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے مقبول ہوتے تو اس کے نتیجے میں ان کو خوشحال ہونا چاہیئے اور ہمیں بدحال۔ ان آیتوں میں اسی سوال کا جواب ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ اگر انکار و سرکشی میں انہیں دنیوی فوائد مل رہے ہیں۔ تو صرف اتنی بات دیکھ کر مغرور نہ ہو جائیں۔ اور نہ اہل ایمان اس پر متعجب ہوں۔ اللہ سبحانہٗ نے دنیا کے لیے قانون ایسا ہی بنایا ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ رکھتا ہے۔ اور جیسا کچھ عمل ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ اگر ایک شخص چاہتا ہے کہ ایک شاندار مکان اسے رہنے کے لیے ملے۔ اور وہ اس کے لیے ان تدابیر کو عمل میں لاتا ہے۔ جن سے یہاں مکان بنا کرتے ہیں۔ تو ضرور ایک عالیشان مکان بن کر تیار ہو کر رہے گا۔ اور اس کی کوئی اینٹ بھی صرف اس لیے جمنے سے انکار

نہیں کرے گی ۔ کہ ایک کافر کے ہاتھ سے لگ رہی ہے ۔یعنی دنیا اور اس کی ٹیپ ٹاپ نیک اعمال کے صلہ کے طور پر نہیں ملتی ہے ۔ دنیا تو نیک و بد دونوں کو ملتی ہے ۔ رزق کے بارے میں انسان کی ہمیشہ سے گمراہی یہ رہی ہے ۔ کہ رزق کی بساطت کو انسان نے اکرام اور رزق کے قدرے بچانے کو اہانت قرار دیا ہے ۔قرآن نے دونوں کے بارے میں کلا فرمایا ہے ۔یعنی ایسا ہرگز نہیں ہے ۔رزق کی بساطت اور قدر کا دارومدار تو انسان کی تگ و دو دوڑ دھوپ اور محنت و جانفشانی پر ہے ۔سب کو ملتا ہے اور اپنے اپنے عمل کے مطابق ملتا ہے ۔اور یہ اللہ کا قانون ہے ۔

(۱۹) جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کو چاہتے ہیں ۔تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دیتے ہیں ۔اور اس میں ان کو گھاٹے میں نہیں رکھا جاتا ہے ۔یعنی ایسے واضح ثبوت کے بعد جو قرآن پر ایمان نہیں لاتا ۔یا اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتا بلکہ دنیا کی چند روزہ زندگی اور فانی ٹیپ ٹاپ ہی کو قبلہ مقصود بنا کر عملی جدوجہد کرتا ہے ۔ اگر بظاہر کوئی نیک کام مثلاً خیرات وغیرہ کرتا ہے ۔ تو اس سے بھی آخرت کی بہتری اور اللہ سبحانہ کی خوشنودی نہیں مقصود ہوتی ہے ۔محض دنیوی فوائد حاصل کرنا پیش نظر ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی بات خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ اور یا مشرکین یا منافقین اور یا دنیا پرست ریاکار مسلمان ۔تبلادیا کہ دنیا ہی میں ان کے اعمال کا بھگتان کردیا جائے گا ۔اور جو اعمال اور کوششیں وہ حصول دنیا کے لیے کریں گے ان کی کمیت اور کیفیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اور حکمت و علم سے جس قدر مناسب جانے گا اور دینا چاہے گا عطا فرمائے گا ۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر جو خیرات وغیرہ کے کام کرے اس کی یہ فانی اور صوری حسنات جو روح ایمان سے یکسر خالی ہیں ۔دنیا میں رائیگاں نہیں جاتی ہیں ۔ان کے بدلہ میں اللہ سبحانہ تندرستی مال اولاد عزت و حکومت وغیرہ دے کر سب کھاتہ بے باق کردیتا ہے ۔مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے ۔جس کافر کے لیے جس درجہ کی سزا ہو چکی ہے ۔وہ کبھی اس سے ٹلنے والی نہیں ہے ۔

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد
ثم جعلنا له جهنم يصلاها مذموما مدحورا ۔

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلدی دے دیں ہم اس کو اسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں ۔پھر ٹھہرا دیا ہم نے اس کے لیے دوزخ کو داخل ہوگا اس میں اپنی بُرائی سُن کر دھکیلا جائے گا ۔ (بنی اسرائیل)

دنیا پرست عالم متصدق اور مجاہد کے حق میں جو وعید آئی ہے ۔اس کا حاصل بھی یہی ہے ۔کہ ان سے

حشر میں کہا جائے گا۔ کہ جس غرض کے لیے تم نے علم سکھلایا یا صدقہ و جہاد کیا۔ وہ دنیا میں حاصل ہو چکا ہے۔ اب ہمارے پاس تیرے لیے کچھ نہیں ہے۔ فرشتوں کو حکم ہو گا۔ کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔ (اعاذ اللہ) [1]

اصل میں باتیں دو ہیں۔

ایک یہ کہ کافروں کی دنیا میں دنیا کی خاطر جو محنتیں ہو رہی ہیں ان محنتوں کے ثمرات اور نتائج کا دنیا میں ان کو ملنا۔

دوسرے یہ کہ کافروں کی دنیا کی زندگی میں کی ہوئی نیکیوں کا حالت کفر میں اجر ملنا

آیت قرآنی کا موضوع دوسری بات نہیں پہلی بات ہے۔ یعنی کافروں کو دنیا میں اموال، دولت عزت اور اقتدار مل رہا ہے۔ یہ ان کے مقبول ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ تو اللہ سبحانہ کے اس قانون کی وجہ سے ہے۔ کہ دنیا میں جو بھی محنت کرتا ہے۔ اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ ضرور ہے۔

آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے۔ کہ حیات دنیا اور اس کی زینت کو حاصل کرنے کو جو لوگ اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنا لیتے ہیں اور اسی راہ میں سعی و عمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں ان کو اپنے عمل کے نتیجے سے محروم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جد و جہد سعی و عمل کے مطابق نتائج سے اللہ سبحانہ ان کو سرفراز کرتا ہے۔

قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ آج اس کی تفسیر ان ملکوں کے باشندوں کے طرزِ عمل سے ہو رہی ہے۔ جنہوں نے اسی حیات دنیا کی زینت بناؤ سنگھار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔ اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج ان کے سامنے آ رہے ہیں۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر ان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ کہ ان کے دلوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ سبحانہ کو وہ بھول جاتے ہیں۔ اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو اس کے پیچھے روانہ ہو جائیں اور جس طرح بن پڑے اس خواہش کو پورا کریں۔ اس کی تصدیق بھی ان ممالک کے باشندوں کی زندگیوں سے ہو رہی ہے۔ جو الدنیا و زینتہا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی و عمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

---

[1] افادات از شیخ الاسلام

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

جو اپنے وجود کا مقصد حیات الحیاۃ الدنیا کو بنائے ہوئے ہیں ان کے متعلق قرآن میں سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں پڑھ چکے ہیں۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا مانشاء لمن نرید
جو مقصود بناتا ہے الدنیا کو تو ہم جلد عطا کرتے ہیں دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زیر تشریح آیت میں تو فرمایا ہے نوف الیھم اعمالھم وھم فیھا لا یبخسون یعنی ان کے اعمال کے نتائج اسی زندگی میں پورے پورے دیتے ہیں اور اس میں کمی نہیں کی جاتی۔ اس سے تو معلوم ہو رہا ہے۔ سب کو دیا جاتا ہے اور سب کچھ دیا جاتا ہے۔ لیکن بنی اسرائیل میں یہ قید لگا دی ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا خواہوں میں سے ہر ایک کی ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور سورہ ہود کی آیت بتا رہی ہے کہ ان کو پورا پورا دیا جاتا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بظاہر دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورہ ہود والی آیت میں سعی و عمل کے نتائج کے بارے میں قانون بتایا گیا ہے۔ یعنی محنت و کوشش کسی کی رائیگاں نہیں جاتی نوف الیھم اعمالھم سے صراحتا اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر نتائج مرتب ہوتے ہیں برخلاف بنی اسرائیل والی آیت کے۔ اس میں صرف ان لوگوں کا حال ہے۔ جو صرف آرزو کرتے ہیں۔ اور دنیا خواہوں میں بلا شبہ ایک بڑی تعداد ایسوں کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنایا ہے لیکن محنت و جفاکشی ان سے نہیں ہو سکتی ان کے متعلق فرمایا جتنا چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔

آیئے شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی کچھ تشریح سُن لیجئے۔ مشہور مفسر قرآن ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ

جو لوگ اپنے عمل کے ذریعے دینوی زندگی، اس کا سامان آرائش و زینت کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کی اجرتیں دنیا میں پوری پوری دے دیتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی ہے۔

اسی آیت کی دوسرے شارحین قرآن نے دوسرے انداز پر بھی تشریح کی ہے۔ یعنی کافروں کی دنیا کی زندگی میں کی ہوئی

نیکیاں بحالت کفر اکارت نہیں جاتی ہیں ۔ ان کو دنیا میں اجر ملتا ہے اور یہ اجر دنیا میں مال، اولاد، عزت اور اقتدار کی صورت میں ملتا ہے ۔ حافظ ابن کثیرؒ اور بیشتر شارحین قرآن کا میلان یہی ہے ۔ علامہ بقاعیؒ نے یہاں یہ لطیف بات لکھی ہے ۔

بداعمالیوں کے باوجود ان کی خوشحالیاں اور خوشحالیوں میں مہلت بخشیاں عذاب کی تاخیر کا سبب بتا رہی ہیں ۔

(۲۰) آخرت میں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ جو کچھ انہوں نے یہاں کاریگری کی ہے سب اکارت ہو جائے گی ۔ اور جو اعمال وہ کرتے رہے ہیں ۔ ملیا میٹ ہو جائیں گے ۔ یعنی ان اعمال پر دوزخ کے سوا اور کسی چیز کے مستحق نہیں ۔ کفار ابدی طور پر اور ریاکار مسلمان محدود مدت کے لیے ۔ ہاں اللہ سبحانہٗ بعض مومنین کو محض اپنے فضل و کرم سے معاف فرما دے وہ الگ بات ہے دنیا میں جو کام دنیوی اغراض کے لیے کیے تھے آخرت میں پہنچ کر ظاہر ہو گا ۔ کہ وہ سب برباد ہو جائیں گے ۔ اور ریاکاری وہ دنیا پرستی کے سلسلے میں بظاہر جو نیکیاں کمائی تھیں ۔ اب یوں ہی خراب ہو گئیں یہاں کوئی کام نہ آئی ۔ [1]

یہ تشریح عام شارحین کے مطابق اس بنیاد پر ہے کہ آیت قرآنی من کان یرید الحیاۃ الدنیا کا موضوع دنیا میں کیے ہوئے اچھے اعمال کافروں اور دنیا پرستوں کے آخرت میں رائیگاں ہوں ۔ ہم پہلے بتا آئے ہیں ۔ کہ آیت قرآنی کا موضوع یہ اور صرف یہ ہے کہ کافروں کی دنیا میں دنیا کی خاطر محنتیں دنیا میں بے نتیجہ نہیں ہیں ۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی اپوزیشن وہ کافرانہ زندگی ہے جو دن رات دنیا میں محنتیں کر رہی ہے ۔ ان کو بھی بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی خاطر ان کی کی ہوئی محنتوں کے دنیا میں تو قانون الٰہی کے مطابق نتائج ہیں مگر آخرت کی زندگی میں یہ سب اعمال بے نتیجہ اور صفر ہیں ۔ وہاں ان اعمال کے ذریعے دوزخ کا آلاؤ تیار ہوتا ہے یعنی دنیا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے ان کے سامنے آجاتے ہیں ۔ لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان متعلق اعلان ہے کہ آخرت میں ان کے لیے صرف آگ ہے ۔ اور ان کا سارا کیا دھرا تہس نہس ہو کر رہ جائے گا ۔ اور ان کے سارے اعمال بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گے مسلمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو ان کی اطاعت اور پیروی سے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو زندگی کا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جائے گا۔ ان دنیا پرستوں کی دولت، ان کی عزت، ان کی شہروں میں سربلندی، تجارت پر ان کا قبضہ اور اقتدار پر ان کا غلبہ بھی الحیاۃ الدنیا وزینتھا ہے۔ ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا چہرہ الا الذین صبروا کے ذریعہ پیش کیا ہے اور زینۃ الحیاۃ الدنیا کے نصب العین بنانے والوں کے سامنے ان کی سعی وعمل کے نتائج جیسے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح قرآن نے یہاں صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل دی ہے۔

لھم مغفرۃ واجر کبیر پہلا نتیجہ تو اس کا یہی ہے۔ اور دوسرا نتیجہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ بتایا ہے کہ ان اللہ مع الصابرین ۔ مسلمانوں کی زندگی معاشی اعتبار سے کافروں کے مقابلے میں کم سے کم تر تھی۔ اسی معیشت کے سلسلے میں مسلمانوں کو جس صبر کی تلقین کی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانو! جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی تمہیں غمگین رکھتی ہے۔ اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقعہ پر امداد لو گے تو تمہیں ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود اللہ سبحانہ کی محبت و رفاقت مل جائے گی۔ جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے۔ جس کا مقابلہ دنیا کی کسی چیز سے بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ سوچیے اللہ سبحانہ ہی جس کے ساتھ ہو جائے اس نے کیا کچھ نہیں پالیا صبر کرنے والوں ہی کو قرآن میں یہ بشارت سنائی گئی ہے۔

اولائک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولائک ھم المھتدون

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات آتی ہے اور رحمت۔ اور یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے راہ پالی ہے۔

یہ سب اللہ سبحانہ کی معیت کے نتائج ہیں اللہ کی معیت ان کو صبر کی بدولت ملی ہے۔ آخر جس کے ساتھ اللہ سبحانہ ہو جائے تو اس پر اگر اللہ کی طرف سے صلوات کا نزول ہو، خدائی نعمتوں سے وہ مالامال ہو اور ہدایت کی راہ زندگی میں اسے مل جائے تو سوچیے کہ اس کے سوا اور دوسری بات کیا ہے جس کا امکان ہو؟

دونوں کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔ ایک طرف وہ دنیا پرست ہیں جن کا نصب العین زینۃ الحیاۃ الدنیا ہے جن کے بارے میں اعلان ہے نوف الیھم اعمالھم کہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج پورے پورے ملیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ایمان وعمل صالح کا سرمایہ رکھتے ہیں۔ یہ بس۔ یہ ہیں سب

کچھ دیکھ رہے ہیں۔ مگر صابرین ہیں۔ ان صابرین سے بھی قرآن میں کہا گیا ہے۔ کہ دنیا پرستوں کو ان کی محنتوں کے نتائج پورے پورے ملیں گے۔ اسی طرح صبر کرنے والوں کو بھی اللہ سبحانہ' صبر کے پورے پورے نتائج سے مالامال کرے گا۔ انما یوفی الصابرین اجرھم بغیر حساب۔ خبر نہیں لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہوتی ہے۔ جس عمل کی وجہ سے لامحدود طاقتوں والے اللہ سبحانہ' کی معیت میسر آئی ہے۔ صلات اور اللہ کی رحمتوں سے جو عمل آدمی کو ڈھانپ دیتا ہو۔ جس کی روشنی میں سیدھی راہ پر عمل کرنے والے بڑھ جاتے ہوں یقیناً ان کا غیر محدود اجر اور اجر کبیر ہی تو ہے۔ جو ان شکلوں میں ان کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

خبر نہیں لوگ قرآن کو قرآن سے کیوں نہیں سمجھتے۔ قرآن ہی میں ایک دوسرے موقعہ پر دنیا پرست اور خدا پرست کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

فخرج علی قومہ فی زینتہ قال الذین یریدون الحیاۃ الدنیا یالیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظ عظیم

ایک روزہ اپنی قوم کے سامنے پورے ٹھاٹھ سے نکلا جو لوگ دنیا پرست دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو ملا ہے وہ تو بڑا ہی بانصیب ہے۔

یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ مخاطب ہیں جن کا یہاں چہرہ من کان یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں یریدون الحیاۃ الدنیا اور حضور کے مخاطبوں کے لیے یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا کی تعبیر آئی ہے۔ دیکھ لیجئے دونوں میں کیسی ہم آہنگی ہے۔

قال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحا ولا یلقھا الا الصابرون

علم والوں نے ان سے کہا افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان وعمل صالح کی مایہ رکھتا ہو اور یہ دولت تو صرف صابرین کو ملتی ہے

یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخاطبوں کا حال ہے جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کرلیا اور دنیا کی زندگی میں معاشی بدحالی اور غریبی کی تصویر میں مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں سرتاسر

زحمت اور نعمت ہیں۔ اگر ایمان وعمل صالح کی آغوش میں نہ ہوں۔ اصل چیز تو ایمان اور عمل صالح ہے۔ دولت اور سرمایہ کو دیکھ کر اس کی تمنا نہ کرو بلکہ صبر کرو بلکہ صبر کرو۔ صبر کے نتائج اس سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہی بات یہاں صحابہ کا چہرہ پیش کرتے ہوئے فرمائی الا الذین صبروا وامنوا وعملوا الصالحات اولائك لهم مغفرة واجر كبير۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓـئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ ۚ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۷﴾

کیا بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اس کی طرف سے آگیا ہو۔ اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوائی کرتی ہوئی اور سراپا رحمت آچکی ہو۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں[۲۱] اور مختلف لوگوں میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ تو دوزخ کی آگ اس کے وعدہ کی جگہ ہے[۲۲] لہٰذا تم اس دعوت کی کامیابی کے بارے میں کسی طرح کا شک نہ کرو بلاشبہ یہ تمہارے رب کی جانب سے ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے لیکن لوگوں کی اکثریت نہیں مانتی ہے[۲۳]

مفردات کے معانی

بینہ ۔ یہ بان یبین سے صفت کا صیغہ ہے اس کے معنے ہیں۔ واضح صاف اور کھلی۔ دلیل کو بھی

وضاحت کی وجہ سے بینہ کہا جاتا ہے۔ چاہے عقلی ہو یا نقلی۔

احزاب۔ گروہ اور ٹولیاں حزب کی جمع ہے۔

ہدایت وضلالت کا تقابلی مطالعہ

کائنات مجموعہ اضداد ہے ہر جگہ قانون تزویج رائج ہے اور یہ صرف مادیات ہی میں نہیں معانی میں بھی قانون رائج ہے۔ ایمان وکفر، ہدایت وضلالت وشقاوت، صلاح وفساد ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ انسان بھی متضاد اوصاف وخصائص کا مجموعہ ہے۔ اس میں کرنے اور نہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ انسانی فطرت یوں تو اللہ سبحانہٗ کی قدرت کے راز ہائے گرانمایہ کا ایک لا محدود خزانہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشاہ گاہ عالم کی بنیا دصفات وکمالات کے تفاوت پر ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائی جاتی ہیں۔ جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے نباتات ان صفات سے مفلس ہیں۔ جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان صفات سے حصہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے۔ اور صفات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دو آدمیوں کی جسمانی، اخلاقی حالت بھی ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ تجلیات میں تکرار نہیں ہے۔ تفاوت صفات ہی کے مسئلہ کی صوفیانہ تعبیر ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر صفات کے تفاوت کا یہ تماشا نہ ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا ہے ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا۔ مختلف استعدادیں، مختلف صلاحیتیں اور مختلف قابلیتوں کی انفعالی قوتیں کارفرما ہیں۔ بلاشبہ قوت فاعلی ایک ہے مگر انفعالی قوتوں کے اختلاف سے ہدایت وضلالت، ایمان وکفر، سعادت وشقاوت کے لبادے مختلف ہو گئے ہیں۔

قرآن کی ان آیات میں اسی قانون کی طرف رہنمائی ہے۔

(۲۱) کیا بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتا ہو۔ اور اس کے ساتھ ایک گواہ بھی اس کی طرف سے آ گیا ہو اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوائی کرتی ہوئی اور سراپا رحمت آ چکی ہو یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی یہ شخص اور وہ ریاکار دنیا پرست مسلمان جن کا ذکر کیا۔ برابر ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ بینہ صاف راستہ سے مراد وہ راستہ ہے۔ جس پر انسان اپنی اصلی اور صحیح فطرت کے مطابق چلنا چاہتا ہے۔ بشرطیکہ گرد وپیش کے حالات وخیالات سے متاثر نہ ہو اور وہ توحید اسلام اور قرآن کا راستہ ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس

علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم

لہٰذا تو سیدھا رکھ اپنا چہرہ دین پر سب سے ہٹ کر وہی اللہ کی بناوٹ جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اللہ کی تخلیق کو بدل دینا نہیں ہے یہی سیدھا اور پائیدار دین ہے۔

اور حدیث میں ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

ہر بچہ فطرۃ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی اور یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

اور شاھد منہ گواہ اللہ کی طرف سے۔ قرآن عظیم ہے جو گواہی دیتا ہے کہ دین فطرت (توحید و اسلام) پر چلنے والا بے شک ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اور وہ قرآن اپنی حقانیت کا بھی خود گواہ ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ چونکہ قرآن لانے والے جبرئیل امین اور لینے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو بھی شاہد کہہ سکتے ہیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے۔ کہ آپ کے اخلاق و عادات، معجزات زبان مبارک چہرہ نورانی سے ہر چیز سے شہادت ملتی ہے۔ کہ جس دین کے آپ حامل ہیں وہ بالکل سچا دین ہے آگے ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماما ورحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے پہلے جو وحی کسی نبی پر نازل کی گئی وہ بھی دین فطرۃ کی صداقت پر گواہ تھی خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عظیم الشان کتاب تورات اتاری گئی۔ قرآن سے پیشتر اسے ایک بڑا بھاری شاھد ان لوگوں کی حقانیت کا کہنا چاہیئے جو دین فطرت کے صاف راستہ پر چلتے ہیں۔ [1]

یہ آیت گرامی شارحین قرآن کی تحقیقی جولانیوں کے لیے بہت بڑی جولانگاہ ہے۔ اس آیت میں احتمالات کے ہجوم نے آیت کے معانی کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ آیت میں ضمیروں کے مراجع، اسم اشارے کا مشار الیہ اسم موصول کا مصداق، استفہام کی حیثیت اور فار تفریعیہ کا موقعہ میں ایک سے زیادہ احتمالات ہیں۔ مثلاً

۱۔ من کان علی بینۃ من ربہ کا مصداق کون ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

۲ ۔ بینۃ من ربہ سے کیا مراد ہے ۔
۳ ۔ یتلوہ کا مطلب کیا ہے ۔
۴ ۔ شاھد سے کیا مراد ہے ۔
۵ ۔ یتلوہ کی ضمیر منصوب کا مرجع کیا ہے ۔
۶ ۔ منہ میں من کے معنے
۷ ۔ منہ کی ضمیر مجرور کا مرجع
۸ ۔ ومن قبلہ کتاب موسیٰ کا اعرابی مقام
۹ ۔ اولائک میں اسم اشارہ کا مشار الیہ
۱۰ ۔ یؤمنون بہ کی ضمیر مجرور کا مرجع ۔

آیئے اب اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر آیت قرآنی کی تشریح سنیئے ۔ فار تفریع کے لیے اور تفریع بھی ام یقولون افتراہ سے فھل انتم مسلمون پر ہے ۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے ۔ تفریع بھی ضد کی ضد پر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ان مکابرین اور مکذبین کا حال یہ ہے تو ان کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں ۔ جو بینات اور شواہد سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کا بھی قرآن پر ایمان ہے ۔ اور یہ مُسلم ہیں ۔ فھل انتم مسلمون کی روح یہی ہے ۔ یعنی کیا تم بھی اسلام قبول کرو گے جیسے وہ لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہو گئے جو تم میں سے اور اہل کتاب میں سے اپنے رب کی جانب سے بینہ پر ہونے کی وجہ سے اسلام لا چکے ہیں ۔ استفہام تقریری ہے ۔ یعنی اگر یہ لوگ ایمان سے گریز پائی اختیار کر رہے ہیں تو وہ لوگ ضرور نعمت ایمان سے ہمدوش ہوں گے ۔ جو اللہ پاک کی جانب سے بینہ پر ہیں ۔ اسی کی تائید قرآن شان اعجاز سے کرے گا اور اسی کی ہمنوائی اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کر چکی ہے ۔ لہٰذا اے مشرکین قرآن پر ایمان لانے والے تم جیسے نہیں ہیں ۔ بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ کتاب الٰہی پر ایمان لائے اور حلقہ اسلام میں داخل ہوئے ۔ اس طرح اولائک یؤمنون خبر ہے ۔ اور افمن کان الخ مبتدا ہے ۔ آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ ایک طرف وہ دنیا پرست ناخدا شناس اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کرنے والے ہیں ۔ اور دوسری طرف وہ خدا پرست اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اپنے ایمان کی پشت پر عقلی اور نقلی دلائل کی قوت رکھنے والے ہیں ۔ کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں ۔ شوکانیؒ لکھتے ہیں ۔

ایک صرف دنیا کی طلب رکھتا ہے دوسرا دنیا و آخرت دونوں کا طالب ہے ۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔

آیت میں مومن وکافر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ایک وہ شخص ہے۔جو دین کی زندگی میں پوری بصیرت رکھتا ہے۔اور اس کی بصیرت کی صحت کی اللہ سبحانہ کی وحی تائید کررہی ہے اور اس کی شہادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب دے رہی ہے اس کے مقابلے میں دوسرا وہ ہے جو دنیا اور اس کی ٹیپ ٹاپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔کیا ان دونوں کا مقام ایک ہوسکتا ہے۔بلاشبہ وہ لوگ جو عقلی اور نقلی دلائل کی قوت سے مالامال ہیں۔وہ ہی اس قرآن پر ایمان کی نعمت سے مالامال ہیں۔یعنی جو لوگ اللہ کی طرف سے دلیل و حجت پر ہیں۔اور وہ نعمت ایمان سے مالامال ہو چکے ہیں۔وہ ان مغرورین دنیا کی طرح نہیں ہو سکتے۔جو دنیا پر ریکھ رہے ہیں۔ان کا راستہ ہدایت الہی کا راستہ ہے۔

آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وہ شخص ہے جو اپنے موقف پر دلائل عقلیہ رکھتا ہے۔ اور دلائل عقلیہ کی تائید دلائل نقلیہ سے ہورہی ہے۔اور یہ دلائل نقلیہ دو قسم کے ہیں۔ایک قرآن اپنی اعجازی شان سے اس کا موئید ہے۔دوسرے قرآن سے پہلے کتاب موسیٰ علیہ السلام ان کی ہمنوائی کررہی ہے۔ یہی لوگ جن کے اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننے والے ہیں۔علامہ آلوسیؒ نے یہ بات بالکل برمحل فرمائی ہے۔

انداز بیان بہانگ دہل کہہ رہا ہے کہ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا اس آیت میں چہرہ پیش کیا جارہا ہے۔نہ ماننے والوں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تقابل نہیں ہے۔

آیت میں یتلو تلو سے ہے تلاوۃ سے نہیں ہے یعنی دلیل عقلی کی تائید دلیل نقلی کررہی ہے آیت میں اس طرح جیسا کہ علامہ آلوسیؒ نے سمجھا ہے۔اشارہ ہے کہ دلائل دو قسم کے ہیں عقلی اور نقلی۔اور نقلی دلائل کے عقلی دلائل کے تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نقلی دلائل عقلی دلائل کے موافق ہوتے ہیں۔یہیں سے علماء نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ۔

نقل صحیح کبھی عقل صریح کے مخالف نہیں ہوتی ہے۔

یہاں سمجھنے کی بات سادہ انداز میں یہ ہے۔کہ اسلام میں داخل ہونے والے وہی ہوں گے۔جن کے فطری قوانین مسخ ہونے سے محفوظ ہوں۔وہی پہلے سے بنیادی حقائق کے بارے میں اپنے اندر ایک دلیل و برہان رکھتے ہیں۔پھر اس کے بعد اللہ کی جانب سے قرآن کی شہادت آجاتی ہے۔تو وہ ان کو بعینہ اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔وہ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ اپنے اندر پا رہے ہیں۔اسی کی تائید و تصدیق اس آسمانی شاہد کی زبان سے ہورہی ہے۔قرآن کے ساتھ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب

کا حوالہ بڑا ہی معنے خیز ہے کتاب موسیٰ علیہ السلام میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیشین گوئی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہاں جو تشریح کی ہے۔ وہ بہت معنویت رکھتی ہے۔

کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے۔ جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اور اس قرآن کا ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے۔ یعنی اس کا معجزہ ہونا اور ایک اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے۔ جو کہ آیا ہے اور رحمت ہے۔ اور یہ دلیل نقلی ہے۔ بغرض قرآن کے صدق وصحت کے لیے دونوں دلیلیں موجود ہیں۔ ان ہی دلائل کی وجہ سے لوگ اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔

بہر حال آیت قرآنی نے اہل ایمان اور اہل کفر کا موازنہ کرکے اہل ایمان کو نجات کا حامل قرار دیا ہے۔ کیونکہ نبوت پر ان کے ایمان کے لیے تین براہین موجود ہیں۔ بینہ، شاہد اور تورات بینہ سے عقل اور نور فطرت مراد ہے۔ یعنی دل کی وہ آنکھ جو حق وباطل میں تمیز کرتی ہے۔ کلام الٰہی کا کوئی حکم اور کوئی نظریہ اس کو خلاف عقل اور خلاف واقعہ نظر نہیں آتا ہے۔ یہی نور فطرت اقرار توحید ورسالت اور صداقت کی واضح دلیل ہے۔ قرآن اسی بینہ کو فطرۃ اللہ کہتا ہے۔ حدیث میں اسی فطرۃ کی طرف رہنمائی ہے۔ گویا یہ بات کھول کر بتادی گئی کہ جو لوگ دنیوی زندگی کی رعنائیوں اور خوشنمائیوں کے دلدادہ ہیں۔ ان کے لیے نبوت کی دعوت کا رد کردینا آسان ہے۔ مگر وہ لوگ جو اپنی ہستی اور کائنات کے نظام میں پہلے سے توحید وآخرت کی کھلی شہادت پارہے ہیں۔ اور نبوت ان کو وہی کچھ بتا رہی ہے۔ جس کی شہادت پہلے سے ان کے اندر موجود ہے۔ اور پھر اس کی مزید تائید قرآن سے پہلے نازل شدہ کتاب سے بھی ہوتی ہے تو یہ صادق اور راست لوگ اتنی زبردست شہادتوں کی آنکھیں بند کرکے ان منکرین نبوت کے ہمنوا کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

یہاں حضرت مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی نے آیت قرآن کے منشا کو جس کو جس اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ ناظرین معالم القرآن اس سے استفادہ کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بینہ سے روشن دلیل اور صاف راستہ مراد ہے یا با الفاظ دیگر اس سے صحیح یعنی دین اسلام مراد ہے۔ جس کی صحت دلائل عقلیہ اور فطریہ سے ثابت ہے۔ اور اس کی صحت وصداقت پر دو شاہد عدل موجود ہیں۔ ایک قرآن کریم دوسری تورات پس ایسے دین کے حسن وجمال میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور من کان علی بینۃ سے وہ مؤمنین ومخلصین مراد ہیں۔ جو اس دین حق پر

قائم ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ دین اسلام ایک نور عقل، نور فطرت اور نور بصیرت سے عجیب قسم کا ایک نور ہے۔ اور دو نور غیبی اس کے شاہد اور مؤید ہیں۔ ایک نور قرآن اور ایک نور تورات ہر طرح یہ دین نور علی نور ہے۔ دین اسلام کیا ہے۔ ایک مجموعہ انوار ہے۔ تو کیا جو شخص ایسے روشن اور منور دین پر قائم ہو وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے۔ جو ظلمات بعضہا فوق بعض میں گھرا ہوا ہو۔ اور سعادت۔ اخرویہ سے محروم ہو۔ وہ اہل نور اور اہل بصیرت کے مماثل اور مشابہ کہاں ہو سکتا ہے۔

(۲۲) اسلام کا تمام کو یکساں خطاب

اور مختلف لوگوں میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ تو دوزخ کی آگ اس کے وعدہ کی جگہ ہے یعنی یہود و نصاریٰ، بت پرست مجوس عرب عجم یورپ ایشیا کسی فرقہ جماعت ملک و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ جب تک قرآن کو نہ مانے گا۔ نجات نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ بعض احادیث میں بہت تصریح و تعمیم کے ساتھ بیان فرمایا ہے[1] اصل ارشاد میں احزاب کا لفظ آیا ہے۔ یہ حزب کی جمع ہے جس کے معنے گروہ اور جماعت کے ہیں مشرکین بھی حزب ہیں، یہود بھی حزب اور عیسائی بھی حزب ہیں۔ قرآن نے قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوطؑ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ اولائك الاحزاب نظریاتی جماعتیں ہوں یا نسلی زبان سے تعلق رکھنے والی یا وطن سے سب کو احزاب کہا جاتا ہے ان سب کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے۔ من یکفر من الاحزاب کوئی اور کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے عمل کے مقبول ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ اور ایمان کی صحت کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ یہود ہوں یا عیسائی یہ وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو مانتے ہیں۔ مراد نجات یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانا اسلام ہے۔ جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ اس کی نجات نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ کو اسلام قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہی وہ دین ہے۔ جس کو یہود و نصاریٰ نے اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا۔ اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی۔ اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو لے کر آئے ہیں وہ کامل ہے۔ من یکفر بہ من الاحزاب سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ قرآن کی جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ اب جو ایمان لایا اور جو یہودی ہوا۔ اور نصرانی اور صابئ جو بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا۔ اس کو خوف دغم نہ ہوگا۔ اس میں اللہ پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہے۔ اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے ساتھ نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں آئی ہے۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ایک ہے۔

ومن یکفر بہ من الاحزاب فالنار موعدہ

ضمناً آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی بھی ہے اور دائمی بھی یعنی آپ سب کے لیے رسول بن کر آئے ہیں۔ اور آپ اللہ کے آخری نبی بھی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی بن کر نہیں آئے گا۔

(۲۲) دعوت کا مستقبل کامیاب ہے

لہذا تم اس دعوت کی کامیابی کے بارے میں کوئی شک نہ کرو بلاشبہ یہ تمہارے رب کی جانب سے ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت مانتی نہیں ہے۔ یہ خطاب ہر شخص کو ہے۔ جو قرآن کے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے۔ کہ قرآن کی صداقت اور من جانب اللہ ہونے میں قطعاً کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ نہیں مانتے وہ احمق ہیں۔[1]

اصل تعبیر یہ ہے۔ فلاتک فی مریۃ منہ انہ الحق من ربک۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دعوت قرآنی کا کامیاب ہونا آپ کے پروردگار کی جانب سے اٹل انمٹ اور قیامت تک باقی رہنے والی حقیقت ہے۔ حق باطل کی نقیض۔ باطل ایسی چیز جس میں ثبات وقیام نہ ہو، ٹل جانے والی اور مٹ جانے والی۔ اور حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو چیز ثابت ہو۔ قرآن جب کسی بات کو علامت تعریف کے لیے کہتا ہے۔ تو الحق کہتا ہے۔ تو اس سے مقصود مخاطبوں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ یہ دنیا کی ایک قائم وثابت حقیقت ہے ۔ جن قوموں نے اسے مٹانا چاہا ہے ۔ وہ خود مٹ گئیں حتیٰ کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا ۔ لیکن قرآن کی دعوت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اسی حقیقت کی طرف اشارا کرنے کے لیے یہاں وہ صرف الحق کہہ کر خاموش ہو گیا ۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں حق ہی کو باقی رکھتا ہے ۔ تو کسی بات کے امر حق ہونے کے لیے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے ۔ کہ وہ حق ہے ۔ یعنی باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے ۔ حدیث وسیر کی کتابوں میں جو آتا ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو کعبہ کے اندر کے بتوں کو توڑتے جاتے تھے ۔ اور زبان مبارک سے فرماتے جاتے تھے ۔ جاء الحق وزھق الباطل تو اس میں اسی طرف اشارا ہے ۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب اس لیے نہیں بنایا گیا ۔ کہ آپ کو شک نہ کرنے کی ہدایت مقصود ہے ۔ بلکہ اس لیے بنایا گیا ہے ۔ کہ آپ کے مقابل قوتوں کا شک ثابت کرنا مقصود ہے گویا اس میں مشرکین مکہ ، یہودیوں اور عیسائیوں کو عتاب ہو رہا ہے ۔ لیکن چونکہ وہ لائق خطاب نہیں ہیں ۔ اس لیے روئے سخن ان کی طرف نہیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دیا اور ضمناً اس اس حقیقت کی طرف اشارا کر دیا کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں اور بے سروسامانی کے سارے درجوں کے باوجود دعوت حق کے کامیاب ہونے کا معاملہ ہو کر رہنا ہے ۔ اور ایسی حالت میں ہو کر رہے گا ۔ جبکہ لوگوں کی اکثریت اسے مانتی نہیں ہے ۔ یعنی الاحزاب دنیا کی بڑی طاقتیں یہودی ، عیسائی ، مجوسی اور مشرکین اس کا مقابلہ کر رہی ہیں ۔ فرمایا ایسا ہی ہو کر رہے گا ۔ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھیے انہیں مظلومیتوں سے فتح و کامرانی کا سورج طلوع ہو گا ۔ کیونکہ یہ حق ہے ۔ اور کامیابی حق کی ہوتی ہے ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ
اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ
كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِیْنَ
یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ
مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ۘ یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وقف لازم
مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ
وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۱۶ ۲ ۲

اور ان سے زیادہ ظلم کار کون ہے۔ جو اللہ پر جھوٹ باندھے[۱۸] ان ہی لوگوں کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور گواہی دینے والے بتائیں گے۔ کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا[۱۹] یاد رکھو ان ظلم کار لوگوں پر اللہ

کی لعنت ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور راہِ خدا میں کجی کے متلاشی ہیں۔ اور بعد میں آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں[۲۲] یہ لوگ زمین میں بھاگ کر اللہ کو ہرانے والے نہیں ہیں۔ اور اللہ سے ورے ان کا کوئی کارساز نہیں ہے ان کو ڈبل عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ نہ تو وہ حق سننا چاہتے تھے اور نہ حق دیکھنا چاہتے تھے[۲۶]۔ ان ہی لوگوں نے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دیا ہے۔ اور زندگی میں حق کے خلاف جو افترا پردازیاں کرتے تھے۔ وہ سب اکارت ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔[۲۸] بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور ایمان کی زندگی میں اعمال صالحہ کیئے۔ اور اپنے مولیٰ کے حضور میں عاجزی اختیار کی یہی جنت والے ہیں اور اس میں سدا رہنے والے ہیں[۲۹] ان دونوں فرقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرہ ہو اور دوسرا بینا اور شنوا ہو۔ بتاؤ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو[۳۰]

مفردات کے معانی

یصدون۔ صد سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ مصدر اگر صدود ہو تو لازم آتا ہے۔ اور مصدر اگر صد ہو تو متعدی۔ لازم کی مثال جیسے یصدون عنك صدودا اور متعدی کی مثال جیسے فصدھم عن السبیل۔

عوجاً ۔ کجی، ٹیڑھا پن یہ عوج یعوج سے ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج ہونے کے معنے میں ہے۔ ابو زید نے جو لغت کے مشہور امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے عَوَج بالفتح اس کے لیے آتا ہے۔ اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آئے تو اس کے لیے عِوج بکسر العین آتا ہے۔

ضل ۔ ضلالۃ سے ماضی کا پہلا صیغہ ہے۔ گمراہی، بھٹکنا، راہ سے دور جا پڑنا، کھو جانا، ضائع ہو جانا، گم ہو جانا، ہلاک ہونا، صراح میں علامہ جمال الدین قرشی لکھتے ہیں ضَلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا کہا جاتا ہے۔ ضل الماء فی اللبن یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اور اسی سے اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی ان ابانا لفی ضلال مبین ہمارے ابا تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی مذکور ہے۔ فعلتہا اذا وانا من الضالین۔ نیز ہلاک ہونے کے معنے یہی ہیں۔ نیز ضلال رشاد کی ضد ہے۔ باب ضرب یضرب سے آتا ہے۔ ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی ۔

اخبتوا ۔ وہ جھکے انہوں نے عاجزی اختیار کی جس کے معنے تواضع اور خشوع و خضوع کے ہیں۔ اخبات کے اصل معنے سیدھے ہونے کے ہیں۔ نرم ہموار زمین کو خبت کہتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں ایسی انابت جس میں تسلسل ہو۔ اس لیے تواضع اور انکساری کے معنے بھی آتے ہیں۔

اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے

نبوت کی دعوت کے بارے میں قرآن نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ انہ الحق من ربک اس کا لازمی تقاضا یہ ہے۔ کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور اب اللہ سبحانہٗ کے نزدیک ثابت اور باقی رہنے والی چیز صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانہ کا انسان اس کی پیروی کرے۔ کیونکہ جب یہ دین دلائل عقلیہ اور نقلیہ کی روشنی لے کر آیا ہے۔ اور اسی کا لانے والا بلا قید زمان و مکان سب انسانوں کے لیے نذیر بن کر آیا ہے۔ تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کا رسول مانا جائے۔ اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب دوسری کوئی کتاب نہیں جیسا کہ انہ الحق من ربک کے قصر کا تقاضا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ آخرت کی نجات صرف اسلام پر موقوف ہے۔ خود قرآن کا اعلان ہے۔

من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اپنائے گا وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔
اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

والذی نفس محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحٰب النار۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔اس امت میں سے جس کسی شخص تک یہودی ہو یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا۔وہ دوزخی ہوگا۔

اس حدیث میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کا لیا گیا ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔دنیا کا کوئی گروہ کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اسکا اطلاق نہ ہوتا ہو۔یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو من یکفر من الاحزاب کھینچ تان نکالی جا رہی ہو۔بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے۔جو اس آیت قرآنی کا صریح مفہوم ہے ظاہر ہے کہ قرآن میں الاحزاب سے مراد امت دعوت ہے۔یعنی وہ پورا گروہ انسانی جس کی طرف آپ نبی بنا کر مبعوث ہوئے ہیں۔اب اگر کوئی گروہ، کوئی قوم، کوئی جماعت یہ کہتی ہے۔کہ یہ اللہ کا پیغمبر نہیں ہے اور یہ قرآن اللہ کی وحی نہیں ہے۔اور فی الواقع وہ اللہ کا پیغمبر ہے تو اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے۔ٹھیک ایسے ہی جیسے کوئی پیغمبر نہ ہو۔اور وہ یہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے۔باتیں دونوں ایک ہیں۔ایک سچے پیغمبر کو رسول نہ ماننے والا ایسا ہی ظالم ہے جیسے جھوٹا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرنے والا یہاں قرآن یہی بتا رہا ہے کہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ کی گاڑی چلانے والوں کا انجام کیا ہوگا۔پیغمبر کی حد تک پہلے پوری وضاحت ہو چکی ہے کہ اس کے پاس آنے والی وحی بلا ریب اللہ کی وحی ہے اور دلیل یہ ہے کہ پوری کائنات مل کر اس کی مثال نہیں بنا سکتی۔نبوت کے ساتھیوں کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ انہوں نے نبوت کو دلائل عقلیہ اور نقلیہ کی پشت پناہی میں مانا ہے اب صرف سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو

جو نہیں ملتے ان کا کیا بنے گا ۔ ان آیات میں اسی کی وضاحت ہے ۔

(۲۴) اور ان سے زیادہ ظلم کار کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یعنی قرآن جھوٹ اور افترا نہیں ۔ اللہ کا سچا پیغام ہے جس کو قبول کرنا ضروری ہے ۔ خوب سمجھ لو اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے مثلاً اس کا کلام نہ ہو اور کہہ دے کہ اس کا کلام ہے ۔ یا واقعی اس کا کلام ہو اور اللہ سبحانہٗ بار بار فرمائے کہ یہ میرا کلام ہے مگر باوجود روشن دلائل کے وہ جھٹلاتا رہے اور کہتا رہے کہ اس کا نہیں ہے۔[1] یہی بات سورہ یونس میں اس سے پہلے آچکی ہے ۔ وہاں کھول کر بتایا تھا کہ تم دو باتوں کا انکار نہیں کر سکتے ۔ جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ۔ اور جو سچ کو جھٹلائے وہ بھی سب سے بڑا ظالم ہے ۔ اب اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام ہونا پڑے گا ۔ اور اگر تم سچائی کی تکذیب کر رہے ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ مزد رھگتنا ہے فیصلہ اللہ سبحانہٗ کے ہاتھ میں ہے ۔ یہاں قرآن نے مقابلہ مومنین اور منکرین کا پیش کیا ہے ۔ اور بتایا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر افترا کرے یعنی مومن تو اللہ کی دلیل وحجت پر چلتے ہیں ۔ اور منکرین اللہ پر افترا کر رہے ہیں ۔ لہٰذا دونوں کی راہیں الگ ہیں ۔ نتائج بھی الگ الگ ہوں گے ۔ اہل ایمان نے اللہ کی بخشی ہوئی عقل سے کام لیا ۔ اور اس کی وحی پر ایمان لایا دوسرے نے عقل و بصیرت سے انکار کیا اور اللہ کی وحی کو جھٹلایا ۔ اس فقرے میں ان کے سارے افترا‌ٔت کی طرف اشارا کر دیا ۔ اور بتا دیا کہ ایک طرف تو وہ جماعت ہے جس نے فکر و عمل اور اپنا نظام حیات عقل صریح اور نقل صحیح کی روشنی میں بنایا ہے ۔ اور اس کے مقابلے میں وہ گروہ ہے جس کے فکر و عمل کے لیے نہ عقل کی دلیل ہے ۔ اور نہ نقل کی طاقت ہے ۔ اس کا سارا علمی اور عملی سرمایہ افترا‌ٔت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے فکری گمراہی کا حال یہ ہے کہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا رہے ہیں ۔ اپنے پسندیدہ اشخاص کو اپنا شفیع قرار دے رہے ہیں ۔ اور عملی زندگی یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت میں نت نئی شرسازیاں کر رہے ہیں ۔ ان کی علمی اور عملی زندگی ساری کی ساری افترا‌ٔت کا انبار ہے بتاؤ اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے ۔

(۲۵) اعمال کے نتائج و لوازم

ان ہی لوگوں کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا ۔ اور گواہی دینے والے بتائیں گے ۔ کہ یہ وہ لوگ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا یعنی محشر میں جب اللہ سبحانہ کے سامنے علی رؤس الاشہاد پیش ہوں گے۔ اور ان کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔ اس وقت گواہی دینے والے فرشتے انبیاء صالحین بلکہ ان کے خود ہاتھ پاؤں کہیں گے یہ ہی وہ بدبخت ظالم ہیں۔ جنہوں نے اپنے پروردگار کی نسبت جھوٹ بولا تھا[1] ان کا سب سے بڑا جرم اللہ پر افترا اور جھوٹ باندھنا ہے۔ اس جرم کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کو قرآن صرف افتری علی اللہ کذبا ہی نہیں بلکہ قول علی اللہ کذبا اور قول علی اللہ ما لا تعلمون بھی کہتا ہے۔ ان کی ساری زندگی افترائی ہے افکار اعمال، اخلاق کی پوری عمارت افترائی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ نذریں نیازیں، چڑھاوے سب کے سب افترار علی اللہ ہیں۔ مشرکین کا شفعاء، والا دھندا، عیسائیوں کا نظریہ ولدیت، یہودیوں کا نظریہ محبوبیت سب کا سب افترائی گھروندا ہے۔ جس کی پشت پر کوئی دلیل عقلی اور نقلی نہیں ہے۔ روز قیامت ان کے بھی اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے قرآن میں تعبیر یہ ہے کہ افترار کے مجرمین اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں گے یعنی اپنے اپنے اعمال کا پشتارہ لیے حاضر ہوں گے۔ اور ساتھ ہی ان کے اعمال پر شہادت دینے والے بول پڑیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مجرم ہیں۔ اسم اشارے کے ذریعے ان کی تشہیر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رسوائی سرعام ہوگی۔ صحیح مسلم میں اس تشہیر کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز میں پیش فرمایا ہے۔

کفار اور منافقین کو علی رؤس الخلائق پکارا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ یہ لوگ ہیں اللہ پر جھوٹ باندھنے والے۔

سب سے بڑا جرم سب سے پہلے بیان کرنے کے بعد آگے دوسرے جرائم کی تفصیل ہے۔

(۲۶) ظالموں کے جرائم

یاد رکھو ان ظلم کار لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور راہ خدا میں کجی کے متلاشی ہیں اور بعد میں آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی جو لوگ ظلم و ناانصافی سے اللہ سبحانہ کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو اللہ سبحانہ کے راستہ پر چلنے پر روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے

[1] افادات شیخ الاسلام

راستے کو ٹیڑھا ثابت کریں ایسے ظالموں پر اللہ سبحانہٗ کی خصوصی لعنت ہے[1]۔ اگرچہ شیخ الاسلام نے الا لعنۃ اللہ علی الظالمین کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف بتائی ہے۔ لیکن قرینہ مقام کا تقاضا یہی ہے کہ یہ شہادت دینے والوں کی جانب ہے۔ سورہ اعراف میں یہ بات پڑھ چکے ہو۔

فاذن مؤذن بینھم ان لعنۃ اللہ علی الظالمین

صحیح مسلم میں ارشاد نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ پہلے سن چکے ہو۔

واما الکفار والمنافقین فیقول الاشھاد ھؤلاء الذین کذبوا علی ربھم الا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔

ظالمین کی تصریح لعنت کی علت بتانے کے لیے ہے اور ان ظالموں کے جو جرائم آگے بتائے ہیں وہ یہ ہیں

۱۔ یہ لوگ انسانوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ میں کجی تلاش کرتے ہیں۔

۳۔ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بعد آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔

[2] یہی سنگین جرائم ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ رحمت الٰہی سے دور ہو گئے ہیں۔ ان کا پہلا جرم یہ بتایا گیا ہے یصدون عن سبیل اللہ۔ یہاں یہ بات مشرکین مکہ کے بارے میں بتائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ یہ روکنا احوال وظروف کے اختلاف اور زمان ومکان کے اختلاف سے ایک سے زیادہ رویوں میں ہوتا تھا۔ کبھی سرمایہ و دولت کے زور سے کسی جگہ تشدد اور طاقت سے لوگوں کو روکا جاتا تھا۔ ایک روکنا فرعون کا ہے۔ ایک روکنا قوم شعیبؑ کا ہے آج یہی روکنا علم وتحقیق کے روپ میں ہے۔ قرآن میں یہی بات یہود ونصاریٰ کے بارے میں چوتھی جلد کے آغاز میں پڑھ چکے ہو۔

یا اھل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللہ من آمن تبغونھا عوجا وانتم شھداء

اے اہل کتاب اہل ایمان کو اللہ کے راستہ سے کیوں روکتے ہو۔ چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستے پر پڑجائیں حالانکہ تمہیں اہل ایمان کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

سیدھے راستہ پر ہونا خوب معلوم ہے ۔

اللہ کے راستہ سے روکنے کی نوعیت اس دور میں جو تھی وہ آج نہیں ہے آج اہل ایمان کو علم و تحقیق کے زور سے روکا جارہا ہے۔ مسلمان نوجوانوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان سیاست کاروں اور مسلمان طالب علموں کے دماغ، میں علم و تحقیق کے نام پر وہ جراثیم ڈالے جاتے ہیں جس سے وہ اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمان، اس کے حال سے بیزار اور اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں وہ خوردبین سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کو دوربین سے دکھاتے ہیں وہ اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں اس سبک دستی، ہنرمندی سے کام لیتے ہیں جس کی مثال مل نہیں سکتی ہے مولانا ابوالحسن میاں ندوی نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ

> قرآن سیرۃ نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، آئمہ کرامؒ، محدثین، فقہاء، مشائخ و صوفیاء، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث فقہ اسلامی کے مآخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق ان مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے۔ جو ایک ایسے ذہین حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو ۔ پورے اسلام سے روک دینے کے لیے کافی ہے ۔

مولانا ابوالحسن علی میاں ہی نے ڈاکٹر محمد البہی کی فاضلانہ کتاب الفکر الحدیث کے حوالہ سے ان ارباب تحقیق کا جو پیش نہاد بتایا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے لیے مولانا کی فاضلانہ کتاب الصراع اور اسلام و مغربیت کے درمیان کشمکش کا مطالعہ ضروری ہے ۔ یہاں تو میں صرف ویصدون عن سبیل اللہ کے نئے ادب سے قارئین معالم کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں ۔

قرآن نے ان کا دوسرا جرم یہ بتایا کہ ویبغونھا عوجا یعنی یہ لوگوں کے بتائے ہوئے سیدھے راستے میں کجی تلاش کرتے ہیں ۔ سورہ کہف میں آغاز قرآن کا چہرہ یہ پیش کیا ہے ۔

> الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا قیما
>
> ساری ستائش ہی اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی بالکل سیدھی بات ۔

یعنی عوج، پیچ وخم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ خود سیدھی ہے سیدھی بات بتاتی ہے۔ فکر ونظر مصنوعی اور من گھڑت ورزشوں سے جن کے دل و دماغ الٹ پلٹ نہیں کردیئے گئے ان کو سیدھی راہ بتاتی ہے۔ اور صرف سیدھی ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ سیدھی راہ بتاتی ہے یہ ایسی ملتی ھی اقوم جو اسے پڑھے گا اس کے اندر اترجائے گی۔ اترتی چلی جائے گی۔ ان کو ایسا معلوم ہوگا۔ کہ وہ اس کتاب کے لیے مخلوق ہوئے ہیں۔ مگر فلسفی مشینوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں سے یہ کتاب اچٹ جاتی ہے۔ نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کرسکتے ہیں اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو محسوس کراسکتی ہے۔ خود جس مسئلہ میں الجھنوں کے کانٹے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وانہیں کانٹوں کی سیج پر انہیں نیند آگئی ہے۔ اور یقین کیئے بیٹھے ہیں کہ زندگی کی ساری بنیادی کانٹوں کی الجھنیں ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ کھلتی جائیں گی۔ یہ اس لیے ہورہا ہے کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو ٹیڑھا جوتا بھی سیدھا نظر آرہا ہے۔ ان کی ذہنیت اور فکر یہ مصنوعی کجی جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی مان رہی ہے۔ اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آرہی ہیں۔ بہرحال ویبغونھا عوجا اور تلاش کرتے ہیں اللہ کے راستہ میں کجی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک طرف اسلام کے دینی افکار واقرار کی تحقیر کا کام کرتے ہیں اور کافرانہ افکار واقرار کی عظمت ثابت کرتے ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات واصول کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ اس سے اسلامی افکار کی کمزوری ثابت ہو۔ اور ایک مسلمان کا اسلام سے رابطہ کمزور پڑجائے۔ اور وہ قرآن واسلام کے بارے میں متشکک ہوجائے۔ یا کم ازکم یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائے کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ان کی اعوجاجی ذہنیتوں اور پراگندہ توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی روک سکتا ہے۔ اس رجالی زندگی کے ہر پہلو میں بیجا پیچ اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلم، یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز اس کی سب سے بڑی خصوصیت عوج اور صرف عوج سامنے آتی ہے۔

غور فرمایئے انسانیت کے سامنے ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے جو کشتی بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے کہ ساحل پر پہنچانے کا سواریوں کو یقین نہیں دلایا جاسکتا بلکہ ممکن ہے کہ منجدھار میں پہنچ کر وہی چیز جس کا نام کشتی نجات رکھا ہے طوفان کی نذر ہوجائے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا جہاز بھی ہے جس میں ضمانت دی جاسکتی ہے کہ اس میں سوار ہونے والے کو سیدھی راہ سے لیجانے والوں کو لے جائے گا۔ اور قطعی طور پر ہر ایک کو ساحل مراد تک پہنچائے گا۔

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

یہ ضمانت نامہ واضح اور صاف ہے اس کے مالک حقیقی کی جانب سے ہونے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ ویتلوہ شاھد سارے نبیوں کے اس پر دستخط ہیں ومن قبلہ کتاب موسیٰ آیت آپ کے اختیار اور صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنی نجات کے لیے ان دونوں کشتیوں میں سے جس پر چاہیں سوار ہوجائیں فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر آیت کے آغاز پر غور فرمائیے۔ افمن کان علی بینۃ من ربہ تیسری بات ان کے بارے میں یہ بتائی گئی ہے کہ یہ آخرت والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ ھم بالاخرۃ ھم کافرون قرآن نے آخرت کی زندگی پر طرح طرح سے استدلال کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نا مکمل ہے اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہیئے جب وہ مکمل کی جائے۔

آخرت کی زندگی کو قرآن کی روشنی میں ماننے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان حقیقتوں کو دل سے تسلیم کیا جائے کہ۔

انسان کی تخلیق ایک منفرد مقصد کے لیے ہوئی ہے وہ ایک ذمہ دار ہستی ہے۔ اس کے پیدا کرنے والے نے اسے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل ہدایت نامہ دے کر پیدا کیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا ہی حق اور نیکی ہے اسے چھوڑ کر من مانا طریقہ اختیار کرنا گمراہی اور برائی ہے۔

انسان کی زندگی موت کے ساتھ نہیں ختم ہوجاتی بلکہ اس کے بعد بھی مسلسل باقی رہنے والی ہے۔ اور اس دنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے مادی نتائج کے اعتبار سے اگرچہ اسی جگہ ختم ہوجاتا ہے مگر اپنے معنوی نتائج کے اعتبار سے سب کا سب باقی رہتا ہے۔

سوچیئے کہ اگر آخرت ایک فرضی زندگی ہے تو ہمارے لیے اس قدر ضروری کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم کوئی سماجی نظام قائم ہی نہیں کرسکتے۔ انسانی ذہن سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہوجاتی ہے۔ کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لیے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے۔ زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لیے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

بہر حال قرآن جن حقیقتوں کی طرف ہمیں دعوت دیتا ہے ان میں سے اہم ترین حقیقت آخرت کا تصور ہے اور مکہ کے مشرک اس کے منکر ہیں۔

۲۷ جرائم پیشہ لوگوں کو ڈبل سزا

یہ لوگ زمین میں بھاگ کر اللہ سبحانہٗ کو ہرانے والے نہیں ہیں اور اللہ سے ورے ان کا کوئی کارساز نہیں ہے اللہ ان کو ڈبل عذاب دے گا۔ کیونکہ نہ تو وہ حق سننا چاہتے تھے۔ اور نہ حق دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی وسیع زمین میں نہ کہیں بھاگ کر اللہ سبحانہٗ سے چھپ سکتے ہیں۔ اور نہ کوئی مددگار حمایتی مل سکتا ہے جو اللہ سبحانہٗ کے عذاب سے بچا سکے۔ وہ دنیا میں ایسے اندھے بہرے تھے کہ نہ حق بات سننے کی تاب تھی نہ اللہ سبحانہٗ کے نشانوں کو دیکھتے تھے جنہیں دیکھ کر ممکن تھا راہ ہدایت پا لیتے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اللہ پر جھوٹ بولا، بے اصل اور غلط باتیں اس کی طرف منسوب کیں۔ کہاں سے لائے غیب سے سُن نہ آئے تھے۔ غیب دیکھتے تھے پھر ان کا ماخذ کیا ہے [1]

اس میں بتایا ہے کہ نبوت جو دعوت لے کر آئی ہے اسے حتماً کامیابی سے ہمدوش ہونا ہے۔ اور وہ دنیا میں نبوت کی راہ نہ روک سکیں گے۔ یہ اسلام کے نظام حیات کی کامیابی کی پشین گوئی کی طرح ہے۔ پشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں دعوت نبوت کامیاب ہوگی اور مخالفین اس کی کامیابی کو روک نہ سکیں گے غور فرمائیے کہ یہ پشین گوئی کن حالات میں کی گئی ہے۔ قرآن نے اسی زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ان الذین اجرموا کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون واذا مروا بھم یتغامزون واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین واذا راوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون

یہ جرائم پیشہ اہل ایمان پر ہنستے ہیں اور ان کا جب اہل ایمان کے پاس سے گزر ہوتا ہے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے سے چشمک زنی کرتے ہیں۔ اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھروں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں۔ اور جب اہل ایمان کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گمراہ ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ایسے واقعات گزر رہے تھے۔ کہ ان کی کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ بلکہ اسلام کے

[1] افادات شیخ الاسلام

سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام و تقدس کے ساتھ وابستہ ہے یعنی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں سجدے میں ہیں۔ پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے اور صحابہ کرامؓ جیسے ترو تازہ ایمان رکھنے والے حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھتے ہیں مگر صحابہ کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے ۔

> میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آسکتا ۔ کاش میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی ۔

ان حالات میں پیشین گوئی کی ہے اولائک لم یکونوا معجزین فی الارض یہ مخالفین حق کی راہ نہیں روک سکیں گے ۔ یہ پیشین گوئی کیسے پوری ہوئی ۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ کے اس بیان پر غور فرمائیے کہ آپ کی حیات ہی میں عرب میں جو ایک آزاد حکومت قائم ہوئی وہ یہ تھی ۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے ۔

> شمالاً تبوک سے ایلہ تک اور جنوباً یمن کے ساحل تک مشرق میں خلیج فارس اور بحر قلزم تک غرباً ان کی حکومت پھیلی ہوئی تھی ۔ (تاریخ التمدن الاسلامی)

مطلب یہ ہے کہ دوست دشمن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ

> ۱۱ھ میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا ۔ تو اسلام کی حکومت سارے جزیرۃ العرب پر چھائی ہوئی تھی ۔

اب دس لاکھ مربع میل زمین کی اس آبادی کو دیکھئے جو زمانہ نبوت ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی ۔ اور عہد رسالت کے بعد دس بارہ سال کی قلیل مدت میں ایران، مصر، شام، الجزیرۃ، ترکستان تک اسلام کی حکومت پھیل گئی ۔ اس میں انسانوں کی کتنی تعداد اسلام کے احاطہ میں داخل ہوئی اس کے اندازے کے لیے بھی مسلمانوں کی نہیں بلکہ ایک عیسائی مؤرخ کی یہ شہادت پڑھیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> اسلامی حکومت کی حدود میں اس زمانہ کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ داخل ہو گیا تھا ۔ جس میں عرب بھی تھے، ایران کے باشندے بھی، ان میں کلدانی بھی تھے اور روم والے بھی، اور گاتھ قوم کے لوگ بھی، قبطی بھی، سوڈانی بھی، بربر بھی، جو زبانیں یہ بولتے تھے ان میں عربی، فارسی، ہندی، روسی، ترکی، کردی اور ارمنی نیز قبطی اور بربری کے سوا بھی زبانیں تھیں ۔

جرجی زیدان نے قدیم معتبر وثائق کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں صرف مصر کی آبادی تیس کروڑ تھی مجموعی طور پر پہلی صدی ہجری میں ممالک محروسہ اسلامیہ کے متعلق تخمینہ آبادی اسی مصنف نے یہ بتایا ہے کہ

اسلامی قلمرو کی آبادی اپنے عنفوان شباب میں بیس کروڑ سے پچیس کروڑ تھی۔

اسی عیسائی مصنف نے اپنے اس بیان کو اس فقرے پر ختم کیا ہے۔

مردم شماری کی یہ تعداد وہی ہے جو اس وقت یورپ کی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اولائك لم یکونوا معجزین فی الارض کی کیسی جیتی جاگتی اور زندہ تاریخی تفسیر ہے۔

بہرحال آیت قرآنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ منکرین دعوت کو اگرچہ اپنی قوت، شوکت، عزت، حکومت، افرادی طاقت، کثرت مال واولاد پر غرور تھا۔ مگر اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ان کے ان کو فرضی معبود کام آئے۔ کسی میں بھی ان کی حمایت کرنے کی تاب نہ تھی۔ ان کو دوگنا عذاب ہوگا۔ ایک بدکاری کا دوسرا بدکاری کی راہنمائی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا۔ کہ نفرت و بیزازی کی وجہ سے وہ دعوت حق سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور نہ محبت دنیا کی وجہ سے اللہ کی نشانیاں دیکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وہ نظریات پادر ہوا ہو گئے جو انہوں نے اللہ سبحانہ اور کائنات اور اپنی ہستی کے متعلق گھڑ رکھے تھے اور وہ سب بھروسے بھی جھوٹے ثابت ہوئے جو انہوں نے اپنے معبودوں پر کر رکھے تھے۔

حافظ ابن جریرؒ نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

یہ لوگ جن کا چہرہ اللہ سبحانہ نے پیش فرمایا ہے کہ یہ لوگوں کو اللہ سبحانہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ یہ ملک میں بھاگ کر اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے جب اللہ سبحانہ ان کو سزا دینا چاہے گا۔ تو اور کوئی مددگار ان کے کام نہیں آئے گا۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

یہ لوگ اللہ سبحانہ کو زمین میں ہرا نہیں سکتے اور نہ ہی ان کے مددگار یہ سب اللہ کے دباؤ میں ہیں۔ ان پر اللہ کا پورا پورا قبضہ اور غلبہ ہے اور اللہ ان سے دنیا ہی میں انتقام پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں عذاب میں تاخیر ہے اور تاخیر کا منشا توبہ کے لیے مہلت دینا ہے۔ روز قیامت ان کو ڈبل عذاب ہوگا۔ اور اس لیے ہوگا۔ کہ اللہ سبحانہ نے ان کو سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں، اور سمجھنے کے لیے دل دیئے تھے۔ انہوں نے ان سے کام نہیں لیا بلکہ حق کے سننے میں بہرے اور

حق کی پیروی میں اندھے بن گئے ۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں ۔

ان لوگوں کی تباہی ناگزیر ہے یہ خود کو اللہ کی گرفت سے زمین میں بچا نہیں سکتے اور نہ اللہ کے سوا ان کے خیال کے مطابق مددگار ان کو بچا سکتے ہیں ۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہے عذاب میں تاخیر ہو ۔ آخرت میں ان کو ڈبل عذاب ہو گا ۔ یہ لوگ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے حق کو سننا نہیں چاہتے تھے اور راہ حق کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے ۔

۲۸ آخرت میں سب سے گھاٹے والے

ان ہی لوگوں نے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دیا ہے اور زندگی میں حق کے خلاف جو افترا پردازیاں کرتے تھے ۔ وہ سب اکارت ہو جائیں گے ۔ تباہی میں ڈالنا یہی کہ ابدی عذاب میں گرفتار اور سب جھوٹے دعوے وہاں پہنچ کر گم ہو گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے گھاٹے میں رہیں گے ۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اپنی صلاحیتیں اس طرح برباد کی ہیں ۔ انہوں نے خود کو اپنے ہاتھوں برباد کیا ہے اور جن کی مدد اور شفاعت کے اعتماد پر یہ خطرناک کھیل کھیلے ان میں سے کوئی ان کے کام نہ آئے گا ۔ کیونکہ اللہ سبحانہ پر افترا کر کے محض اپنے ذہن سے جو خیالی پلاؤ پکاتے تھے وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گے ۔

یہ استیناف بیانی ہے ان ہی لوگوں کا ایک اور چہرہ ہے جو روز قیامت بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے اور اعمال کے نتائج نمایاں ہوں گے اس روز ان کو نتائج کے لحاظ سے اپنی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ اور اللہ پر جو جھوٹ کی افترا پردازیاں کرتے رہے سب ہوا ہو کر رہ جائیں گی یعنی افترا پر مبنی سارے اعمال بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گے ۔ جن جن کے بارے میں جو جو افترآت کر رکھے ہیں ۔ سب ملیامیٹ اور ناپید ہو جائیں گے ۔ ان کی بنائی ہوئی شفاعتوں کے گھروندے مسمار ہو جائیں گے ۔ جن جن شخصیتوں کے اشخاص اور مجسموں کے سہارے ان کی مذہبی زندگی قائم تھی سب کافور ہو جائیں گے اور ان افترائی افکار ، افترائی اعمال ، افترائی اخلاق ، افترائی معاشرت ، افترائی معیشت رکھنے والے اس روز بلاریب سب سے زیادہ گھاٹے اور نقصان میں ہوں گے ۔ انکی حالت اس تاجر کی سی ہو گی جو نفع اور فائدے کے ولولوں کے ساتھ بازار میں آئے اور نفع کی جگہ نقصان سے دوچار ہو جائے ۔ یہ لوگ نقصان اور خسارے میں اس روز منفرد

ہوں گے۔ لاجرم انہم فی الاخرۃ ھم الاخسرون کی تعبیر بے حد بلیغ ہے یہ بتانے کے لیے ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔

(۲۹) لطف و مسرّت کا بلند تر مقام

بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان کی نعمت سے ہمدوش ہوئے اور ایمان کی زندگی میں اعمال صالحہ کیے اور انہوں نے اپنے مولیٰ کے حضور میں عاجزی اختیار کی یہی جنت والے ہیں اور اس میں سدا رہنے والے ہیں۔ منکرین کی بدانجامی کے بالمقابل مؤمنین کا نیک انجام بیان فرمایا۔ ان کی عاجزی اللہ سبحانہٗ کو پسند آئی اس لیے اپنی دائمی خوشنودی کا ان کو مقام عطا فرمایا[۱]

ان کے مقابلے میں جو لوگ اپنے پرورش کرنے والے سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے زندگی گزار رہے تھے۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روک رہے تھے۔ جن کی ساری زندگی افترائی بنی ہوئی تھی وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی راہ اپنے رب پر ایمان کی راہ اپنائی اور اس طرح اپنا رشتہ اللہ سے قائم کرکے مؤمن ہو گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی زندگی میں اس ایمان کے تقاضے پورے کیے اور اچھے اچھے کام کیے۔ اللہ کی رضاجوئی کی ان کو فکر ہوگئی اور سارے اعمال وحرکات کو اللہ کے لیے مخصوص کر لیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے جذبات واحساسات بھی اللہ سبحانہٗ کے لیے خاص کر لیے۔ ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لیے دشوار تھا انہوں نے ایمان اور عمل صالح کی قوت سے اپنے اندر پیدا کر لیں۔ تااینکہ باطنی سلوک کی اس روشنی میں چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے۔ جس کی خبر قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے واخبتوا الی ربھم یعنی ایمان کی راہ سے اپنے پرورش کرنے والے کو جو پالیتے ہیں اور اس ایمان کے صدقے میں جو معنوی روشنی ان کو عطا ہوئی۔ اس روشنی کی شدت جس قدر زیادہ ہوتی گئی اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور ربوبیت کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگا۔ تاآنکہ ہر طرف سے ہٹ کر اللہ کے ہو کر رہ گئے۔ اطمینان وسکون کی اس نعمت کو لوگ روپے کے ڈھیروں بنک کی پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں میں تلاش کرتے ہیں لیکن اخبتوا الی ربھم کی باطنی نعمت جسے مل جاتی ہے اس کے پاس ظاہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس کے قلب میں سکون واطمینان ہوتا ہے۔ دل کے ڈانوا ڈول ہونے سے ان کو

[۱] افادات شیخ الاسلام

نجات مل جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی ان کے اندر جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اللہ سے بیگانہ لوگ سوچ ہی نہیں سکتے۔ اخبات کی باطنی روشنی جو ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں ان کو ملی تھی اسی روشنی میں انہوں نے معلوم کر لیا کہ اللہ سبحانہ کی ربوبیت سب کی پروردگاری کر رہی ہے وحدانی ربوبیت کے اس جلوے نے ان کے لیے اسیری غریبی، گھر میں ہونا اور بے گھر ہونا دونوں کو ایک کر دیا تھا ان کی قوم جو ایمان سے پیدا ہونے والی اس بصیرت سے محروم تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ لامحدود کثرتوں کے اس نظام کی ربوبیت و پروردگاری کے لیے صرف ایک ہی رب کیسے کافی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ایک خالق کے وجود کو ربوبیت و پروردگاری کے لیے ناکافی سمجھتے ہوئے انہوں نے دوسری ہستیوں کے ساتھ وہی رشتہ قائم کر لیا تھا جو رشتہ بندوں اور ان کے معبود میں ہوتا ہے۔ یعنی ان سے مدد حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان سے دعائیں مانگتے تھے، ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے، مگر ان مؤمنین اور مخلصین کے استکبار اور غرور نفس چھوڑ کر اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کی۔ اس کی بندگی اور غلامی پر مطمئن ہو گئے اور اس کے فیصلوں پر راضی ہو گئے۔

(۳۰) دو مثالی جماعتوں کی تمثیل

ان دونوں فرقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا ہو۔ اور دوسرا بینا اور شنوا ہو تباؤ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو یعنی منکرین حق اندھے اور بہرے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ارشاد ہوا ماکانو یستطیعون السمع وما کانوا یبصرون۔ پھر جسے نہ خود نظر آئے اور نہ دوسرے کی سن سکے اس کا آغاز و انجام کیسے ان روشن ضمیر ایمان والوں کے برابر ہو سکتا ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے حق و باطل اور بھلے برے میں تمیز کرتے ہیں اور اپنے ہادیوں کی باتیں بگوش ہوش سنتے ہیں۔ غور کرو ان دونوں کا انجام کیسے برابر ہو سکتا ہے؟ آگے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ اس کی تائید میں پیش کرتے ہیں[1]

دونوں جماعتوں کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد ان دونوں کی ایک تمثیل پیش کی ہے ایک اہل ایمان کی جماعت اور دوسری منکرین حق کی۔

منکرین حق کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھا اور بہرا ہو۔ اندھا ہونے کی وجہ سے راہ دیکھ

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں سکتا اور بہرا ہونے کی وجہ سے راہ آشنائی کی بات سُن نہیں سکتا ۔ یہ منکرین حق ہیں جو اندھے ہونے کی وجہ سے راہ حق نہیں دیکھتے ہیں اور بہرے ہونے کی وجہ سے راہ حق پر جانے والے کی پکار نہیں سنتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کی جماعت ہے جو آنکھوں سے بینا اور کانوں سے شنوا ہے ۔ حق کو آنکھوں سے دیکھ رہی ہے ۔ اور داعی حق کی بات کانوں سے سُن رہی ہے ۔ سوچو کہ یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں ۔ کیا روشنی اور اندھیرے میں کوئی فرق نہیں ہے ، کیا بصارت اور کوری کا ایک حکم ہے اگر نہیں ہے تو ضروری ہے کہ دونوں کے احوال و نتائج ایک دوسرے سے متضاد ہوں اور دنیا میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا کہ اب ہو رہا ہے ۔ سوچنے کی بات ہے کیا ان دونوں کو طرز عمل اور بالآخر انجام برابر ہو سکتا ہے ۔ ظاہر ہے جو شخص نہ خود راستہ دیکھتا ہو اور نہ کسی ایسے شخص کی بات ہی سنتا ہے جو اسے راستہ بتا رہا ہے وہ ضرور کہیں ٹھوکر کھائے گا ۔ اور کہیں کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوگا ۔ بخلاف اس کے جو خود ہی راستہ دیکھ رہا ہے اور کسی واقف کار کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ وہ ضرور منزل مقصود پر بسلامت پہنچ جائے گا ۔ یہی فرق ان لوگوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک اپنی آنکھوں سے بھی کائنات میں حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے ۔ اور اللہ سبحانہ کے روانہ کردہ رسول کی بھی بات سنتا ہے ۔ اور دوسرا نہ خود ہی دیکھتا ہے اور نہ پیغمبر کی بات سنتا ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دونوں برابر ہوں ۔ اعمال کا یہ اختلاف بزبان حال بول رہا ہے ۔ کہ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے قوم سے کہا۔ لوگو! میں تمہارے لیے کھلے طور پر نذیر بن کر آیا ہوں یعنی یہ بتانے آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی سے بھی عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ مجھے اندیشہ ہے تمہارے لیے دردناک عذاب کے دن کا[۳۱] ان کی قوم میں سے بڑے منکرین نے کہا تم تو ہمیں ہمارے ہی جیسے انسان نظر آتے ہو اور تمہارے پیچھے لگنے والے بھی بظاہر نیچ قوم کے لوگ نظر آتے ہیں اور تمہیں ہم پر کوئی بھی برتری نہیں ہے ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں[۳۲]

توحید عبادت پر تاریخی استدلال

توحید عبادت یہ ہے کہ جب خالق ایک ہے۔ ساری کائنات کا چلانے والا ایک ہے۔ تو ہمارے نیازمندانہ اعمال اور ہماری عبادتوں کا مستحق بھی ایک ہی ہے۔ ایک کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سرزمین عرب میں ملحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے۔ جو اللہ سبحانہٗ کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا ہمارے نیازمندانہ اعمال کے اور بھی مستحق ہیں۔ وہ دو خدا نہیں مانتے تھے۔ لیکن خدائی میں ضرور شریک مانتے تھے اور نظام عالم کے چلانے میں ان کو اللہ کا ساجھی اور ساتھی کہتے تھے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے اس کو براہ راست کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے۔ اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے۔ چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش غلہ کی پیداوار اور نباتات کی روئیدگی سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے۔ اس لیے ان کو عبودیت کا جو تعلق تھا ان ہی معبودوں سے وہ ان ہی کی عبادت کرتے تھے ان ہی سے محبت کرتے تھے۔ ان ہی پر نذرانے چڑھاتے ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے معرکوں میں ان ہی کے نام کی جے پکارتے اس بنا پر قرآن اور نبوت کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے۔ زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر و توہین ہے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو اجس کی رضا چاہی جائے، کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے سامنے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں۔ اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے، کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف رکھا جائے، جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جن سے حقیقی محبت رکھی جائے، کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ ہو جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے جو کسی کیلئے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ پرستش بھی اسی کی ہونی چاہیئے اور بندگی کے تعلقات بھی اُسی سے استوار ہونے چاہئیں۔ یہ ہے۔ توحید عبادت اور وہ دعوت جو قرآن پیش کرتا ہے اور جو نبوت محمدیہ لے کر آئی اور جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے ان میں سے ایک کا بھی انکار اللہ پر ایمان رکھنے کے دعوے کو بے معنے کر دیتا ہے۔

(۱۲۱) اور بلاشبہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے قوم سے کہا

لوگو ! میں تمہارے لیے کھلے طور پر نذیربن کر یہ بتانے آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی سے بھی عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ مجھے اندیشہ ہے تمہارے لیے دردناک عذاب کے دن کا یعنی نہایت وضاحت کے ساتھ دو چیزیں بتلاتا ہوں ۔ جن کے ارتکاب پر مہلک عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے یا جو اس عذاب سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں ۔غیر اللہ کی پرستش سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت عذاب آنے کا اندیشہ ہے۔ ہے۔دردناک دن سے وہ دن مراد ہے ۔جس میں المناک اور دردانگیز حوادث کا وقوع ہوگا مثلاً قیامت کا دن یا وہ دن جس میں قوم نوحؑ غرق آب کی گئی[1]

سورت کے آغاز میں جو دعویٰ کیا گیا تھا ۔ان لا تعبدوا الا اللہ یہاں سے اسی دعوے کے تاریخی دلائل شروع ہوئے ہیں ان تاریخی دلائل میں پہلی کڑی حضرت نوح علیہ السلام کی ہے۔قرآن کے ارشادات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جسے ہم آج عراق کہتے ہیں ۔بابل کے آثار قدیمہ بائبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور توراۃ میں ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے ۔جو روایات کردستان اور اور آرمینیا قدیم ترین زمانہ سے نسلاً بعد نسل آرہی ہیں ۔ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی ۔موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس آرمینیا کی سرحد پر کوہ اراراط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے ۔ اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام نے رکھی تھی ۔حضرت نوحؑ کے واقعہ سے ملتی جلتی روایات یونان ،مصر ،ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں ۔اس کے علاوہ برما ، ملایا ،جزائر شرق الہند ، آسٹریلیا ، نیو گنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں ایسی ہی قدیم زمانہ سے روایات چلی آرہی ہیں ۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی ۔ اور پھر وہاں سے مختلف حصوں میں پھیلی ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے ۔جو اس سورۃ کے شروع میں آئے ہیں انی لکم نذیر مبین اور ان لا تعبدوا الا اللہ اور انی اخاف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علیکم عذاب یوم الیم. سورۃ کے شروع میں پڑھ آئے ہو. ان لا تعبدوا الا اللہ اننی لکم منہ بشیر و نذیر. اسی دعوے پر یہ تاریخی شہادت ہے جو بات آج کہی جا رہی ہے. وہی بات تاریخ کے ہر دور میں کہی گئی ہے. جو بات محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں وہی بات حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ ان لا تعبدوا الا اللہ اس کے سوا اس کا مطلب کچھ نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔

اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات کیوں نہ رکھو؟ اس لیے کہ لا الہ الا اللہ پوری کائنات ہستی میں اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے. الٰہ مفعال کے وزن پر ہے. اس کے معنے اس ذات کے ہیں. جس کی عبادت کی جائے. جیسے امام اس کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے. ہر قوم کے نزدیک جس کی عبادت کی جائے وہ اِلٰہ ہے. خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل. لفظ اللہ اسم ذات ہے جبکہ الٰہ اسم ذات نہیں اسم صفت ہے. یعنی خدا کی ساری صفتوں کا موصوف لفظ اللہ ہوتا ہے. بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دونوں مترادف نہیں ہیں. لا الہ الا اللہ کے یہ معنے نہیں کے خدا کے سوا خدا کوئی نہیں بلکہ صحیح معنے یہ ہیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں قرآن عزیز کے عام مترجمین نے اس کا ترجمہ غلط اور مراد متکلم کے خلاف کیا ہے. صرف حضرت شاہ عبد القادرؒ، شیخ الہندؒ نے ترجمہ صحیح کیا ہے. یہاں جو بات منفی انداز میں کہی گئی ہے. دوسرے موقعہ پر مثبت انداز میں اس طرح پیش کیا ہے. یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ. لوگو! اللہ سے عابدانہ تعلقات رکھو اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے. اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جس فطری جذبے کی راہنمائی میں دعا، نذر قربانی وغیرہ مختلف اشغال و اعمال کی صورت میں استفادہ کیا جاتا ہے اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ سبحانہ کی ذات مبارک کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ. اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں. موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد آنے والی زندگی. ہر زندگی کی ضروریات کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الٰہ سب ضروریات میں ہے. دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الہ الدنیا والٰہ بالآخرۃ ہے. بلاشبہ انبیاء کی دعوت میں حق تعالیٰ شانہٗ کی الٰہیت کو الدنیا بالآخرۃ کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے. بلکہ عموماً ان لا تعبدوا الا اللہ کا خطاب جن لوگوں سے تھا. اور جن کی غلطی کی تصحیح نبوت کے پیش نظر تھی وہ اولا الدنیا کی ضرورتوں کی بجائی کے لیے اللہ کے سوا دوسروں سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہیں. یعنی اللہ کے سوا جن کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی ہیں. مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے. کھیتیوں کی پیداوار

میں برکت دی جائے ۔ باغوں کو آفتوں سے محفوظ رکھا جائے، قحط دور کیا جائے، بیماریوں اور وباؤں سے تحفظ ہو، ہنر مند اولاد ہو، دشمنوں پر فتح نصیب ہو۔ غیر اللہ کو الہ بنا کر جو پوجا پاٹ کرتے ہیں ان کی غرض یہی ہوتی تھی اور اب بھی یہی ہے آج بھی دنیا میں الوہیت میں شرک پس منظر معاشی ضرورتوں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ آپ نے کسی مندر کے پجاری، کسی گرجا میں حضرت مسیح کی مورتی کے سامنے پوجا پاٹ کرنے والے اور کسی مزار پر چڑھاوا چڑھانے والے کو یہ مانگتا ہوا کبھی نہ دیکھا ہو گا ۔ کہ عذاب قبر سے بچایا جائے، حشر کی پریشانیاں دور ہوں ۔ جہنم سے حفاظت ہو ۔ جنت کی ابدی زندگی ملے ۔ بلکہ جو کچھ ان معبودوں اور الہوں سے ان کا تعلق سارا کا سارا دنیا کی ضرورتوں سے ہے ۔ ایسی حالت میں نبوت کا ان سے یہ مطالبہ کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرو ۔ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو ۔ اس کا مطلب مخاطب کے طرز عمل کی بنیاد پر یہی ہو سکتا ہے کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو ۔ ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے بجائے ان کے اللہ سبحانہ کو اپنا الہ بناؤ ۔ اس لیے کہ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ کا اولین رخ دینوی زندگی کی پیچیدگیاں ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو مانگنا بھی اللہ سے چاہیئے اور سب کچھ مانگنا چاہیئے ۔ حتی کہ خمیر میں ڈالنے کے لیے نمک بھی ۔

کاش ان لا تعبدوا الا اللہ کا مقصد سمجھ لیا جاتا تو معاشی ضرورتوں کے لیے اللہ سے عابدانہ تعلقات کا طریقہ رفتہ رفتہ جو مسلمانوں میں مفقود ہوتا جا رہا ہے وہ مفقود نہ ہوتا ۔ اور آج امت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقہ نے ان ہی معاشی ضرورتوں کے لیے مختلف ناموں سے ہر جگہ الہ بنا رکھے ہیں ۔ اور جنہیں دیکھ کر اہل ایمان کا کلیجہ منہ آتا ہے ۔ وجود میں نہ آتا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

غربت و افلاس کے اس دور میں آج بھی مسلمانوں کی دولت، ان کا وقت، ان کی توانائیوں کی بہت بڑی مقدار ان بے سود مشرکانہ اعمال پر صرف ہو رہی ہے یہ تو دنیا میں ہے ۔ اور خدا ہی جانتا ہے ۔ کہ اس سلسلے میں کتنوں کے اعمال و افعال شرک جلی کی ان حدود کو پھاند رہے ہیں جن کے بعد اخروی زندگی کی ان تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے گا جن کی خبر قرآن نے دی ہے ۔

"ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ"

خلاصہ یہ ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ کا مطالبہ اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک خود ساختہ الہوں سے انسانی زندگی کا عابدانہ تعلق نہیں ٹوٹتا ۔ اور یہ تعلق اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک اللہ سبحانہ سے معاشی ضرورتوں میں الہ ہونے کا تصور پختہ نہ ہو جائے ۔ ایسا تعلق جو ہر وقت، ہر حال میں ۔ ہر جگہ اس کے پاس ہو، اس کو محیط ہو ۔ ظاہر و باطن، اول و آخر سب پر وہی حاوی ہو جائے ۔ کس قدر

دردانگیز ہے یہ سماں کہ انسان زندگی کے تمام شعبوں میں مدد تو اللہ سبحانہٗ سے حاصل کر رہا ہے قدموں سے لے کر انفاس تک تو اس کے سہارے گزارتا ہے لیکن بھجن دوسروں کے گاتا ہے۔ دہائی دوسروں کی دیتا ہے۔ قرآن نے ان لاتعبدوا الا اللہ کہہ کر انسان کو بتایا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے اور اسی سے زندگی کی ساری شاخوں میں مدد مانگی جائے۔ جو معبود ہو وہی مستعان ہو۔ جس کا کھایئے اسی کا گایئے اس مقصد میں کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ لہٗ الآخرۃ کے ساتھ لہ الاولی کے قرآنی یقین کو دلوں میں پوری طاقت کے ساتھ پیدا کرے۔ آخر سوچیئے کہ اللہ سبحانہٗ کو معبود بنانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیداواروں کو مانگا جائے۔ بلا شبہ علم و یقین کا جس احساس پر دعا کا یہ شعبہ قائم ہے یعنی یہ بات کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے یہ ایسا دعویٰ ہے جو وجدانی طور پر ہر ایک کی فطرت کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔ قرآن نے اس کی خبر دی ہے۔ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ بات صاف ہے کہ جب ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے تو پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنے کے لیے ان لاتعبدوا الا اللہ کی تعمیل کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے اور اللہ کو معبود مان لینے کے بعد الٰہ باطلہ کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور معاشی خساروں کی وہ ساری راہیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ جن کی بے حاصلی کو دیکھ کر بصیرت والوں نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے ہیں۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ان لاتعبدوا الا اللہ اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی کی پرستش اور بندگی نہ کرو دعاؤں، طلبگاریوں، درودوں، وظیفوں میں اللہ کے سوا کسی کے سامنے طلبگاری کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤ احیب الدعوۃ الداع اذا دعان اسی کی شان ہے ادعونی استجب لکم اسی کا مقام ہے۔ ان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم اسی کا اعلان ہے اگر تم سرکشی سے باز نہ آئے تو عذاب کا ایک بڑا ہی دردناک دن آنے والا ہے یہ وہی بات ہے جو نبوت محمدیہ نے آغاز سورۃ میں پیش کی تھی۔ ان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر۔ دونوں باتوں میں کیسی ہم آہنگی ہے۔ جو بات مکہ میں کہی جا رہی ہے وہی بات عراق میں حضرت نوح علیہ السلام ہزاروں سال پہلے فرما رہے ہیں۔ یہی قرآن کا مقام استشہاد ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرو۔ تاریخ کا مطالعہ تمہیں بتائے گا کہ دنیا کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جہاں اس طرح کا معاملہ پیش نہ آیا ہو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آ رہا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے کہ قوموں میں ایک خاص قسم کی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انہوں نے ایک خاص طرح کی صدا بلند کی اور ان کے اور ان کی قوم کے درمیان خاص طرح کے معاملات پیش آئے اور بالآخر نتیجہ رونما ہوا اور اس نتیجے نے تمام قضیے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ سارا معاملہ اپنی

ساری باتوں میں کچھ اس طرح یکساں اور ہم آہنگ ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حقیقت ہے جو بار بار ابھرتی اور اپنے آپ کو دکھاتی رہتی ہے یا ایک ہی زنجیر ہے جس کی مختلف کڑیاں یکے بعد دیگرے رونما ہوئی ہیں یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ ملکوں اور قوموں کا اللہ سبحانہٗ کی جانب سے قانون سعادت و شقاوت ایک ہے۔ چونکہ ہمیشہ کام کرتا رہا ہے اس لیے اب بھی ضرور کام کرے گا۔

(۳۲) زعماء، قوم اور حکمران کی سرکشی

ان کی قوم میں سے بڑے متکبرین نے کہا کہ تم ہمیں ہمارے ہی جیسے انسان نظر آتے ہو اور تمہارے پیچھے لگنے والے بظاہر نیچ قوم کے لوگ نظر آتے ہیں اور تمہیں ہم پر کوئی بھی برتری نہیں ہے ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ یعنی رسول کو تمام قوم کے مقابلے میں نمایاں امتیاز ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح جنس بشر ہو کوئی آسمان کے فرشتے نہیں ہو جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جائیں پھر بشر بھی ایسے نہیں جسے کوئی خاص تفوق اور بڑائی ہم پر حاصل ہوتی۔ مثلاً بڑے دولت مند اور جاہ و حکومت کے مالک ہوتے۔ جو لوگ تمہارے پیرو ہوتے وہ بھی ماشاء اللہ سب کے سب مفلس، رزیل، پست اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں۔ جن کے ساتھ بیٹھنا بھی ہم جیسے شریفوں کے لیے ننگ و عار کا موجب ہے تو کیا ساری خدائی میں سے تم ہی ملے تھے۔ جنہیں خدا نے اپنے منصب سفارت پر مامور فرمایا۔ آخر ہم تم میں سے حسب نسب، مال و دولت، خلق و خلق کس بات میں کم تھے۔ جو ہمارا انتخاب اس عہدہ کے لیے نہ کیا گیا۔ کم از کم آپ کا اتباع کرنے والے ہی کوئی معزز اور بڑے آدمی ہوتے بھلا ان موچیوں اور حجاموں کا تابع ہو جانا آپ کے لیے کیا موجب فضل و شرف ہو سکتا ہے اور کس طرح صداقت کی دلیل بن سکتی ہے ایسے سطحی لوگوں کا جن کی پستی اور رزالت بالکل عیاں ہے بے سوچے سمجھے بدوں غور و تامل کے ظاہری اور سرسری طور ایمان لے آنا آپ کا کون سا کمال ہے بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سب جھوٹے ہو۔ تم نے ایک بات بنائی اور چند بے وقوفوں نے ہاں میں ہاں ملادی تاکہ اس طرح ایک نئی تحریک اٹھا کر کوئی امتیاز اور بزرگی حاصل کر لیں یہ ان ملعونوں کی تقریر کا ماحصل تھا۔ نوح علیہ السلام کا جواب آگے آرہا ہے[1] لفظ مَلأَ ملأ یملأ سے بنا ہے لغوی مفہوم بھرنا ہے اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جن میں طاقت بھری ہوئی ہو۔ جیسے

---

[1] افادات از شیخ الاسلام

کسی قوم کے اشراف واعیان اور اکابر وسادات مطلق جماعت کے معنے میں نہیں بلکہ اہل حل وعقد یا اہل الرائے کو کہتے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ اشرافھم ووجوھھم۔ قوم کے اشراف اپنی رائے کی خوبی اور طاقت کی نمائش سے لوگوں کی آنکھوں کو بھر دیتے ہیں۔ یا اپنی قوت انتظامی سے دلوں میں ہیبت بھر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کو ملأ کہتے ہیں علامہ ابو السعودؒ کہتے ہیں۔ جو لوگ زینت محفل ہوں دلوں میں ان کی عظمت وہیبت بھری ہوئی ہو۔ اور آنکھوں میں ظاہری حسن وجمال ہو تو ان کو ملأ کہتے ہیں۔ امام راغب نے بھی ابو السعودؒ کی تائید کی ہے۔ بہرحال قوم کے ان زعماء اشراف واعیان نے حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں انی لکم نذیر مبین ان لا تعبدوا الا اللہ بیک وقت تین باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ ما نراک الا بشرا مثلنا

دوسری یہ کہ ما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا

تیسری یہ کہ ما نری لکم علینا من فضل

ان تینوں مقدمات یا ان کی بنیاد انکے خیال میں یہ ہے کہ نبوت ایک درجہ کمال ہے اور درجہ کمال حاصل ہونے کے لیے تین باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو اگر اللہ سبحانہ روانہ فرماتے تو اس کے لیے کسی برتر مخلوق جیسے فرشتے کو رسول بنا کر روانہ کرتے۔ یہی وہ بنیادی گمراہی ہے جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت کے منکر ہو گئے ان کا خیال ہے کہ انسان کو انسان کا بیٹا کیونکہ نجات دے سکتا ہے اور یہ نہ سمجھے کہ انسان ماں کے پیٹ سے گنہگار نہیں ہے بے گناہی اور معصومیت کے لیے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے یہی بات دوسرے منکرین نبوت کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ انبیاء علیہم السلام کو ظاہری اور جسمانی طور پر اپنی ہی طرح کا انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہ سمجھتے۔ ان انتم الا بشرا مثلنا دوسروں کو نبی کے انکار پر بھی اسی دلیل سے آمادہ کرتے ھل ھذا الا بشر مثلکم حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی اسی بیماری کا شکار تھی۔ انہوں نے اپنے دعوے کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدے کا سہارا لے کر پیش کیا۔ ما نراک الا بشرا مثلنا

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں۔ اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے ہیں رحلت فرما کے وارثا ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی باکرامتی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ

سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق الفطرت بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں۔ قرآن ایک طرف انبیاء کو مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اللہ سبحانہٗ کے حکم کے سامنے عاجز تسلیم کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ ان کو اللہ سبحانہٗ کا برگزیدہ معصوم اور نیک اور اللہ سبحانہٗ کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب وغریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے۔

اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے۔ قرآن نے ان کے خیال کی بار بار تکذیب کی ہے۔

قوم نوحؑ کے زعمار اشراف اور اکابر کا موقف بھی یہی تھا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے انسان ہوتے ہوئے تم اس کمال کے لائق نہیں ہو۔ یہاں علامہ بقاعیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

فرشتہ نہیں ہو جس میں رسالت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تم تو آدمی ہو اور آدمی میں رسول ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

براہمہ کی بھی یہی رائے ہے۔

یعنی ان کے خیال میں انسان میں روحانی کمال حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی نبوت کے موضوع پر ان کی فکری گمراہی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کا وہ فیصلہ پہلے کرچکے تھے اس فیصلہ کے لیے بطور دلیل پہلے یہ بات پیش کی ہے کہ چونکہ آپ انسان ہیں اس لیے تم نبی نہیں ہو۔ دراصل چونکہ ان کے پیش نظر اسباب کمال نہ تھے اس لیے کمال کے اسباب کو مقرر کرنے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ استدلال کی اسی غلطی نے ان کے منہ سے یہ بات نکلوائی۔ ما نراک الا بشرا مثلنا۔ استدلال کا رُخ بجائے کسی معقول اساس کے اپنے دیکھنے کی طرف پھیر دیا۔ اور جب دیکھا کہ یہ استدلال ناتمام ہے تو بات کو دوسری طرف لے گئے اور بولے ما نراک اتبعک الا الذین ھم۔ اراذل جمع ارذل کی ہے بالخلاف قیاس رذیل کی جمع ہے یعنی تمہارے پیچھے لگنے والا ہمارے معاشرے کا اور شہری زندگی کا وہ طبقہ ہے جو کہ شہری زندگی میں نیچ اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں۔ انداز تعبیر ما نراک اتبعک الا اراذلنا چھوڑ کر الا الذین ھم اراذلنا۔ صرف یہ بتلانے کے لیے اختیار کیا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کی پیروی کرنے والوں کی شہری زندگی میں بہت زیادہ شہرت تھی۔ یہ بھی ان کی فکری کجی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے کہ حصول کمال کے لیے معیار معاشی اور معاشرتی برتری کو بنا رہے ہیں۔

سوچیے ان دو باتوں میں کون سا منطقی ربط ہے کہ چونکہ تمہارے پیروکار نادار، غریب، اور ضعفا ہیں۔ اس لیے آپ پیغمبر نہیں ہیں۔ یہ ان کی مادہ پرستانہ نگاہ کا قصور ہے ورنہ حصول کمال کے لیے امیری، دولت مندی شرط نہیں ہے۔ دیکھنے کی چیز دولت و سرمایہ نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز فکر صحیح، عمل صالح اور اخلاق حسنہ ہیں۔ خود انکے نزدیک بھی انکار نبوت کیلئے اس دلیل میں کوئی قوت نہیں ہے اسی لیے اس سے ہٹ کر تیسری بات یہ کہہ دی مانری لکم علینا من فضل ہم پر تمہیں کوئی برتری نہیں ہے لہٰذا ہم تمہیں نبی کیسے مان لیں۔ یہ ان کے اندر کی بات ہے۔ قلب کی طہارت، ایمان کی قوت، اعمال کی کیفیت، اور اخلاق کی بلندی پر ان کی نظر نہ تھی۔ ان کو جو کچھ آنکھوں سے نظر آرہا تھا یہی کہ ان کے مقابلے میں حضرت نوح ؑ کو سرمایہ اور دولت کی برتری حاصل نہ تھی۔ زعامت، سیادت کی طرح نبوت ہے جیسے نادار کو ہم چودھری نہیں بناتے اسی طرح نادار کو ہم نبی بھی نہیں مانتے یہ باتیں اپنے خیال میں بطور دلیل پیش کرکے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا۔ بل نظنکم کاذبین۔ ہمارے خیال میں نبوت والی بات تم نے جھوٹ اڑائی ہے۔ غور کیجیئے یہی باتیں جن کے سہارے قوم نوح علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر رہی تھی۔ بعینہٖ یہی باتیں قریش مکہ کی زبان پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر آئی ہیں۔ قرآن میں ہے۔

مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق

اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا بھی کھاتا ہے۔ بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔

یہ اور اس قسم کی ساری باتیں مشرکین مکہ ہی کہتے تھے۔ یہاں قرآن کا موقف یہی ہے کہ جتنے رسول بھی آئے وہ ایسے ہی وقتوں میں پیدا ہوئے اور جن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی پکارہ بھی یہی تھی اور پکار کی نوعیت بھی یہی تھی۔ ان کی دلیلیں بھی یہی تھیں جن باتوں پر انہوں نے زور دیا وہ بھی یکسانی تھیں۔ ان ساری باتوں میں جیسے ایک رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا۔ اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ سارے انبیاء علیہم السلام اس حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہ رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا
وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًاؕ اِنْ
اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّىْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ
يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ
لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ
لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِىْۤ اَعْيُنُكُمْ
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًاؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْۚ اِنِّىْۤ
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا لوگو! تمہاری اس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر میں فی الواقع اپنے رب کی جانب سے ایک روشن اور صاف راستہ پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جانب سے خاص رحمت سے نوازا ہو یعنی نبوت دی ہو۔ مگر وہ تمہیں نظر نہ آتی ہو تو کیا ایسی صورت میں میں

اور میرے ساتھی تمہیں اس کے بارے میں مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اس سے بیزار ہو[۳۲]۔ لوگو! میں اس کام پر تم سے کوئی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں۔ مزدوری تو مجھے اس کام کی وہی دے گا۔ جس کا میں کام کر رہا ہوں یعنی اللہ[۳۴]۔ اور دیکھو میں ان لوگوں کو دھکے نہیں دے سکتا جو نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئے ہوں خواہ وہ تمہاری نظر میں کتنے ہی حقیر ہوں۔ وہ بلاشبہ اپنے پروردگار کے حضور پیش ہوں گے[۳۵]۔ لیکن میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ اس راہ میں تم عقل سے بے بہرہ ہو حقیقت تک تمہاری کوئی رسائی نہیں ہے[۳۶]۔ لوگو! بتاؤ کہ اگر میں ان کو دھکے دیدوں تو مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے ہو[۳۷]۔ اور دیکھو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالموں میں سے ہوں گا[۳۸]۔

مفردات کے معانی

عُمِّیَت : وہ چھپا دی گئی نظروں سے اوجھل کر دی گئی تعمیہ سے بنا ہے۔ باب تفعیل ہے۔ مادہ عمی ہے

عمی یعمی باب سمع سے ہے۔ مشتبہ ہوجانا۔ نظروں سے اوجھل ہونا علامہ احمد فیومی نے مصباح میں عمی الخبر کے معنے خبر پوشیدہ ہونے کے لکھے ہیں۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں عمی علیہ کے معنے کسی چیز کا ایسا مشتبہ ہونا کہ آدمی اس کے لحاظ سے اندھا ہوجائے اور وہ چیز اسے بالکل سُجھائی نہ دے ارشاد ہے فعمیت علیہم الانباء پھر سُجھائی نہ دیں گی اس دور کی ان کو باتیں نیز اٰتانی رحمۃ من عندہ فعمیت علیکم اور اس نے بھیجی مجھ پر اپنی رحمت اپنے پاس سے پھر وہ تمہاری نظروں سے اوجھل کر دی گئی۔

علامہ خفاجیؒ عنایت القاضی میں لکھتے ہیں دلیل سے اندھا ہونے کا مطلب مجازاً دلیل کا چھپ جانا ہے محاورے حجۃ عمیاء بولا جاتا ہے جیسے واضح اور روشن دلیل کے لیے حجۃ بصرہ بولا جاتا ہے۔ دلیل کی پوشیدگی کو عمی سے تشبیہ دی گئی ہے اس لیے استعارہ تبعیہ ہے۔

تزدری: زری سے باب افتعال ہے مصدر ازدرا ہے اس کے معنے حقیر سمجھنے کے ہیں۔ مضارع کا صیغہ واحد مؤنث ہے۔ زری یزری باب سمع آتا ہے محاورہ ہے زری علیہ عملہ اس کے کام میں عیب نکالا ازری بالامر عیب نکالا۔ اسی سے باب افتعال ازدرا، اور باب استفعال استزرا آتا ہے۔ حقیر سمجھنے کے معنے میں۔

(۳۳) زعماء قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کا جواب

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا لوگو! تمہاری اس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر میں فی الواقع اپنے رب کی جانب سے ایک روشن اور صاف راستہ پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی جانب سے خاص رحمت سے نوازا ہو یعنی نبوت دی ہو۔ مگر وہ تمہیں نظر نہ آتی ہو تو کیا ایسی صورت میں میں اور میرے ساتھی تمہیں مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اس سے بیزار ہو یعنی یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کو عام انسانوں سے بالکل ممتاز ہونا چاہیئے لیکن وہ امتیاز مال و دولت، ملک و حکومت اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق، بہترین اخلاق، بہترین ملکات، تقویٰ خداترسی، حق پرستی، دردمندی، خلائق اور ان صریح آیات و نشانات پیش کرنے سے ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ بطور اتمام حجت اور اکمال نعمت ان کے اندر قائم کرتا یا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ وحی الٰہی اور ربانی دلائل و براہین کی روشنی میں صاف راستے پر چلتے ہیں۔ اور دن رات خدا کی خصوصی رحمتیں ان پر بارش کی طرح برستی ہیں۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ سب چیزیں مجھ میں کھلے طور پر موجود ہوں اور یقیناً موجود ہیں جس طرح اندھے کو

سورج کی روشنی نظر نہیں آتی ۔ تو تمہاری آنکھیں بھی اس نور الٰہی کے دیکھنے سے قاصر ہیں تو کیا ہم زبردستی مجبور کرکے تم سے اس نور اور رحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں ۔جس سے تم اس قدر نفور و بیزار ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہو ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ میری بزرگی اور برتری جو تم کو نظر نہیں آتی ۔ یہ اس لیے ہے کہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں یا بند ہیں[1]

منکرین حق نے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کی تکذیب کے لیے پہلی بات یہ کہی تھی ۔ما نراک الا بشرا مثلنا ۔حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے اسی کا جواب دیا ہے کہ جس انسان کو نفس ناطقہ پر فضیلت ہے کہ یہ عقلی خصوصیت حیوان میں نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اسی طرح انبیاء کو اپنے نفوس قدسیہ کی وجہ سے تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے نفس قدسی اور اپنے پیغمبرانہ قوت کی وجہ سے دوسروں کو راہ راست سمجھاتے ہیں ۔اور خود راہ راست پر قائم ہوتے ہیں ۔ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے برتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت کا فرض انجام دیتے ہیں ۔اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ معلوم ہوتے ہیں ۔اگرچہ تمام انسانوں کے ساتھ بشریت میں شریک ہوتے ہیں ۔مگر فضیلت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتے ہیں ۔کیونکہ ان میں وحی قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی ہے اسی بات کو حضرت نوح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ۔

ان کنت علی بینۃ من ربی و آتانی رحمۃ من عندہ

یعنی ہوں تو میں انسان اور ہوں بھی تمہارے ہی جیسا لیکن اس کے ساتھ میں اپنے مولی کی جانب سے بینہ پر ہوں ۔اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے عظیم الشان رحمت سے نوازا ہے تمہیں میرا انسان ہونا تو نظر آتا ہے لیکن اللہ سبحانہ، کی وہ نوازش تمہیں نظر نہیں آتی ہے جو مجھ پر ہوئی ہے ۔اسی بات کو حضرت نوح علیہ السلام نے فعمیت علیکم سے تعبیر کیا ہے یعنی نبوت والے اوصاف تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں ۔میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ۔ایک تو اس نور فطرت پر جو اللہ نے مجھ میں پہلے ودیعت کیا ہے یعنی نبی بننے کی صلاحیت ۔ دوسرے اس وحی

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

الٰہی پر جس سے اللہ سبحانہ نے مجھے نوازا ہے۔ اب تم خود سوچ کر بتاؤ کہ اگر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ واقعہ اور حقیقت ہے نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ یہ امر واقعہ ہے تو کیا اب میں تمہیں اس کے ماننے کے لیے مجبور کروں اور جبر سے تمہیں منواؤں اور ایسی حالت میں منواؤں جبکہ تم اس سے بیزار ہو۔

اس ارشاد کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم اس دعوت سے بیزار ہو اور اس لیے نہیں مانتے ہو اور اس بیزاری کی علت عناد و عداوت کے سوا کچھ نہیں ہے تو ایسی صورت میں تمہیں ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا ہوں۔ کیونکہ نبوت کی دعوت اپنی اشاعت کے لیے صرف تبلیغ کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں اپنے مخاطبوں سے مطالبہ کرتی ہے۔ ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت پیش کرتی ہے وہ کیونکر الزام و اکراہ کے طریقہ کو اختیار کرے گی۔ نبوت کا اولین مطالبہ ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی ہے۔ یہ اسلام کی وہ اساس ہے جس کا اعلان سب انبیاء نے کیا ہے۔ ایمان و کفر دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے۔ فعمیت علیکم میں اسی طرف اشارہ ہے اس لیے قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ رسول کا کام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ زبردستی منوانا نہیں ہے۔

اس آیت سے یہ بھی اشارہ مل رہا ہے۔ میری مراد ان کنت علی بینۃ من ربی سے ہے یعنی یہ آیت بتا رہی ہے کہ انبیاء کرام جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب، سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں۔ تاکہ منصب نبوت ملنے کے بعد ان کے دعویٰ نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی موجود ہو۔ شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں اس بات کا اشارا کیا ہے۔ علامہ بقاعیؒ نے علی بینۃ کی تفسیر میں لکھا ہے،

روشن دلیل مجھے میرے رب نے دی ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے یہ روشن دلیل میرے دعوی نبوت کی شہادت ہے اس میں کسی با انصاف آدمی کو شبہ نہیں ہو سکتا ہے

علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں ۔

کھلی دلیل میرے رب کی جانب سے یہ میرے دعویٰ کی صداقت کی گواہ ہے ۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس سے مراد معجزہ نہیں ہے کیونکہ اگر معجزہ مراد ہوتا تو تعبیر یہ نہ ہوتی کنت علی بینۃ من ربی ۔ میں اپنے رب کی جانب سے بینہ پر تھا ۔ بلکہ یوں کہا جاتا انا علی بینۃ من ربی میں اپنے رب کی جانب سے بینہ پر ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ بینہ وہ نور فطرت ہے جو انبیاء کو خاص طور پر اللہ سبحانہ کی جانب سے ارزانی ہوتا ہے ۔

(۳۴) حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کی ایک اور دلیل

لوگو! میں اس کام پر تم سے کوئی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں ۔ مزدوری تو اس کام کی مجھے وہی دے گا جس کا میں کام کر رہا ہوں ۔ یعنی اللہ یعنی میں تبلیغ کے کام پر کوئی تنخواہ تم سے نہیں مانگتا ہوں ۔ جو مالی خود غرضی کا شبہ ہو ۔ میں تو اپنے پروردگار کا نوکر ہوں ۔ اسی کے یہاں سے مجھے مزدوری ملے گی ۔ بحمد اللہ نہ مجھے تمہارے مال کی ضرورت ہے نہ طلب ۔ پھر میں غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کی طرف کیوں جھکوں[1]

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی نبوت کے حق میں ایک اور دلیل پیش فرمائی ہے یعنی یہ کہ آپ اپنے اس کام میں بالکل بے غرض ہیں ۔ کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ دعوت کی راہ میں یہ ساری محنت اور تگ و دو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ کوئی مادی غرض آپ کے پیش نظر ہے ۔ یہ آپ اپنی قوم کے سرمایہ داروں اور سرداروں سے کہہ رہے ہیں ۔ کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کان کھول کر سن لو کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے ۔ سرتاسر تمہارا ہی نقصان ہے میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔ اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو مجھے تمہاری اس بیزاری کی پرواہ ہوتی لیکن جب میں تم سے کسی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں تو تم اس کو اگر قبول نہ کرو گے تو خود ہی گھاٹے میں رہو گے مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے وہ اللہ کے پاس ہے اور وہ مجھے مل کر رہے گا ۔ تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایک بے غرض ناصح ہوں اپنے کسی

[1] افادات شیخ الاسلام

فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی بھلے کے لیے یہ ساری مشقتیں اور محنتیں برداشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی مفاد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس امر حق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ محنتیں اور مشقتیں جھیلنے میں میرے پیش نظر ہو۔ آپ سورۃ شعرا ء میں پڑھیں گے کہ یہ بات نبیوں کی زبان پر آئی ہے۔

(۳۵) ایمان میں امیر و غریب برابر ہیں

اور دیکھو میں ان لوگوں کو دھکے نہیں دے سکتا جو نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئے خواہ تمہاری نظر میں کتنے حقیر و معیوب ہوں وہ بلاشبہ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے یعنی اگر تم میرے اتباع کو محض ان کے افلاس یا پیشہ کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ میں انہیں جو دولت ایمان کے سرمایہ داروں کو ظاہری خستہ حالی کی بنا پر جانوروں کی طرح دھکے دے کر نکال دوں۔ انہیں ایک روز پروردگار سے ملنا ہے وہ میری شکایت اس کے دربار میں کریں گے۔ کہ آپ کے پیغمبر نے متکبر دنیا داروں کی خاطر ہم غریب وفاداروں کو نکال دیا تھا۔ میں ظاہر حال کے خلاف یہ کیونکر کہوں کہ ان کا ایمان محض ظاہری اور سرسری ہے۔ دلوں کو چیر کر دیکھنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ پروردگار کے یہاں پتہ لگے گا۔ کہ ان کے دلوں کا کیا حال تھا[1]

یہاں تو انہوں نے یہ اعتراض کیا ہے وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا تمہارے پیروکار تو صرف نیچ قسم کے لوگ ہیں۔ اور دوسرے موقعہ پر اسی بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔ انؤمن لک واتبعک الارذلون۔ کیا ہم تجھے ایسی حالت میں نبی مان لیں جبکہ تیری پیروی نیچ قسم کے لوگ کر رہے ہوں۔ یہ ان کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی پوشیدہ تھی۔ کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے۔ اس لیے بڑے لوگوں میں سے کوئی شخص ان میں شامل ہونا گوارا نہیں کرتا ہے دوسرے الفاظ میں وہ گویا یوں کہہ رہے ہیں۔ کہ اے نوح ؑ کیا آپ پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو ان اراذل کی صف میں لا کھڑا کریں۔ کیا ہم غلاموں، نوکروں اور پیشہ ور لوگوں میں آبیٹھیں حضرت نوح علیہ السلام نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔ کہ میں یہ غیر معقول طرز عمل اپنے کام میں کیسے

[1] افادات شیخ الاسلام

اختیار کر سکتا ہوں کہ جو نہیں ملنتے ان کے پیچھے جاؤں اور جو مانتے ہیں ان کو دھکے دے کر نکال دوں
ما انا بطارد الذین امنو۔ میری حیثیت تو داعی کی ہے میں تو دعوت دے رہا ہوں کہ جس راستہ
پر تم چل رہے ہو یہ ہلاکت کا راستہ ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور
میں جس راستہ کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں۔ اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ جس کا جی چاہے میری بات
کو پذیرائی دے کر میرے بتائے ہوئے راستہ پر چلے میں یہ نہیں کر سکتا کہ آنے والوں سے دریافت
کروں کہ ان کی ذات برادری اور نسب نامہ کیا ہے۔ اگر وہ تمہاری نگاہوں میں نیچ ہوں تو ان کو واپس
کر کے اس انتظار میں بیٹھ جاؤں کہ سرمایہ دار لوگ کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم
رنجہ فرماتے ہیں۔

یہی صورت حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ میں پیش آئی اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام
اور ان کی قوم کا یہ مکالمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہی مقام استشہاد ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے۔ کہ ہم آخر بلال رض، صہیب رض اور عمار رض جیسے غلاموں کے
ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کا مطلب بھی یہی تھا۔ کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب و
فقیر لوگ نکالے جائیں۔ آپ سورۃ الانعام میں پڑھ چکے ہیں۔

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون
وجھہ ما علیك من حسابھم من شیٔ وما من حسابك
علیھم من شیٔ فتطردھم فتکون من
الظالمین

دور نہ کرو ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ جن کا مقصد
محض اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی ہے۔ ان کا کوئی حساب آپ کے ذمہ نہیں اور نہ
تمہارا کو حساب ان کے ذمہ ہے۔ تم ان کو دور کرو گے۔ تو تمہارا کوئی شمار بھی ان
ظالموں میں ہو گا۔

یہ ہدایت اس لیے کی گئی کہ سرداران قریش کے تمرد و غرور پر ضرب کاری لگائی جائے مطلب یہ ہے۔
کہ جو بکواس یہ لوگ کرتے ہیں کرنے دو آپ ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آگے جو
بات فرمائی ہے وہ بھی سنانا چاہتا ہوں۔

وکذالك فتنا بعضھم ببعض لیقولوا اھآؤلاء من اللہ علیھم

من بيننا أليس الله بأعلم بالشاكرين۔

اسی طرح ہم نے کچھ کا کچھ کے ذریعے امتحان لیا ہے۔ تاکہ کہنے والے کہیں ۔ کیا ہمارے معاشرے میں یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل ہو۔ کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا۔

مطلب یہ ہے کہ امارت اور غربت دونوں پرچہ امتحان ہیں غریب یہ نہیں کہہ سکتا کہ غریبی میرے اعمال کی سزا ہے اور امیر یہ نہیں کہہ سکتا کہ دولت ریل پیل میرے اعمال کی جزا ہے ۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ دنیا میں اگر کسی کو دولت مند بنایا ہے تو اس بنا پر نہیں بنایا کہ وہ اس کا حقدار تھا اسی طرح اگر کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کا سزاوار تھا۔ بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان مقصود ہے وہ جن کو دولت دیتا ہے ۔ تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پاکر اس کے شکرگزار متواضع اور فرماں بردار بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو بنظر حقارت دیکھنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں ۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر اور اپنے نان جویں پر قانع اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر پر خود دار رہتے ہیں ۔ یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی ، خدا سے برہم اور ذلیل وخوار ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ بس یہی امتحان فقیری اور امیری کا پس منظر ہے ۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو سمجھا رہے ہیں ۔ کہ اونچ نیچ کا مسئلہ تمہارا بنایا ہوا ہے۔ اس کا ایمان پر کوئی اثر نہیں ۔ امیر ہو یا غریب دعوت سب کے لیے ہے ۔ اگر میں غریب اہل ایمان کو ہٹا دوں۔ تو اس وقت میرا کیا حال ہوگا جب یہ لوگ بارگاہ الہی میں میرے خلاف استغاثہ دائر کریں گے ۔

(۳۷) حقیقت سے بے خبری

میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ اس راہ میں تم عقل سے بے بہرہ ہو۔ حقیقت تک تمہاری رسائی نہیں ہے یعنی جہل و حماقت سے انجام پر نظر نہیں کرتے ہو۔ صرف ان کی ظاہری شکستگی دیکھ کر حقیر سمجھتے ہو۔ اور ایسی مہمل درخواست کرتے ہو کہ ان کو ہٹا دیا جائے تو ہم تمہارے پاس آئیں ۔ کیا غربت اور کسب حلال کوئی عیب ہے یہ ہی چیز تو ہے جو حق کے قبول کرنے میں مزاحم نہیں ہے ۔ عموماً دولت وجاہ

کا نشہ انسان کو قبول حق سے روکتا ہے ۔ اسی لیے حدیث ہرقل میں آیا ۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے پیروکار ضعفاء ہوتے ہیں ۔ بہرحال تم نہیں جانتے کہ سب کو اللہ سبحانہ کے پاس جانا ہے ۔ وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھنا تمہارا جاہلانہ غرور تھا ۔[1]

جہل کے دو معنے ہیں ۔ ایک یہ کہ تم علم سے بیگانے ہو ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ان غریب اور نادار اہل ایمان کا اللہ سبحانہ کے یہاں کیا مقام ہے ۔ مال کی محبت نے تمہارا ذہنی توازن خراب کر دیا ہے ۔ اور مال کے عشق مفرط میں سرمایہ میں پیچھے رہنے والوں پر حماقت، سفاہت، ناقبت اندیشی اور اسی قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کر رہے ہو ۔ قرآن کی نگاہ میں یہ لوگ قوانین قدرت سے بے خبر ہیں ۔ ان کو رزق کے بارے میں قبض و بسط کے قوانین کا پتہ ہی نہیں ہے ۔

جہل کے دوسرے معنے احمق ہونے کے ہیں ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ غریب اہل ایمان کو رذیل کہہ کر تم بیوقوفی کا مظاہرہ کر رہے ہو ۔

دراصل انی اراکم قوماً تجھلون کے ذریعے ان کے علم کی تصحیح فرما رہے ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کہہ کر انکم قوم تجھلون بنی اسرائیل کی تصحیح علم فرما رہے ہیں ۔ اور نبوت تو آتی ہے تصحیح علم کی خاطر ۔ علامہ بقاعیؒ نے یہاں یہ بات بالکل برموقعہ لکھی ہے کہ

> تم جاہلوں اور بے خبر لوگوں کا کردار پیش کر رہے ہو ۔ سچ کی تکذیب کر رہے ہو اور اہل ایمان میں بلا وجہ کیڑے نکال رہے ہو ۔ اللہ کی عدالت سے نڈر ہو کر بے محل اور بے موقعہ تنگ بندیاں کر رہے ہو ۔

قوماً جاھلین کی تعبیر چھوڑ کر قوماً تجھلون اس لیے کہا ہے کہ تمہارا یہ کردار وقتی ہے ورنہ یہ تمہاری عادت نہیں ہے ۔

(۳۷) خدائی مواخذہ کا اندیشہ

لوگو! بتاؤ کہ اگر میں ان کو دھکے دیدوں تو مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا کیا تم اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر غور نہیں کرتے ہو یعنی میں تمہارے کبر و غرور اور جہالت سے متاثر ہو کر اپنا نقصان کیسے کروں۔ اگر تمہاری رعایت سے میں نے اللہ کے مخلص بندوں کو دھکے دے دیئے تو اس کی سزا اور گرفت سے مجھے کون بچائے گا جن کو تم رذیل کہتے ہو میں کبھی ان کو رذیل نہ کہوں گا۔ اور یہ نہیں کہوں گا کہ وہ خوبی و سعادت سے ہمدوش نہیں ہو سکتے اگر میں ایسا کہوں تو مجھ سے اللہ سبحانہ مواخذہ فرمائیں۔ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ اللہ کا پیغام پہنچانا میرا کام ہے اور بس۔ آیت میں اشارا ہے کہ جیسے ناداری و فقیری کی وجہ سے کسی شخص کو سعادت سے محروم نہیں رکھا جا سکتا ٹھیک نیچ اور رذالت کے جعلی پیمانوں کی بنا پر بھی کسی کو سعادت سے محروم کرنا جائز نہیں ہے اس میں درسگاہوں میں دین کا طالب علم ہو یا خانقاہوں میں شیخ طریقت سے طالب اصلاح ہو۔ دونوں کا حکم ایک ہے۔

نبوت کے ابتدائی مراحل میں نبوت کی دعوت پر لبیک کہنے والے نادار، کمزور اور ضعیف ہوتے ہیں۔ سرمایہ داران کمزوروں کو اپنے ایمان میں رکاوٹ بنا لیتا ہے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا۔ کہ آپ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ ان کو ساتھی کیسے ملے ہیں۔ بلالؓ، عمارؓ، صہیبؓ، رومیؓ اور خبابؓ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ پھر ان نادار اہل ایمان کی خستہ حالی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ قرآن نے اس موضوع پر نبوت کو دو ہدایتیں دی ہیں۔

ایک یہ کہ آپ ان کو اپنی مجلس سے نہ ہٹایئے یہ لوگ اپنے رب کو دن رات پکارتے رہتے ہیں اور ان کی تگ و دو یہی ہے کہ اللہ سبحانہ کی خوشنودی حاصل ہو۔

لا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی

دوسری یہ کہ

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ و یریدون وجھہ ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیاۃ الدنیا۔

اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے مالک کو

۱؎ افادات شیخ الاسلام

صبح و شام مقصود بنایا ہے اللہ سبحانہ کی ذات کو اور نہ ہٹانا اپنی دونوں آنکھیں ان سے کیا تم دنیا کی شان و شوکت چاہتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ قریش کے سردار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے۔ کہ یہ فقراء قسم کے لوگ بلالؓ، عمارؓ، خبابؓ اور صہیبؓ جیسے لوگ آپ کی مجلس میں ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کو ہٹا دو تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں گے۔ اس پر اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر آپ کے گرد جمع ہوئے اور صبح و شام اپنے مالک کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ آپ ان سے وابستہ اپنی نگاہ نہ پھیریئے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ سبحانہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا یعنی اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا اختیار کر لیا ہے۔ یہی تو اسلام کا آخری خلاصہ ہے ان کے ساتھ آپ اپنے کو جوڑے رکھیں ان سے اپنی نگاہیں نہ ہٹائیں۔

ظاہر ہے یہی دونوں ہدایتیں نبی ہونے کی حیثیت سے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی ملی تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا بھی یہی مطالبہ تھا۔ کہ ان فقراء مومنین کو اپنے پاس سے ہٹا دیجئے۔ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں فرما رہے ہیں۔ کہ اگر میں ایسا کروں تو یہ ربانی ہدایات کی نافرمانی ہوگی۔ اور اس نافرمانی کی پاداش میں جب اللہ سبحانہ میرا محاسبہ کریں گے۔ تو وہاں میری مدد کون کرے گا من ینصرنی من اللہ ان طردتہم ۔ میں ان کو چھوڑ کر ان لوگوں کے پیچھے نہیں جا سکتا ہوں جنہوں نے اپنے وجود کا نصب العین یہ بنا رکھا ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آرائشوں، آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی زندگی کی آخری سانس پوری کریں گے۔ افلا تذکرون ۔ بڑائی کے نشہ میں مخمور ہو کر تم اس بات پر دھیان نہیں دیتے ہو۔

(۳۸) مقامِ نبوت کی حد بندی

اور دیکھو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم بنظر حقارت دیکھتے ہو۔ اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔ کفار نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو۔ جتھے اور دولت کے اعتبار سے بھی کوئی امتیاز

نہیں رکھتے ہو۔ اس کا جواب نہایت متانت اور انصاف کے ساتھ دیتے ہیں۔ کہ بے شک جیسا تم امتیاز چاہتے ہو اس کا ہم دعویٰ نہیں رکھتے۔ بلا شبہ میں ایک بشر ہوں۔ نہ خدا نے اپنے سارے خزانے میرے تصرف و اختیار میں دے دیئے ہیں۔ نہ تمام غیب کی باتوں پر مطلع کیا گیا ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے اعتراف کے ساتھ تمہاری طرح یہ کبھی نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری نگاہ میں معیوب و حقیر ہیں یعنی میں اور میرے رفقاء ان کو ہرگز کوئی خیر بھلائی نہیں دے سکتا۔ مثلاً ان میں سے کسی کو نبوت و حکمت عطا فرماوے اور باقیوں کو ایمان و عرفان کی دولت سے بہرہ ور کرے۔ خوب سمجھ لو حق تعالیٰ ان کے مناسب فیض پہنچانا اور باطنی احوال و کیفیات کے موافق برتاؤ کرنا ہے۔ اس نے جو خاص مہربانی میرے ساتھیوں پر کی ہے وہ تمہاری آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ اگر میں یہ کہنے لگوں کہ جو تمہیں بظاہر شکستہ حال اور حقیر دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے بھی جو بواطن کا جاننے والا ہے انہیں کوئی عزت و شرف نہیں بخشا تو نہایت بے اصول اور ناانصافی کی بات ہوگی [1]

دراصل اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام نے مقام نبوت کے بارے میں اپنے حق طلبوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ روحانی ہدایت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کو پیش کرنے والا انسانیت سے بالاتر ہو۔ تمہارا یہ کہنا کہ ما نراك الا بشرا مثلنا۔ بتا رہا ہے کہ تم نبوت اور بشریت میں منافات سمجھتے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہ کہنا دلیل و حجت کی تلاش کی خاطر نہیں تھا۔ بلکہ محض سرکشی، ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس سے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جائے اور ہمیشہ راستبازوں کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرز عمل رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہاں کھول کر بتایا ہے کہ

۱۔ مختار کل ہونا اور اختیار ناطق رکھنا اور دولت کے انبار ہونا۔

۲۔ غیب دان ہونا اور غیب کی باتیں جاننا۔

۳۔ فرشتہ ہونا۔

۴۔ فقیری اور غریبی کو حقیر نگاہوں سے دیکھنا۔

لوازم و شرائط نبوت میں سے نہیں ہیں۔ مختار کل ہونا، غیب دان ہونا، اللہ سبحانہٗ کی صفات خاصہ میں سے ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں نہ نبی اور نہ فرشتہ۔ ان دونوں کی تعبیر علم اور قدرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ یہ دونوں خاصہ خداوندی ہیں۔ انسان کے علم کے ذریعے وجدان، حواس اور عقل واستدلال ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو علم حاصل نہ ہو۔ اس کو علم غیب سمجھتے ہیں۔ یا یوں کہہ دیجئے جو علم قرائن، وسائل ذرائع اور دلائل سے حاصل نہ ہو بلکہ خود بخود ہو وہ علم ہے یہ علم صرف اللہ سبحانہٗ کا ہی ہو سکتا ہے۔ جس کی ذات خود بخود ہے۔ اور جس کی ذات خود بخود نہیں اس کا علم بھی خود بخود نہیں۔ اللہ کی ذات قدیم اس کی صفات وجود علم وقدرت بھی قدیم ہیں۔

یہ بات ہدایت عقل کے خلاف ہے کہ موصوف خود بخود نہ ہو۔ اور اس کی صفت خود بخود ہو۔ عام انسانوں سے علمی ذرائع سے ممتاز نبوت کا علمی ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہوتی ہے۔ اس لیے نبی وہ ذات گرامی کہلاتی ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو۔ نبی کے بارے میں غیب دانی کا تصور اس ذریعہ کی نفی کرتا ہے۔ بہر حال حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو سمجھا رہے ہیں کہ نبوت کے اصل لوازم وحی مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار تبشیر تعلیم اور ہدایت ہیں۔ اس بنا پر حضرت نوح علیہ السلام ان کو بتا رہے ہیں۔ کہ تمہاری نگاہوں میں تمام فضائل ومحاسن کا مرکز صرف دولت جائداد مال واسباب، ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق وعادات تمدن ومعاشرت، رسم ورواج غرض کہ تمام چیزوں میں امراء کی تقلید کرتے ہیں لیکن نبوت ہمیشہ اپنی معاشرت، اپنی وضع، اپنے لباس غرض اپنی ہر ایک چیز سے یہ ثابت کرتی ہے کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے۔ اور زخارف دنیوی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لا اقول لکم عندی خزائن اللّٰہ کا یہی منطوق ہے اور اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف سے آنے والا بے انتہا خدائی قدرتوں کا مالک نہیں ہوتا اور اسے کائنات میں اختیار ناطق حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہ ذہن تھا کہ نبی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقام انسانیت سے بالا ہو۔ اور براہ راست عالم کائنات کا علم رکھتا ہو۔ اور کائنات میں تصرف پر قادر ہو۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر دین باطل اور ضلالت کی دیوار کج کھڑی ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ کائنات میں تصرف اور کائنات کے علم سے نبوت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ولا اعلم الغیب۔ کا یہی مقصود ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کی ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ نبوت کو دنیوی علائق سے بالا سمجھتے تھے۔ کھانا تناول کرنا، پانی پینا، نہانا، ضروریات زندگی کی بجا آوری کرنا، معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا۔ اسی غلط خیال کی حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کہہ کر اصلاح فرمائی ہے۔ لا اقول

انی ملک یہ فرشتوں کی خصوصیات ہیں اور میں فرشتہ نہیں ہوں ۔میں انسان ہوں اور خالص انسان ہوں۔ مجھے بھوک بھی لگتی ہے ،پیاس بھی لگتی ہے ۔میں ساری انسانی ضروریات کے تقاضے رکھتا ہوں ۔ان کا خیال حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ تھا ۔کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے بھی رکھتا ہے ۔کھاتا پیتا ہے ۔بازاروں میں پھرتا ہے اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اس پر حضرت نوح علیہ السلام فرما رہے ہیں ۔کہ میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے ۔ یہ فرشتوں کی خصوصیات ہیں ۔میں تو انسان ہوں اور مجھ میں انسانوں کی خصوصیات ہیں ۔

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کی اس دلیل کا ذکر کیا کہ اگر تم رسول ہوتے تو قوم کا کمترین طبقہ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہتا بلکہ ہم جیسے بڑے لوگ اس کا استقبال کرتے ۔یہ کمتر لوگوں کا تمہارے پیچھے لگنا ہی تمہارے رسول نہ ہونے کی دلیل ہے ۔اگر تم کسی صحیح بات کی دعوت لے کر آتے تو قوم کے سربرآوردہ لوگ آگے بڑھ کر اسے قبول کرتے آپ کی ہمرکابی میں اراذل اور کمترین لوگ نہ ہوتے ۔اس پر فریب استدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔کہ اس دعوت میں ضرور کوئی خرابی ہے اسی لیے تو بڑے لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو جواب دیا کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی ہے وہ تمہاری نگاہوں میں کمین و رذیل ہیں ۔اس کی بنیاد پر تم میری دعوت کو رد کر رہے ہو تو یاد رکھو میں تمہاری دلداری کی خاطر ان کو اپنے پاس سے دور کرنے کے لیے تیار نہیں ۔وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں ۔اور کل کو ایمان کی حالت میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوں گے ۔یہ تو میری دوکان دعوت کا نقد سرمایہ اور حقیقی سرمایہ ہے ۔میں موہوم کے پیچھے متقین کو دریا بُرد نہیں کرسکتا ۔اگر آج میں ان کو تمہاری خاطر اپنے پاس سے دھتکار دوں تو اس میں دو قباحتیں ہیں ۔

اول ۔یہ کہ اس کی ضمانت کوئی نہیں کہ تم میرے اقدام کے بعد دعوت کو شرف پذیرائی دو گے تمہاری یہ فرمائش حجت و برہان کی طلب میں نہیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی فرمائش ہے ۔جو اس لیے کی جا رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے کوئی سہارا تلاش کیا جائے ۔

تمہارا یہ کہنا کہ لن یؤتیھم اللہ خیرا ۔اللہ سبحانہ ان پر اپنی رحمت و خیر کی ارزانی کا دروازہ کبھی اور ہرگز نہ کھولے گا ۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ہمیشہ نبوت کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرز عمل رہا ہے تم نے یہ بات رجما بالغیب کیسے کہہ دی ۔یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ قبول حق کی استعداد کس میں ہے کون ارادہ کرتا ہے ۔اللہ اعلم بما فی انفسھم ۔

دوسرے ۔ یہ کہ اگر میں ان نادار اہل ایمان کو تمہاری خاطر دھکے دے دوں تو کل کو میں اللہ سبحانہ کو کیا جواب دوں گا۔ شرافت اور رذالت کا فیصلہ تو اللہ سبحانہ کے دربار میں ہوگا ۔وہ بتائے گا کہ کون شریف ہے اور کون رذیل ہے ۔امیری ،فقیری ،نسب ،نسل ،رنگ اور زبان ،ملک اور وطن ان میں سے کوئی بات بھی شرافت و رذالت کا پیمانہ نہیں ہے ۔

ساری آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم مجھ میں کوئی بات مافوق البشریت نہیں پاتے ہو۔ تو میں نے بشریت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ ہی کب کیا ہے کہ میں خدائی خزانوں کا مالک ہوں یا میں غیب راہ ہوں یا میں فرشتہ ہوں میں ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں صرف اللہ کا رسول ہوں ۔اور جس پیغام کے ساتھ اس نے مجھے تمہاری طرف روانہ کیا ہے وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں ۔میرے ساتھی غریب اور نادار لوگ ہیں ۔اس وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو اور چونکہ تمہاری نگاہوں میں ساری قدر و قیمت دنیا اور سامان دنیا کی ہے ۔اس لیے تم سمجھتے ہو کہ اس دعوت میں اگر کوئی خیر ہوتی تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ یہ نادار طبقہ اس سے ہمنوائی کرتا اور تم سرپڑا ہوکر اس سے محروم رہتے اگر تم اس کج فہمی کا شکار رہو کہ چونکہ ان کے پاس دنیا اور سامان دنیا نہیں ہے ۔تو اللہ سبحانہ ان کو ایمان کی دولت سے کیسے مالا مال کرسکتا ہے تو میں تمہاری اس کج فہمی کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں ۔اگر میں ایسا کروں تو میرا شمار بھی بے انصاف لوگوں میں ہو جائے گا ۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے کہا اے نوحؑ تم نے ہم سے جھگڑا کیا پس جھگڑا بہت کر چکے ہو۔ اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز لاؤ جس کی تم دھمکی دے رہے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا۔ بتانا میرا کام ہے۔ لانا میرا کام نہیں صرف اللہ کا کام ہے اور وہ بھی اس کی مشیت پر موقوف ہے نہ کہ میری اور تمہاری بات جب اللہ سبحانہ اپنی مشیت کے مطابق لائے گا تو تم اللہ کے مقابلے میں بیچارگی کے سوا کچھ نہ کر سکو گے۔ اور دیکھو اگر اللہ کے قانون میں تمہارا اغوا ہی ہے تو میں تمہاری کتنی خیر خواہی بھی چاہوں۔

میری خیر خواہی تمہارے لیے بالکل بے سود ہوگی۔ یاد رکھو اللہ ہی تمہارا مالک ہے اور اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے[۱۴۱] کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعوی نبوت جھوٹ موٹ کر دیا ہے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر واقعی دعوی نبوت میں نے جھوٹ موٹ کیا ہے تو میرے جرم کرنے کا وبال مجھ پر ہوگا۔ اور اگر میں واقعی نبی ہوں تو انکار کا سنگین جرم اس کی سزا تمہیں ملے گی۔ میں اس سے قطعاً بری الذمہ ہوں[۱۴۲]۔

مفردات کے معانی

نصحی۔ نصح ینصح باب فتح سے ہے۔ لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے جب شہد کو موم سے صاف کر دیا جائے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ نصح کے معنے کسی چیز کا کھوٹ نکال دینا۔ یہ معنی نصحت العسل کے محاورے سے لیے گئے ہیں۔ محکم میں ہے کہ نصح کھوٹ غش کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔ اس لیے نصیحت کے معنے یہ ہیں کہ ناصح اپنے آپ اور جس کو نصیحت کر رہا ہے کے درمیان کوئی کھوٹ کا معاملہ نہ رکھے۔

ان یغویکم۔ یہ اغوا سے باب افعال ہے مضارع منصوب کا واحد مذکر غائب ہے۔ اس کے معنے بے راہ کرنے کے ہیں۔ جب اغوا اللہ کی طرف سے ہو۔ تو اس کے معنے دو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ غوایت اغوا کا سبب بن گیا۔ بایں طور کہ کسی شخص نے بے راہ روی اختیار کی بدیں وجہ اللہ سبحانہ نے اس پر اغواء کا حکم صادر فرما دیا۔ دوسری صورت اغوار الٰہی کی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے جبلت انسانی کو ایک خاص وضع پر بنایا ہے۔ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو پھر وہی راستہ

اس کو مرغوب و محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کو وہ کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتا۔ اس وقت اغوا کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ عالم انسانی اس کے قوانین کے تحت ہوا ہے۔

نبوت کا جذبہ خیر خواہی

نبوت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بندوں کے نام جو پیغام لے کر آتی ہے۔ اس کی تمام تر اساس خیر خواہی پر ہوتی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کا جوہر الدین النصیحۃ کہہ کر پیش فرمایا ہے۔ قرآن نے نصیحۃ اور خیر خواہی کو انبیاء کی دعوت کی اساس بتایا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام انصح لکم کا اعلان کر رہے ہیں۔ یعنی لوگو! میں تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ انا لکم ناصح امین۔ میں بھروسہ کے قابل تمہارا خیر خواہ ہوں۔ حضرت صالح علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ونصحت لکم ولکن لا تحبون النٰصحین۔ میں نے تمہاری خیر خواہی کی ہے لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے ہو لوگوں کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کے بُرے اعمال بُرے اخلاق، اور بُرے افکار پر نبوت غمگین ہوتی ہے۔ اور دل سے چاہتی ہے کہ لوگ اچھے اعمال اچھے اخلاق اور اچھے افکار کو اپنائیں لوگوں کی محاسن سے گریز پائی اور منکرات کا ارتکاب نبوت کے لیے پریشان کن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی بے چینی اور اضطراب میں نبی راتوں کو جاگتا ہے اور اللہ کی جناب میں روتا ہے۔

نبوت کی دعوت کی اصلی اساس عوام کے لیے جذبہ خیر خواہی ہوتا ہے شہری زندگی کا کوئی خاص طبقہ مثلاً تاجروں کا گروہ، کاشتکار، زمیندار، پیشہ ورانہ زندگی گزارنے والوں کی کوئی جماعت نبوت کی مخاطب نہیں ہوتی۔ اس کا خطاب سب سے یکساں ہوتا ہے اور اس خطاب کے پس منظر میں سب کے لیے جذبہ خیر خواہی کارفرما ہوتا ہے۔ اسی جذبہ خیر خواہی کی وجہ سے نبوت کی دعوت میں عوام سے خطاب کے لیے حکمت اور موعظت حسنہ ہوتی ہے۔ حکیمانہ استدلال ہو یا واعظانہ انداز بیان ہو نرمی اور خیر خواہی داعی کی ضرورت ہے۔ سختی اور شدت کا طریق کار دوسرے کے دل میں عداوت اور نفرت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ خیر خواہی کے منافی ہے اس لیے ہر پیغمبر اپنا کام عوام کی خیر خواہی پر مبنی جذبات کے تحت کرتا ہے۔

(۳۹) حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے کہا۔ اے نوحؑ تو نے ہم سے جھگڑا کیا پس جھگڑا بہت کر چکے ہو اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز لاؤ جس کی تم دھمکی دے رہے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام قبل از طوفان

ساڑھے نو سو سال ان میں رہے۔ شب و روز سرا و علانیہ انہیں نصیحت کرتے رہے۔ ہر شبہ کا جواب دیتے تبلیغ و تفہیم اور بحث و مناظرے کا سلسلہ جاری رہا اس جھگڑے میں صدیاں گزر گئیں۔ کفار نے ان حقائی بحثوں اور شب و روز کی نوک جھوک سے عاجز ہو کر کہا۔ کہ اب یہ سلسلہ بند کیجئے اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی دھمکیاں دیتے رہتے ہو وہ فوراً لے آؤ تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو[1]

جب حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب بحث و مناظرہ کے میدان میں شکست کھا کر پسپا ہو گئے اور نوح علیہ السلام نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی اور ان کے لیے کوئی جائے گریز باقی نہ چھوڑی تو آخر میں انہوں نے جائے پناہ اسی خیال میں محسوس کی کہ حضرت نوح علیہ السلام سے اس عذاب کے لانے کا مطالبہ کریں۔ جس کی وہ خبر دے رہے تھے۔ چنانچہ صاف صاف کہہ دیا کہ جناب بحث و مناظرہ کی کافی منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ بس اب تو اگر آپ سچے ہیں تو وہ عذاب لائیے جس کی آپ مدت سے دھمکی دیتے آرہے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ عذاب کا لانا اللہ کے اختیار میں ہے وہی جب چاہے گا لائے گا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو جب آدھمکے گا اس وقت کوئی بھی خدا کے قابو سے باہر نہیں ہوگا۔

معاندین عموماً انبیاء علیہم السلام کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزہ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو۔ وہ آخر کب آئے گا۔ چونکہ اپنی نافہمی سے ان کو یقین ہوتا ہے۔ کہ یہ معجزہ عذاب اب ظاہر نہ ہوگا اس لیے وہ اس کا مطالبہ بڑی دلیری سے کرتے ہیں۔ تاکہ وہ رائے عامہ کو گمراہ کر سکیں اور اس طرح لوگوں میں پیغمبر کی سُبکی ہو۔ اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں۔ قرآن میں بار بار ہر دور کے کافروں کے اس مطالبہ کو دہرایا گیا ہے۔ اور اس کا جواب دیا گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی امت نے کہا۔

وان نظنك لمن الكاذبين فاسقط علينا كسفا من السماء ان كنت من الصادقين ۔

اور ہمارے خیال میں تو تم جھوٹے ہو اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو۔

تاخیر عذاب کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے۔ کہ معجزہ ہلاکت سے پہلے پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

منکرین کا گروہ ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے عذاب کی تاخیر کا یہی راز ہے۔

دراصل منکرین نبوت پر نتائج کی حیثیت سے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ معجزہ ہدایت، معجزہ ہلاک۔ نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے۔ اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ نبوت کے مخاطبوں کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں۔ وہ اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ یہاں قوم نوحؑ جس معجزہ ہلاکت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس کی تاخیر کا سبب یہی ہے۔

آیت قرآنی کا مدلول بتا رہا ہے۔ کہ باطل کے مقابلہ میں حق کو دلائل کی قوت سے پیش کرتا اور منکرین کے شبہات کا ازالہ۔ انبیاء علیہم السلام کا کردار ہے۔ باطل پر اصرار اور باپ دادا کی ڈگر پر چلتے رہنا۔ حق کا انکار کفار معاندین کا شیوہ ہے اور آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام توحید و معاد اور نبوت کی تائید میں دلائل و شواہد ایک عرصہ دراز تک پیش فرماتے رہے ہیں۔ اور یہ آیت سے اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے یہ بات اس مکالمہ کے بعد کہی ہے جو یہاں اس رکوع میں بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوا ہے۔ کہ یہ ان کا اپنی قوم سے آخری مجادلہ تھا اور یہ بات لوگوں نے حضرت نوحؑ کی تقاریر ان کے مواعظ اور نصائح کی بہتات سے تنگ آکر اور دل برداشتہ ہو کر کہی تھی۔

یاد رہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں دعوت کا کام ۹۵۰ سال کیا ہے۔ اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے اور انہوں نے ہمت نہیں ہاری ۹۵۰ سال کام کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سالانہ اجتماع کر کے دعوت دیتے تھے یہ بھی نہیں کہ اس مقصد کے لیے کوئی ماہانہ کانفرنس کرتے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی ہفتہ وار اجتماع کرتے تھے۔ بلکہ قرآن نے انکشاف کیا ہے۔

رب انی دعوت قومی لیلا ونھارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا۔

اس کا مطلب اس کا سوا اور کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم میں ۹۵۰ سال کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات دعوت کا کام کیا ہے۔ اس طویل عرصہ میں اس طویل کام کے بعد یہ آخری

دعوت ہے جس میں قرآن نے لوگوں کی دعوت سے بیزاری کو اکثرت جدالنا فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی صرف یہ نہیں کہ وہ دعوت قبول نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ وہ خود حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت ہی سے بیزار ہو چکے تھے ۔

(۴۰) عقیدہ معجزات کی اصلاح

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ۔ بتانا میرا کام ہے لانا میرا کام نہیں ہے ۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے ۔ اور اس کی مشیت پر موقوف ہے ۔ نہ کہ میری اور تمہاری ۔ جب اللہ سبحانہ اپنی مشیت کے مطابق لائے گا تو تم اللہ کے مقابلے میں بیچارگی کے سوا کچھ نہ کر سکو گے یعنی یہ چیز میرے قبضہ میں نہیں ۔ اللہ سبحانہ جس وقت اپنی حکمت کے موافق چاہے گا عذاب نازل کر دے گا ۔ ہمارا فرض صرف آگاہ کر دینا تھا ۔ باقی عذاب تو ایسی ہولناک اور عظیم الشان چیز ہے ۔ جس کا لے آنا اور دفع کر دینا دونوں پہلو قوائے بشریہ سے خارج ہیں ۔ جب مشیت الٰہی ہو گی تو کہیں بھی بھاگ کر پناہ نہ لے سکو گے ایسا کون ہے جو اللہ سبحانہ کو معاذ اللہ بھٹکا کر عاجز کر سکے [۱]

اصل یہ ہے کہ نبوت کی نظر میں ظاہری اعجاز کی چنداں وقعت نہیں ہوتی وہ لوگوں کو ہمیشہ اصلی روح نبوت کی طرف متوجہ کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظاہری معجزات لوگوں میں بہت غلط عقیدے پیدا کرتے ہیں ۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیان کے ذریعے نہایت تصریح اور نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے مخاطبوں کو بتایا ہے ۔ کہ عذاب کا آنا نبی کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتا ہے ۔ فرمایا انما یاتیکم بہ اللہ ۔ انما حرف قصر ہے اس کا کام یہ بتانا ہے ۔ کہ عذاب کا لانا اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے ۔ اس کے منہ میں بیک وقت دو مثبت اور منفی باتیں ہوتی ہیں ۔ مثبت یہ کہ عذاب کا لانا اللہ سبحانہٗ کا کام ہے ۔ اور منفی یہ کہ اللہ کے سوا اور کسی کا یہ کام نہیں ہے ۔ علامہ آلوسیؒ نے اسی قصر کو سمجھانے کے لیے یہ لکھا ہے ۔ کہ

> یہ میرا کام نہیں اور نہ یہ میرے بس میں ہے یہ تو صرف اللہ سبحانہٗ کا ہی کام ہے ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اس وقت جب انہوں نے جلدی عذاب کا مطالبہ کیا فرمایا لوگو! جس چیز کے بارے میں تم جلدی کا مطالبہ کر رہے ہو یہ میری قدرت میں اور بس میں نہیں یہ تو صرف اللہ ہی کا کام ہے کہ وہ اگر چاہے تو تم پر عذاب لے آئے۔

ان بزرگوں نے اسی انداز تعبیر کو سمجھانے کے لیے یہ انداز تشریح اختیار کیا ہے۔

(۴۱) شر پسندی اور خیر سے بے رغبتی کا نتیجہ

اور دیکھو اگر اللہ کے قانون میں تمہارا اغوا ہی ہے تو میں تمہاری کتنی خیر خواہی چاہوں۔ میری خیر خواہی تمہارے لیے بالکل بے سود ہوگی۔ یاد رکھو اللہ ہی تمہارا مالک ہے۔ اور اسی کے دربار میں تمہیں پیش ہونا ہے۔ یعنی کفر پر اس قدر اصرار و ضد اور انتہائی شوخ چشمی سے نزول عذاب کی استدعا پتہ دیتی ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کا ارادہ یہی ہے۔ کہ تم کو گمراہی میں پڑا رہنے دے اور آخر کار ہلاک کر دے۔ پس اگر تمہاری بدکرداری کے سبب سے اللہ نے یہی چاہا تو میں کتنا ہی نصیحت و خیر خواہی کر کے تم کو نفع پہنچانا چاہوں تو کچھ نافع اور مؤثر نہ ہوگا۔ تمہارا رب وہی ہے جس کے ملک اور تصور میں ہر چیز ہے۔ جیسا جس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہے کوئی روک نہیں سکتا۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہی سب کے اعمال کی جزا و سزا دینے والا ہے[1] یہ دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت کا آخری مرحلہ ہوتا ہے کہ اللہ کا رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالے کر دیتا ہے جو ان کے لیے ان کے کردار کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے مقرر ہو چکا ہے۔ یہ بات حضرت نوح علیہ السلام نے اسی موقعہ پر فرمائی ہے کہ اب تم اللہ سبحانہٗ کے قانون کی زد میں آچکے ہو اور اپنے اعمال کی وجہ سے اس لائق ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہیں گمراہی کی راہ پر چھوڑ دے اور خیر کی ساری توفیق تم سے صلب کر لے ایسی حالت میں میں لاکھ نصیحت اور وعظ کروں میری کوئی نصیحت کارگر نہ ہوگی۔ اب تمہارا معاملہ اللہ سبحانہٗ کے سپرد ہے وہی تمہارا مالک ہے۔ اور اسی کی بارگاہ میں تمہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں۔ کہ اگر اللہ سبحانہٗ نے تمہاری ہٹ دھرمی اور خیر

[1] افادات شیخ الاسلام

سے گریز پائی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ تمہیں راہ راست پر چلنے کی توفیق نہ دے۔ اور جن راہوں میں تم خود بھٹکنا چاہتے ہو ان ہی میں تمہیں بھٹکا دے تو اب تمہیں راہ راست پر لانے کے لیے میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں دو بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ ایک نحوی اور دوسری کلامی۔ آیت قرآنی اپنے معنے اور مطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے۔ ہم معالم القرآن کے پڑھنے والوں کو اس میں الجھانا نہیں چاہتے ہیں۔ اصل یہ ہے یہاں دو صداقتیں ہیں۔ اور دونوں عالم انسانیت میں کارفرما ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان و ہدایت کے لیے بندے کا ارادہ اور کوشش ہو۔ اسی کو قرآن میں بندے کی مشیت کہا گیا ہے۔ فرمایا کہ

فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

دوسری جگہ ہے۔

فمن شاء اتخذ الى ربه سبيلا۔

جو چاہے اپنے پروردگار کے راستہ کو اختیار کرے۔

ایک اور آیت ہے۔

فمن شاء اتخذ الى ربه مآبا

جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف بازگشت کرے۔

سورہ فرقان میں ہے۔

الا من شاء ان يتخذ الى ربه سبيلا

ہاں مگر جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے

ان سب میں بندے کی مشیت اور اس کے ارادے کا ذکر ہے۔ ایمان و عمل صالح، کفر و فسق، ہدایت و سعادت، ضلالت و شقاوت سب بندے کے لیے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ارادی اور اختیاری چیزیں ہیں۔ اگر بندے کے ارادے اور اختیار میں نہ ہو تو ان پر جزا و سزا نہ ہو۔ فرشتوں اور انسانوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

دوسری صداقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزء و کل پر حاوی ہے ان آیتوں میں اسی صداقت کا ذکر کیا ہے۔ وما تشاؤن

الا ان یشاء اللہ رب العالمین تم نہیں چاہو گے مگر یہ اللہ سبحانہٗ چاہے گا۔ وما کانوا لیؤمنوا الا ان یشاء اللہ۔ وہ نہیں ہیں کہ ایمان لائیں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی اور فلو شاء لھداکم اجمعین اور ولو شئنا لآتینا کل نفس ھداھا۔ ان آیات میں اللہ کی مشیت اور ارادے کا ذکر کیا ہے۔ ہدایت وضلالت، سعادت وشقاوت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔ اور اس کی مشیت اور ارادے سے ہے۔

نبوت یہ دونوں صداقتیں لے کر آتی ہے اور ان کی تبلیغ کرتی ہے۔ ایک اس کا اعلان ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی اجازت کے بغیر درخت کا پتا بھی نہیں ہلتا اور دوسری وہ یہ کہتی ہے کہ ہر جان ارادہ واختیار کے مطابق کام کرنے کی طاقت رکھتی ہے یہی ارادہ واختیار اور مشیت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اس لیے انسان پر اس کے کسی عمل کی ذمہ قانوناً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوتی ہو بلکہ اس کے کرنے یا کرنے میں مجبور و بے اختیار ہو۔ اسی لیے ارشاد ہے۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ اس لیے ہر انسان اپنی جنت اور دوزخ خود بناتا ہے۔

من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا

جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس نے بُرا کیا تو اپنے لیے کیا۔

انسان کو اسی ارادے اور اختیار کی تکمیل کی خاطر اللہ سبحانہٗ نے حواس خمسہ اور مشاعر خمسہ ارزانی فرمائے ہیں۔ ایک شخص اگر آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھتا نہیں ہے۔ اور کان ہوتے ہوئے سنتا نہیں ہے۔ تو اللہ سبحانہٗ اس کو جبراً دیکھنے اور سننے پر مجبور نہیں کرتا۔

ہدایت واضلال، رشاد واغوار کا مسئلہ بھی یہیں سے سمجھ لو۔ ضلالت ہو یا ہدایت دونوں اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں۔ اور انسان کے اچھے یا بُرے کام جواب ہیں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اضلال واغوا کن لوگوں کے لیے آتی ہے قرآن نے صراحتاً بتایا ہے۔ اللہ سبحانہٗ بدکاروں کو گمراہ کرتا ہے۔ وما یضل بہ الا الفاسقین یعنی لوگوں کی بدکاری کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اضلال ہوتا ہے۔ یا فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم یعنی ان کے اعمال وافکار اور اخلاق میں کجی آنے کے سبب اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ یہ اور اس قسم کی

آیات ہیں۔ ہر ایک سے صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کی بد اعمالی مقدم ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے اضلال، اغواء فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ کی جانب اضلال اور اغواء معلول ہے اور لوگوں کی بدکاری، فسق و فجور، کفر، انکار وجحود علت ہے۔ یہی طبعی اصول ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے۔ غمگین ہوتا ہے تو آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے کہ چوٹ کی وجہ سے گرا ہے۔ یا آنسو کی وجہ سے غمگین ہوا ہے یا اللہ کے گمراہ کرنے کی وجہ سے بدکار ہوا ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کے دل کو ٹیڑھا کرنے کی وجہ سے وہ ٹیڑھا ہوا ہے۔ تو یہ کیسی بے دانشی اور سخت نادانی ہوگی۔

آیئے اب زیر بحث آیت ان کان اللہ یرید ان یغویکم پر غور کیجیے۔ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا اغواء معلول ہے اس ارادہ واغواء کی علت ان کی جانب سے دعوت حق سے اعراض و انکار میں شدت اور تسلسل اور پھر حضرت نوح علیہ السلام سے گستاخانہ انداز میں یہ کہنا کہ اگر تمہارے پاس اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت ہے تو ہمارے انکار و اعراض پر جو عذاب لانا ہے وہ لاؤ۔ اس اغواء کی علت ہے۔ لوگ علت پر دھیان نہیں دیتے معلول پر زور دیتے ہیں۔ حالانکہ بات واضح اور صاف ہے۔ کفر میں ان کے شدت آتی ہے تو نبوت کے منہ آئے۔ بات کہی گئی نہیں۔ نبی کی ذات نے باطنی نشانیوں سے آنکھیں بند کرلی ہیں اب اس کے نتیجے میں اللہ کا ارادہ و اغواء رونما ہوا تو اس پر شور مچا رہے ہو۔ علم کی تصحیح خود نہیں کرتے اور عدم صحت علم کی پاداش میں عمل غلط ہو رہا ہے تو الزام دوسرں کو دے رہے ہو۔ دیکھ کر خود نہیں چلتے اب چوٹ لگنے پر الزام حق سبحانہٗ پر تھوپ رہے ہو۔

بلا شبہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے۔ اور یہ بات بھی بے غبار ہے کہ انسان کو بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب ارادہ واختیار کا فیضان ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کو کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزاء و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور بازپرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول آئے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو ان دونوں صداقتوں کو پوری قوت کے ساتھ سمجھا رہے ہیں۔ اور تبلیغ کر رہے ہیں کہ ہر انسان اپنے کردار کا ذمہ دار ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کی

ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادے اور مشیت کے مطابق کام کرنے کی استعداد و صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تم نے دعوت حق کے مقابلہ میں مبارزت کا ارادہ کرلیا، مخاصمت اور عناد کو اپنالیا اس کا نتیجہ یہی ہوا اور یہی ہونا چاہیئے کہ حق قبول کرنے کی صلاحیت تم سے سلب ہوگئی ہے اور اللہ نے اسی راہ کا دروازہ تمہارے لیے کھول دیا ہے جس راہ پر چلنے کا تم نے خود ارادہ کیا ہے یہ مطلب ہے۔ ان کان اللہ یرید ان یغویکم کا یعنی تمہارا ارادہ غوایت کا ہے تو اللہ کا ارادہ بھی تمہارے اغوار کا ہوگیا۔ اس صورت حال میں قانون الٰہی کے مقابلے میں میری نصیحت تمہارے لیے کیسی نافع اور سودمند ہوسکتی ہے وہی ہوگا جو اللہ کا ارادہ ہوگا۔ اللہ کی مشیت ہوگی۔ اللہ کا ارادہ اور اس کا قانون بغیر ارادے کے کسی کو ہدایت کی نعمت نہیں دیتا اور جبراً کسی کو حق قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کرتا۔

(۴۲) افترا اور جُرم انکار کا تقابل

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعویٰ نبوت جھوٹ موٹ کیا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر واقعی میں نے دعویٰ نبوت جھوٹ موٹ کیا میرے جُرم کا وبال مجھ پر ہوگا۔ اور اگر میں واقعی نبی ہوں تو انکار نبوت کا سنگین جرم تم کر رہے ہو۔ اس کی سزا تمہیں ملے گی میں اس سے قطعی بری الذمہ ہوں حضرت شاہ عبدالقادر موضح میں لکھتے ہیں۔ یہاں تک جتنے سوالات واعتراضات اس قوم کے تھے۔ وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے گویا یہ سب جواب ان کو ملے ایک ان کا نیا دعویٰ تھا اسے آگے قصہ کے درمیان بیان فرماتے ہیں۔ یہ ہے شاہ عبدالقادرؒ کی بات۔ شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں۔ یہ گفتگو کفار کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ کہ قرآن آپ خود بنا لائے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کا کلام نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کتاب نہ لائے تھے جو ان کی قوم یہ بات کہتی لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی نوح علیہ السلام کے قصے کا جزء بتایا ہے۔ یعنی ان کی قوم نے کہا کہ جن باتوں کو نوح علیہ السلام اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ خود ان کی من گھڑت ہے بعض نے کہا کہ گفتگو تو اہل مکہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر اس کا تعلق خاص نوح علیہ السلام کے قصے سے تھا گویا وہ کہتے تھے۔ کہ یہ داستان آپ نے جھوٹ بنا لی ہے واقعہ میں ان قصوں کی کوئی اصل نہیں ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

اس آیت کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے خلاصہ یہ ہے ۔

۱ ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے ہے جو کلام مربوط مسلسل ہے ۔ جملہ معترضہ نہیں ہے ۔

۲ ۔ حضرت مقاتل کہتے ہیں کہ آیت کا تعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبوں اہل مکہ سے ہے ۔ کلام مربوط نہیں یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے ۔

دوسری تشریح جو مقاتل کے حوالہ سے آئی ہے اور جسے حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن جریرؒ نے شارحین قرآن سے شریف پذیرائی دی ہے ۔ اردو شارحین میں سے مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز مولانا مفتی محمد شفیعؒ مولانا مودودیؒ نے مقاتل ہی کی تشریح کو اپنایا ہے چنانچہ مولانا حضرت اشرف علیؒ فرماتے ہیں ۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ قرآن تراش لیا ہے ۔ آپ جواب میں فرما دیجئے میں نے تراشا ہوگا تو میرا یہ جرم مجھ پر عائد ہوگا ۔ اور تم میرے جرم سے بری ہو گئے ۔ اور اگر یہ دعویٰ تراشا ہوگا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہوگا اور میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ ہوں ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے بھی مولانا موصوف کی ہمنوائی کی ہے ۔ مولانا مودودیؒ نے اس تشریح کو اپنانے کے لیے سب سے الگ ایک نئی راہ اختیار کی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

انداز کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ سنتے ہوئے اعتراض کیا ہوگا ۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ قصے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتا ہے کہ انہیں ہم پر چسپاں کرے ۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہ راست نہیں لگا سکتا ۔ ان کے لیے ایک قصہ گھڑ لیتا ہے ۔ اور اس طرح در حدیث دیگراں کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے ۔ لہذا سلسلہ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا ۔

لیکن امام رازیؒ ، علامہ آلوسیؒ ، قاضی بیضاویؒ نے سیاق و سباق قرآنی کے پیش نظر عبداللہ بن عباسؓ کی تشریح کو اپنایا ہے اور اس کو علامہ آلوسیؒ اور علامہ خفاجیؒ جمہور کا مذہب قرار دیا ۔ آلوسیؒ لکھتے ہیں ۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا نتیجہ ہے اور آیت حضرت نوح علیہ السلام ہی سے تعلق رکھتی ہے یہی ظاہر ہے اور یہی جمہور کا مختار ہے

خفاجیؒ نے یہی بات لکھی ہے ان کا کہنا ہے۔

والظاهر انه من نتيجة قصة نوح وفی شانه وعليه الجمهور

ان بزرگوں نے آیت کی جو تشریح فرمائی ہے یہ ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ، اگر میں نے اپنی جانب سے اللہ کی وحی کی بات خود ہی گھڑلی ہے تو اس کی سزا مجھے ملے گی اور اگر میں دعویٰ وحی میں سچا ہوں اور اس کے باوجود تم نے میری تکذیب کی ہے تو اس کی سزا تمہیں ملے گی اور تمہارے جرم اور جرم کی سزا کی مجھ پر ذمہ داری نہیں ہے۔

علامہ محمود آلوسیؒ نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ

کیا نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے کہ نوح علیہ السلام نے اللہ کی وحی والی بات اللہ کے ذمہ جھوٹ موٹ اڑا دی ہے اے نوح علیہ السلام ان سے کہہ دو کہ بالفرض اگر میں نے یہ بات اللہ کی جانب سے خود کہی ہے تو اس کا وبال میرے سر ہے اور میں تمہارے اس جرم کا ذمہ دار نہیں ہوں کہ تم مجھے مفتری بتا رہے ہو اور مما تجرمون میں ما مصدریہ ہی ہو سکتا ہے یعنی تمہارے جرم کرنے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

لباب التاویل فی معانی التنزیل میں علامہ علاء الدین نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ

اکثر شارحین قرآن کا موقف یہی ہے کہ یہ گفتگو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہو رہی ہے اور اس کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے ہے۔

مشہور مفسر قرآن امام محمد بغوی کا میلان بھی یہی ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے فتح القدیر میں اسی تشریح کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ

حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق تشریح زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ آیت موقعہ و محل اور سیاق و سباق کے اعتبار سے یہی چاہتی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اسی تشریح کو پذیرائی دی ہے اور فتح البیان میں نواب

صدیق حسن رحمۃ اللہ نے اسی کو اپنایا ہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پر اللہ کی وحی آنے کا قصہ خود گھڑ لیا ہے۔ اے نوح علیہ السلام آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کی وحی کا واقعہ میرا من گھڑت ہے تو اس گناہ کی سزا کا وبال مجھ پر ہے لیکن اگر میں سچا ہوں اور تم میری تکذیب کر رہے ہو۔ تو اس کی پاداش کے لیے تمہیں تیار رہنا چاہیئے اور تمہارے اس جرم سے کہ تم مجھ پر اللہ کی وحی کو من گھڑت بتا رہے ہو۔ میں بالکل بری ہوں۔ اس کی ذمہ داری کوئی بھی مجھ پر نہیں ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے مقاتل کی تشریح کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ

آیت کی یہ تشریح مطالب قرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ہے۔ خواہ اس میں کچھ اور بھی کوئی تاویل کی جائے۔

ہماری رائے میں قرآن کے سیاق وسباق کے لحاظ سے عبداللہ بن عباسؓ کی تشریح قابل قبول و ترجیح ہے۔ دراصل یہ دعوت وموعظت کے آخری مرحلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے اعلان برارت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت ہوئی ہے کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ تم انہیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ تو اب یہ بحث بالکل ختم کرو اور ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم عناد سے جان کر انکار کر رہے ہو تو اس جرم سے میں اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔

اصل یہ ہے کہ ذہنی مریضوں کا ذہن ہمیشہ بال کی کھال نکالنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ان کو حقائق و واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ کہ بات کو دیکھیں اور تولیں۔ ایک شخص اگر کوئی حکمت کی بات کہہ رہا ہے یا آپ کو وہ کوئی مفید سبق دے رہا ہے۔ یا آپ کی کسی غلطی پر متنبہ کر رہا ہے۔ تو اس سے فائدہ اپنانا اور اپنی اصلاح کرنا آپ کا کام ہے۔ مگر اخلاق باختہ لوگ بات سے ہٹ کر بات کہنے والے سے عناد اور دشمنی کا اظہار کرے۔ بات کا مخاطب کے پاس کوئی جواب نہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ کیوں کہہ رہا ہے۔ اور کہنے والے میں ایسا کوئی پہلو تلاش کرے گا۔ جس سے حکمت ونصیحت پر پانی پھیر دے۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنی برائی پر ڈٹا رہے۔ بلکہ بات کہنے والے کے ذمہ بھی الٹی باتیں

لگا دیتے ہیں ۔ مثلاً یہی کہ ہمارے ماننے والے لوگ کمین ہیں ۔ بہتر سے بہتر بات بے قیمت اور بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اگر سننے والا سننے پر تیار نہ ہو اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس کی جگہ برائیاں تلاش کرنے میں لگ جائے ۔ یہی صورت حال یہاں ہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب حضرت نوح علیہ السلام پر الزام لگا رہے ہیں کہ تم نے وحی والی بات خود گھڑلی ہے اور یہ سارا گھروندا تمہارا اپنا ساختہ و پرداختہ ہے ۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بات کو دیکھو اگر میں یہ بات خود تراش کر کہہ رہا ہوں اور اللہ پر افترا کر رہا ہوں تو اپنے جرم کا میں خود ذمہ دار ہوں ۔ لیکن تم جس جرم کا ارتکاب کر رہے ہو وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور اس کی باز پرس تم سے ہوگی نہ کہ مجھ سے ۔

وَاُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّهٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ
مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا كَانُوۡا
یَفۡعَلُوۡنَ ۝ وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡیُنِنَا وَوَحۡیِنَا وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ
فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ۝ وَیَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ
وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیۡهِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ سَخِرُوۡا مِنۡهُ ؕ قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا
مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡكُمۡ كَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ۝ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ
مَنۡ یَّاۡتِیۡهِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡهِ وَیَحِلُّ عَلَیۡهِ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ۝

اور حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ ان کے سوا جواب تک ایمان لا چکے ہیں۔ کوئی ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ لہٰذا ایمان نہ لانے والوں کے کردار پر تم غمگین نہ ہو[۴۳] اور اب تم ہماری ہدایت میں ہمارے رُوبرو جہاز بناؤ اور دیکھو ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا جو ظلم کار ہیں وہ بلا ریب ڈوب کر رہیں گے۔[۴۴] اور حضرت نوح علیہ السلام جہاز سازی کا کام کر رہے تھے۔ اس حالت میں جب بھی بڑے لوگوں کی جماعت کا گزر ہوتا تو وہ حضرت نوح علیہ السلام

کا مذاق اُڑاتے[۴۵] حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کے جواب میں فرماتے اگر تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو تو وقت آرہا ہے ہم بھی تمہارے ساتھ ایسے ہی مذاق کریں گے جیسے تم ہمارا مذاق کر رہے ہو[۴۶] تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کن عذاب کا نشانہ کون بنتا ہے اور کس پر دائمی عذاب ڈیرہ لگاتا ہے۔[۴۷]

مفردات کے معانی

اوحی۔ ایحار، باب افعال سے ماضی مجہول کا واحد مذکر غائب ہے۔ وحی کی گئی۔ حکم دیا گیا۔ وحی کے لغوی معنے کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کی جُنبش کے بغیر اخفار اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کا اپنے دلی منشار سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔ جس طرح علم کے تینوں ذریعے وجدانیات، حسیات، اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں۔ اس طرح روحانی ذریعہ علم انبیار علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں۔

لاتبتئس۔ تو غم نہ کھا، تو غمگین نہ ہو۔ ابتئاس سے فعل نہی ہے۔ اس کے معنے غمگین ہونا اور رنجیدہ ہونے کے ہیں۔

سخروا۔ انہوں نے ٹھٹھا کیا۔ سخر یسخر باب سمع سے آتا ہے جس کے معنے ٹھٹھا کرنے کے ہیں۔ سخر سے ماضی کا جمع مذکر غائب اسی سے سخریٌ اسم ہے۔ علامہ زمخشری رقمطراز ہیں۔ سُخری پیش اور زیر کے ساتھ بھی تسخیر کا مصدر ہے۔ سخر کی طرح مگر یار نسبت کی وجہ سے فعل کی قوت میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ جیسے خصوص سے خصوصیت۔ اور کسائی اور فرار سے منقول ہے کہ مکسور تو ٹھٹھے کے معنے میں ہے اور مضموم سخر کرنے کے معنے میں ہے پہلا مذہب خلیل اور سیبویہ کا ہے۔

ظہور نتائج کی تمہید

سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت کا ایک خاص انداز ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے اندر رہ کر کہتا ہے۔ قرآن کا انداز دعوت بتاتا ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے۔ قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیئے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرہ بصیرت ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ سبحانہٗ کے وجود گرامی کی منکر تھی نہ اس سے ناواقف تھی نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا۔ بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا تھی۔ شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو کائنات کی کارفرمائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ اسی بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں پیدا ہو گئیں تھیں جو خود ساختہ عبادت میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا تھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی تھی۔ اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی۔ مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھنسایا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے انی بریئ مما تجرمون کہہ کر اعلان برارت کیا اور اللہ سبحانہٗ سے دعا کی۔ رب لا تذر من الکافرین دیارا۔ اس موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بتایا کہ من یؤمن قومك الامن قد آمن

(۴۳) اور حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا کہ ان کے سوا جو اب تک ایمان لا چکے ہیں۔ کوئی ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ لہٰذا ایمان نہ لانے والوں کے کردار پر غمگین نہ ہو جب قوم کی ایذائیں حد سے گزر گئیں تو نوح علیہ السلام نے سینکڑوں برس ظالموں کی زہر گداز جفائیں جھیلنے کے بعد اللہ سبحانہٗ کی جناب میں شکوہ کیا۔ رب انی مغلوب فانتصر۔ میں مغلوب ہوں آپ ان سے بدلہ لے لیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا لا چکے۔ آئندہ ان میں کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ لہٰذا اب آپ ان کی عداوت و تکذیب اور ایذا رسانی سے زیادہ غمگین نہ رہیں بقرب

اللہ سبحانہٗ کی شمشیر انتقام بے نیام ہونے والی ہے جو سب شرارتوں اور شریروں کا خاتمہ کر دے گی۔ لے
اس آیت میں سب سے اہم بات انہ لن یؤمن من قومك الا من قد امن ہے۔
یہ بات اس لیے کہی ہے۔ کہ نبوت اوّل اپنے مخاطبوں کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ مخاطبوں کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزار ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر وہ وقت آجاتا ہے۔ جب مادہ فاسد کے سوا مخاطبوں کی پوری جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیت ہلاکت، آسمان کی بجلی، زمین کا سیلاب رونما ہوتا ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے۔ لے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شق بحر کی صورت میں آیت ہلاکت عنایت ہوئی۔ اور بحر احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سازوسامان کے ساتھ کھا گئیں۔ یہ معجزہ ہلاکت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیات سے قوم کے تمام صالح اجزار ان کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے۔ اور رسول کو بقیہ عناصر سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی۔ اس کے بعد ناامید ہو کر معجزہ ہلاکت کی دعا مانگی۔ یہاں یہ بتانے کے بعد فرمایا فلا تبتئس بما کانوا یفعلون۔ ابتئاس۔ غم کی گھٹن محسوس کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا تعلق امت کی دعوت سے غرض پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ سرتاسر خیر خواہی پر ہوتا ہے۔ اسی جذبہ خیر خواہی کی وجہ سے ایمان نہ لانے والوں پر حزن و ملال اور رنج و غم ہوتا ہے۔ رنج و غم کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے یہ آپ کے جذبات ہیں جو آنسوؤں کی لڑی بن کر رونما ہوتے ہیں۔ راحت و شفقت بھی خیر خواہی کی اساس ہوتی ہے۔

(۴۴) جہاز سازی کی صنعت حضرت نوحؑ کی ایجاد ہے

اب تم ہماری ہدایت میں ہمارے رُوبرو جہاز بناؤ اور دیکھو ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا جو ظلم کار ہیں وہ بلا ریب ڈوب کر رہیں گے۔ حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک جہاز ہمارے رُوبرو یعنی ہماری حفاظت میں اور نگرانی میں ہمارے حکم تعلیم اور الہام کے موافق

لے افادات شیخ الاسلامؒ

تیار کرو کیونکہ عنقریب پانی کا سخت توفناک طوفان آنے والا ہے جس میں یہ سب ظالمین و مکذبین یقیناً غرق کیے جائیں گے۔ ان کے حق میں اب یہ فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ آپ کسی ظالم کی سفارش وغیرہ کے لیے کوئی بات نہ کریں۔ آنے والا عذاب بالکل اٹل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم لوط کے حق میں جھگڑنا شروع کیا تھا۔ ان کو بھی اسی طرح کا ارشاد ہوا تھا۔

یا ابراھیم اعرض عن ھذا۔ انہ قد جاء امر ربك وانھم اتیھم عذاب غیر مردود [1]

اے ابراہیم علیہ السلام اب اس بات کا خیال چھوڑ دے تیرے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی بات جو تھی وہ آپہنچی اور ان لوگوں پر عذاب آرہا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ اب قانون الٰہی کے مطابق ان کے لیے اللہ کی عدالت کے ظہور کا وقت آگیا ہے اور اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ سب غرق کر دیئے جائیں گے۔ تو تم اپنے اور اہل ایمان کے بچاؤ کے لیے ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے تحت ایک جہاز بناؤ اور ان ظالموں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا ان کو بلاشبہ غرق ہونا ہے۔

قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ کشتی سازی نہیں بلکہ جہاز سازی کی ایجاد کا سہرا حضرت نوح علیہ السلام کے سر ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے جہاز اللہ سبحانہٗ کی تعلیم اور وحی کی راہنمائی میں تیار کیا ہے۔ قرآن نے الفلك کہا ہے۔ عام تراجم میں اس کا ترجمہ کشتی کیا گیا ہے۔ کشتی کے لفظ سے اردو میں جو بات سمجھی جاتی ہے۔ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کی اس کشتی کی حیثیت اس سے بالکل مختلف تھی اتنا تو قرآن بھی بتا رہا ہے کہ کوہ آسا موجوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی جاتی تھی۔ کشتی والوں کو لیے ہوئے پہاڑ جیسے تھپیڑوں میں جانے سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کشتی جسے اردو میں ناؤ کہتے ہیں۔ ایسے تھپیڑوں کو برداشت کر سکتی ہے۔ پھر قرآن سے جیسا کہ آگے آرہا ہے جب یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو ہر قسم کے چرند پرند اور درندے کے جوڑے رکھنے کا حکم ہوا ہے۔ اس سے کشتی کی وسعت اور گنجائش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور بائیبل میں جو تفصیلات اس کے بارے میں پائی جاتی ہیں اس کے بعد اسے کشتی کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تورات کتاب

---

[1] ۔ ترجمہ از شیخ الاسلامؒ

پیدائش میں ہے۔

تو اپنے لیے ساگوان کی لکڑی کی ایک کشتی بنا ۔ اس کشتی میں کوٹھڑیاں بنا کر اور اس کے باہر اندر پرال لگا اور اس کو ایسی بنا کہ لمبائی ۳۰۰ ہاتھ اور چوڑائی ۵۰ ہاتھ ہو اور اس کی اونچائی ۳۰ ہاتھ ہو ۔ اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا اس سے اوپر ہاتھ بھر چھوڑ تمام کر اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا اور نیچے کا طبقہ اور دوسرا تیسرا طبقہ بھی بنا ۔

(پیدائش باب ۷۔ ۱۰)

کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ جہاز سازی کی صنعت حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہزاروں سال میں ایک بال بھی ترقی نہ کر سکی البتہ سٹیم اور برق کے عہد میں بلاشبہ ترقی کی دوسری منزلیں اس صنعت نے طے کی ہیں۔ بہر حال حضرت نوحؑ کی یہ صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی ۔ جس کے بعد نسل انسانی انقلاب کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں ۔ کہ آج دنیا کی مختلف اقالیم اور خطوں میں انسان آباد ہیں اور ہر جگہ تمدن و عمران برپا ہوا ہے تو یقیناً اس کا امکان اسی ایجاد کے بعد پیدا ہوا ۔ اور خونخوار سمندروں اور ذخار دریاؤں کو پھاند کر بنی آدم کے گھرانوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف انتقال کی صورت اس سے پہلے کیا تھی ؟ اس انتقال کی ساری داستان اس نوحی ایجاد کے ذریعے وجود میں آئی ہے دنیا کے جس خطے میں بھی انسانوں کی آبادی ہے وہاں کسی نہ کسی شکل میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس ایجاد کا تذکرہ پایا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ ہندوستان والوں میں کشتی کا ہم معنے لفظ بھی نوح کی بگڑی ہوئی شکل ناؤ ہے اگرچہ زمانہ کی طول دانی سے واقعات کے بعض اجزاء میں ردو بدل ہو گیا ہے ۔ مگر کشتی کی تاریخ کا مرکزی نقطہ ہر جگہ حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی ہے ۔ ہندوستان والے ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو ناؤ بندھن کہتے ہیں اور بجائے نوحؑ کے کشتی والے کا نام منوجی بتاتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مہا نوح کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ بہر حال دنیا کی تاریخ میں جہاز سازی کی صنعت کے موجد حضرت نوح علیہ السلام ہیں ۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کام اللہ سبحانہ کی نگرانی میں اللہ کی ہدایت کے مطابق کیا ہے ۔

(۴۵) جہاز سازی پر قوم کے آوازے

اور حضرت نوح علیہ السلام جہاز سازی کا کام کر رہے تھے ۔ اس حالت میں ان کے پاس سے جب بھی بڑے لوگوں کی جماعت گزرتی تو وہ حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑاتی ۔ کہتے ہیں کہ کشتی سالہا سال میں تیار کی گئی ۔ کشتی کیا تھی ایک بڑا جہاز تھا جس میں الگ الگ درجے تھے ۔ حضرت نوح علیہ السلام

کو بناتے دیکھتے تو کہتے کہ دیکھو پیغمبر سے بڑھئی بن گئے ہیں۔ کبھی ایک عجیب سی چیز دیکھ کر نوح علیہ السلام سے پوچھتے کہ یہ کیا بناتے ہو؟ آپؑ فرما دیتے کہ ایک گھر بناتا ہوں جو پانی پر چلے گا۔ اور ڈوبنے سے بچائے گا۔ وہ سُن کر ہنسی اُڑاتے کہ خشک زمین پر ڈوبنے کا بچاؤ کر رہے ہو۔ جہاں یہ قوم آباد تھی وہ کوئی نشیبی علاقہ نہیں تھا۔ ایک بلند میدان تھا اور قریب ترین سمندر یعنی خلیج فارس سے صدہا میل کے فاصلے پر۔ اس لیے ان لوگوں کا اپنے نقطہ نظر سے حیرت کا اظہار کرنا کچھ بیجا نہ تھا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے وجدان، حواس خمسہ اور مشاعر کو ظاہر سے کس قدر دھوکا ہوتا ہے جب حضرت نوح علیہ السلام دریا سے بہت دور خشکی پر اپنا جہاز بنا رہے تھے تو فی الواقع لوگ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز کام محسوس کرتے ہوں گے اور مذاق کے انداز پر کہتے ہوں گے کہ بڑے میاں کی دیوانگی ترقی کر کے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خشکی پر جہاز چلانے کی فکر میں ہیں۔ اس وقت بیچاری عقل نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں گے اور یہ بات کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی کہ چند روز کے بعد واقعی یہاں جہاز چلے گا وہ اس کام کو حضرت نوح علیہ السلام کی خرابیٔ دماغ کا نتیجہ قرار دیتے ہوں گے اور باہم کہتے ہوں گے کہ اس کردار کی موجودگی میں تو ان کے دیوانہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو حقیقت کا علم تھا اور ان کو معلوم تھا کہ کل یہاں جہاز کی کیا ضرورت پیش آنے والی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی علمی وسائل کی حقیقی علمی ذریعہ کے یعنی وحی کے مقابلے میں کیا حیثیت ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کی نگرانی میں اور اللہ کی راہنمائی میں جہاز بنانا شروع کیا۔ ان کی قوم کے متکبرین جو عذاب کی دھمکی کو خیالی پلاؤ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ عذاب کے بچاؤ کے لیے کشتی بنانا شروع ہوگئی ہے تو بجائے متنبہ ہونے کے انہوں نے اس کو بھی خلل دماغ ہی پر محمول کیا اور جب پاس سے گزرتے تو خوب آوازے کستے طنز آمیز فقرے بولتے اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس صورت حال سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ لیکن نبوت اور اس کے ساتھیوں کو اس قسم کے امتحانات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس غیب سے نبوت لوگوں کو مطلع کرتی ہے اس پر اس کو کس درجہ یقین ہوتا ہے گویا وہ اسے اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ نے لوگوں کے مذاق کی دو وجہیں لکھی ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلامؒ

۱. اس لیے کہ وہ کشتی سے آشنا ہی نہ تھے اور کشتی کا وجود مجہول مطلق تھا۔ انکو دیکھ کر حیرت ہوتی اور حیرت کا اظہار مذاق کے ذریعے کرتے تھے۔ اس کی تائید حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

> اللہ سبحانہٗ نے جب حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ اصنع الفلک تو حضرت نوح علیہ السلام نے حیرت سے پوچھا اے مولیٰ فلک کیا ہوتا ہے۔ فرمایا لکڑی کا گھر جو پانی پر چلے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا اے مولیٰ پانی کہاں ہے؟ فرمایا میں سب کچھ قدرت رکھتا ہوں۔

۲. اور یاان کا مذاق اس لیے تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام پانی سے دور کشتی بنا رہے تھے۔ اور یہ ہنس رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ نوحؑ! نبی ہو کر بڑھئی بن گئے۔ اس پس منظر کا مطلب یہ ہے کہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کے لیے جانی بوجھی چیز تھی۔ حاکم اور ابن جریرؒ کی روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لیکن حافظ ذہبیؒ نے اس کی تضحیک کی ہے۔

جمہور شارحین قرآن کا موقف یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب کشتی اور جہاز سے قطعاً ناآشنا تھے۔ کشتی اور جہاز کی ایجاد کا سہرا حضرت نوح علیہ السلام کے سر ہے۔

(۴۶) ایک خاص اور بلیغ انداز جواب

حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کے جواب میں فرماتے کہ اگر تم ہمارا مذاق اُڑاتے ہو تو وہ وقت آرہا ہے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی مذاق کریں گے۔ حضرت شاہؒ صاحب لکھتے ہیں وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں اسی تفسیر کے مطابق حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تسخر میں استقبال کے معنے مراد لیے ہیں۔ کہ آج تم ہمیں احمق بناتے ہو اور ہنستے ہو لیکن وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کے جواب میں تمہاری حماقت اور سفاہت پر ہمیں ہنسنے کا موقعہ ملے گا۔ جب تم اپنے جرائم کی پاداش میں سزایاب ہو گئے[۱] بلاشبہ اس بلیغ انداز جواب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ مذاق کا وہی انداز اختیار کر رہے ہیں جیسے تم نے اختیار کیا ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ آج جس طرح بے کسی و بیچارگی کی حالت

---

[۱] افادات شیخ الاسلامؒ

میں ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان استہزاء و تمسخر ہے۔ اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے ازدیاد ایمان کا باعث اور سامان اطمینان ہوگا۔ آج تم ہنس رہے ہو کل کو تم رُو ؤ گے۔ اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر شاداں ہوں گے۔ اور اپنے رب کا شکر ادا کریں گے۔

دراصل یہاں شارحین قرآن کو شبہ یہ پیش آگیا ہے۔ کہ تمسخر نبی کی شان سے فروتر ہے۔ ایک جواب تو شیخ الاسلام نے شاہ عبد القادرؒ کے حوالہ سے دیا ہے کہ تسخر فعل حال کے معنے میں ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر پانی سے بچاؤ کر رہے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہنس رہے ہیں کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنس رہے ہیں اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ انتقام کے موقعہ پر جواب بالمثل سے کام لینا مکارم اخلاق کے منافی نہیں ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے ابن جریجؒ کے حوالہ سے دونوں فعلوں کا متعلق محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر تم دنیا میں ہمارا مذاق اڑا رہے ہو ہم تمہارا آخرت میں مذاق اڑائیں گے۔ اور مشہور علامہ طبریؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ تسخر کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں تمہارے مذاق کا بدلہ دیں گے۔

دراصل یہ استیناف بیانی ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا۔ کہ مخاطبوں کی جانب سے جب یہ ناخوشگوار حالات پیدا ہو گئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے کیا کہا۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ان تسخروا منا فانا نسخر منکم۔ عربی زبان کا یہ انداز تعبیر جو ہے اس کو مشاکلت کہتے ہیں۔ مجاوزات سزا معاوضہ کے موقعہ پر لغت عرب میں یہ محاورہ عام ہے کبھی کبھی جملہ میں صوتی ہم آہنگی کے اقتضاء سے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ جیسے اجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا اور دنا ھم کما دانوا میں ہے۔

بلاشبہ کسی کا مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں اچھا نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں پر اس طرح کی حجت تمام ہو چکی ہو۔ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر کی۔ ان پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کے سرنگوں کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔

یہاں صاحب تفسیر التحریر والتنویر بڑی لطیف بات لکھ گئے۔

کما تسخرون میں اگر کما تشبیہ کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ سخریۃ کے سبب میں تشبیہ ہے۔ اگرچہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے مذاق کا باعث یہ ہے کہ نوح علیہ السلام جو کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ کے لحاظ سے صفر

ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے مذاق کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ کتنے ناخدا شناس ہیں اور صفات باری سے بے خبر ہیں۔ گویا ان کی ہنسی مخاطبوں کی نادانی پر ہے اور مخاطبوں کا مذاق ان کے خیال میں کشتی بنانے کے عمل کا بیکار ہونا ہے۔ اور اگر کما تعلیل کے لیے ہے جیسے واذکروہ کما ھدا کم میں تو پھر دونوں مذاقوں میں جوہری فرق ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب تو ایسے عمل پر مذاق کر رہے ہیں جس کے نتیجے سے وہ بے خبر ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کی غرور پر مبنی جہالت پر مذاق کر رہے ہیں۔ آگے فا کے ذریعے تفریع ہے فسوف تعلمون میں اس کی دلیل ہے۔

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہوں گے کہ کس قدر نادان ہیں کہ عذاب الٰہی سروں پر منڈلا رہا ہے۔ میں ان کو اس کی آمد کی خبر بھی دے چکا ہوں۔ اور ان کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری کر رہا ہوں مگر یہ مطمئن ہیں۔ اور الٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا کے ظاہر و محسوس کے اعتبار سے انسان جسے بے وقوفی اور عقلمندی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق سے کس قدر مختلف ہوتا ہے ظاہر بینوں کا پیمانہ اور ہے اور حقیقت شناس اور ارباب نظر کا پیمانہ کچھ اور ہوتا ہے۔ ظاہر میں آدمی جس چیز کو انتہائی دانشمندی سمجھتا ہے وہ حقیقت شناس کی نظر میں انتہائی بیوقوفی ہوتی ہے۔ جو بات ظاہر کی رائے میں بالکل لغو، سراسر دیوانگی ہوتی ہے۔ حقیقت شناس کے لیے وہی کمال دانش انتہائی سنجیدگی اور مقتضائے عقل ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ تسخرون کے آئینے میں حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو ان کا جو چہرہ دکھا رہے ہیں وہ یہی کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل ہوتے ہوتے تباہی کی ان حدود تک پہنچ گیا ہے۔ جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے تسخرون سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب بقول علامہ آلوسیؒ یہی ہے کہ ایمان و طاعت سے گریز کا فرانہ زندگی پر جاد غضب الٰہی کے اسباب حاصل کرنے کی لگاتار کوشش اور نبوّت کی جناب میں گستاخانہ انداز یہ سب عوامل ہیں عذاب الٰہی کی آمد کے۔ اعاذنا اللہ من غضبہ۔

(۴۷) قوم نوحؑ کے لیے عذاب مقیم

لہٰذا تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ کہ رسوا کن عذاب کا نشانہ کون بنتا ہے۔ اور کس پر نازل

عذاب ڈیرہ لگاتا ہے یعنی اب زیادہ تاخیر نہیں ہے۔ جلد آشکارا ہو جائے گا۔ کہ دنیا کا رسوا کن اور آخرت کا دائمی عذاب کس پر نازل ہوتا ہے[1] یہاں فسوف تعلمون پر فاء دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو تفریع کے لیے ہے تو مطلب یہ کہ تمہارے مذاق کا نتیجہ عنقریب تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا اور تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ مذاق کس کا اڑایا جاتا ہے۔ یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں پتہ لگ جائے گا۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمہیں پتہ لگنا چاہیئے اور جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو ہمیں تو پورا یقین ہے کہ تمہارے اعمال کے نتائج ضرور علی رؤس الاشہاد ظاہر ہو کر رہیں گے۔ جب پوری کائنات میں ایک ہی قانون ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو اور وہاں کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو۔ اعمال کے نتائج کا بھی اللہ نے قانون بنا رکھا ہے اور اس قانون کے مطابق تمہارے اعمال کے نتائج ظاہر ہو کر رہیں گے۔ فا رجزائیہ ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں آج میرے کام کا فائدہ معلوم نہیں ہے تو کام پورا ہونے پر عنقریب تمہیں پتہ لگ جائے گا۔ کہ رسوائی، ہلاکت اور ذلت کی آماجگاہ کون بنتا ہے اور آخرت میں عذاب کا نشانہ کون ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عذاب دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے۔ جس کا مطلب غافلین کو جگانا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ داعی کی بات پر توجہ کریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے۔ اس کے آثار دیکھ کر متنبہ ہو جائیں۔

دوسرا۔ عذاب وہ ہوتا ہے جو کامل اتمام حجت کے بعد رسول کی تکذیب کرنے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نازل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے۔ جو ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے جو اللہ کے رسول کی دعوت کا تمسخر کرتے ہیں اور اس کے مواعظ کو دماغی خلل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ جھونکا نہیں ہوتا کہ وقتی طور پر آیا اور گیا بلکہ جس بستی پر اور جس قوم پر آتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ
زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ
اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ
اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَهِیَ
تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ
فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ۝
قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ
الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ
فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝ وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ
یٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى
الْجُوْدِیِّ وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

حضرت نوح علیہ السلام جہاز بنا رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فیصلے کی گھڑی آگئی۔ اور تنور نے جوش مارا[۴۸] تو ہم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ جہاز میں ہر قسم کے جانوروں میں سے نر اور مادہ لو[۴۹]۔ اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے لو۔ مگر اہل و عیال میں وہ لوگ نہ

ہوں جن کے لیے بات پہلے ہو چکی ہے۔ نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لے آئے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے تھوڑے ہی تھے[۴۰]۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے ساتھیوں سے کہا۔ اس میں سوار ہو جاؤ۔ اس جہاز کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے۔ بلاشبہ میرا آقا بخشنے والا رحمت والا ہے[۴۱]۔ جہاز ان کو لیے پہاڑوں جیسی موجوں کے تھپیڑوں میں جا رہا تھا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ حضرت نوح علیہ السلام سے کسی دُور جگہ تھا۔ میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ ہو[۴۲]۔ بیٹے نے کہا میں تو کسی پہاڑ پر چڑھ ہی جاؤں گا۔ جو مجھے پانی سے محفوظ رکھے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا بیٹے آج اللہ کے حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہاں وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ رحم فرما دے اسی حالت میں باپ اور بیٹے کے درمیان سیلاب کی موج روک بن گئی۔ بس پھر بیٹا سیلاب کی نذر ہو گیا[۴۳]۔ پھر اللہ کا حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تو تھم جا۔ اور پانی کا چڑھاوا اتر گیا۔ اور سیلاب کا حادثہ ہو چکا۔ اور جہاز جودی پر ٹھہر گیا۔ اور کہا گیا۔ ان لوگوں کے لیے رحمت حق سے دُوری ہے جو ظلم کار ہیں[۴۴]۔

مفردات کے معانی

التنور۔ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ معرب ہے۔ چونکہ اہل عرب اس کے دوسرے نام سے واقف نہیں اس لیے قرآن میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے اور جس لفظ کو وہ جانتے تھے وہی بتایا۔ بعض کا خیال ہے کہ تنور فارسی اور عربی دونوں میں اسی طرح ہے۔ اس لیے یہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اصل میں تنور بھی ہے۔ پھر اہل عرب نے اسے بولنا شروع کر دیا تو عربی ہو گیا۔ علماء نے لفظ تنور کو ان الفاظ میں شمار کیا ہے۔ جو غیر عربی الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ابو علی الفارسی کہتے ہیں کہ اس کا وزن تفعول ہے اور ثعلب کا خیال ہے کہ یہ عربی ہے۔ اس کا وزن تفعول ہے۔ نور مادہ ہے۔ اصل میں تنوور تھا۔ پہلے واؤ کو ماقبل مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ سے بدلا۔ پھر ہمزہ کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا۔ پھر ہمزہ کے عوض میں نون کو ڈبل کر کے ادغام کر دیا۔ تنور ہو گیا۔

عذاب قانون اعمال کے مطابق ہوتا ہے

جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہ کے مقررہ ضوابط ہیں۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی ہدایت و ضلالت، نجات و ہلاکت کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جیسے اللہ سبحانہ کے سارے قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر مبدل ہیں۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی جیسے سنکھیا کی خاصیت ہلاکت ہے۔ خواہ کسی ملک اور کسی دور میں کھائی جائے۔ اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہیں خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزاروں سال پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہو۔ اور اب زندگی ہو جائے۔ جو کچھ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ قوموں کا ماضی قوموں کے مستقبل کے لیے آئینہ ہے۔ قرآن اسی قانون کو سنت اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ظہور اس سرزمین میں ہوا۔ جو دجلہ و فرات کی وادیوں میں ہے دجلہ و فرات دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں۔ اور بہت دور الگ الگ بہہ کر عراق زیریں میں باہم مل گئے ہیں۔ پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ اسی سرزمین میں حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ پوری قوم ظلم و فساد کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے دعوت کی ہنسی اڑائی۔ سب نے دلیلوں سے منہ موڑا۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے۔ سب نے جبر و تشدد

سے حق کی راہ روکنی چاہی ۔سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا ۔سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ حق و باطل میں امتیاز کرے ۔ نتیجہ ہمیشہ کی طرح ایک رہا۔ اللہ کے فیصلے کا انتظار ہوا ۔ فیصلہ یہی ہوا کہ مؤمنوں نے نجات پائی اور سرکشوں کے لیے ہلاکت ہوئی ۔

(۲۸) حضرت نوح علیہ السلام جہاز بنا رہے تھے ۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فیصلے کی گھڑی آگئی اور تنور نے جوش مارا یعنی نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ وعدے کے مطابق اللہ سبحانہٗ کا حکم پہنچ گیا ۔ بادلوں کو کہا کہ برس پڑیں اور زمین کو کہا کہ اُبل پڑے ۔ اور فرشتوں کو کہا تعزیب وغیرہ کے متعلق اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دیں ۔آخر اُوپر سے بارش ہوئی اور نیچے زمین کی سطح سے چشموں کا جوش مار کر پانی اُبلنے لگا حتیٰ کہ روٹی پکانے کے تنوروں میں بھی جہاں آگ بھری ہوئی تھی پانی اُبل پڑا[1] یہ اس عذاب کی جو سیلاب و طوفان کی شکل میں آیا ایک دلکش منظر کشی ہے ۔ امر سے مراد یہاں وہ عذاب ہے جو حکم الٰہی سے ظہور میں آیا ۔

یہاں تنور سے کیا مراد ہے ۔ اس موضوع پر شارحین قرآن میں اختلاف ہے ۔عکرمہ اور زہری کا بیان ہے کہ تنور سے سطح زمین مراد ہے کیونکہ نوح علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ جب پانی کو سطح زمین سے اُبلتا ہوا دیکھو ۔ تو کشتی پر سوا ہو جانا ۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنور کے جوش مارنے یعنی سطح زمین سے اُبلنے کو نوح علیہ السلام کے لیے اس حادثہ کی علامت بتایا گیا تھا ۔حضرت علی فرماتے ہیں ۔کہ فار التنور کے معنے ہیں ۔ طلع الفجر تنور الصبح ۔ یعنی پو پھٹ گئی اور صبح ہوگئی ۔ صبح کی روشنی کو تنور میں سے آگ نکلنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ۔حسن بصریؒ اور شعبیؒ فرماتے ہیں کہ تنور وہی ہے جس میں روٹی پکاتے ہیں ۔یہی اکثر مفسرینؒ کا خیال ہے ۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک بیان میں آیا ہے ۔اور یہی قول زیادہ صحیح ہے ۔کیونکہ لفظ میں جب حقیقی اور مجازی معنے کا احتمال ہو تو جب تک مجازی معنے کے لیے قرینہ نہ ہو حقیقی معنے ہی مراد لینا زیادہ بہتر ہے اور لفظ تنور اس جگہ کے نام کے لیے جہاں روٹی پکائی جاتی ہے حقیقت ہے ۔اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ الف لام التنور تعین چاہتا ہے اور یہاں سامع کے ذہن میں کوئی چیز متعین نہیں لہٰذا تنور کو کسی اور معنے پر محمول کرنا ناگزیر ہے ۔اس لیے فار التنور کے معنے یہ ہیں کہ بس صورت حال سنگین سے سنگین تر ہوگئی ۔

اصل یہ ہے کہ فار التنور میں لفظ فوران سے فار آیا ہے ۔ اور فوران کے معنے دیگچی میں اُبال آنے

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

لے ہیں۔ پانی قوت اور زور سے اچھل کر نکلے تو اس کے لیے فار الماء بولتے ہیں۔ لیکن یہاں فوران کی نسبت تنور کی طرف ہے۔ اس نسبت ہی نے عام نگاہوں میں اس کے معنے میں پیچیدگی پیدا کردی ہے کیونکہ تنور روٹی پکانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ ان دو باتوں نے مل کر تشریح و تفسیر میں متعدد آراء کو جنم دے دیا۔

کچھ شارحین قرآن نے لفظ تنور کو حقیقی معنے میں لیا اور معنے یہ بتائے کہ تنور سے پانی ابلنا شروع ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو آغاز طوفان کے لیے اسی کو علامت مقرر کیا گیا تھا۔

کچھ نے تنور کو مجازی معنے میں لے کر سطح زمین کے معنے بتائے۔ یعنی ساری زمین سے تنور کی طرح پانی ابلنے لگا۔

اور کچھ نے فار اور تنور کو دونوں کو حقیقی معنے میں لیا ہے۔ لیکن پورے جملے کو صورت حال کی سنگینی کے لیے تمثیل قرار دیا۔ جیسے جنگ کی سنگینی کے پیش نظر حمی الوطیس بولا جاتا ہے۔ اب تنور گرم ہو گیا۔ یہ تشریح مشہور مفسر ابن عطیہؒ نے کی ہے۔ نابغہ جعفری کہتا ہے۔

تفور علینا قدرھم فندیمھا

ونفثاء ھا عنا اذا قدرھا نملی

ہمارے خلاف ان کی جنگ کی دیگچی میں ابال آتا ہے۔ ہم اسے برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن جب دیگچی کو زیادہ ابال آتا ہے تو ہم پانی کے چھینٹے سے ابال کو دبا دیتے ہیں۔

تنور کے معنے وادی کے کنارے کے بھی آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایسا بھی محاورہ ہے جیسے بلغ السیل الزبی۔ سیلاب ٹیلوں تک پہنچا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا فیصلہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ان کی سرکشی اور کفر و ظلم کی عمر درازی ناقابل معافی کی حد تک پہنچ گئی۔

آیئے اس ساری تفصیل کا خلاصہ افادات میں شیخ الاسلامؒ کی زبانی بھی سُن لیجئے۔

تنور کے معنے میں اختلاف ہے۔ بعض مطلق روٹی پکانے کا تصور مراد لیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک تنور حضرت حواء سے منتقل ہوتے ہوتے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پہنچا تھا۔ وہ ان کے گھر میں طوفان کا نشان ٹھہرا دیا گیا تھا۔ کہ جب اس سے پانی ابلے۔ کشتی میں سوار ہو جانا۔ بعض کے نزدیک تنور کوئی خاص چشمہ کوفہ یا جزیرہ میں تھا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ تنور صبح کے اجالے اور روشنی کو کہتے ہیں یعنی صبح کی روشنی خوب ہو جائے۔ ابو حیان کہتے ہیں۔ کہ فار التنور ممکن ہے ظہور عذاب اور شدت ہول سے کنایہ ہو۔ جیسے حمی الوطیس شدت حرب سے کنایہ ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے

کہ تنور کے معنے وجہ ارض سطح زمین کے آتے ہیں ۔ ہم نے اُوپر جو تفسیر کی ہے ۔مقدم اسی کو رکھا ہے ۔اشارہ بعض دوسرے معانی کی طرف بھی کر دیا ہے ۔حافظ ابن کثیرؒ بھی تفسیر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں ۔ ھذا قول جمھور السلف وعلماء الخلف[۱] علامہ بقاعی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے ۔

عبداللہ بن عباسؓ ،حسن بصریؒ اور مجاہدؒ بھی لکھتے ہیں کہ تنور اپنے حقیقی معنے میں ہے ۔ ظاہر کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ لہٰذا ظاہر سے بلا دلیل ہٹنا عبث ہے ۔

ظاہر کا بھی یہی تقاضا ہے ۔اس لیے فرمایا ہے کہ فار التنور جملہ کی بذریعہ عطف جاء امر اللہ سے پیوند کاری کی ہے ۔اس طرح حتیٰ کا مدخول دونوں جملے ہیں ۔مطلب یہ ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ۔کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہوگیا ۔اور روٹی پکانے کے تنور سے پانی اُبلنے لگا ۔اور تنور ہی سے طوفان کا آغاز ہوگیا ۔جس کے اندر سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ۔ پھر ایک طرف سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی ۔اور دوسری طرف وفجرنا الارض عیونا ۔زمین میں جگہ جگہ چشمے پھوٹ پڑے ۔اس طرح سیلاب نے اتنا گہرا پانی جمع کرلیا تھا ۔اور طوفانی ہواؤں کا یہ عالم تھا کہ اُونچی اُونچی موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں ۔ اور یہ طوفانی ہوائیں تند اور چکردالی تھیں ۔جن سے سخت بارش ہوتی تھی ۔ بارش کے سمندر کا پانی بھی اُبل پڑا ۔

(۴۹) جہاز میں نر و مادّہ رکھنے کا حکم

تو ہم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جہاز میں ہر قسم کے جانوروں میں سے دو نر و مادّہ رکھ لو یعنی جن جانوروں کی ضرورت ہے ۔اور نسل باقی رکھنی مقصود ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا نر و مادّہ دونوں لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ[۲] احمل من کل زوجین اثنین ۔ لفظ کُلُ دو طرح سے پڑھا گیا ہے ایک یہ کہ کُلِّ کو مضاف بنایا جائے ۔اور زوجین کو مضاف الیہ اور اثنین کو احمل کا مفعول بہ بنایا جائے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر جوڑے میں سے دو عدد لے لو ۔ یعنی نر اور مادّہ زیادہ نہ ہوں ۔اور دو جوڑے نہ ہوں ۔ کچھ شارحین قرآن نے دو ترجمہ کیا ہے ۔یہ مراد کے خلاف ہے ۔ زوجین نر و مادہ کو ملا کر کہتے ہیں ۔ یہ زوج کا تثنیہ ہے ۔قرآن میں ہے ۔ ومن کل شیئ خلقنا زوجین ۔ ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا

[۱] افادات شیخ الاسلام

[۲] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ قرآن نے نر و مادہ کو زوجین ہی کہا ہے۔ انہ خلق الزوجین الذکر والانثیٰ
آیت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ نر و مادہ کے دو دو جوڑے رکھو۔ جیسا کہ اُردو کے بعض تراجم سے ابہام
ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ نر و مادہ رکھو جو دو پر مشتمل ہوں۔ اگر زوجین سے مراد دو جوڑے ہوں۔ تو
پھر دو نہیں چار ہو جائیں گے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔

مراد اس سے وہ ایک ہے۔ جو دوسرے سے ملا ہوا ہو۔ لہٰذا نر زوج ہے مادہ کا اور
مادہ زوج ہے نر کا۔ کبھی دونوں کے مجموعہ پر بھی زوج بولا جاتا ہے۔ لیکن یہاں وہ مراد
نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ ہر صنف میں سے چار لیے جائیں اور اس لیے بھی کہ
اس صورت میں اثنین زوجین کی صفت نہ رہے گی۔

دوسری قرأت یہ ہے۔ کہ کل کو کسرے کی تنوین کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس صورت میں مضاف الیہ یعنی
من کل شیٔ یعنی دو لے لو۔ حال دونوں کا ایک ہے مگر اس میں عموم زیادہ ہے۔ یہاں پوری کائنات میں
قانون تزویج کام کر رہا ہے۔

سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض
ومن انفسھم ومما لا یعلمون۔

پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کے نباتات
میں سے ہوں یا خود نوع انسانی میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو لوگ جانتے
نہیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دن رات جو کچھ دیکھ رہے ہو ان کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود
ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑا خود انسان کا سبب پیدائش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادہ کے ازدواج
سے چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ ان میں تزویج کا اصول کام کر رہا ہے۔ بہرحال
اس صورت میں مطلب بالکل واضح اور صاف ہے۔

یہاں شارحین قرآن نے بڑی دور دراز کار بحثیں اس موضوع پر چھیڑ دی ہیں۔ کہ جن جانوروں کے
نر و مادہ لینے کا یا جن چیزوں کے جفت لینے کا حکم ہے۔ وہ کون کون سی اور کیا کیا ہیں۔
من کل کے عموم سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا بھر کے سارے جانور کیڑے مکوڑے تک سب اسی
میں شامل ہوں۔ بلکہ یہ بات معیشت انسانی کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ اس سے مراد صرف وہی جانور
ہو سکتے ہیں۔ جن کا تعلق انسان کی معیشت سے ہے۔ اور جو ان کی مختلف معاشی ضرورتوں کے لیے ناگزیر

تھے ۔یہاں مولانا اشرف علیؒ کی یہ بات بہت وزنی ہے ۔کہ

تمام انواع حیوان میں سے وہ یقیناً خارج ہیں جو پانی میں رہ سکتے ہیں ۔اور جو محتاج تناسل نہیں وہ بھی خارج ہیں اور اقسام تو ان میں سے ممکن ہے کہ وہی سوار کیے گئے ہوں جن سے انسانی جسامت متعلق ہوتی ہے ۔ جیسے ماکولات ،مرکوبات ،عوامل اور حوامل تاکہ بعد ختم طوفان کے بقیہ افراد انسانی کو تکلیف نہ ہو۔

(۵۰) اور اپنے اہل وعیال کو بھی لے لو ۔مگر اہل وعیال میں وہ نہ ہوں ۔جن کے بارے میں بات پہلے ہو چکی ہے ۔نیز ان لوگوں کو بھی لے لو ۔جو ایمان لے آئے ۔نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے تھوڑے تھے ۔یعنی مقرر ہو چکا ہے کہ وہ ظالموں کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے غرق کیے جائیں گے ۔ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انہم مغرقون ۔اس سے مراد ہے حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ریام) جس کا لقب کنعان تھا ۔اور کنعان کی والدہ "داعلہ" گھروالوں میں سے یہ دونوں علیحدہ رہے ۔اور غرق ہوئے ؛

من سبق علیہ القول ۔جس پر بات پہلے ہو چکی سے مراد کیا ہے ۔ظاہر یہی ہے کہ جن کے بارے میں ظلم کاری کی پاداش میں غرق کیے جانے کا فیصلہ اللہ سبحانہٗ پہلے لا تخاطبنی الخ میں وحی کے ذریعہ سنا چکے ہیں ۔ان کو کشتی میں سوار نہ کرنا ۔ واھلک میں دو احتمال ہیں ۔ایک یہ کہ اہل ایمان مراد ہوں ۔دوسرے یہ کہ اہل قرابت ہوں ۔اہل ایمان اگر مراد ہیں ۔توالامن سبق میں استثنار متصل ہے ۔اور اگر اہل قرابت ہیں استثنار منقطع ہے ۔اور قرینہ دلیل ہے کہ اہل سے اہل قرابت مراد ہیں ۔حضرت نوح علیہ السلام نے اہل سے اہل قرابت ہی سمجھ کر دعا رکی تھی ۔کہ ان ابنی من اھلی ۔اگر اہل سے اہل ایمان مراد ہوتے تو حضرت نوح علیہ السلام یہ دعا ہرگز نہ فرماتے۔ یہ کہنا بالکل بے معنی اور بے جان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے کفر کی خبر نہ تھی ۔اس لیے کہا کہ وہ میرے اہل سے ہے اور میرے اہل وعیال کی حفاظت کا آپ نے وعدہ کیا ہے ۔کیونکہ اہل ایمان کا صراحتاً آگے ذکر آرہا ہے ۔ ومن امن وما امن معہ الا قلیل اس لیے بلا ریب اہل سے مراد اہل قرابت ہیں ۔نہ کہ اہل ایمان مطلب صاف ہے ۔کہ الذین ظلموا میں داخل ہیں اہل قرابت اور اہل ایمان کو یہاں اہلک کہہ کر یہی کہا گیا ہے کہ اپنے اہل قرابت کو جہاز

لے افادات شیخ الاسلام

میں سوار کر لینا مگر ان اہل قرابت کو کشتی میں سوار نہ کرنا جن کے دامن پر ظلم کے دھبے ہیں ۔ یہ سوال کہ اگر ایسا ہے تو حضرت نوح علیہ السلام نے دعا ر کیوں کی ۔ ؟ دعا ر اس لیے کی کہ اہلک مطلق ہے۔ اس میں ایمان کی قید نہ تھی ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے شفقت پدری کی وجہ سے اس اطلاق سے یہ فائدہ اٹھایا ہے ۔ اور اس کہنے میں بھی کہ

اس فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو روز اوّل اس کے الٹی میٹم کے کے جواب میں سنا دیا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے ۔ میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا ۔ مطلب یہ ہے کہ جو حکم ازل کی زد میں آچکے ہیں ۔ وہ تو اس میں سوار ہونے سے محروم رہیں گے ۔ باقی کو ان میں سوار کر ۔

کوئی معنویت نہیں ہے ۔ خود حضرت نوح علیہ السلام جو اس کلام کے مخاطب ہیں ان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں جو ان شارح قرآن کے جملۂ دماغ میں آئی ہے ۔

آخر میں ہے کہ ما اٰمن معہ الا قلیل ۹۵۰ سال کے طویل عرصہ میں جانکاہ اور روح فرسا محنت اور عرق ریزی کے بعد ایمان میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد قلیل تھی ظاہر ہے کہ قلت سے قلت عددی مراد ہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عمومی نہیں بلکہ علاقائی ہے اس علاقہ میں، اس دور میں افرادی طاقت عام شہری زندگی میں کیا تھی ۔ اس کا کوئی حتمی فیصلہ محض قیاس سے نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں قلت کا پیمانہ بتا رہا ہے کہ کفر پسندوں کی بھرپور اکثریت تھی ۔ اور قرآن بتا رہا ہے ۔ کہ آدمیوں کے سمندر میں سے صرف ایمان لانے والے گنتی کے چند آدمی تھے ۔ ان گنتی کے اہل ایمان میں سے متمول سرمایہ دار شہری زندگی میں اُونچے مرتبہ والا کوئی نہ تھا ۔ بلکہ یہ سارے لوگ شہری زندگی کے ایسے افراد پر مشتمل تھے ۔ جن پر مادیت کے پرستار اراذل کی پھبتی کستے تھے ۔ اور اُن سے بات کرنا، ان کے پاس بیٹھنا اپنے لیے باعث توہین سمجھتے تھے ۔

اس تعبیر سے یہ بات بھی دلالۃً سمجھ میں آ رہی ہے ۔ کہ یہ خوفناک اور بلاخیز طوفان انسانوں کی اس عظیم اکثریت کو بہا کر لے گیا ۔ صرف چند گنے چنے لوگ جن کو ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا ۔ وہ اس بلائے بے درماں سے محفوظ رہے ۔

اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اکثریت اگر ظلم و فساد کا گہوارہ اور کفر و شرک کا اڈہ ہو تو نگاہ رب العزت میں وہ گندگی کا ڈھیر ہے ۔ وہ اس گندگی سے زمین کو پاک ہی دیکھنا چاہتا ہے ۔ اور صرف اس لیے کہ کفر و شرک کو عددی اکثریت اور افرادی قوت حاصل ہے ۔ اپنی زمین کی پشت پر لادے رکھنا

وہ پسند نہیں کرتا۔

یہ آیت یہ بھی بتارہی ہے۔ کہ اچھے لوگ خواہ تعداد میں کتنے تھوڑے ہوں۔ اللہ کی رحمت ان کو اپنے دامن کرم میں رکھ کر ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ طوفان نوح بھی اسے گزند نہیں پہنچاتا۔

(۵۱) ایمان کا مرکزی نقطہ نظر

اور حضرت نوح علیہ السلام نے ساتھیوں سے کہا۔ اس جہاز میں سوار ہو جاؤ۔ اس جہاز کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے۔ بلاشبہ میرا اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بنام خدا کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ کچھ فکر مت کرو۔ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ سبحانہ کے اذن وحکم اور اس کے نام کی برکت سے ہے۔ غرقابی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرا پروردگار مؤمنین کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور ان پر بے حد مہربان ہے۔ وہ اپنے فضل سے ہم کو صحیح وسلامت اتارے گا۔ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت بسم اللہ کہنا چاہیئے[1] اللہ سبحانہ کے حکم کے موافق حضرت نوح علیہ السلام نے ان لوگوں کو جنہوں نے دعوت ایمان پر لبیک کہی تھی۔ جہاز پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ اور پہلی بات اس موقعہ پر جو زبان مبارک پر آئی یہ تھی۔ بسم اللہ مجرھا ومرسا ھا۔ یہ کہنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اسباب و وسائل خود کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں۔ لیکن مرد مؤمن کا اصلی سہارا اسباب نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت ورحمت پر ہوتا ہے۔ اُس کی آغوش رحمت اگر متوجہ ہو تو بحر زخار کی متلاطم موجوں میں لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ بھی آدمی کے لیے بچاؤ کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اور یہ بھی آیت بتا رہی ہے کہ اسباب میں محو ہو کر خالق اسباب سے بیگانہ ہونا یا یاد الہٰی میں لگ کر ترک اسباب کرنا ایمان کا مطالبہ نہیں ہے۔ ایمانی تقاضا یہ ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اسباب کی پاسبانی اسباب کی حد تک کرے مگر اصلی اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب کی رحمت پر ہو۔ اسباب کا ہو کر رہ جانا اگر مادیت ہے۔ اور اسباب سے بیگانہ ہو کر نرا خالق اسباب پر سہارا کر لینا۔ رہبانیت ہے۔ اسلام اور صراط مستقیم دونوں کے درمیان ہے۔ گویا مؤمن کی اصلی شان یہ ہے۔ کہ وہ عالم اسباب میں ساری تدابیر اللہ سبحانہ کے قانون کے مطابق اسی طرح اختیار کرتا ہے۔ جس طرح دنیا دار کرتے ہیں۔ مگر اس کا بھروسہ

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

ان تدابیروں پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہ پر ہوتا ہے اور اسے بھر پور یقین ہوتا ہے۔ کہ کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک شروع ہو سکتی ہے۔ اور نہ ٹھیک چل سکتی ہے۔ اور نہ آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے۔ جب تک اللہ سبحانہ کا فضل اور اس کا رحم وکرم شامل حال نہ ہو۔

سورہ مؤمنون میں یہ ہدایت بھی ہے۔ کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد یہ بھی کہو۔

الحمد للہ الذی نجانا من القوم الظالمین

اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرو۔

رب انزلنی منزلا مبارکا وانت خیر المنزلین

خدایا مجھے زمین پر اس طرح اتار کہ برکت کا اترنا اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے۔

یہ دعائیں بتا رہی ہیں۔ کہ نبوت زندگی کا جو نظام لے کر آتی ہے اس کے تمام اجزا جس مرکز سے جرأت اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سبحانہ کی ذات ہے۔ نبوی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اسی تصور کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اس کے تمام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے شعبے اور تمام احوال اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ رنج وغم کی حالت ہو یا شادمانی ومسرت ہو، معاشرتی زندگی ہو، یا اخلاق واعمال و فرائض ہوں، یا آداب کی تمام شاخیں غرض زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اس مرکزی تخیل سے وابستہ ہے۔ اس بنیاد سے ذرا ہٹ جایئے تو نبوت کا کوئی حصہ اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہ سکتا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً اسی آیت کے اشارے سے معلوم کر کے سفر کے آداب واذکار کا نقشہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے پیش فرمایا ہے۔ تفصیل دیکھنی ہو تو امام نوویؒ کی کتاب الاذکار الجزری کی الحسن الحصین حافظ ابن القیم کی الوابل الصیب حافظ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب پڑھیئے۔

(۵۲) طوفان کی بلاخیزی کا دہشتناک منظر

جہاز ان کو پہاڑوں جیسی موجوں کے تھپیڑوں میں لیے جا رہا تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ اور وہ حضرت نوح علیہ السلام سے کسی دور جگہ پر تھا۔ میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ یعنی کشتی پہاڑوں جیسی موجوں کو چیرتی ہوئی۔ بے خوف وخطر چلی جا رہی تھی۔ سوار ہونے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے یام کنعان کو جو اپنے باپ بھائی وغیرہ سارے کنبے سے کنارے ہو کر کافروں کی صحبت میں تھا۔ آواز دی کہ ان بدبخت کافروں کی معیت چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو جاؤ تاکہ اس مصیبت عظمیٰ سے نجات مل سکے۔ یہ پکار یا تو اس لیے تھی کہ حضرت

نوح علیہ السلام اسے مسلمان خیال کرتے تھے۔ خواہ وہ واقع میں مؤمن نہ ہو یا کافر ہونا معلوم تھا مگر یہ توقع ہو گی۔ کہ ان ہولناک نشانات کو دیکھ کر مسلمان ہو جائے گا۔ واھلك کے عموم میں داخل سمجھ کر شفقت پدری کے جوش میں ایسا کیا ہو۔ اور الا من سبق علیہ القول۔ کو مجمل ہونے کی وجہ سے اس پر منطبق نہ سمجھتے ہوں [1] جہاز بلاخیز موجوں میں چل رہا تھا۔ موجیں اس طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ گویا پہاڑ اُٹھ رہے ہوں۔ یہ اس منظر کی صحیح تصویر ہے۔ جو طوفانی سمندروں میں موجوں کے اُٹھنے سے ہو جاتی ہے۔ یہ ساری صورت حال یکبارگی نہیں ہوئی بلکہ بتدریج دھیرے دھیرے فعل مضارع تجری اسی تدریج کو ظاہر کر رہا ہے۔ موجوں کا یہ نظارہ سیلاب کی جوانی ہے۔ اسی سیلاب کے آغاز میں جب طوفان میں یہ بلاخیزی نہ آئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ نادٰی ماضی کا صیغہ اسی بات کو ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موجوں کے تلاطم سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ بیٹا حضرت نوح علیہ السلام سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس کو دیکھ کر پدری شفقت جوش میں آگئی۔ اُس کو آواز دے کر پکارا۔ یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین۔ علامہ آلوسیؒ نے محققین کی طرف منسوب کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ انما کان قبل الرکوب فی السفینۃ والواو لا تدل علی الترتیب۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ بات وہی ہے کہ ابھی جہاز اور زمین کے درمیان علاقہ تھا۔ پانی کی ابھی بہتات نہ تھی۔ سیلاب بتدریج بڑھ رہا تھا۔ کہ یہ گفتگو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس پکار میں بیک وقت شفقت اور دعوت دونوں کی روح کام کر رہی ہے۔ یا بنی پیار و شفقت میں ڈوبی ہوئی پکار ہے۔ اور لا تکن مع الکافرین میں گویا آخری دعوت ہے۔ کہ پیارے اب بھی موقع ہے۔ کہ ان کافروں کا ساتھ چھوڑ کر ہم میں شامل ہو جا۔ بلاشبہ تجری حال کا صیغہ تصویر حال کے لیے ہے۔ لیکن نادٰی نوح ابنہٗ وکان فی معزل۔ کے الفاظ قاری کے سامنے حال کی نہیں ماضی کے منظر کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ایک قرآنی تفسیر کے شارح کی سمجھ میں ماضی اور حال میں منظر کشی کے لیے ہم آہنگی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ دور از کار تاویل کی اور الفاظ کی شوکت سے اپنے مخاطبوں کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ وہ فرماتے ہیں

> طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ پہاڑوں کی طرح موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ ان موجوں کے تھپیڑوں سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نبرد آزما ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ اتنے میں نگاہ اٹھتی ہے۔ تو دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلے پر جواں سال بیٹا حالات سے سراسیمہ ششدر کھڑا ہے۔

کوئی ان سے پوچھے کہ جب موجیں پہاڑوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ تو یہ صاحبزادے کہاں کھڑے تھے؟ خشکی کہاں تھی؟ اور جب ان موجوں میں سب ڈوب رہے تھے تو یہ اکیلے کہاں تھے؟

اصل یہ ہے۔ کہ انہوں نے آیت میں واؤ کو ترتیب کے لیے سمجھ لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دو باتوں میں زمانی اور مکانی ترتیب کوئی نہیں ہے۔ اس لیے بات بتائی جا رہی ہے۔ کہ

اللہ نے چاہا کہ حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کے ڈوبنے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی وفاداری کا آخری امتحان تھا۔

غور فرمایئے اس میں نبوّت کے امتحان کی کون سی بات ہے۔ جب کہ حضرت نوح علیہ السلام کفر سے بیزاری کا کھلے بندوں اظہار فرما رہے ہیں۔ اور بیٹے کو کافروں کی معیت چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ بلا ریب حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹے سے یہ مکالمہ پہاڑوں جیسی موجوں میں نہیں بلکہ اس سے پہلے ہے۔ جب کہ ان کا بیٹا کسی دُور مقام پر خشکی پر کھڑا ہے۔ قرآن میں نادیٰ اور کان فی معزل۔ اسی کی تائید کر رہے ہیں۔ علامہ طاہر نے التحریر والتنویر میں یہی بات مخاطبوں کو سمجھانے کے لیے لکھی ہے۔

کان نداءہ ابنہ قبل جریان السفینۃ فی موج کالجبال

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو پکارنا پہاڑ جیسی موجوں میں جہاز کی روانگی سے پہلے تھا۔ جہاز کی روانگی کے بعد پہاڑوں جیسی موجوں میں جہاز کا ٹھہرنا ہی ممکن نہیں ہے کان فی معزل۔ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دُور کھڑا تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اہل ایمان سے علیحدہ تھا۔ یا تو اس لیے کہ وہ ایمان کی نعمت سے بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے طوفان کے آنے کی تصدیق نہ کرتا تھا۔ اور یا اس نے راہ ارتداد اپنالی تھی۔ لاتکن مع الکافرین قرینہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس کو مومن سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ نہ کہتے کہ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ اور ارکب معنا دلیل ہے۔ کہ جہاز میں سوار ہونے کے وقت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ اگر وہ پہلے مسلمان نہ ہوتا۔ تو حضرت نوحؑ یہ نہ فرماتے کہ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ بلکہ فرماتے بیٹے اب تو مان لے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ مسلمان کے لیے کفار کی معیت بھی سنگین جرم ہے۔ یہ ایمانی زندگی کا اصل اُصول ہے۔ اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ کفر بے قیدی اور بے راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے۔ جس میں افراد کے ارادوں پر کوئی بالاتر ضابطہ حیات

اور اعلیٰ ترین آئین زندگی حکمران نہیں ہوتا ہے۔ کفار کا ارادہ بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے۔

(۵۳) یہ سیلاب نہیں عذاب الٰہی ہے

بیٹے نے کہا ابا میں تو کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ جو مجھے پانی سے محفوظ رکھے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا بیٹے آج اللہ کے حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہاں وہ بچ سکتا ہے۔ جس پر اللہ رحم فرمائے۔ اسی حال میں باپ اور بیٹے کے درمیان سیلاب کی موج روک بن گئی۔ بس پھر بیٹا سیلاب کی نذر ہو گیا۔ یعنی کس خبط میں پڑا ہے یہ معمولی سیلاب نہیں۔ وہ اپنی غباوت سے ابھی یہی خیال کر رہا تھا۔ کہ جس طرح معمولی سیلابوں میں بعض کسی بلندی پر چڑھ کر آدمی جان بچا لیتا ہے۔ میں بھی کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچالوں گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بتایا۔ یہ طوفان عذاب الٰہی ہے۔ پہاڑ کی کیا حقیقت۔ کوئی چیز آج عذاب سے نہیں بچا سکتی ہے۔ ہاں اللہ سبحانہٗ ہی کسی پر رحم کرے تو بچ سکتا ہے۔ مگر اس ہنگامہ دار و گیر اور مقام انتقام میں کھڑے مجرموں پر رحم کیا؟ باپ بیٹے کی یہ گفتگو پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ پانی کی ایک موج نے درمیان میں حائل ہو کر ہمیشہ کے لیے دونوں کو جدا کر دیا[1] حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو سیلاب کی ہولناکی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام سے یہ مکالمہ جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہو رہا تھا۔ اور جہاز ابھی روانہ نہ ہوا تھا۔ کہ باپ کی اس شفقت بھری دعوت کا جواب بڑے دانشمندانہ انداز میں اس طرح دیا۔ کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ پہاڑ کی بلندی مجھے پانی سے بچا لے گی۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ کہ نادان سمجھ رہا تھا۔ پانی کے طوفان کی پہاڑوں کی بلندی تک رسائی نہ ہوگی۔ اور یہ بھی حافظ ابن کثیرؒ نے بتایا ہے۔ کہ اپنے بیٹے کو جہاز پر سوار ہونے کی دعوت جہاز پر خود سوار ہونے کے وقت دی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں جہاز پر سوار ہونے کی دعوت سوار ہونے کے وقت اور بیٹے کا یہ کہنا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ بتا رہی ہیں۔ کہ یہ گفتگو طوفان کے آغاز میں ہو رہی ہے۔ ورنہ پہاڑوں جیسی موجیں آنے کے بعد پہاڑ پر چڑھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور جہاز کے پانی سے اٹھ جانے کے بعد دعوت کا کوئی سوال نہیں ہے۔

نوح علیہ السلام نے بیٹے کو سمجھایا۔ بیٹے یہ سیلاب نہیں قہر الٰہی ہے۔ اس سے بچانا پہاڑ کا نہیں اللہ کا کام ہے۔ جس پر اللہ رحم کرے گا وہ ہی عذاب کی گرفت سے محفوظ رہے گا۔ یہ طبعی سیلاب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے۔ یہ دعا کی قبولیت پر عذاب الٰہی آیا ہے۔ یہ قہر الٰہی ہے۔ اس سے پناہ دینے کی مجال کسی کو نہیں ہے۔ نہ پہاڑ کو اور نہ پہاڑ کی چوٹی کو ہاں جسے اللہ سبحانہ خود ہی بچا لینا چاہے بچائے

بائبل میں ہے۔

> اور پانی بڑھ گیا اور کشتی کو اوپر اٹھایا۔ کشتی زمین پر سے اٹھ گئی۔ اور پانی زمین پر بڑھا۔ اور بہت زیادہ ہوا۔ اور کشتی پانی کے اوپر بہتی رہی۔ اور پانی زمین پر بے نہایت بڑھ گیا۔ اور سب اونچے پہاڑ جو زمین کے نیچے تھے۔ چھپ گئے۔ پندرہ ہاتھ ان کے اوپر بڑھا اور پہاڑ ڈوب گئے۔ پیدائش ۷ : ۱۷ - ۲۱

ارشاد ہوا ہے۔ وحال بینھما الموج اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی۔ واؤ صرف جمع کے لیے ہے ترتیب کے لیے نہیں ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی یہ گفتگو جہاز پر سوار ہوتے وقت ہوئی۔ پانی نے بڑھنا شروع کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی نگاہیں بچے کو اس بلاخیز طوفان میں اپنے بچے کو دیکھ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے حضرت نوح علیہ السلام اور بیٹے کے درمیان پانی کا ایک بڑا ریلا حائل ہوگیا۔ قرآن نے یہی نہیں بتایا کہ حضرت نوح علیہ السلام ہی کا بیٹا غرق ہوا ہے بلکہ بتایا کہ سب غرق ہوگئے اور وہ بھی غرق ہونے والوں میں تھا۔ یعنی نہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بچا نہ اور کوئی اس طوفانی عذاب سے محفوظ رہا۔

(۵۴) بلاخیز طوفان کا خاتمہ

پھر اللہ کا حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تو تھم جا اور پانی کا چڑھاوا اتر گیا۔ اور سیلاب کا حادثہ ہو چکا اور جہاز جودی پر ٹھہر گیا اور کہا گیا کہ ان لوگوں کے لیے رحمت حق سے دوری ہے۔ جو ظلم کار ہیں۔ یعنی ایک مدت تک اتنا پانی برسا گویا آسمان کے دھانے کھل گئے۔ اور زمین کے دھانے پھٹ گئے۔ درخت اور پہاڑ تک پانی میں چھپ گئے۔ جہاز والوں کے سوا تمام لوگ جن کے حق میں حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا

غرق ہوگئے۔ اس وقت خداوند قدوس نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا اور بادل کو فرمایا کہ تھم جا۔ پھر کیا مجال تھی کہ دونوں اس کے تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی تاخیر کرتے۔ چنانچہ پانی خشک ہونا شروع ہوگیا۔ کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی۔ جو بعض کے نزدیک موصل میں تھا۔ اور جو کام اللہ سبحانہ نے کرنا تھا یعنی مجرمین کو سزا دینا وہ پورا ہو

چکا۔ ظالموں کے حق میں کہہ دیا گیا کہ اللہ سبحانہ کی رحمت سے دُور ہو کر ہمیشہ کے لیے معیبت و ہلاکت میں پڑے رہو۔

اس میں اختلاف ہے کہ طوفان نوحؑ تمام دنیا میں یا خاص مُلکوں میں آیا۔ اس کے فیصلے کا یہاں موقعہ نہیں ہے مگر یاد رہے کہ دائرۃ المعارف میں بعض محققین یورپ کے ایسے اقوال و دلائل نقل کیے ہیں جو عموم طوفان کی تائید کرتے ہیں۔ جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔ وجعلنا ذریتہ ھم الباقین طوفان سے جو بچے اور حیوانات ہلاک ہوئے۔ ان کا اہلاک بطور تعذب نہ تھا۔ بلکہ جیسے اللہ سبحانہ دوسرے اسباب طبعیہ کے ذریعے سے ان پر موت طاری کرتا ہے۔ اور وہ ظلم نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں ان کی موت اس ذریعہ سے واقع ہوئی۔ آخر اب بھی جو سیلاب اور طوفان آتے ہیں۔ ان میں کتنے جانور اور بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔[1]

طُوفان کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے۔ کہ

۱۔ کیا دنیا کی آبادی صرف عراق تک محدود تھی۔ یا آج کی طرح دنیا آباد تھی۔

۲۔ اگر دنیا عراق سے باہر بھی تھی۔ تو کیا حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عمومی تھی۔ یعنی کیا آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح عموم بعثت لے کر آئے تھے۔

قرآن میں صراحۃً دلالۃً اور اشارۃً بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ دنیا کی آبادی اس علاقہ تک محدود تھی۔ آیت قرآنی وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ سے اس پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنے تو یہ ہیں۔ کہ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے مخالف تھے۔ ان کی نسل اس علاقہ سے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی ناپید کر دی گئی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی نسل باقی رکھی گئی۔ اور بس۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت علاقائی تھی۔ عالمی نہ تھی۔ جیسا کہ ہر جگہ الی قومہ کی تعبیر بتا رہی ہے۔ ان دو باتوں میں کوئی منطقی ربط نہیں ہے۔ کہ بعثت حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کی طرف ہو۔ اور اپنے علاقہ میں ہو۔ اور طوفان کے ذریعے ان لوگوں کو تباہ کر دیا جائے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب نہیں ہیں۔ یہ بات صراحۃً قرآن کے خلاف ہے۔ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے۔ جسے قرآن بار بار اور مختلف طریقوں سے اپنے مخاطبوں کے ذہن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بیں بٹھانا چاہتا ہے۔ کہ اللہ سبحانہ کا نظام عدالت بھی ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ رسول اور اس کا لایا ہوا پیغام بھی بندوں پر اللہ سبحانہ کی حجت ہے۔ یہ حجت قائم نہ ہو۔ تو بندوں کو عذاب دینا خلاف انصاف ہوگا۔ یہ کہنا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پوری دنیا عراق میں سمٹی ہوئی تھی اور اس کی توجیہہ اس طرح کرنا کہ

> حضرت نوح علیہ السلام کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ برما، ملایا، مشرق الہند، آسٹریلیا، بنوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی قدیم روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔

اور اس سے یہ استدلال کرنا کہ

> اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ پوری نسل آدم ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی۔

بالکل بے معنے ہے۔ کسی بات کا سب کی زبانوں پر ہونا واقعہ کے ہونے کی دلیل تو ہوسکتا ہے۔ کہ یہ تواتر ہے۔ مگر واقعہ کے عام ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اور پھر یہ تو توجیہہ کرنا بھی اپنے اندر کوئی جان نہیں رکھتا۔ کہ

> پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہوئی ہیں۔ اس سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتی ہیں۔

قرآن نے جس طرح دوسری قوموں کے عذاب کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح قوم نوحؑ کے عذاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر دوسری قوموں کا عذاب صرف ان ہی قوموں کے لیے تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم نوحؑ کا عذاب یعنی طوفان عالمگیر تصور کیا جائے۔ لیکن چونکہ تورات کی کتاب پیدائش میں اس طرح کی تصریحات ہیں۔ کہ طوفان عام تھا۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کا ایسا ہی عقیدہ رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں بھی خیال پھیل گیا۔ ورنہ قرآن میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے طوفان نوحؑ عام ثابت ہوتا۔ غالباً اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے صاف کہدیا۔ والذی یمیل الیہ القلب ان الطوفان لم یکن عاما۔ دل کا میلان تو یہی ہے۔ کہ طوفان عام نہ تھا۔ تورات میں یہ واقعہ چار فصلوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے کے مکالمے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ تورات کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ لیکن موجودہ زمانے

کے محققین کا یہ فیصلہ قطعی ہے۔ کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات کہ طوفان ساری روئے زمین پر عام تھا۔ قرآن میں نہیں کہی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے۔

جہاز کا جودی پر ٹھہراؤ

جہاز پانی کے بہاؤ پر چلتے چلتے جودی نامی پہاڑ پر لگ گیا۔ جودی ایک پہاڑ کا نام ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح میں امام مجاہدؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جودی جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے۔ یعنی کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ بائیبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے۔ جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے۔ اور ایک سلسلہ کوہ کا نام بھی ہے۔ سلسلہ کوہ کے معنے میں جس کو اراراط کہتے ہیں۔ وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلا جاتا ہے۔ اور جبل الجودی اسی سلسلہ کا ایک پہاڑ ہے۔ جو آج بھی جودی کے نام سے مشہور ہے۔ تورات میں اراراط کا ذکر ہے۔ اور قرآن نے خاص اُس چوٹی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں جہاز جا کر ٹھہرا۔ اس سے اگر ایک طرف طوفان کی ہولناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ طوفان عالمگیر نہیں علاقائی تھا۔ کہتے ہیں کہ محرّم کی دس تاریخ تھی۔ اور جمعہ کا دن تھا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کا جہاز کوہ جودی پر آکر رکا۔

آخر میں ارشاد ہے فبعدا للقوم الظالمین یہ بعد یبعد سے مصدر ہے۔ پوری عبارت یوں ہے۔ یبعدوا البعد یعنی ان ظالموں کو ہلاک اور تباہ و برباد ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی ظالمانہ زندگی کا ناگزیر تقاضا ہے۔

یہاں لفظ ظالم لا کر اشارہ کر دیا۔ کہ ہلاک ہونے والے اور طوفان کی نذر ہونے والے صرف ظالم ہیں۔ اور ان کی ہلاکت کی علت ظلم ہے۔ اس میں بھی خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کہ تمام دنیا کی انسانی آبادی کا نسلی سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں تک پہنچتا ہے۔ دراصل اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ اس طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام کے ان تینوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر اس کی تصریح کرتا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے سوا ان کی قوم کی ایک معتد بہ تعداد اگرچہ وہ تھوڑی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں بلکہ ان سب لوگوں

کی اولاد قرار دیتا ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بٹھایا تھا۔ ذریۃ من حملنا مع نوح
اور من ذریۃ آدم ومن ذریۃ من حملنا مع نوح

فصاحت وبلاغت کا شاہکار

زیرِ نظر آیت گرامی قیل یا ارض ابلعی الخ کو موضوع بنا کر عربی ادب کے شناوروں نے اس کی فصاحت و بلاغت پر مختلف زاویوں سے دادِ تحقیق دی ہے۔ علامہ سکاکی نے مفتاح العلوم میں۔ آمانی نے اعجاز القرآن میں، زمخشری نے کشاف میں، طیبی نے کشف میں، علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں، علامہ طاہر نے التحریر والتنویر میں اس کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے موضوع کے آغاز میں لکھا ہے۔ کہ

یہ آیت گرامی بلاغت میں حد اعجاز کی بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی بلاغت کے سامنے بڑے عربی ادب کے شہسوار بھی مات کھا گئے ہیں۔

افسوس اس کی تفصیلات ناظرین معالم القرآن کے لیے چنداں مفید نہیں ہیں۔ اس لیے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے اپنے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔ کیونکہ یہ ذوقی چیز ہے۔ اور ذوقیات سے استفادے کے لیے صاحب ذوق ہونا ضروری ہے۔ معالم القرآن میں معانی بیان اور بدیع کی لطافتوں کو پیش کرنے کے لیے مخاطبوں کی رعایت ناگزیر ہے۔ اسی لیے بہت مباحث میں بالارادہ قلم کو روکنا پڑا ہے۔ معالم القرآن میں صرف یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ پیش پا افتادہ حالات میں مخاطبوں کی صلاحیت کے مطابق قرآن عزیز کے مقاصد اور مطالب سادہ انداز میں کھل کر سامنے آجائیں۔ اس میں نہ روایات کا انبار ہے۔ نہ کلامی موشگافیاں نہ عربی ادب کی نزاکتیں ہیں۔ قرآن اور صرف قرآن سے قرآن دانی کی راہ کو مشکلات سے صاف کیا گیا ہے۔ اور مخاطبوں کے لیے قرآن کے علوم ومعارف کو مؤلف نے کسی کی نہیں اپنی زبان میں اپنی استعداد کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بس۔ اللہ اسے قبول فرما کر میرے لیے آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنائے۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ

فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ
أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ
عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ
أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ
أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن
مِّنَ الْخَاسِرِينَ ۝ قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ
عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم
مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا
كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ
الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور میں دعا کی اور کہا کہ میرے مولا میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے۔ اور آپ کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ اور آپ سب سے پائیدار اور حکیمانہ فیصلہ کرنے والے

ہیں۔[۵۵] اللہ سبحانہ نے فرمایا : اے نوحؑ یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ تو سرتا سر عمل بد ہے۔ لہٰذا جس چیز کی حقیقت کا تجھے پتہ نہیں ہے اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہوجانا۔[۵۶] حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے میرے آقا: میں اس بات میں تیری جناب میں پناہ لیتا ہوں۔ کہ ایسی بات کا سوال کروں جس کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے مجھے نہ معاف کیا اور میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ کیا تو میں تباہ حال ہونے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔[۵۷] حکم ہوا: اے نوحؑ جہاز سے اُترو۔ ہماری جانب سے تم پر سلامتی اور برکتیں ہوں گی۔ نیز اُن جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور کچھ اور جماعتیں ہیں۔ جن کو ہم زندگی کے فوائد سے بہرہ یاب کریں گے۔ پھر دیر بعد وہ ہماری دردناک گرفت کا نشانہ بنیں گے۔[۵۸] اے اللہ کے رسول یہ غیب کی خبریں ہم تمہیں بذریعہ وحی بتارہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تم جانتے تھے۔ اور نہ تمہاری قوم۔ بس صبر کرو۔ بلاشبہ انجام متقیوں کے حق میں ہے۔[۵۹]

واقعہ نوحؑ کی واقعاتی تعبیر

یہ حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات کا آخری حصہ ہے۔ واقعہ کو پڑھتے وقت یہ

بات ذہن میں رکھنی چاہیئے۔ کہ یہ سارا معاملہ جو یہاں دو رکوع میں بیان ہوا ہے۔ اور جس کے چیدہ اجزار دوسرے مواقع پر قرآن میں آئے ہیں۔ صرف ایک دو صحیفوں میں ختم نہیں ہوئے۔ فی الواقع جن واقعات کے چہرے سے یہاں نقاب ہٹائی ہے۔ وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے ہیں۔ قرآن کا یہ مخصوص طرز بیان ہے۔ کہ وہ قصہ گوئی کی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا ہے بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصے کے صرف ان اجزار کو پیش کرتا ہے۔ جو اس کے مقصد سے تعلق رکھتے ہوں۔ باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی واقعہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے۔ تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف انداز میں پیش کرتا ہے مثلاً اسی واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھئے۔ یہاں اس واقعہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ نبوت کی تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لہذا اس موقعہ پر یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ کہ اللہ کا رسول کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ واقعہ اس لیے بیان ہوا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو دعوت کے میدان میں صبر کی تلقین کی جائے۔ وہاں خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی طول مدت کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اپنی چند سال کی تبلیغی جدوجہد کو نتیجہ خیز نہ ہوتے دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی صبر آزما منزل کو دیکھیں۔ جنہوں نے مدت ہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوت حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔

(۵۵) اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور میں دعا کی۔ اور کہا اے میرے مولا۔ میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے۔ اور آپ کا وعدہ یقیناً سچا اور پکا ہے۔ اور آپ سب سے پائیدار اور حکیمانہ فیصلہ کرنے والے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے یہ کس وقت عرض کیا۔ کنعان کے غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد۔ دونوں احتمال ہیں۔ نیز کنعان کو اس کی منافقانہ اوضاع واطوار دیکھ کر غلط فہمی سے مومن سمجھ رہے تھے۔ یا کافر سمجھتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں یہ گزارش کی۔ دونوں باتوں کا امکان ہے اگر مومن سمجھ کر غرق آبی سے پہلے عرض کیا تھا۔ تو مقصود اپنی اضطرابی کیفیت کا اظہار اور اللہ سبحانہٗ سے کہہ کر اس کے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا۔ اور اگر غرق آبی کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔ تو محض معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے اپنا خلجان یا اشکال پیش کیا۔ یعنی خداوند تونے میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور کنعان مومن ہونے کی وجہ سے الامن سبق علیہ القول کے استثنار میں بظاہر داخل نہیں ہے۔ پھر اس کی غرقابی کا راز کیا ہے؟ بلاشبہ آپ کا وعدہ سچا ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں

گزرسکتا کہ معاذ اللہ وعدہ خلافی کی ہو۔ آپ تو احکم الحاکمین اور شہنشاہ مطلق ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ کسی کو حق نہیں کہ آپ کے فیصلے کے سامنے دم مار سکے۔ یا آپ کو وعدہ خلافی پر مجبور کر دے۔ نہ کسی کا یہ منصب ہے۔ کہ آپ کے حکم ناطق کے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی کر سکے۔ فقط اطمینان قلبی کے لیے بطور استعلام واستفسار اس واقعہ کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں[1]

ارشاد کا موقعہ ومحل کے لحاظ سے تقاضا یہ ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی ہے جب جہاز جودی پر ٹھہر گیا۔ شفقت پدری کے طبعی تقاضا سے مغلوب ہو کر محض اہل کے اس لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ دعا کی جو اوپر آیت واہلک الا من سبق علیہ القول میں گزرا ہے۔ جس میں حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا تھا۔ کہ اس جہاز میں ہر چیز کے نر و مادہ اور اپنے اہل وعیال کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے۔ سوار کر لو۔ دنیا کی نجات سے مایوس ہونے کے بعد آخرت میں نجات کے لیے دعا کی ہے۔ کیونکہ یہ بات اللہ سبحانہ نے دنیا کی حد تک حضرت نوح علیہ السلام کو دی تھی نہ کہ جہاز میں سوار ہونے والوں کے سوا غرق آبی سے کوئی نہ بچے گا۔ اور اس لیے بھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جہاز پر سوار ہونے کی دعوت دی۔ اور وہ یہ کہہ کر کہ ساوی الی جبل انکار کر چکا ہے۔ اور جہاز روانہ ہو چکا ہے۔ اور بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہو چکا ہے۔ تو اب دنیا کی نجات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اب دعا دنیا کے عذاب سے بچاؤ کی نہیں بلکہ آخرت میں مغفرت کی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں آگے فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم اسی کی تائید کر رہا ہے۔ ظاہر کلام کا تقاضا یہی ہے۔ اب اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ترتیب کے لحاظ سے اس دعا کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ غرق ہونے کے بعد یہ دعا صرف اس لیے کی گئی کہ۔

> خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا۔ اس کے باب میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کو زیر بحث لانا ہی پسند نہیں فرمایا۔

اس توجیہہ میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ بات صاف ہے کہ غرق ہونے کے بعد آخرت میں مغفرت کے لیے دعا مانگی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ونادی نوح الربہ فقال رب میں نکتہ بلاغت یہ ہے۔ کہ نادیٰ دعا کے معنے میں نہیں۔ بلکہ ارادہ دعا کے معنے میں ہے۔ جیسے اذا قمتم الی الصلوٰۃ میں ارادہ قیام مراد ہے۔ یہاں جملہ کا انداز خلاف مقتضاء ظاہر محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے۔ کہ نادیٰ کے بعد فاء آرہی ہے۔ ورنہ ظاہر کا تقاضا یہی تھا۔ کہ قال رب ہو۔ جیسے اذ نادیٰ ربہ نداءً خفیا فقال رب۔ اس سے معلوم ہوا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعاء کا ارادہ فرمایا۔ بعدازیں دعاء میں تردد ہوا۔ اور الا من سبق علیہ القول میں غور فرمانے لگے۔ مگر غلبۂ شفقت نے تردد کی مہلت زیادہ نہ دی۔ اور دعا مانگ لی۔ ان ابنی من اھلی۔ اور اس دعا مانگنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خیال میں بیٹا مؤمن تھا۔ قرطبیؒ نے بتایا ہے۔ کہ لاتکن مع الکافرین کا مطلب یہ ہے۔ کہ بیٹے تو ان لوگوں کی معیت اختیار نہ کر جن میں سے تو نہیں ہے۔

ان وعدك الحق فائدۃ الخبر کے لیے نہیں بلکہ لازم فائدۃ الخبر کے لیے ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اللہ سبحانہٗ کے وعدہ کے سچا اور پکا ہونے کے لیے اپنا علم بتا رہے ہیں۔ یعنی مجھے اس بات کا علم ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کا وعدہ بالکل پکا ہے۔ اور تاکید کا مقصود صرف بات کی اہمیت جتانا ہے اور وعدہ سے الا من سبق علیہ القول منھم میں کیا ہوا وعدہ مراد ہے۔ اسی وعدہ کا اگلا حصہ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ بتا رہا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اہل میں کچھ ضرور ہوں گے۔ جو جہاز میں سوار نہ ہوں گے۔ اس کا مصداق واقعہ کی روشنی میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں۔ جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے سوار ہونے کی دعوت دی ہو۔ اور اس نے سوار ہونے سے انکار کیا ہو۔ جہاز میں سوار نہ ہونے والا علم الٰہی کی رو سے ظالم ہے۔ اور اسے غرق ہونا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو معلوم ہے۔ کہ سوار نہ ہونا اور غرق ہونا کفر کی علامت ہے۔ مگر شفقت پدری کے جوش میں اس آس پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کہ شاید اللہ سبحانہٗ قرابت کی بنیاد پر بیٹے کو معاف فرما دیں۔ آیت میں اس کا قرینہ انت احکم الحاکمین ہے۔ شریعت نوحؑ میں کافر کی عدم مغفرت کا کوئی قانون نہ تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے بارے میں فرمایا تھا۔ لاستغفرن لك مالم انہ۔ میں ضرور آپ کیلئے دعاء مغفرت کروں گا جب تک مجھے روکا نہ جائے۔ اور یہ صورت حال آیت قرآنی میں۔

ماکان للنبی والذین امنو معہ ان یستغفروا للمشرکین ولوکانوا

ادلی فتدبّر۔

نازل نہیں ہوئی تھی۔ آیت قرآنی میں تین جملے بولے ہیں۔ پہلا جملہ ان ابنی من اھلی دوسرا جملہ ان وعدك الحق اور تیسرا جملہ وانت احکم الحاکمین۔ تینوں جملے اہل مقصود کو بطور تعریف پیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مقصود کا صراحتا ذکر نہیں کیا یہ بہت ہی عظیم دعا، کا ادب ہے۔ گویا بزبان حال اس انداز تکلم سے کہہ رہے ہیں۔ کہ درخواست کروں یا نہ کروں۔

دوسرے بزرگوں نے اس آیت کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا بیٹے کے ڈوبنے سے پہلے کی تھی۔ مگر قرآن کا سیاق وسباق اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔

(۵۶) حضرت نوحؑ کی درخواست کا جواب

اللہ سبحانہ نے فرمایا۔ کہ اے نوحؑ یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ تو سرتاسر عمل بد ہے۔ لہذا جس چیز کی حقیقت کا تجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ کہ ناواقفوں میں سے نہ ہو جانا۔ جواب ملا: یہ ان گھر والوں میں سے نہیں جن کے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ الا من سبق علیہ القول میں شامل ہے۔ کیونکہ اس کے عمل خراب ہیں تم کو اس کے کفر و شرک کی خبر نہیں ہے۔ مقام تعجب ہے کہ پیغمبرانہ فراست کی روشنی میں صریح آثار کفر کے باوجود ایک کافر کا حال مشتبہ رہا۔ جس شخص کا واقعی حال تمہیں معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں ہم سے ایسی نامناسب رعایت یا اس طرح کی کیفیت مت طلب کرو۔ سفر میں کوئی لائق نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ادب ناشناس جاہلوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ آیت کی یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ نوح علیہ السلام کنعان کو مومن سمجھتے ہوں۔ اور اگر وہ کافر سمجھتے تھے۔ تو شاید اس درخواست یا سوال کا منشا یہ ہو کہ انجام کے ذکر میں اہل کو چونکہ عام مومنین سے الگ کر کے ذکر کیا تھا۔ اس سے نوح علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میرے اہل کو اس دنیا کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے ایمان شرط نہیں ہے۔ اور الا من سبق علیہ القول مجمل تھا۔ اس لیے اس کے مصداق کی تعیین نہیں کر سکے۔ بنا، علیہ شفقت پدری کے جوش میں عرض کیا کہ الہ العالمین میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں داخل ہے۔ جس کے بچانے کا آپ وعدہ فرما چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں غرق کیا جا رہا ہے۔ یا غرق کر دیا گیا۔ جواب ملا: کہ تمہارا پہلا مقدمہ ان ابنی من اھلی غلط ہے۔ جس اہل کے بچانے کا وعدہ

تھا۔ یہ اس میں داخل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے کرتوت بہت خراب ہیں۔ نیز الا من سبق علیہ القول کے مصداق کا تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ کہ وہ کون لوگ ہیں۔ پھر جس چیز کا تم علم نہیں رکھتے۔ اس کی نسبت ایسے محاجہ کے رنگ میں سوال یا درخواست کرنا تمہارے لیے اچھا نہیں ہے[1]

یہ تشریح اس مفروضہ پر کی گئی ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ درخواست بیٹے کے غرق ہونے سے پہلے ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے ایک نہیں متعدد تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے۔ دوسرے شارحین قرآن نے اسی مفروضہ کے تحت آیت کی تشریح کی ہے۔ لیکن ہم نے آیت کی جو تشریح کی ہے وہ ان تمام خدشات سے پاک ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کو غرق ہوتا دیکھ کر آخرت میں اس کی مغفرت کی دعا کی۔ جواب میں اللہ سبحانہ نے انہ لیس من اھلک کہہ کر بتایا کہ آخرت میں مغفرت کا مدار نسبی کی قرابت نہیں بلکہ ایمانی قرابت ہے۔ اور وہ عمل غیر صالح ہونے کی وجہ سے ناپید ہے۔ آپ کا اہل ہونا ایمان پر موقوف ہے۔ چونکہ ایمان کے مفقود ہونے کی وجہ سے آپ کے اہل سے نہیں اس لیے آپ کو اس قسم کا سوال زیب نہیں دیتا۔ اور یہ آپ کے مقام کے خلاف ہے۔ یعنی یہ سوال آپ کو کرنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ اور سوال کرنے سے پہلے غور کر لینا چاہیئے تھا۔ یہ آپ کے مقام سے بہت فروتر ہے۔ کہ آپ ایسے شخص کی مغفرت کی دعا کریں۔ جس کی موت کفر پر ہوئی۔ اور صرف اس لیے کریں کہ اس سے آپ کی نسلی قرابت ہے۔

اندر راہ فلان بن فلان چیزے نیست

کسی کام کے لیے قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لینا دانشمندی کا تقاضا ہے۔ آپ کا یہ اقدام اس ایمانی دانش کے خلاف ہے بے شک بیٹے سے آپ کا جذباتی تعلق ہے۔ لیکن جذبات میں مغلوب ہو کر تقاضائے عقل سے بیگانہ ہونا آپ کے مقام وضع کے خلاف ہے۔ یہی مطلب ہے انی اعظک ان تکون من الجاھلین کا۔ مطلب یہی ہے کہ وفور جذبات میں قانونی، اصولی اور عقلی تقاضوں کو پیش نظر نہ رکھنا۔

یہ کہنا کہ انہ لیس من اھلک۔ یہ بیٹا تمہارے خاندان سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایمان و عمل صالح کی نعمت سے محروم ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے بیٹا ہونے کی نفی کی جا رہی ہے۔ بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ یہ بیٹا تمہارے ایمانی خانوادے سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ وہ آپ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے نبی خاندان کا فرزند ہو تو ہو مگر آپ کے ایمانی خاندان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور آخرت میں نجات کا فیصلہ قومی یا نسلی قرابت کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ یہ کفر و ایمان کے نزاع کا فیصلہ ہے۔ جس میں صرف اہل ایمان کی مغفرت ہوگی۔ اس نزاع میں سب کا حکم ایک ہے۔ خواہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب ہوں یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں اور یا حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے ہوں۔

انہ عمل غیر صالح فرما کر اس اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ایمان کا رشتہ نسلی، لسانی، وطنی رشتوں پر مقدم ہے۔ اس پر سب کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایمان کے رشتے کو کبھی قربان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صاحب ایمان کی نظر اس حقیقت پر ہونی چاہیئے۔ کہ رب کی وفاداری کہاں ہے۔ ایمان ایک فکری و اخلاقی صفت ہے۔ مومن اسی صفت کے لحاظ سے مومن کہلاتا ہے۔ اگر ایمان و کفر کے نزاع میں اہل قرابت اہل ایمان کے مقابل ہوں۔ تو اس کے لیے وہ اور اجنبی کافر دونوں برابر ہیں۔

بتانا یہ ہے۔ کہ نبوت کا گھرانہ صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل کی موجودگی میں نبوت سے نسبی رشتہ ضرور نافع ہوتا ہے۔ لیکن ایمان نہ ہونے کی صورت میں نبی زادہ ہونا کسی درجہ میں بھی مدار نجات نہیں ہے۔

۵۷ حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا! اے میرے آقا میں اس بات سے تیری جناب میں پناہ لیتا ہوں۔ کہ ایسی بات کا سوال کروں۔ جس کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ فرمایا تو میں تباہ حال ہونے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ آدمی وہی پوچھتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیئے۔ یہ کام جاہل کا ہے کہ بڑے کی مرضی پوچھنے کی نہ دیکھے پھر پوچھے مرضی کیوں نہ تھی۔ اسے ہم قاعدہ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کانپ اُٹھے اور توبہ کی۔ لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے۔ بندے کو کیا مقدور ہے۔ چاہیئے کہ اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر نہ ہو۔ اور دل میں نہ کرنے کا عزم رکھے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت یونسؑ کی توبہ کے جو الفاظ قرآن میں نقل ہوئے۔ ان میں بھی ادب ملحوظ رہا[1] حضرت نوح علیہ السلام کے مقام رفیع اور اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ابھی جوان جان بیٹا موت کے منہ میں جا چکا ہے۔ اور اس نظارہ سے دل پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا نہیں بلکہ صرف دعا کا ارادہ ہی فرما رہے ہیں۔ اور صرف اتنا کہہ سکے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ کا وعدہ برحق اور سر آنکھوں پر آپ احکم الحاکمین ہیں۔ ابھی زبان پر بات نہیں آئی۔ اللہ سبحانہٗ نے بتا دیا کہ یہ انداز سخن مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا ہے۔ اس کو محض اس لیے اپنا بیٹا کہنا کہ وہ تمہاری نسل ہے محض ایک جذباتی بات ہے۔ نظریاتی دعوت کا یہ تقاضا نہیں ہے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فوراً جذبات سے بے پروا ہو کر اس اندازِ فکر کو اپنا لیتے ہیں۔ جو نظریہ دعوت کی جان ہے۔ اور فرماتے ہیں۔ رب انی اعوذبك۔ حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کے لیے مغفرت کی دعا کے بارے میں یہ سوچ کر چونک گئے۔ کہ قرابت ایمانی کے مقابلے میں قرابت نسبی کی بات جذباتی ہے۔ اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہ کروں گا بلکہ فرمایا کہ میں تو آپ کی پناہ کا طلب گار ہوں۔ مجھے تو آپ کا آسرا چاہیئے۔ آپ ہی میرے معاذ ہیں۔ آپ کی پناہ میں آکر میں ایسے سوال سے بچ سکتا ہوں۔ جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر کے اپنے دامنِ رحمت میں نہ لیں گے۔ تو میں تو ان لوگوں کی صف میں ہو جاؤں گا۔ جو تباہی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔

اس دعائی پیرایہ نے انی اعوذبك میں بڑی بلاغت ہے۔ عوذ کے دو معنے ہیں۔ ایک تھامنے کے اور دوسرے چمٹ جانے کے ہیں۔ اور استعاذ سے دونوں معنے پائے جاتے ہیں۔ یہ استعاذہ اصل میں قلبی کیفیت ہے۔ قلب میں پناہ گیری، چمٹ جانے، بچھ جانے، محتاج ہونے، عاجز و نیازمند ہونے اور بیقرار ہونے کی حالتیں رونما ہوتی ہیں۔ تو کہنے والے کی زبان پر اعوذباللہ آتا ہے۔ استعاذے تین ہوتے ہیں۔ مستعیذ، مستعاذ منہ، مستعاذ بہ۔ یہاں مستعیذ حضرت نوح علیہ السلام مستعاذ بہ اللہ سبحانہٗ اور مستعاذ منہ ان اسئلك ما لیس لی بہ علم ہے مستعاذ منہ یہاں نہ گناہ ہے۔ اور نہ شرور میں سے کوئی شر ہے۔ مقام نبوت چونکہ بلند ترین مقام اور اللہ سبحانہٗ سے قرب کا اشرف ترین درجہ ہے۔ اس لیے اپنے مقام رفیع کے لحاظ سے اس کو مستعاذ منہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ مقام عصمت کے بھی منافی نہیں ہے۔ اس لیے یہ گمان بھی نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اندر روحِ اطاعت کی کوئی کمی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ بات انبیاء کے مقام سے متعلق ہے۔ اُن کی استغفار کا پیمانہ ان کے

مقام کی رفعتوں سے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہی حضرت نوح علیہ السلام کے مقام کی بلندی ہے۔

(۵۸) حضرت نوحؑ اور ساتھیوں پر برکتوں کا نزول

حکم ہوا کہ اے نوح جہاز سے اترو ہماری جانب سے تم پر سلامتی اور برکتیں ہوں گی۔ نیز ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور کچھ اور جماعتیں جن کو ہم زندگی کے فوائد سے بہرہ یاب کریں گے۔ اور دیر بعد ہماری دردناک سزا کا نشانہ بنیں گے۔ یعنی کشتی سے جودی پر اور جودی سے زمین پر اتریئے برکتیں اور سلامتی تم پر اور ان قوموں پر رہے گی جو تمہارے ساتھیوں سے پیدا ہونے والی ہیں۔ فی الحال جو زمین طوفان سے بالکل اُجڑ گئی ہے۔ اللہ سبحانہ دوبارہ آباد کردے گا۔ اور اسکی رونق و برکت پھر عود کر آئے گی۔ سلامت کے لفظ سے گویا حق سبحانہ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری نوع انسانی پر قیامت سے پہلے ایسی عام ہلاکت نہ آئے گی بلکہ بعضے فرقے ہلاک ہوں گے[1]۔

یہ آیت قرآنی ان مؤرخین اور علماء انساب کی تردید کررہی ہے۔ جو تمام انسانوں کا شجرہ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے۔ کہ اس طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر تصریح کرتا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے سوا ان کی قوم کی ایک معتد بہ تعداد کو بھی اگرچہ وہ تھوڑی تھی۔ اللہ نے طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں۔ بلکہ ان سب لوگوں کی اولاد قرار دیتا ہے۔ جنہیں اللہ سبحانہ نے کشتی میں ان کے ساتھ بٹھایا تھا۔ ذریۃ من حملنا مع نوح۔ اور من ذریۃ آدم، وممن حملنا مع نوح (سورہ مریم) اب من حملنا مع نوح کو امم ممن معک کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ آپ ضرور اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ جہاز پر سوار ہونے والے اگرچہ اہل کفر کی بہت بڑی تعداد کے مقابلے میں تھوڑے تھے۔ مگر امتوں کی صورت میں تھے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اُمت کا اطلاق جماعتوں پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا رابطہ ہو اُسے اُمت کہا جاتا ہے۔ ایمان کے لحاظ تو یہ ایک اُمت تھے۔ مگر نسل و نسب کے اعتبار سے یہ مختلف جماعتوں پر مشتمل تھے۔ تعداد ان کی تھوڑی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھی مگر اہل کفر کے مقابلے میں یعنی ان کی اکثریت کے مقابلے میں کتنے تھوڑے نہ تھے۔ جتنے اسرائیلی روایات کی بنا پر شارحین بتا رہے ہیں۔ صرف تفسیر قرطبی میں ما امن معہ الا قلیل کی تفسیر میں جو تعداد بتائی ہے۔ اسے دیکھ کر غور کیجئے۔ کہ اسرائیل روایات کی بنا پر قلیل بتانے کا شوق کی آخری منزل کیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ۸۰ کی تعداد منسوب ہے۔ ایک روایت میں صرف آٹھ ہیں۔ امام اعمش صرف، بتاتے ہیں حافظ ابن جریرؒ نے یہ کہہ کر قلت کی اس ساری کہانی کو بے جان کر دیا ہے۔

درست بات یہ ہے کہ تعداد کے موضوع پر صرف یہ بات درست ہے کہ وہ تھوڑے تھے۔ لیکن کتنے تھے؟ یہ اللہ سبحانہ نے مقرر نہیں کیا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر کوئی صحیح بیان نہیں آیا ہے۔ لہٰذا جب تک قرآن وسنت کا پیمانہ نہ ہو تو قرآن کی بتائی ہوئی بات سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔

اور کچھ بزرگوں نے پوری انسانیت کو ذریۂ حضرت نوح علیہ السلام بنانے کے شوق میں جہاز میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ہونے والوں کو جہاز سے اترنے کے بعد موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ قرآن کے اشارات صاف کہہ رہے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بلا ریب اس تعداد کثیر کے مقابلے میں تھوڑے تھے۔ جنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو نہیں مانا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی تعداد ۸ یا ۸۰ تھی۔ بلکہ ان کی تعداد کافی تھی۔ اسی تعداد کے موافق جہاز تیار ہوا تھا۔ خود ہی بتانے والوں نے کہا کہ جہاز کی لمبائی تین۳۰۰ سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس۵۰ ہاتھ تھی۔ اور حسن بصریؒ نے بارہ۱۲ سو ہاتھ بتائی ہے۔ اور ہاتھ کو شانے تک مقرر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاز سَو۱۰۰ فٹ چوڑا اور چھ۶ فٹ لمبا تھا۔ اور اس میں تین منزلیں تھیں تحتانی منزل حیوانات کے لیے، درمیانی منزل کھانے پینے کے سامان کے لیے۔ اور فوقانی منزل آدمیوں کے لیے۔ سوچیے کیا یہ عظیم الشان جہاز صرف اسّی۸۰ یا آٹھ۸ آدمیوں کے لیے بنایا تھا۔ اس میں تو ہزاروں کی تعداد رہ سکتی ہے۔ جہاز کی بناوٹ اور سواریوں کی تعداد میں کوئی ربط نہیں ہے۔ ہاں قرآن کی امم ممن معک کی تصریح پیش نظر ہو تو پھر کوئی گنجلک نہیں رہتی ہے اور بات صاف ہو جاتی ہے۔

اس ارشاد کے ذریعے اگر ایک طرف اللہ سبحانہٗ نے حضرت نوح علیہ السلام کو توبہ کے قبول ہونے کی بشارت دی ہے۔ تو دوسری طرف حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی ہمرکاب جماعتوں کو زندگی میں عظیم سلامتی کے ساتھ برکتوں کی خوشخبری سنائی ہے۔ سلامتی تو ظاہر ہے کہ جان و مال، آبرو اور ایمان کو تحفظ

ہوگا۔ اور برکات یہ کہ افرادی قوت میں اضافہ اقتصادی اور معاشی خوشحالی کا فیضان ہوگا۔ اور جملہ امیہ سے تعبیر میں ان انعامات کے دیرپا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کے موقع پر فرمایا تھا۔

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمدد کم باموال وبنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا۔

یعنی تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور توبہ کرو۔ اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ

۱۔ باران رحمت نازل فرمائے گا۔

۲۔ تمہارے مالیاتی حالات خوشگوار ہوں گے۔

۳۔ افرادی قوت میں اضافہ ہوگا۔

۴۔ تمہاری معاشی حالت بہترین اور شاندار ہوگی۔

ان ہی چاروں کے لیے یہاں اللہ سبحانہٗ نے سلام اور برکات کی تعبیر اختیار کی ہے۔ گویا بتا دیا کہ ایمان و عمل کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ اب قانونی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عائلی، اخلاقی اور زندگی میں بھرپور سلامتی اور برکتیں ہوں۔

اس دعائی پیمانے نے یہ بات بھی کھول دی ہے۔ کہ انبیائی دعوت میں نجات کے لیے کام آنے والی چیز صرف ایمان وعمل ہے۔ وراثت اور نسب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں مگر ہم پر خدا کا غضب نہیں نازل ہوسکتا۔ کیونکہ ہمارا نسبی تعلق سادات سے ہے۔ یا ہم فلاں حضرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں بتایا گیا ہے۔ کہ ایک عظیم المرتبت پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لخت جگر کو ڈوبتا دیکھ رہا ہے۔ کڑھ رہا ہے مگر بے بس ہے۔ اور پھر مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ تو دربار الٰہی سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری اپنے بیٹے سے ایمانی قرابت نہیں ہے۔ نسبی قرابت ہے۔ نجات کے لیے ایمانی قرابت شرط ہے۔ پیغمبر کا باپ ہو یا بیٹا، پیغمبر کا چچا ہو یا پیغمبر کی بیوی کوئی رشتہ، کوئی قرابت ایمانی قرابت کے بغیر کام نہ آئے گی۔

(۵۹) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روئے سخن

اے اللہ کے رسول یہ غیب کی خبریں ہم آپ کو بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو آپ یہ باتیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔ بس صبر کرو انجام متقیوں کے حق میں ہے۔ یعنی یہ۔

دلائل نبوت میں سے ہے۔ کہ ایک اُمّی کی زبان سے امم سابقہ کے ایسے مستند اور مفصل حالات سنوائے جائیں۔ جیسے نوح علیہ السلام اور ان کے رفقار کا انجام جلد ہوا۔ آپ کے ساتھیوں کا مستقبل بھی نہایت تابناک اور کامیاب ہے۔ آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کریں۔ گھبرا کر تنگدل نہ ہوں۔ جیسے نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال صبر کیا ہے۔[1]

واقعہ بیان کرنے کے بعد روئے سُخن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگیا۔ اس آیت میں دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک کا تعلق تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے ہے۔ اور دوسری کا تعلق خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام نبوت سے یعنی اس کام سے جس کو انجام دینے کے لیے آپ تشریف لائے ہیں۔

پہلی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ کر مخاطبوں کو سنائی ہے کہ زمانہ ماضی کے واقعات کا علم نہ تو حواس کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ کہ حواس سے صرف موجود کا علم ہوتا ہے۔ اور نہ عقل و فکر کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو نقل و روایت کے ذریعے۔ لیکن جس کے لیے تحریر و روایات کا ذریعہ یقینی طور پر مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے۔ تو نبی ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں واقعات کے علم کے طبعی طریقے کی نفی کی گئی کہ آپ کو اس کا علم نہ تھا۔ اب رہ گیا کسی انسانی ذریعہ سے استفسار اس کی نفی پہلے ہی سے ہے۔ کہ تیری قوم میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ اب اس کا علم آپ کو جس غیر طبعی طریقہ سے دیا گیا ہے۔ وہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہے۔ اور نبی اسی کو کہتے ہیں۔ جس کے علم کا ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہو۔ نبی کی یہی حقیقت بتانے کے لیے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن کی اس آیت سے انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوحؑ الخ کیا ہے۔

ہم اس علمی ذریعہ یعنی وحی پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ علمی ذریعہ کسبی نہیں خالصۃً وہبی ہے۔ حکیم الامت نے شاہ ولی اللہ اس ذریعہ علمی پر حجۃ اللہ البالغہ میں بہترین کلام کیا ہے۔ یہاں آیت کا منطوق چونکہ اس کے پاس علمی ذریعہ ہے۔ تو تم کیوں عناد سے انکار کر رہے ہو۔ اس انکار و سرکشی کا نتیجہ وہی ہوگا۔ جو تم واقعہ نوحؑ میں سُن چکے ہو۔ اعمال اور ان کے نتائج میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم نبوت کے مدمقابل ہو۔ عناد و بغض اختیار کرو، حق کے راستے میں روڑے اٹکاؤ۔ اور تمہارے اوپر کوئی گرفت نہ ہو۔ یہ واقعہ نوح علیہ السلام بتا رہا ہے۔ کہ ایک مرتبہ کا حادثہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک مرتبہ کا حادثہ نہیں۔ جو اس ونتائج دائمی ہیں۔ تاریخ کا صحیح استعمال یہی ہے۔ کہ گزشتہ کا مطالعہ سے آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنی جو کچھ گزر چکا ہے۔ وہ آئندہ کے لیے ذخیرہ بصیرت ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنا چھوڑ دو۔ کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے اگر اس نشہ میں ہو۔ کہ ہم حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے انجام سے عبرت پکڑو۔ اللہ کا عذاب نسب نامے نہیں دیکھتا ہے۔ عذاب نسبوں اور نسبتوں سے نہیں ٹلتا ہے۔

دوسری بات خاص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی گئی۔ فاصبر ان العاقبۃ للمتقین۔ یعنی صبر کیجئے۔ صبر کے معنے ڈٹنے اور سہنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام آپ کو بتایا ہے۔ اس کو خوب جم کر اور ڈٹ کر حضرت نوح علیہ السلام کی طرح کیجئے۔ دیکھ لیجئے ۹۵۰ سال کی جانفشانی اور محنت کے نتیجے میں برکتوں کا نزول ہوا۔ اور دشمنوں کی تباہی رونما ہوئی۔ اور اس راہ میں جو بھی تکلیف آئے۔ سہتے جائیے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرح مصائب کا خندہ پیشانی سے استقبال کیجئے۔ اور اپنے آپ کو جزع و فزع اور شکوہ و شکایت سے حضرت نوح علیہ السلام کی طرح روکے رکھیئے۔ ظاہر ہے کہ صبر کا مطالبہ عموماً نامناسب اور ناموافق حالات میں کیا جاتا ہے۔ سورۂ ہود جس دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے پُرآشوبی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر اُدھر بیٹھے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابو جہل نے کہا کہ کون مذبح میں جا کر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو وہ نجاست کا الاوہ آپ کی پشت مبارک پر ڈال دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ کی وجہ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں۔ کہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا۔ اسی اثنا میں کسی شخص نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں۔ وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا۔ یہ پہلا موقعہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوئے ہیں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف پہنچی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ لوگ نماز میں خلل انداز ہوئے۔ یہ روسائے قریش کی مہلت کا آخری موقعہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بددعا کی مگر پھر بھی رحمت عالم کی شفقت دیکھئے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرح یہ نہیں فرمایا۔

رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا ۔ بلکہ صرف قریش کے رؤسار کے حق میں بد دعا کی ۔ اور ان میں سے بھی صرف سات رئیسوں کے نام لیے ۔ اور فرمایا کہ خداوندا قریش کے سرداروں کو لے ۔ خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ ابن معیط، امیہ ابن خلف، ولید بن عقبہ، اور ابی بن خلف کو پکڑ ۔ یہ دعا سُن کر سب کے ہوش اڑ گئے[1] ان ہی حالات میں فرمایا فاصبر ۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ

تکذیب کرنے والوں کی تکذیب پر اور ان کی جانب سے ہونے والی تکلیفوں پر صبر کیجیے ۔ ہم ضرور مدد کریں گے اور اپنی عنایت کریں گے ۔

اور علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں ۔

جب آپ وحی کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتی داستان سُن چکے ہیں تو راہِ دعوت میں آنے والی تکلیفوں پر صبر کیجیے ۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں ۔

آپ حکم الٰہی کی بجا آوری پر ڈٹے رہیئے اور اس راہ میں جو تکلیفیں آئیں ان کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح سہتے جائیے ۔

آخر میں فرمایا والعاقبۃ للمتقین یعنی انجام کار متقیوں کے حق میں ہوتا ہے ۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں ۔ ایک انفرادی صلاح و فلاح دوسری اجتماعی فلاح و صلاح یہاں دوسری بات بیان ہو رہی ہے ۔ اور بتایا جا رہا ہے ۔ کہ اجتماعی فلاح کے لیے ضروری ہے ۔ کہ آپ کی رفاقت میں متقیوں کی جماعت ہو ۔ ایک دوسرے موقع پر انفرادی کامیابی کا ذکر کیا ہے ۔

نحن نرزقك والعاقبة للتقوى

ہم ہی آپ کو روزی دیتے ہیں ۔ اور انجام کار متقیوں کے لیے ہے ۔

یہاں انفرادی نہیں اجتماعی فلاح کا ذکر ہے ۔ اس لیے متقین کی تعبیر اختیار کی ہے ۔ اور مطلب یہ ہے کہ صبر کی آخری منزل یہ ہے ۔ کہ اجتماعی تقویٰ پر مشتمل ایک جماعت آپ کی رفاقت میں آجائے اگر ایسی جماعت جو تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو ۔ آپ کے صبر سے وجود میں آ گئی تو جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا آخر میں بول بالا ہوا ۔ اسی طرح آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا بول بالا ہوگا ۔ اللہ کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قانون یہی ہے کہ آغاز کار میں دشمنان حق خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں ۔مگر آخری کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے ۔جو اللہ سے ڈر کر فکر و عمل کی غلط راہوں سے بچتے ہوئے حق کے لیے کام کرتے ہیں۔ گویا رفاقت کی زندگی اختیار کرنے والوں کو خبردار کر دیا گیا ہے ۔اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ صبر کے جذبے کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ کر کے رفاقت کے رشتہ کو قائم کرے۔ اس لیے قرآن نے اصبر کے بعد والعاقبۃ للمتقین کہہ کر انتخاب رفقار کا قانون بتایا ہے رفقار کا معیار، مال و دولت جاہ و اقتدار، رنگ و نسل نہیں ہے ۔بلکہ تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے ۔اور اسی کی بنیاد پر رفاقت کی عمارت استوار ہوتی ہے ۔قرآن نے متقی جماعت کی خود علامتیں بتائی ہیں۔ اور حضور کو ارشاد فرمایا واصبر نفسک اپنے آپ کو تھامے رکھیئے، کن کے ساتھ ! ان کے ساتھ ۔الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ۔ وہ جو صبح و شام اللہ سبحانہ کو اپنی مراد بنا کر پکارتے رہتے ہیں ۔یہ ان متقین کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت اور نشانی ہے ۔علامہ شوکانی ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

سارے اوقات میں دعائیں کرتے رہنا اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

اس کا مطلب یہی ہے ۔کہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل بغیر کسی انقطاع کے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اندر بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا ہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوتا ہے ۔اور فقر نام احتیاج مطلق فقط سوال صرف بھیک کی اسی پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی ہے ۔یریدون وجھہ کے فقرے میں اس کی تصویر پیش کی گئی ہے ۔اس کا صاف مطلب یہ ہے ۔کہ ان کو اپنی دعاؤں اور پکاروں کے جواب میں جو کچھ بھی ملتا ہے ۔اس میں اپنی اپنی زندگی کے منطقی نتیجہ سے زیادہ ان کو اپنا رب اور اس کا فضل و احسان نظر آتا ہے ۔ان کی نگاہ کسی حال میں بھی وجہ اللہ سے نہیں ہٹتی ۔حتیٰ کہ جنت بھی ان کے سامنے ہوگی ۔تو وہ بھی ان کو رسوائے من اللہ کا پیمانہ محسوس ہوگا ۔وہ محسوس کریں گے ۔کہ رب ہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ گیا ہے ۔الغرض اللہ سبحانہ کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں اللہ ہی کو مراد بنائے رکھنا ان ہی دو علامتوں سے قرآن نے ان متقین کی شناخت کرائی ہے ۔ان ہی کے لیے فلاح کی راہیں کھلتی ہیں ۔ والعاقبۃ للمتقین ۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ۭ قَالَ یٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝
یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ
فَطَرَنِیْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ
تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْكُمْ قُوَّةً
اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝

اور ہم نے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام ان کے بھائی کو روانہ کیا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہاری عابدانہ نیازمندیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے عبادت کے موضوع پر تمہاری زندگی افترا کے سوا کچھ نہیں ہے۔[۱۶۰] اے میری قوم میں اپنے کام پر تم سے کسی اجرت کا خواہاں نہیں ہوں۔ میری اجرت تو وہی دے گا جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے[۱۶۱] اور اے میری قوم تم اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو۔ پھر آئندہ کیلئے گناہ نہ کرنے کا عہد کرو۔ وہ تم پر برستے ہوئے بادل روانہ کرے گا۔ اور تمہاری طاقت میں اور

طاقت بڑھائے گا۔ اور مجرمانہ انداز میں اس سے منہ نہ موڑو۔[۶۲]

عاد اور قوم عاد کا تاریخی چہرہ

السنہ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی زبان سب سے قدیم زبان ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اس میں محفوظ ہے۔ لغوی حیثیت سے عربی میں عاد کے کوئی معنے نہیں ملتے۔ عبری میں عاد کے معنے بلند و مشہور کے ہیں۔ تورات میں عاد مذکر ہے۔ اور اس کا مؤنث عادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموماً مستعمل تھا۔

نام کے بعد دوسری بحث زمانہ کی ہے۔ عرب قبل از اسلام میں کوئی باقاعدہ تاریخ رائج نہ تھی۔ اس لیے عرب بائدہ کا کوئی زمانہ مذکور نہیں لیکن اس بنا پر کہ مؤرخین عرب نے عاد کو عوص بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لیے اس کا زمانہ ...۳قبل مسیح سے پہلے قرار دینا چاہیئے۔ قرآن حکیم نے عاد کا ذکر خلفاء قوم نوحؑ بنا کر کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنو سام کی پہلی ترقی شام کی دوبارہ آبادی کے بعد عاد سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے آیت قرآنی اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوحؑ میں نہ صرف زمانہ کی تعین ہوتی ہے۔ بلکہ ہمارے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہے۔ کہ امم سامیہ اولی اور علی الاغلب عاد ایک ہی چیز ہے۔ اسی قرآن نے ان کو عاد الاولی وانہ اھلک عاد الاولی۔ لیکن بنو سام کی حقیقی ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح یا ...۲قبل مسیح ہے۔ سامی اقوام کے مصر و بابل پر حملہ کی بھی یہی تاریخ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاد کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ انتہائے مدت کی تعین کی صورت ہے۔ کہ ۱۵۰۰ قبل مسیح میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے عاد کی عام تباہی ہو چکی تھی۔ قرآن عزیز نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کیا ہے۔ اس لیے مادی عظمت کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح سے ۱۷۰۰ قبل مسیح تک ہے۔

عاد کا مقام کیا ہے؟ ان کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصے یعنی یمن و حضرموت سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی۔ دراصل حکومت کا مرکز یمن تھا۔ لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی۔ جس سے آسانی سے وہ راہ معلوم ہو سکتی ہے۔ جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق

اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی۔ (ارض القرآن)

(۶۰) اور ہم نے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام ان کے بھائی کو روانہ کیا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: اے میری قوم تم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہاری عابدانہ نیازمندیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ عبادت کے موضوع پر تمہاری زندگی افترار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ پتھر کے بت بھی بااختیار، حاکم بلکہ معبود ہیں۔ [1]

قوم عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ اُن کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔ اسی شہرت کی وجہ سے ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں۔ جس زمین کے ممالک باقی نہ رہے ہوں۔ اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو۔ اسے عادی الارض کہتے ہیں قدیم عربی شاعری میں اس قوم کا بڑی کثرت سے ذکر آتا ہے۔ ان کی حکومت وسیع ہونے کے ساتھ بڑی طاقتور تھی۔ ان کا نعرہ تھا۔ من اشد مناقوۃ۔ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟

پرستش میں ان کے تعلقات اللہ سبحانہٗ کو چھوڑ کر اُن کے وہی معبودوں سے تھے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ معبودان باطل کی پرستش ان میں عام تھی۔ ظلم و جور ان کی حاکمانہ زندگی کا سب سے بڑا نشان تھا۔ اپنے ممالک میں اکڑتے پھرتے۔ بغیر کسی تحقیق کے قوموں کو چھیڑتے تھے۔ عاد کی اس جباری اور ستمگری کا ثبوت مصری مفتوح اقوام کی زبان سے بھی ملتا ہے۔

قرآن نے قوم عاد کے دو جرم بتائے ہیں۔ ایک اللہ کے سوا مظاہر آثار اور خود تراشیدہ شخصیتوں کے اسمار کی پرستش ان کا مذہب تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم۔

یہ ان کے عابدانہ کردار پر ایک ضرب کاری ہے۔ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور جن ناموں کی تم دہائی دیتے ہو۔ یہ سارا صرف ناموں کا گورکھ دھندہ ہے۔ اور سب کا سب افسانہ تمہارا افترائی ہے۔ تم کسی کو بارش کا کسی کو ہوا کا، کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو۔ حالانکہ کوئی بھی فی الحقیقت رب نہیں ہے۔ یہ سب افترارات ہیں۔ اگر آپ کسی کو اللہ کے سوا مشکل کُشا کہتے ہیں۔ یا داتا کہتے ہیں یا گنج بخش کہتے ہیں۔ ایسے سب نام محض نام ہیں۔ جن کے پیچھے کوئی مسمّی نہیں ہے۔ اور ناموں کی یہ ترش توہمات کی تخلیقات ہیں۔ اس لیے ان کا سرمایہ افترائی ہے۔ اس جرم میں تو پوری قوم شریک تھی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چھوٹے بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، امیر، غریب، حاکم اور محکوم سب ہی اس حمام میں برابر کے ننگے تھے۔ اجسام پرستی، ستارہ پرستی، بت پرستی، ارواح پرستی موجود تھی۔ لیکن استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عام قومی مذہب ستاروں اور روحوں کے خیالی مجسموں کی پرستش کرنا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اسی بات کو فی اسماء سمیتوھا میں ظاہر کیا ہے۔

دوسرا جرم ان کا قرآن نے جو بتایا ہے۔ فاستکبروا فی الارض قوم عاد نے ملک میں بڑائی کی۔ ان کی بڑائی ملک میں یہی تھی۔ کہ سرکش و جبّار بنے ہوئے تھے۔ اور ملک میں صرف خدا کے نافرمان نہ تھے۔ بلکہ ملک میں اللہ کی نافرمانی پر مبنی قوانین بناتے تھے۔ اور لوگوں کو اسی پر چلنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ قرآن کی زبان میں اسی استکبار کا نام طغیان ہے۔ اور اس کردار کے مالک کو الطاغوت کہتے ہیں۔ اور لوگوں کے ان متکبرین کے تحت تابعدارانہ زندگی گزارنے کا نام بندگی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام پرستش اور بندگی دونوں کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ تمہارے عابدانہ تعلقات صرف اللہ سے ہونے چاہیں۔ نیازمندانہ اعمال اور نذر و نیاز طلبگاری، رکوعوں، سجدوں میں دور سے پکارنے، روح کی تربیت کے سارے اطوار میں، اخلاق، عائلی زندگی، معاشرتی اطوار، معاشی اقدار، سیاسی نظام اور قانون کی اطاعت کی حد میں صرف اللہ کی عبادت ہونی چاہیئے۔ اسی لیے جن بزرگوں کی نظر قوم کی قانون و سیاست پر گئی انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہٗ کے معنے یہ کیئے ہیں۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں۔ اور جن کی نگاہ قوم کی پرستاری پر گئی۔ انہوں نے ترجمہ یوں کیا ہے۔ کہ اللہ کے سوا پوجا کے لائق کوئی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ مالکم من الٰہ غیرہٗ کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں داخل ہیں۔ اللہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط ہے۔ مگر اس سے زیادہ غلط یہ بات ہے۔ کہ الٰہ کے مفہوم میں حاکمیت کا تصور ہی نہ مانا جائے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں نہیں دی تھی۔ کہ لوگو! اللہ کی حکومت قائم کرو۔ کیونکہ اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر نبی کی دعوت کے الفاظ یہی تھے۔ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ۔ اللہ کی عبادت کرو اسکے سوا تمہارا الٰہ کوئی نہیں۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ان الفاظ کے مفہوم میں ان لفظوں کا مفہوم بھی پوری طرح شامل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اسی وقت کہی جا سکتی ہے۔ جبکہ عبادت کا مفہوم صرف پرستش ہوتا بندگی نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ حقیقت ہے۔ کہ عبادت کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں داخل ہیں۔ کیونکہ جیسے پرستش اللہ سبحانہٗ کی محبوبیت کا تقاضا ہے۔ ایسے ہی بندگی اللہ سبحانہٗ کی حاکمیت کا ناگزیر مطالبہ ہے۔ مالکم من الٰہ غیرہٗ کے معنے موقع و محل کی مناسبت سے کیئے جن کی

نگاہ اللہ سبحانہ کی شان محبوبیت پر ہوتی ہے ۔ وہ معنے یوں کرتے ہیں ۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے ۔ اور جن کی نگاہ اللہ کی شانِ حاکمیت پر ہوتی ہے ۔ اور نبوت کا خطاب ارباب اقتدار سے ہوتا ہے ۔ وہ ترجمہ یوں کرتے ہیں ۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے ۔ بزرگوں میں شاہ عبدالقادرؒ نے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مخاطبات میں ترجمہ یہی کیا ہے ۔ دیکھ لیجئے آٹھویں پارے بارہویں پارے کے خطابوں میں الٰہ کا ترجمہ حاکم اور عبادت کا ترجمہ بندگی ہے ۔ تراجم میں بے جان ، بے روح اور بے مقصد ترجمہ ان لوگوں کا ہے ۔ جو یہ کہتے ہیں: لوگو ! خدا کے سوا تمہارا خدا کوئی نہیں ہے ۔ حالانکہ نبوّت کے مخاطبوں میں منکرین خدا نہیں بلکہ مشرکین ہیں ۔

بہر حال حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا ہے ۔ لوگو ! عبادت واطاعت، پرستش اور بندگی، اطوار پرستش اور اقدار بندگی میں تمہاری روحانی ، معاشرتی ، اخلاقی ، معاشی اور سیاسی زندگی پوری کی پوری بلا استثنار افترائی ہے ۔ یہ سب کچھ تمہارے توہمات اور تمہاری خواہشوں کے خود ساختہ پیمانے ہیں ۔ ان کی پُشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے ۔ اللہ سبحانہ سے تعلقات بندگی کے ہوں یا پرستش کے ۔ ان دونوں میں فساد جن راہوں سے آتا ہے ۔ ان میں قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت افترار کی ہے ۔ دونوں تعلقات افترارات کا مجموعہ بن جاتے ہیں ۔ اور افترائی زندگی کی بنیاد علم کا صحیح نہ ہونا ہے ۔ نبوّت علم ہی کی تصحیح کے لیے آتی ہے ۔ اس لیے ہر افترار پر ٹوکتے ہوئے باآواز کہتی ہے ۔ ما انزل اللہ بہا من سلطان ۔ اسی لیے حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہا ہے ۔ اور پوری قوت سے قصر کے ساتھ کہا ہے ۔ ان انتم الا مفترون ۔ تم اللہ سبحانہ کے نام پر جو کچھ کہہ رہے ہو ۔ کر رہے ہو ۔ سب کا سب جھوٹ اور صرف جھوٹ ہے جھوٹ کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے ۔

۶۱ حضرت ہودؑ کی بیقراری

اے میری قوم میں اپنے کام پر تم سے کسی اُجرت کا خواہاں نہیں ہوں ۔ میری اُجرت تو وہی دے گا جس نے مجھے پیدا کیا ہے ۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے ۔ یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں ہے ۔ میرا پیدا کرنے والا ہی تمام ضروریات اور اُخروی اجر و ثواب کا کفیل ہے ۔ یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی ہے ۔ تاکہ نصیحت بے لوث اور مؤثر ہو ۔ لوگ ان

کی محنت کو دنیوی طمع پر محمول نہ کریں۔ آگے فرمایا افلا تعقلون یعنی اس قدر غبی ہو، اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔ کہ ایک شخص بے طمع، بے غرض محض دردمندی اور خیر خواہی سے تمہاری فلاح دارین کی بات کہتا ہے۔ تم اسے دشمن اور بدخواہ سمجھ کر دست و گریباں ہوتے ہو۔[1]

انبیاء کی دعوت میں تبشیر و انذار دونوں ہوتے ہیں۔ تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا۔ اور انذار اللہ سبحانہ، کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا، اور لوگوں کو ان کے عذاب بد سے آگاہ کرنا۔ اور انبیاء کی یہ شان اس لیئے ہوتی ہے۔ کہ اللہ سبحانہ، کی حجت بندوں پر پوری ہو جائے۔ وہ اس انذار میں لوگوں کے سامنے اپنی خیر خواہی، دلسوزی اور اخلاص مندی کا اعلان کرتے ہیں۔ انا لکم ناصح امین۔ وہ اپنی بے لوثی، بے غرضی کو ظاہر کرتے ہیں۔ لا اسالکم علیہ اجرا۔ یعنی وہ اس خیر خواہی پر مخاطبوں سے کسی اُجرت کے خواہاں نہیں ہوتے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ نے یہ بات یہاں بالکل برموقع لکھی ہے۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام اس کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں اُبھرے ہوئے اس وہم کو دُور کر رہے ہیں۔ کہ شاید مادیت کے متوالے سوچنے لگیں کہ اس کار نبوت کی پشت دنیا حاصل کرنے کی فکر میں کام کر رہی ہے۔ اور اسے جاہ و وقار کی طمع ہے۔ فرمایا کہ میری خیر خواہی قطعاً بے لوث ہے۔ اس میں طمع کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ یہ بات تھوڑی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو بغیر لالچ اور طمع کے محنت کر رہا ہے۔ وہ بلا شبہ پیکر اخلاص ہے۔ افلا تعقلون میں ایک بڑا استدلال چھپا ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ میری دعوت کو جس انداز پر تم نظر انداز کر رہے ہو۔ اور اس پر غور نہیں کرتے ہو۔ یہ صاف اس بات کی نشانی ہے کہ تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ہو۔ ورنہ اگر عقل سے ذرا بھی کام لیتے تو ضرور سوچتے کہ جو شخص کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ، تبشیر و انذار اور تذکیر و نصیحت پر یہ گوناگوں تکلیفیں برداشت کر رہا ہے۔ جس کی تگ و دو میں شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنا عیش و آرام تج کر دیا ہے۔ اور اپنی دنیا بنانے کی فکر سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اس کام میں ڈالا ہوا ہے۔ کہ صدیوں کے رچے اور جمے ہوئے عقائد کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔ ایسے شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن نہیں ہو سکتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اس سے بے رُخی اختیار کر لی جائے۔ گویا حضرت ہود علیہ السلام لوگوں سے فرما

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہے ہیں ۔ لوگو ! میں یہ نصیحت اور انذار کا کام اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے بدلے میں تم سے میں اپنا مفاد وابستہ رکھتا ہوں ۔ یہ کوئی مالِ تجارت نہیں ہے کہ میں گاہک تلاش کر رہا ہوں ۔ کہ اگر تم نے نہ خریدا تو میرے کاروبار میں نقصان ہو جائے گا ۔ یہ تو صرف اور صرف تمہاری صلاح اور فلاح کی خواہش میرے اندر جوش مار رہی ہے ۔ خدارا میری بات توجہ سے سنو ۔ آخر میں اس کا تم سے معاوضہ تو نہیں طلب کر رہا ہوں کہ تم مجھے خود غرض سمجھ کر میری بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو ۔

(۶۲) استغفار و توبہ کی تلقین

اور اے میری قوم تم اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو ۔ پھر آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرو ۔ وہ تم پر برستے ہوئے بادل روانہ کرے گا ۔ اور تمہاری طاقت میں اور طاقت بڑھائے گا ۔ اور مجرمانہ انداز میں منہ نہ موڑو ۔ اسی سورت کے شروع میں اس جملہ کی تفسیر گزر گئی ۔ یرسل السماء الخ کا مطلب یہ ہے ۔ کہ موقع بموقع خوب بارش دے گا ۔ وہ قوم چونکہ کھیتی باڑی اور باغ لگانے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھی ۔ اس لیے ایمان لانے کے ظاہری فوائد و برکات بیان کیے ۔ جو ان کے حق میں خصوصی طور پر موجبِ ترغیب ہوں ۔ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ تین سال سے خشک سالی اور امساک باراں کی مصیبت میں گرفتار تھے ۔ ہود نے وعدہ کیا کہ ایمان لا کر اللہ سبحانہ کی طرف رجوع کرو گے تو یہ مصیبت دور ہو جائے گی ۔ اور یزدکم قوۃ الی قوتکم کا مطلب یہ ہے ۔ کہ مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا ۔ اولاد میں برکت دے گا ۔ خوشحالی میں ترقی ہوگی ۔ مادی قوت کے ساتھ روحانی و ایمانی قوت میں اضافہ کر دیا جائے گا ۔ بشرطیکہ اللہ سبحانہ کی طرف رجوع ہو کر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔[1]

سورت کے آغاز میں بھی یہی بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے حوالہ سے کہلوائی گئی ۔ اپنے رب سے معافی مانگو ۔ اور اس کی طرف پلٹ آؤ ۔ تو اللہ سبحانہ تم کو بہترین سامان حیات عطا فرمائے گا ۔ یہاں یہی بات حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرما رہے ہیں ۔ کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف لوٹ آؤ ۔ لوٹ آنے کا مطلب یہ ہے ۔ کہ آئندہ اللہ کی نافرمانیوں سے بچو ۔ ناخداشناسی اور اللہ سبحانہ کی کھلم کھلا بغاوت چھوڑ دو ۔ جو کچھ ہو چکا اس کی معافی مانگو اور آئندہ خداشناس بنو ۔ اور اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو ۔ اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہ تمہیں اس مادی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندگی میں پہلے فلاح سے ہمدوش کرے گا۔ وقت پر بارشیں ہوں گی۔ پیداوار خوب ہوگی۔ تمہاری معاشی زندگی خوب سے خوب تر ہوجائے گی۔ ویزدکم قوۃ الی قوتکم۔ اور سیاسی اعتبار سے تمہاری طاقت میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کی دعوت میں صرف آخرت ہی فلاح کی ضمانت نہیں بلکہ آخرت کے ساتھ نبوت دُنیا کی کامیابی اور فلاح کی بھی ضمانت دیتی ہے۔ اس سے اللہ سبحانہٗ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ قطعی طور پر یہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ ایمان وعمل صالح کے عوض آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے۔ اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔ اور وہ جن کی آخرت سنور رہی تھی۔ ان کی دنیا بھی باغ وبہار بنی رہی۔ یہ واقعات قرآن میں اس لیے آئے ہیں۔ تاکہ قرآن کے مخاطب جانیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ جیسے قوم ہود کے لیے تھا۔ ویسے ہی اُمّت مسلمہ کے لیے ہے۔ شروع سورت کی پکار اور حضرت ہودؑ کی پکار کو ملا کر دیکھئے۔ دونوں میں کیسی ہم آہنگی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش مکہ سے کہہ رہے ہیں۔

ان استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمی ویوت کل ذی فضل فضلہٗ۔

اور یہاں حضرت ہود علیہ السلام فرما رہے ہیں۔

یا قوم استغفروا ربکم ثم الیہ یرسل السماء علیکم مدرارا ویزدکم قوۃ الی قوتکم

اس اُمت سے بھی فلاح دنیا کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ ایمان وعمل کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کس طرح پورے ہوئے۔ اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ کہ اسلام نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہوسکتا ہے۔ یہ آیات بتارہی ہیں۔ کہ آخرت میں ہی نہیں، بلکہ اس دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ ایمان وعمل ہی پر ہوتا ہے۔ یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر بتائی گئی ہے۔ کہ جب نبوّت اللہ سبحانہٗ کا پیغام لے کر آتی ہے۔ تو قوم کی قسمت کا فیصلہ اس پیغام سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ اگر وہ اسے قبول کرلیتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اور اگر رد کردیتی ہے۔ تو اسے تباہ کرڈالا جاتا ہے۔

یہ حضرت ہود علیہ السلام کی جانب سے قوم کو اجتماعی توبہ کی دعوت ہے۔ کہ شرک اور نافرمانی سے

توبہ کرو اور خالص اپنے رب سے عابدانہ تعلقات استوار کرو۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں۔ استغفار اور توبہ استغفار کا مطلب یہ ہے۔ کہ بندہ اللہ سبحانہ سے التجا کرے۔ کہ وہ اس کے ماضی میں کیئے ہوئے گناہوں کے نتائج سے اس کی حفاظت فرمائے۔ یہ غفر سے ہے۔ غفر کے معنے ڈھانپنے کے ہیں۔ بلکہ محفوظ کرنے کے ہیں۔ مغفر ڈھال کو اس لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ سر کو تلوار کی ضرب سے محفوظ رکھتی ہے غفار پٹے کو اس لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ ازار کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ استغفار کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ ماضی کے گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ گناہوں کے نتائج سے حفاظت فرمائے۔ اور توبہ کے معنے لوٹنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس صراط مستقیم کی طرف لوٹ آؤ۔ جو نبوت لے کر آئی ہے۔ یرسل السماء اور یزدکم قوۃ الی قوتکم۔ اجتماعی توبہ کی برکتیں ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ انفرادی توبہ ان برکتوں سے خالی ہوتی ہے۔ جو بندہ گناہ کی زندگی سے منہ موڑ کر اللہ کی جناب میں استغفار و توبہ کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ رزق طیب سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کو سکینت و اطمینان کی نعمت مرحمت فرماتا ہے۔ حدیث میں ہے۔

من لزم الاستغفار جعل اللہ لہ من ھم مخرجا ومن کل ضیق مخرجا ورزقہ من حیث لا یحتسب۔

جو استغفار کو اپنا لیتا ہے۔ اللہ سبحانہ اس کے ہر غم میں فراخی اور ہر تنگی سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے گا۔ اور داد و دہش ایسے مقام سے ہوگی جہاں کا خیال ہی نہ ہوگا۔

یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے۔ کہ جو قوم دنیا کی خوشحالی سے دھوکہ کھا کر ظلم و بدکاری کی راہوں کو اپنا لیتی ہے۔ اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور نافرمانی چھوڑ دے تو اس کی قسمت بر آتی ہے۔ ولا تتولوا مجرمین کے فقرے سے ویسے ہی نہ گزر جاؤ۔ قرآن کا ترجمہ کرنے والوں نے اسے اس طرح سمجھایا ہے۔ شاہ عبد القادرؒ فرماتے ہیں کہ اور نہ پھرے جاؤ گنہگار ہو کر حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔ روگردانی نہ کرو گنہگار ہو کر۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ اور مجرم رہ کر اعراض نہ کرو۔ اور مولانا دریا آبادی فرماتے ہیں۔ اور مجرم رہ کر روگردانی نہ کرو۔ اور مولانا غلام اللہ خانؒ فرماتے ہیں۔ نہ روگردانی کرو گنہگار رہ کر۔ مولانا پیر کرم شاہؒ فرماتے ہیں۔ نہ منہ موڑو اللہ تعالیٰ سے جرم کرتے ہوئے۔ مولانا آزادؒ فرماتے ہیں۔ اور جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو۔ مولانا

مودودیؒ فرماتے ہیں ۔ کہ مجرموں کی طرح منہ نہ موڑو ۔ مولانا اصلاحیؒ فرماتے ہیں ۔ اور مجرمانہ روگردانی کی روشن اختیار نہ کرو ۔

لفظ مجرمین کو سارے شارحین قرآن نے تتولوا کی ضمیر سے حال قرار دیا ہے ۔ علامہ آلوسیؒ نے مراد یہ بتائی ہے ۔ کہ جرائم پیشہ زندگی پر اصرار کرکے میری دعوت سے روگردانی نہ کرو ۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی آلوسیؒ سے پہلے یہی بات کہی ہے ۔ علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں بات کو اور کھول دیا ہے ۔ کہ کفر پر جم کر اور جرائم پر کافرانہ زندگی میں اڑ کر میری دعوت سے اعراض نہ کرو ۔ حافظ ابن جریرؒ نے ان سے پہلے یہ تشریح کی ہے ۔

میری دعوت توحید اور برارت عن الشرک سے اللہ سبحانہٗ کا کفر کرکے روگردانی نہ کرو ۔
حال سب کا ایک ہے ۔ کہ تمہاری موجودہ زندگی جرائم کی زندگی ہے ۔ اسی پر جم کر تم میری دعوت کو رد نہ کرو ۔ بلکہ اسے چھوڑ کر میری دعوت کو اپناؤ ۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا
بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ
قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۞
مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۞ اِنِّىْ
تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ
بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا
غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ
حَفِيْظٌ

قوم عاد نے کہا۔ کہ اے ہود علیہ السلام تو نے ہمارے سامنے کوئی واضح
دلیل پیش نہیں کی ہے۔ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبود نہ چھوڑیں
گے۔ اور ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔[۶۳] ہمارا کہنا تو صرف یہ
ہے۔ کہ تجھے ہمارے کسی معبود نے جھپٹ لیا ہے۔ برائی سے[۶۴]
حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا۔ لوگو! میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ تم بھی

گواہ رہو۔ کہ اللہ سے ورے جن کو تم اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو۔ میں ان سے بیزار ہوں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو۔ ضرور کر لو۔ پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے۔ اور تمہارا بھی۔ پاؤں سے چلنے والا کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کی چٹیا اللہ کے قبضے میں نہ ہو۔ بلاشبہ میرا رب سیدھی راہ پر ہے[۶۵] اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام مجھے تمہاری طرف دے کر روانہ کیا گیا ہے۔ وہ میں نے تم کو پہنچا دیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو دے دے گا۔ اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے[۶۶]

مفردات کے معانی

مؤمنین۔ مؤمن کی جمع مذکر سالم ہے۔ یہ ایمان سے بنا ہے۔ عربی میں ایمان دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ با کے ساتھ جیسے اٰمنا باللہ اور یؤمنون بالیوم الآخر اس کے معنے میں تصدیق، اعتراف اور تسلیم و انقیاد ہوتا ہے۔ یعنی خبر دینے والے کو سچا یقین کرنا اور اس کی بات کو سچا تعین کرنا اس طرح کہ اس بات کو قبول کرنا اور اس کا اعتراف کر کے تسلیم و طاعت کے لیے تیار ہو جانا۔ جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔ کہ بغیر اعتراف کے تصدیق کا اعتبار نہیں ہے۔ اور کبھی یہ ایمان لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس کے معنے ماننا آتے ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی یہ کہہ کر کہ یوسفؑ کو بھیڑیئے نے کھا لیا۔ سمجھتے ہیں۔ ما انت بمؤمن لنا۔ آپ ہماری بات کو نہ مانیں گے۔ یا آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ فاٰمن لہٗ لوط۔ حضرت لوط علیہ السلام نے حضرت ابراہیمؑ

کی بات، مان لی ۔ ما امن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ ۔ موسیٰؑ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کچھ لوگوں نے مان لی ۔ اسی لیے محققین نے یہاں ترجمہ اس طرح کیا ہے ۔ ہم تجھے ماننے والے نہیں ۔ اور غیر محققین کہتے ہیں ۔ کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ۔ ایمان یہ ہے کہ نبوت کی ان تمام تعلیمات کی تصدیق کی جائے جن کے متعلق نبی کی تعلیم ہونا ثابت ہو جائے ۔ جس چیز کا علم تفصیلی ہو ۔ اس کی تفصیلی اور جس کا اجمالی علم ہو ۔ اس کی اجمالی طور پر تصدیق کرنا جمہور کا ہی مذہب ہے ۔

قوم عاد اور اشراک باللہ

ذہنوں میں کوئی تصور اسی وقت واضح ہوتا ہے ۔ جبکہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ہی ساتھ بیان کر دیا جائے ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے پہلے فرمایا تھا ۔ اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ ۔ اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو ۔ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے ۔ اب فرمایا ۔ انی بریئ مما تشرکون من دونہ ۔ تم اللہ کے سوا جن جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو ۔ میں اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں ۔

عرب کی سرزمین عجیب سرزمین تھی ۔ یہاں انسان کے مذہبی ارتقار کے ہر درجہ کی مجسم تاریخ موجود تھی ۔ اجسام پرست ، ستارہ پرست ، بُت پرست ، ارواح پرست ، ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے ۔ لیکن استقصا سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ان کا عام قومی مذہب ستاروں اور روحوں کی پرستش تھا ۔

قوم عاد عرب سے لے کر عراق و شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس بنا پر ان کا مذہب وہی ہو سکتا ہے ۔ جو ان ممالک کے اندر اس عہد میں رائج تھا ۔ عربی تاریخوں سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے ۔ کہ یہ قومیں بُت پرست تھیں ۔ لیکن کن بتوں کی پرستش کرتے تھے ۔ ان کی بُت پرستی کے اصول مراسم کیا تھے ۔ اس کی تفصیل نہیں ملتی ہے ۔ قرآن عزیز نے عاد کے ذکر میں حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی صرف اس قدر معلوم ہوا ۔ کہ الٰہ برحق کو چھوڑ کر اور بہت سے الٰہوں کو پوجتے تھے ۔ اور ان کے الگ الگ نام رکھے ہوئے تھے ۔ حضرت ہود علیہ السلام کی تقریر معالم القرآن کی آٹھویں جلد میں پڑھ چکے ہو ۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام فرما رہے ہیں ۔ اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا ۔ ان کی قوم جواب دیتی ہے ۔ اجئتنا لنعبد اللہ وحدہ ونذر ما کان یعبد آباءنا ۔ اس سوال و جواب سے کہ قوم عاد اللہ کے ساتھ اور الٰہوں کو بھی پوجتی تھی ۔ عرب سے مصر و شام اور

مصر میں بھی عاد تھے۔ ان ملکوں میں جو مذہبی مراسم ان قوموں کے جاری تھے۔ ان ہی پر ان کی عرب آبادی کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔ ان ممالک کے بارے میں قدیم کتبات اور تحریروں کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں قاعدہ یہ تھا۔ کہ قومیں مختلف آبادیوں میں منقسم ہوتی تھیں۔ ہر آبادی میں دو بڑی بڑی عمارتیں ہوتی تھیں۔ ایک بیت الحکومت اور ایک ہیکل۔ آبادی کا حاکم بیت الحکومت میں رہتا تھا۔ اور ہیکل آبادی کے کاہن کا مسکن ہوتا تھا۔ اور ان ہی دونوں کی شرکت سے آبادی پر دنیاوی اور مذہبی حکمرانی کی جاتی تھی۔ اور جس طرح ہر آبادی کا الگ حاکم ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر ہیکل میں ایک بت جو اس آبادی کا محافظ خیال کیا جاتا تھا ہوتا تھا۔ جب دو آبادیوں کے رہنے والوں میں جنگ ہوتی۔ تو گویا ان دونوں آبادیوں کے دیوتاؤں میں جنگ ہوتی۔ فاتح مفتوح کا دیوتا اٹھا کر لے جاتا۔ مفتوح اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک لڑ کر یا منت سماجت کر کے اپنا دیوتا واپس نہ لیتے۔

(۶۳) قوم عاد نے کہا۔ اے ہود علیہ السلام تو نے ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبود نہ چھوڑیں گے۔ اور ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ ان کی کھلی ہٹ دھرمی تھی۔ جو کہتے تھے کہ آپ کوئی واضح سند اور دلیل اپنی صداقت کی نہیں لائے۔ اللہ سبحانہٗ جسے پیغمبری عہدہ پر فائز کرے۔ ضروری ہے کہ اس کو تقرر کی سند اور پروانہ عطا فرمائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ کہ جو نبی مبعوث ہوا۔ اس کے ساتھ ایسے واضح نشانات بھیجے گئے۔ جس پر آدمی ایمان لانا چاہیں۔ تو لا سکتے ہیں۔ اس لیے بالیقین کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہود علیہ السلام نے نشان پیش کیئے ہوں گے۔ مگر وہ لوگ ہٹ دھرمی سے کہہ رہے ہیں۔ کہ آپ کوئی کھلا نشان نہیں لائے۔ شاید یہ مراد ہو کہ ایسا نشان نہیں لائے جو سب کی گردنیں پکڑ کر ایمان لانے پر مجبور کر دے۔ بہر حال ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کبھی تیری رسالت پر ایمان لا سکتے ہیں[1]

ان کا یہ کہنا کہ اے ہودؑ تو نے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی جانب سے ان کے سامنے ان گنت دلائل پیش کیئے جا چکے ہیں۔ اور وہ ان دلائل کا انکار کر چکے ہیں۔ آگے قرآن میں آ رہا ہے۔ تلک عاد جحدوا بایات ربھم۔ آیات آیت کی جمع ہے۔ شاید بینہ کہہ کر یہ جتانا چاہتے ہیں کہ آیتیں تو آتی ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے مطالبے کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے وہ واضح نہیں ہیں۔ دراصل ہمارا فن استدلال آیات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہی پر موقوف ہے۔ ہم علت سے معلول پر اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں۔ قرآن میں ان معنے میں آیات کا لفظ اس کثرت سے آیا ہے۔ کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندہ اور خدا، خالق اور مخلوق کے تعلق کو اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعے نمایاں کرتا رہتا ہے۔

نبوت قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نورِ الٰہی کی مشعل لے کر تنہا مجمعوں میں آتی ہے۔ مادیت پوری طاقت سے اس نور کو بجھانا چاہتی ہے۔ اور تیغ و خنجر سے مشعل تھامنے والے ہاتھ اور بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ شمع الٰہی بجھنے کی بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرہ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جدوجہد کے الذین اٰمنوا معہٗ کا وجود میں آنا اس بات کی بات کی دلیل ہے۔ کہ وہ اللہ سبحانہٗ کی طرف سے ہے۔

نبوت کے صحیفۂ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے۔ اس کی سچائی اور راستبازی عالم آشکارا اور دوست و دشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے

غرض یہ وہ امور ہیں۔ جو خالق فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطہ خاص کا کام کرتے ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیات و دلائل کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔

ظاہری اور مادی آیات وہ خوارق ہیں۔ جن کو لوگ عام طور پر معجزہ کہتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن نے ان آیات کا ذکر نہیں کیا۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ واقع میں وہاں آیات و معجزات نہ تھیں۔ تو قرآن ان کے انکار کا جحدوا بایات ربہم کہہ کر کیوں ذکر کر رہا ہے۔ انداز تعبیر بتا رہا ہے۔ کہ آیت نہیں بلکہ حضرت ہودؑ کی جانب سے آیات پیش کی گئیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ ان کی افتراحی آیات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ پیغمبر کو معجزہ مخاطبوں کی خواہش کے مطابق نہیں دیا جاتا بلکہ اعجاز کا سارا دارومدار اللہ سبحانہٗ کے ارادے اور مشیت پر ہوتا ہے۔ ان سب آیات کو دیکھ کر وہ کہہ رہے ہیں۔ کہ تمہاری کسی نشانی کو نہیں مانیں گے۔ اور تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ توڑیں گے۔

(۶۴) جاہلی ذہنیت کی صحیح ترجمانی

ہمارا کہنا تو صرف یہ ہے کہ تجھے ہمارے کسی معبود نے برائی سے جھپٹ لیا ہے۔ یعنی یہ جو تم

بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ اور سارے جہاں کو بیوقوف بنا کر اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی نے آسیب پہنچا کر تمہیں مجنوں اور پاگل کر دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔ تم جوان کی عبادت سے روکتے اور بُرا بھلا کہتے تھے۔ انہوں نے اس گستاخی کی سزا دی کہ اب تم بالکل دیوانوں کی طرح باتیں کرنے لگے ہو۔ [1]

آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ قوم عاد نے حضرت ہود علیہ السلام سے کہا کہ تمہاری بات ماننا الگ رہا ہمارا کہنا تو یہ ہے۔ کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی مار پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے تم پاگل ہو گئے ہو۔ اور اس قسم کی باتیں کرتے ہو۔ کہنا یہ چاہتے ہیں۔ اے ہود علیہ السلام تم نے ہماری کسی دیوی یا دیوتا یا کسی حضرت کے آستانے پر کچھ گستاخی کی ہو گی۔ تم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہو۔ کہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ اور پورے معاشرے سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ اور اس وجہ سے تم یہ یاوہ گوئی کر رہے ہو۔

دراصل یہ جملہ استیناف بیانی ہے۔ یعنی ایک ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ وما نحن لك بمؤمنين۔ ان کی زبان پر آتے ہی ذہنوں میں یہ سوال اُبھر آیا ہے۔ کہ اگر نہیں مانتے ہو۔ تو پھر حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو۔ جواب دیا کہ ہم تو اس پر اپنے معبودوں کی پڑی ہوئی مار خیال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اور یہ سب دیوتاؤں کی مار کا نتیجہ نہیں کچھ کی مار کا نتیجہ ہے۔ تاکہ مخاطب سمجھ لیں۔ کہ کچھ کی مار کا یہ نتیجہ ہے۔ اگر سب کی مار ہوتی تو ہود علیہ السلام کا نام ونشان ہی مٹ جاتا۔ یہاں علامہ آلوسیؒ نے یہ بات بہت لطیف لکھی ہے۔

> حضرت ہود علیہ السلام کے مخاطبوں نے مخالفت وعناد کی راہ میں ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ برا اور برے سے زیادہ پہلے کیا کہ تم واضح دلیل نہیں لائے حالانکہ ان کا وجود ہی مستقل دلیل ہے۔ اور ترقی کی اور بولے کہ ہم تمہارے کہنے سے بتوں کی عبادت نہ چھوڑیں گے۔ اس میں ابہام تھا۔ کہ تمہیں مانتے تو ہیں۔ مگر تمہارے کہنے پر نہ چلیں گے۔ پھر ایک قدم اور بڑھایا اور بولے کہ ما نحن لك بمؤمنين کہ ہم تمہیں مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں گنجائش تھی۔ کہ ہے تو تمہاری بات ٹھیک

[1] افادات شیخ الاسلام

مگر ہم نہیں مانتے پھر ایک قدم اور بڑھایا کہ تمہاری باتیں جنون کا نتیجہ ہیں۔ اور تمہیں ہمارے معبودوں کی گستاخی کے نتیجے میں جنوں اور دیوانگی ہوگئی ہے۔

العیاذ باللہ۔

جاہلوں کا جیسے یہ اعتقاد ہوتا ہے۔ کہ فلاں دیوتا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکالے تو فوراً بلائیں ہمیں آلپٹیں گی۔ قوم عاد میں بستی بستی بت تھے۔ اور بیسیوں صنم خانے تھے۔ ان کو ہیکل کہتے تھے۔ دنیا کے تمام کام انہیں اصنام کے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آرہا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت سے ان کو لرزہ آتا تھا۔ اسی لیے پوری قوم نے اسی توہم کی بنا پر حضرت ہودؑ سے کہا۔

ان نقول الا اعتراك بعض الهتنا بسوء۔

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخاطبوں کی ان ذہنی تخلیقات سے دوچار ہونا پڑا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اکثر لوگوں نے آپ کو نعوذ باللہ مجنوں سمجھ لیا۔ زمانہ جاہلیت کے بعض احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے۔ ضمام بن ثعلبہ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں واپس آئے اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا۔ کہ ضمام ان کو برا نہ کہو۔ دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔ حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئیں تھیں۔ کفار نے کہنا شروع کر دیا۔ کہ لات وعزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے۔ اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو " ذوالشریٰ" بت کہیں برباد نہ کر دے۔

توہم پرستی میں کسی دعوت کی صحت اور بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ توہمات ہوتے ہیں اور بس۔

(۶۵) حضرت ہودؑ کا شرک کے خلاف اعلان

حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا لوگو! میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں تم بھی گواہ رہو کہ اللہ سے ورے جن کو تم اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو۔ میں ان سے بیزار ہوں۔ تم سب میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو ضرور کر لو۔ پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اس اللہ پر ہے۔ جو میرا بھی پروردگار

ہے۔ اور تمہارا بھی۔ پاؤں سے چلنے والا کوئی بھی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چٹیا اللہ کے قبضے میں نہ ہو۔ بلاشبہ میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ یعنی وہ بیچاری پتھر کی مورتیاں تو مجھے کیا گزند پہنچا سکتی ہیں۔ تم سب جو بڑے شہزور، تنومند، طاقتور نظر آتے ہو۔ اپنے دیوتاؤں کی فوج میں بھرتی ہو کر اور مجھ جیسے یکہ د تنہا پر پوری قوت سے بیک وقت ناگہاں حملہ کر کے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ سنو! میں اللہ سبحانہٗ کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں۔ اور تم سب بھی اس پر گواہ رہو۔ کہ میں تمہارے جھوٹے دیوتاؤں سے قطعاً بیزار ہوں۔ تم سب جمع ہو کر جو برائی مجھے پہنچا سکتے ہو۔ پہنچاؤ۔ ذرا کوتاہی نہ کرو۔ ایک منٹ بھی مہلت نہ دو۔ اور خوب سمجھ لو۔ کہ میرا بھروسہ اللہ وحدہٗ لاشریک پر ہے۔ جو میرا رب ہے۔ اور تمہارا بھی مالک و حاکم ہے۔ گو بدقسمتی سے تم نہیں سمجھتے ہو۔ نہ صرف میں اور تم بلکہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز جو زمین پر چلتی ہے۔ خالص اس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ گویا ان کے سر کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جدھر چاہے پکڑ کر کھینچے اور پھیر دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قبضہ و اختیار سے نکل کر بھاگ جائے۔ نہ ظالم اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہیں۔ نہ نیکی اس کی پناہ میں رہ کر رسوا ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ میرا پروردگار عدل و انصاف کی سیدھی راہ پر ہے۔ اس کے یہاں نہ ظلم ہے۔ نہ بے موقع انعام۔ اپنے بندوں کو نیکی اور خیر کی جو راہ یعنی سیدھی راہ جو اس نے بتلائی ہے بے شک اسی پر چلنے سے وہ ملتا ہے۔ اور اس پر چلنے والوں کی حفاظت کے لیے خود ہر وقت وہاں موجود ہے۔[1]

قوم عاد کی یہ بات سُن کر کہ تم پر ہمارے دیوتاؤں کی مار پڑی ہوئی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے توحید الوہیت کا اعلان کیا۔ کہ اگر تمہارا خیال یہ ہے۔ کہ تمہارے یہ معبود میرا بگاڑ سکتے ہیں۔ تو لو میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں۔ اور تم بھی گواہ رہو۔ کہ میں ان تمام معبودوں سے جن کو تم نے اللہ کی عبادت میں شریک کر رکھا ہے۔ بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ تم اور تمہارے معبود سب کے سب یا تم سب یعنی ہیکل والے اور بیت الحکومت والے سب مل کر جو کچھ میرے خلاف کر سکتے کر لو۔ اور مجھے کسی قسم کی مہلت نہ دو۔

ٹھہر جائیے: مما تشرکون میں حضرت ہود علیہ السلام نے جس شرک کی ان کی طرف نسبت کی ہے۔ قرآن ہی کی روشنی میں اس کی حقیقت معلوم کر لیجیے۔ شارحین قرآن میں سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں بڑی دقت نظر سے کام لے کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی تفسیر میں شرک کی جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حقیقت سمجھائی ہے۔ وہ اس لائق ہے۔ کہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

سورۂ بقرہ میں زیر نظر آیت ولا تنکحوا المشرکات میں رقمطراز ہیں۔ شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے۔ یا وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو دانائے غیب جاننا، حاضر و ناظر، یقین اور مختار کل سمجھنا اور تصرف و اختیار کا مالک خیال کرنا اور اس سے حاجتیں مانگنا شرک ہے۔ بلا استثنار اس میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ جن نہ فرشتہ نہ ارواح نہ ستارے نہ انبیار نہ اولیار۔ مزارات پر حاجتوں کی بھیک کے لیے جانا قبروں پر چادریں چڑھانا، ان کے نام کے بکرے دینا، قبروں کو سجدے کرنا۔ اور ان کے گرد گھومنا سب مشرکانہ اعمال ہیں۔ یہ اللہ کی بارگاہ میں قطعاً پسند نہیں ہیں۔

سورۂ نسار میں زیر نظر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہٖ میں تحریر فرماتے ہیں۔

شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے۔ بس جو دین ہے۔ سوائے۔ اسلام کے سب شرک ہے۔ اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورۂ انعام میں زیر نظر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔ میں فرماتے ہیں۔

شرک یہی نہیں ہے۔ کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

بتانا یہ چاہتے ہیں۔ کہ شرک صرف عبادت میں نہیں ہوتا بلکہ اطاعت میں بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ چور کو زانی کو قاتل کو اللہ کے قانون کے مقابلے میں سزا دینے کے لیے کسی اور کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ بھی شرک ہے۔ یہ اطاعت میں شرک ہے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں۔ کہ عبادت میں شرک ہو یا اطاعت میں شرک دونوں ہیں۔

حضرت ہود علیہ السلام دونوں طرح کے شرک یعنی عبادت میں شرک اور اطاعت میں شرک دونوں کا رد کر رہے ہیں۔ اور دونوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ قوم عاد نے دونوں گھڑنے

بنا رکھے تھے۔ شرک فی العبادت کی قیادت ان کے ہیکل کر رہے تھے۔ تو شرک فی الطاعت کی امامت ان کا بیت الحکومت کر رہا تھا۔ جو بات یہاں حضرت ہود علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ ٹھیک یہی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے فرمائی ہے۔

انا برآؤ منکم ومما تعبدون دون اللہ

دوسری بات حضرت ہود علیہ السلام نے فرمائی یعنی انی توکلت علی اللہ ربی وربکم۔ یہ توحید خالص کی دعوت ہے۔ اور توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے۔ ربی وربکو کا زور سمجھنے کے لائق ہے۔ قوم عاد کو ہی نہیں بلکہ تمام مشرک قوموں کو اس بات سے انکار نہ تھا کہ ایک خالق و پروردگار کی ہستی موجود ہے۔ اور اصلی طاقت اس کی طاقت ہے۔ یعنی وہ توحید ربوبیت میں نہیں توحید الوہیت میں کھوئے گئے یعنی سمجھتے تھے۔ کہ اس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں ہیں جنہیں اللہ کی جانب سے تصرف و اختیار مل گیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کی پوجا کرنی چاہیئے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے ربی وربکم فرما کر ان کو سمجھایا کہ جب تم مانتے ہو کہ کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ خالق بھی وہی ہے رب بھی وہی ہے۔ تو پھر یہ حاجت روائیوں اور طلبگاریوں کے لیے بہت سے تخت اقتدار تم نے کیوں بنا رکھے ہیں۔ اور کیوں انہیں نذر و نیاز کا مستحق سمجھتے ہو۔ شاہ عبدالقادرؒ نے لاتضربوا للہ الامثال کی تشریح میں کیسی اچھی بات لکھی ہے۔ کہ

> مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے۔ یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں۔ "موضح القرآن"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات واشگاف انداز میں اپنے مخاطبوں کو سمجھائی ہے۔ کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ توحید وجود، توحید خالقیت، توحید ربوبیت اور توحید عبادت۔ اسی کا دوسرا نام توحید الوہیت ہے۔ فرمایا ہے کہ انبیاء کا اپنی مخاطب قوموں سے توحید وجود، توحید خالقیت، توحید ربوبیت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ تینوں توحید کے درجے انبیاء کے مخاطبوں کے مسلمات میں سے تھے۔ ان کا اختلاف، توحید الوہیت میں تھا۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی ہستی اس کی مستحق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ نیازمندیوں اور طلبگاریوں میں اس کو ہی سمجھا جائے، نہ سجدوں میں، نہ دعاؤں اور پکاروں میں نہ نذروں اور نیازوں میں، نہ مصیبتوں کے ٹالنے میں، نہ اعتماد و توکل میں اور نہ امید و رجاء میں نہ بیماریوں کے دور کرنے میں ہر حال میں اللہ کی ذات مومن کا مقصود ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے دیوتاؤں کی مار کا مقابلہ انی توکلت علی اللہ کہہ کر کیا ہے۔
معلوم ہوا کہ عالم غیب میں اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ کرنا توحید کے منافی ہے۔ اللہ پر توکل کا اعلان کر کے حضرت ہود علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے کہ

(۱) صرف اللہ ہی ہے۔ جس کی رضاجوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیئے۔ وہی اس کے سامنے کاموں کا محرک ہونا چاہیئے۔ اور اصل مقصد یہی ہو۔

(۲) وہ جذبات احساسات بھی اللہ کے لیے خاص کر دینے چاہئیں۔ جن کے اندر پرستش کی روح پائی جاتی ہو۔ توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اس سے وابستہ کی جائیں۔ تقویٰ صرف اس کا اختیار کیا جائے۔ خوف صرف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

(۳) اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے، کوئی اور نہیں جسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔

اس کے بعد توکلت علی اللہ کی علت بیان فرمائی۔ یعنی میرا اللہ پر توکل اس لیے ہے۔ کہ اس کائنات میں کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں جو اس کے قبضہ سے باہر ہو۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ یہ فقرہ اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ کہ میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اور تمہارے معبودوں پر نہیں ہے۔ ساری مخلوقات اللہ سبحانہٗ کے سامنے مغلوب اور مقہور ہے۔ کسی کو یارائے دم زدن نہیں ہے سب کی پیشانیاں اسکے قبضے میں ہیں۔ وہ جس کو جدھر چاہے اس کی چٹیا پکڑ کر موڑ دے اور جہاں چاہے روک دے۔

آخر میں فرمایا ان ربی علی صراط مستقیم یہ نہ سمجھو کہ مجھے اپنے رب تک پہنچنے کے لیے متعدد راہوں سے گزرنے اور تمہارے خیال کے مطابق بہت سے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے یہی کافی ہے کہ میں سچے دل سے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ اگر میں متوجہ ہو جاؤں تو بس وہ سیدھی راہ پر میرے سامنے ہے۔

یہاں مدارج السالکین میں حافظ ابن القیمؒ نے اللہ سبحانہٗ کے صراط مستقیمؒ پر ہونے کا جو مطلب بتایا ہے۔ اس میں گہری معنویت ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ آیت صریح ہے۔ اور اس کے ایک ہی معنے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کے صراط مستقیم پر ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے ارشادات میں صداقت، رشد و ہدایت، عدالت اور

حکمت کے خزانے ہیں۔ وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا اور اللہ سبحانہ،
کے کاموں میں مصالح ہیں، حکمتیں ہیں، رحمت ہے، عدل ہے، اور سرتاسر خیر
ہے۔ شرک کا اس کے اقوال وافعال سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان معنے کو
پیشِ نظر رکھ کر فقرے کی پشت پر توکلت علی اللہ کے بعد غور کیجئے۔ آپ کو محسوس
ہوگا۔ کہ یوں کہا جا رہا ہے۔ کہ میں نے اس پر توکل اس لیے کیا ہے۔ کہ وہ مجھے
چھوڑے گا نہیں۔ ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اس لیے تم
کو مجھ پر غلبہ نہ دے گا۔ کیونکہ تمہاری چوٹیاں اس کے قبضے میں ہیں۔ تم اسکی مشیت
کے بغیر حرکت بھی نہیں کر سکتے ہو۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے۔ صراط مستقیم پر ہونے کی وجہ
سے حکمت پر مبنی کرتا ہے۔ اگر بالفرض تمہیں مجھ پر قابو بھی دے دے۔ تو یہ بھی
اس کی شان حکیمانہ ہے۔ اس کی بارگاہ میں ظلم اور عبث کی باریابی نہیں ہے۔

(۶۶) حضرت ہودؑ کا آخری پیغام

اگر تم روگردانی کرو گے۔ تو جو پیغام مجھے دے کر تمہاری طرف روانہ کیا گیا ہے۔ وہ میں نے
تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو دے دے گا۔ اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ
سکو گے۔ میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔ یعنی ایسی صاف اور کھری باتیں سن کر بھی نہ مانو گے تو اب میرا
کچھ نقصان نہیں ہے۔ میں فرض تبلیغ پوری طرح ادا کر چکا ہوں۔ تم اپنی فکر کر لو۔ ضروری ہے کہ اس
قسم کی ہٹ دھرمی اور تعصب و عناد پر آسمان سے عذاب آئے جو تم کو ہلاک کر ڈالے۔ اللہ سبحانہ، کی
زمین تمہاری بربادی سے ویران نہ ہوگی۔ وہ دوسرے لوگوں کو تمہارے اموال وغیرہ کا وارث بنا دے
گا۔ تمہارا قصہ ختم کر دینے سے یاد رکھو۔ اللہ کا یا اس کے پیغمبر کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کا ملک خراب
ہوتا ہے۔ جب وہ ہر چیز کا محافظ و نگہبان ہے۔ تو ہر قابل حفاظت چیز کی حفاظت کے سامان اپنی
قدرت کاملہ سے کر دے گا۔[1]

یہ حضرت ہود علیہ السلام نے خدا کا آخری پیغام پہنچایا۔ اب وہ وقت آگیا کہ اس عظیم الشان
قوم کو جس نے اپنے زور قوت سے دنیا کو ہلا دیا آخری دعوت دی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن میں اس رکوع میں ان کی تباہی کا اہم اور بنیادی سبب ناخدا شناسی اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت اور معبودان باطل کی پرستش ہے۔ یہاں حضرت ہود علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ اگر تم اسی اعراض کی روش پر اڑے رہے تو اب نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ کیونکہ مجھے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے۔ وہ تمہیں واضح طور پر پہنچا چکا ہوں۔ اب آگے مرحلہ یہ ہے کہ میرا رب تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اقتدار دے گا۔ اور تمہاری بربادی سے اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ وہ ہر چیز کا نگران ہے۔ جس کو بچانا ہوگا بچا لے گا۔ ان آیات میں ان کی تباہی کے اسباب میں سے صرف اللہ سے عابدانہ تعلق کو توڑ کر غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات وابستہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قرآن ہی میں دو سبب اور بھی بتائے ہیں۔

(۱) غرور و قوت: عاد کو اپنی قوت پر بڑا ناز تھا۔ اور اسی طرح ہر قوم جو مجد و تفوق پر قابض ہوتی ہے اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں اپنی قوت پر مغرور رہتی ہے۔ متکبرین عاد نے کہا: کہ اے ہود علیہ السلام ہمیں کس سے ڈراتے ہو۔ من اشد منا قوۃ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا تمہاری قوت مسلم لیکن اگر اصلاح و تقویٰ کی دعوت قبول کرو گے تو یزدکم قوۃ الی قوتکم لیکن وہ نہ سمجھے۔ ان کو نہ صرف اپنی فوجی اور سیاسی قوت پر ناز تھا بلکہ اپنی افرادی طاقت اور مویشیوں کی بہتات پر اور اپنے باغوں کی کثرت پر بھی ناز تھا۔ جو اس زمانہ کی سب سے بڑی دولت تھی۔

(۲) ظلم و جور: قوم کی حاکمانہ زندگی کا سب سے زیادہ زہر قاتل ظلم اور جور و ستم ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ اس دعویٰ پر بہترین شاہد ہے۔ عاد اپنے مملوکہ ممالک میں اکڑتے پھرتے تھے۔ بغیر کسی استحقاق کے قوموں کو چھیڑ چھیڑ فنا کرتے رہے ہیں۔

عاد اور قوم عاد کی تاریخی حیثیت

یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو محض ایک فرضی نام اور مذہبی افسانہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مستشرق قولا لکی نے جو یورپ کی سرزمین میں مشرقیات اور تاریخ کا سب سے بڑا فاضل مانا جاتا ہے۔ عاد اور عمالقہ کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں ثابت کیا ہے۔ کہ یہ غیر تاریخی قوم ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی ریسرچ نہیں قدیم زمانہ میں بھی بعض ایرانیوں کو ان کے وجود سے انکار تھا۔ چنانچہ حافظ ابن جریر طبریؒ نے جو مشہور مورخ ہیں۔ عاد کے حالات میں لکھا ہے بعض ایرانیوں نے عاد کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ اشعار جاہلیت میں ان کا نہایت

کثرت سے تذکرہ ہے ۔ اگر خوف تطویل نہ ہوتا تو میں ان کو ضرور نقل کرتا ۔

لیکن یہ ایک نہایت فاش غلطی ہے ۔ عاد و ثمود کے واقعات عرب کے مشہور ترین واقعات ہیں ۔ جن کا علم خود ان کو ذاتی طور پر حاصل تھا ۔ کیونکہ عاد و ثمود کی آبادیاں خود ان کے ملک کی آبادیاں تھیں ۔ اور ان کے حالات واقعات خاندانی طور پر ان میں نقل ہوتے چلے آتے تھے ۔ مشہور مؤرخ ابن ہشام کلبی نے جس کا مخصوص موضوع عرب جاہلیت کی تاریخ درروایت ہے ۔ ان کے حالات میں تین مستقل کتابیں لکھی ہیں ۔ پہلی کتاب کا نام "تفرق عاد" یعنی عاد کی قوم عرب سے نکل کر کہاں کہاں گئی ۔ اور دوسری کتاب کا نام کتاب من نقل من عاد و ثمود والعمالیق وجرھم و بنی اسرائیل ہے ۔ تیسری کتاب کا نام ہے کتاب عاد الاولی والثانیہ یعنی عاد اولی اور عاد ثانیہ کے حالات ۔

بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں جنوبی عرب کے قبائل میں عادریٹیا اور عاد ائٹ کا ذکر کیا ہے ظاہر ہے کہ پہلا نام عادارم اور دوسرا عاد ہے جس کو یونانی تلفظ نے یہ صورت دے دی ہے ۔ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا ۔ اس لیے عاد کا وجود اس زمانہ تک مسلّم ہے ۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن مصر کے گورنر تھے ۔ انہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ حصن غراب پر ایک کتبہ پایا تھا ۔ یہ کتبہ علامہ نویری نے اپنی کتاب مسالک الابصار میں نقل کیا ہے ۔ ۱۸۴۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن بھیجا تھا ۔ اس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا ۔ یہ کتبہ فارسٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق قوم عاد کا ہے ۔ اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں سے ہے ۔ جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس پہلے ہے ۔ یہ کتبہ ایک منہدم عمارت میں پتھر پر کندہ تھا ۔ ایک انگریز افسر جس کا نام ولٹڈ تھا ۔ اس کا مکتشف تھا ۔ اور یہ سب سے پہلا عربی کتبہ ہے جو یورپ نے عرب کی سرزمین میں دریافت کیا ۔ اصل کتبہ اور اس کا حل اولا ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا تھا ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا پورا ترجمہ عاد ثانیہ کی تحقیق میں اپنی مشہور کتاب ارض القرآن میں درج کردیا ہے ۔ جو پیش خدمت ہے ۔

> ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے ۔ اور ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی ۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی زور سے آتا تھا ۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضبناک ہوکر ٹکریں مارتا تھا ۔ ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے ۔ بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغباں خشک چھوہارے ہماری وادیوں

کے چھوہاروں کی زمینوں میں لگاتے تھے ۔ اور خشک چاول بوتے تھے ۔ ہم پہاڑی بکروں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار پنجروں اور جالوں سے کرتے تھے ۔ اور مچھلیوں کو بہلا کر باہر نکال لیا کرتے تھے ۔ اور ہم آہستہ آہستہ خراماں خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامہ پہن کر چلتے تھے ۔ اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے ۔ ہود علیہ السلام کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے ۔ ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے ۔ قیامت کے راز اور فتنوں کے راز پر ایمان رکھتے ہیں ۔ رہزن دشمن گھس آتے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو پریہ ڈال دیا اور ہمارے کریم نوجوان سخت اور نوکدار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے ۔ ہمارے خاندان کے مغرور بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں ۔ اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے ۔ ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں ۔ اور چھید رہی تھیں ۔ یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوع انسان میں سے تھے ۔

یہ کتبہ متعدد حیثیتوں سے قرآن عظیم کی تائید کرتا ہے ۔ اول یہ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی تاریخی شخصیت ثابت ہے ۔ دوسرے یہ کہ بقایائے عاد صرف متبعین ہود تھے ۔ تیسرے یہ کہ عاد ذات العماد اور عمارتوں کے بانی تھے ۔ چوتھے یہ کہ وہ حقیقتاً جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے ۔ بڑے بڑے باغ اور چشمے آل اولاد اور چوپایوں والے تھے ۔

بہرحال عاد کا انکار تاریخ کی ایک مسلّمہ حقیقت کا انکار ہے ۔ تاریخ اور اکتشافات عصریہ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے ۔ کہ عرب کے باشندے ایک کثیر التعداد اور باعظمت و جبروت قوم تھی ۔ جن کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پہلے ہے ۔ عرب مؤرخین ان کو عرب عاربہ یعنی خالص عرب کہتے ہیں ۔ یہ بہت سے قبائل تھے ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ان میں سے حسب ذیل بارہ قبائل نام بنام گنائے ہیں ۔

(۱) عاد (۲) ثمود (۳) جرہم (۴) طسم (۵) جدیس (۶) امیم (۷) مدین (۸) عملاق (۹) وعبیل (۱۰) جاسم (۱۱) قحطان (۱۲) بنو یقطن

ان قبائل کو امم بائدہ بھی کہا جاتا ہے ۔ یعنی برباد شدہ قومیں ۔ ان میں سے عاد ، ثمود ، جرہم ،

لمیان، طسم، جدیس وغیرہ مشہور قبائل ہیں ۔ اور اشعار جاہلیت میں ان کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ قبیلہ عاد کی ان قبائل میں سب سے زیادہ کثیر الافراد باعظمت جماعت تھی۔ جو تمام عرب بائدہ میں شوکت و جبروت کے اعتبار سے ممتاز تھی۔ یہی قوم دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اسی کی دستکاری کا نتیجہ ہیں۔ ذرا اس پر غور فرمایئے۔ کہ

(۱) جیمز منٹگمری نے اپنی کتاب عرب اور بائیبل میں بتایا ہے۔ کہ عہد قدم میں عرب میں نسبتاً وافر پانی موجود تھا۔ وادیاں اور سرسبز قطعات تھے۔ احقاف میں جہاں آجکل زندگی بسر کرنا محال ہے آبادیوں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ جو کسی قوم کے نقش پا کی غمازی کرتے ہیں۔ عاد اسی زمانہ کی قوم ہے۔

(۲) آر۔ بی دوگرٹی اپنی کتاب عرب کی سمندری زمین میں لکھتا ہے کہ عرب عہد شادابی سے گزر چکا ہے۔ یہاں کئی تہذیبیں دفن ہیں آشوری کتبات میں ریگ زار عرب کی ایک قوم عادرامات ارمت عاد کا ذکر ہے

(۳) عصر حاضر میں مشرقی عرب اور خلیج فارس کی ریاستوں میں علمائے اثریات نے کام کیا ہے۔ اس کے نتائج جیفری بی بی نے اپنی کتاب میں پیش کئے ہیں۔ کہ دنیا میں قدیم ترین سمیری تہذیب کا مرکز عراق نہیں بلکہ عرب تھا۔ عہد قدیم میں عرب میں پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ جھیلیں جو کہ اب خشک ہو چکی ہیں۔ موجود تھیں۔ ان کے قرب وجوار میں برابر آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں۔

(۴) علماء کو جنوبی عرب کے آثار تک پوری دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ جو محدود کام ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عرب کا جنوبی حصہ اقوام و ملل کا گہوارہ رہا ہے۔ برائیڈی کی کتاب جنوبی عرب ۱۹۷۱ء میں کھنڈر اصنام کتبات قدیمہ اور ان کے نتائج پیش کئے گئے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنوبی عرب ملل قدیمہ کا مولد و مسکن ہے۔

(۵) ڈاکٹر فلپ ہٹی تاریخ ملت عربی میں لکھتا ہے۔ ملک عرب کی وجہ سے کبھی ناقابل سکونت نہیں رہا۔ اس کی گہری وادیاں جو اب خشک پڑی ہیں۔ شہادت دیتی ہیں کہ بارش کا پانی جو ایک زمانہ میں ان کے اندر سے بہتا تھا۔ کٹاؤ ڈالنے کی کیسی قوت رکھتا ہے۔ پھر لکھتا ہے۔ حضرموت کی سرزمین پر گہری وادیاں نمایاں ہیں۔ اور ان میں زیر زمین پانی کی کچھ کمی نہیں ہے۔ عاد کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ قوم عاد کی نسبت قیاس ہے۔ کہ وہ قدیم حضرموت پھلی پھولی ہیں۔

(۶) سمیری کتبات میں ادا ہمارا آقا

ادا شہزادہ

ادا بادشاہ

کا تکرار ہے۔ نوحا کریمر ماہر سمیریات لکھتا ہے کہ لفظ ادا ایک معما ہے اس سے پہلے کچھ ترمیم کے ساتھ اس کا ترجمہ باپ کیا جاتا رہا۔ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ جب تک یہ معما حل نہ ہوا سے ترجمہ کے بغیر رہنے دیا جائے ۔ اس معمے کا حل تورات میں موجود ہے ۔عرب کے اہل خیام کا ذکر ان الفاظ میں ہے:' عادہ سے یابل پیدا ہوا ۔ وہ ان کا باپ ہے ۔جو خیموں میں رہتے اور مویشی پالتے ہیں۔ تکوین ۲۰: ۴ عرب کی امم بائدہ کا نسل عاد سے تعلق واضح ہے ۔

(۷) اکادی تہذیب عرب سے نکل کر عراق میں پھیلی ۔اکاد کون تھے ۔ اکاد دراصل اخا عاد ہے ۔ گویا اکاد عاد ثانیہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ (۱) سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے ۔ کہ

> یمن وحضرموت کے حدود کے ساحل سمندر پر ایک مشہور شہر واقع ہے ۔ اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے ۔ لفظ عدن کی حقیقت پر غور کیجئے ۔ عہد قدیم میں عموما سامی مذاق یہ رہا ہے ۔ کہ شہر کا نام بعینہ بانیٔ شہر کے نام نام پر رکھتے تھے ۔ عرب کے شہر راقیم ، سبا، حضرموت، عمان، مدین ، تیما ، وغیرہ اس قسم کے نام ہیں ۔ اس بنا پر اگر یمن کے قدیم شہر عدن کو جس کے قرب میں وہ تمام عمارات واقع ہیں ۔جن کو عرب عادیات کہتے ہیں ، اور تاریخ جس کے قرب میں قوم کی آبادی کا نشان بتاتی ہے ۔عادیین کا مخفف قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہے ۔ فارسٹر عدن کو عدنان سے متعلق بتاتا ہے ۔ حالانکہ عدنان کو یمن سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۱۲

وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَ
تِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا
اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ
قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

ع ۱۱

اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ہم نے حضرت ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ نعمت ایمان سے مالا مال تھے۔ اپنی رحمت سے بچا لیا اور ان کو ایسے عذاب سے بچایا جو بڑا ہی سخت تھا[۷۷] یہ داستان ہے۔ اس قوم عاد کی جس نے اپنے رب کی نشانیاں سرکشی اور ہٹ دھرمی سے جھٹلائیں۔ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی[۷۸] اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت پڑی اور قیامت کے دن بھی۔ دیکھو قوم عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اور سن لو کہ عاد، قوم ہود کیلئے رحمت سے دوری اور پھٹکار ہے۔[۷۹]

قوم عاد پرستش اور بندگی میں شرک کرتی تھی

اللہ سبحانہٗ کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان اللہ سبحانہٗ کے محبوب ہونے کی ہے۔ اس شان کے تقاضے میں ساری کائنات اللہ سے محبت کرتی ہے۔ ساری کائنات کی محبت تسخیری ہے۔ جبکہ انسانوں کی محبت اللہ سبحانہٗ سے تسخیری نہیں بلکہ ارادی و اختیاری ہے۔ یہ اس کی محبت ہی کا تقاضا ہے۔ کہ اسے خلوت و جلوت میں بلکہ ہمہ اوقات یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے شب بیداری کی جاتی ہے۔ ہر قسم کی جسمانی مشقت برداشت کی جاتی ہے۔ دعا ، الحاح گریہ وزاری اسی کی محبت میں کی جاتی ہے۔ محبت کی بنیاد پر جس قدر اعمال کیئے جاتے ہیں۔ اسی کا نام پرستش ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی دوسری حاکمیت ہے۔ یعنی ساری کائنات اللہ کی محکوم ہے۔ پوری کائنات کی محکومی تسخیری ہے۔ مگر انسانوں کی محکومی تسخیری نہیں۔ بلکہ ارادی و اختیاری ہے۔ اسی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جاتی ہے انفرادی زندگی میں اور اجتماعی زندگی میں۔ اور پھر اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں یعنی عائلی، معاشرتی، سیاسی اور قانونی نظام میں اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی کا نام بندگی ہے۔ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو عربی میں عبادت کہتے ہیں۔ پیچھے پڑھ آئے ہو۔ کہ قوم عاد نے پرستش کے لیے ہیکل، اور بندگی کے لیے بیت الحکومت دو الگ ادارے قائم کر رکھے تھے۔ پہلی آیات میں اللہ سے الگ ہو کر پرستش میں ان کے باغیانہ تعلقات کا ذکر تھا۔ اور ان آیات میں بندگی میں ان کی ناخداشناسی اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کا ذکر ہے۔ اور یہ بات اشارتاً نہیں بلکہ صراحت کی پوری قوت سے بتائی جا رہی ہے۔ واتبعوا امر کل جبار عنید۔

(۶۸) اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ہم نے حضرت ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ نعمت ایمان سے ہمدوش ہوئے تھے۔ اپنی رحمت سے بچالیا۔ اور ان کو ایسے عذاب سے بچا لیا۔ جو بڑا ہی سخت تھا۔ یعنی سات رات اور آٹھ روز مسلسل آندھی کا طوفان آیا جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مکان گر گئے، چھتیں اُڑ گئیں۔ درخت جڑ سے اکھڑ کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ ہوا ایسی سموم تھی کہ آدمیوں کی ناک میں داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور جسم کو پارہ پارہ کر ڈالتی۔ اس ہولناک عذاب سے ہم نے حضرت ہودؑ اور انکے ساتھیوں کو جو آخر میں چار ہزار تک پہنچ گئے تھے۔ اور ایمان و عمل صالح کی بدولت آخرت کے بھاری عذاب سے بھی نجات دی۔[۱]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ سارا کام ایک ہی دن، ایک ہفتہ، یا ایک ماہ، یا ایک سال میں ہو گیا۔ نہیں بلکہ حضرت ہود علیہ السلام نے ایک عرصہ دراز تک محنت کی، ہیکل والوں کو اور بیت الحکومت والوں کو دعوت پیش کی۔ اور اس دعوت کے نتیجے میں اہل ایمان کی ایک جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ پہلے صرف ہود علیہ السلام تھے۔ اب ان کے ساتھ اہل ایمان کی ایک جماعت بھی تھی۔ ان کے ساتھ ہیکل والوں اور بیت الحکومت کا جو طرز عمل ہو گا۔ جو مادہ پرست کا اہل حق کے ساتھ ہو گا۔ سب پیغمبروں کی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی پکار ایک تھی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے، مزدوری کی کوئی طلب نہیں ہے۔ ہمارے سامنے علم ویقین ہے۔ ہم تمہیں افترائی زندگی سے بچانا چاہتے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ جواب میں سب نے انکار کیا۔ سب نے دعوت کا مذاق اُڑایا۔ سرکشی اور گھمنڈ کی راہ پر چلے۔ جبر و تشدد سے راستہ روکنا چاہا۔ ماننا والوں نے مانا۔ وہ تھوڑے سے تھے۔ بالآخر ساری کشمکش کے بعد نتیجہ بھی وہ نکلا جو ہمیشہ نکلا کرتا ہے۔ آخر وہ وقت آگیا جب سنت الٰہی نے اپنی زمین کے لیے ایک دوسری قوم کا انتخاب کرلیا۔ اور اس شریر قوم کو احقاف سے باہر تلوار سے اور احقاف کے اندر ہوا اور ریگ کے طوفان کے ذریعے برباد کر دیا۔ یہ سب اس کے ہتھیار ہیں۔ اس کا حکم انسانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی کام کرتا ہے۔ جس طرح ہوا پانی اور آگ میں۔ اور ملکوں میں پانی کا دریا ہے۔ جس میں کبھی کبھی طوفان آتا ہے عرب اور افریقہ میں ریگستان کا دریا ہے۔ کوسوں تک ریگستان ہے۔ احقاف وہ عظیم الشان ریگستان ہے۔ جو سینکڑوں میل تک وسیع ہے۔ اور اب اس کو الربع الخالی کہتے ہیں۔ اس میں جب تیز ہوا چلتی ہے۔ زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ ریگ کے پہاڑ کے پہاڑ ہوا پر اُڑتے ہیں۔ اور جہاں وہ تھمتے ہیں۔ اس کو دبا کر دفن کر دیتے ہیں۔ قافلے کا قافلہ گاؤں کا گاؤں اس کے نیچے دب کر موت سے پہلے مدفون ہو جاتے ہیں۔ پھر اتفاق سے وہاں سے ریت ہٹتی ہے۔ تو ہڈیوں کا ایک قلعہ نظر آتا ہے۔ ایک انگریز سیاح جس نے اس طوفان سموم کا عرب میں نمونہ دیکھا ہے۔ اس کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے۔

> "دوپہر تھی جنوب کی طرف سے دفعتہً جھونکے آنے لگے۔ ہوا کی تیزی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ میرے عرب رفیق نے چہرے کو کپڑے لپیٹ لیا۔ اور اونٹوں کو مار مار کر تیز کرنے لگے۔ لیکن اونٹ بار بار بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے رفیقوں سے واقعہ دریافت کیا۔ انہوں نے نہایت گھبراہٹ کے ساتھ کہا تو صرف اتنا کہ سامنے

کے خیمے میں اگر پہنچ گئے تو جان بچ جائے گی۔ اسی اثنا میں ہوا اور تیز و تند ہو گئی۔ گرمی کی یہ شدت ہو گئی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان سے دوزخ اتر آئی ہے۔ بالآخر کوشش کر کے ہم خیمے تک پہنچے وہاں ایک عورت منہ لپیٹے پڑی تھی۔ ہمارے اُونٹ ہوا کے رُخ سے منہ پھیر کر ناک کو ریت میں گاڑ کر شتر مرغ کی طرح گر پڑے ہم بھی خیمے میں جا کر منہ لپیٹ کر اوندھے پڑ گئے تاریکی اتنی شدید تھی کہ رات معلوم ہوتی تھی۔ دس منٹ تک یہی حالت رہی۔ پھر ہوا اور گرمی میں تخفیف ہوئی۔ جب ہم اُٹھے تو ہمارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ (ارض القرآن)

یہ اس طوفانی ہوا کی بات ہے۔ جو طبعی طور پر چلتی ہے۔ لیکن جو ہوا کا طوفان لما جاء امرنا کے مطابق طبعی نہیں بلکہ امری تھا۔ یعنی ہمارے حکم کے تحت آیا تھا۔ اور مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن لگا تار آتا رہا اس کا کیا حال تھا۔ اس کی جو تفصیل قرآن حکیم کے دوسرے مقامات پر آئی یہ ہے کہ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر گر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں۔ (الحاقہ) جس چیز پر سے یہ ہوا گزر گئی۔ اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ الزاریات۔ جس وقت یہ ہوا آرہی تھی اس وقت قوم عاد خوشیاں منا رہی تھی۔ کہ بادل خوب اٹھا ہے۔ بارش ضرور ہوگی۔ بارش گھر آئی اور اس طرح آئی کہ پورے علاقے کی تباہی لے کر آئی۔ کہ پوری انسانی تاریخ میں قوم عاد تباہی کے لیے ضرب المثل بن کر رہ گئی۔

جاء امرنا کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس اضافہ کے ساتھ کہ برحمۃ منا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب ایسا تھا کہ لوگ مر مر کر گر رہے تھے۔ ہوا جہاں سے گزر جاتی تباہی کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ سوچنے کی بات ہے۔ کہ اس طوفانی بلا سے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی کیسے بچے، اس کی ایک ہی صورت ہے۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کر لی ہو مگر اس کی صراحت کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ چونکہ اسی طوفانی مقام پر رکھ کر حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچایا اس لیے برحمۃ منا کا اضافہ کیا اور بتایا کہ عذاب جو پورے علاقہ پر آیا تھا۔ اس سے حضرت ہود علیہ السلام اور اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت سے بچایا اور یہ عنایت خداوندی کا عظیم کرشمہ ہے۔ اور یہ اضافہ ونجیناھم من عذاب غلیظ۔ یہ سمجھانے کے لئے کیا ہے۔ کہ ان کو کسی معمولی عذاب سے نہیں بلکہ سخت ترین عذاب سے بچایا ہے۔ جس نے پوری قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ کہہ کر اگر

ایک طرف عذاب کی ہولناکی کو بتا دیا تو دوسری طرف اس عظیم رحمت کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ جس کے ذریعے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اللہ سبحانہٗ نے اسباب سے بالآخر ہو کر بچایا۔

(۶۹) قوم عاد جبابرہ کی پیروکار تھی

یہ داستان ہے اس قوم عاد کی جس نے اپنے رب کی نشانیاں سرکشی اور ہٹ دھرمی سے جھٹلائیں اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کی پیروی کی۔ یعنی ان کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھو کہ یہ وہ قوم عاد تھی جن کے بڑوں نے بڑے طمطراق سے اپنے پروردگار کی باتوں کا مقابلہ کیا۔ اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور چھوٹوں نے بڑے شیطانوں کی پیروی کی آخر دونوں تباہ و برباد ہو گئے[1]

اس آیت میں قوم عاد کے تین جرائم بتائے گئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ وہ رب کی نشانیوں کے لیے کفر و جحود کر رہے تھے۔ یعنی جان بوجھ کر اور محض ہٹ دھرمی اور شرارت سے انکار کر رہے تھے۔ یعنی انہوں نے دیدہ دانستہ راہِ کفر اختیار کی۔ سنگین انکار کو جحود کہتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کے ان معجزات کا جو ان کو اللہ کی جانب سے ملے تھے۔ اس طرح انکار کر دیا۔ جیسے واقعات اور مشاہدات کا انکار کیا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا جرم یہ بتایا کہ انہوں نے اللہ سبحانہٗ کے رسول کی نافرمانی کی۔ یہ بات کہ رسول تو قوم عاد میں صرف حضرت ہود علیہ السلام آئے۔ پھر جمع کی تعبیر کیوں ہے۔ اس لیے کہ ان کی تعلیم سب رسولوں کی تعلیم تھی۔ لہذا ایک کی نافرمانی سب رسولوں کی نافرمانی ہے۔ جیسے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔ گویا اعتبار علت فعل کا ہے۔ نہ کہ فعل کا۔ یعنی جس علت کی وجہ سے انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اس کی موجودگی میں کسی رسول کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ ہوتا۔ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

> رسلہٗ شاید اس لیے فرمایا کہ ایک کی تکذیب سب پیغمبروں کی تکذیب ہے کیونکہ توحید وغیرہ اصول میں سب متفق ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔

یہ تاویل رسلہٗ کی شیخ الاسلام نے کی ہے۔ یہی تاویل دوسرے شارحین قرآن نے بھی کی ہے۔ شاید یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تاویل اس مشہور عام کی وجہ سے کی گئی ہے۔ کہ قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام کے سوا اور کوئی رسول نہیں آیا۔ حالانکہ یہ بات صراحتاً قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے یہ بات صراحتاً بتائی ہے کہ قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں بہت رسول آئے ہیں۔ اور سب کی منادی یہ تھی۔ کہ ان لا تعبدوا الا اللہ۔

اذجاءتھم الرسل من بین ایدیھم ومن خلفھم

ان کے اگاڑی اور پچھاڑی رسول آئے۔

یہ تو قوم کے تذکرے ہیں۔ بہت سے رسولوں کی روانگی کی صراحت دوسری جگہ احقاف میں خاص حضرت ہود علیہ السلام کے تذکرے میں ہے۔

اذانذر قومہ بالاحقاف وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ ان لا تعبدوا الا اللہ۔

جب ہود علیہ السلام نے احقاف میں اپنی قوم کو ڈرایا۔ حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے اور ان کے بعد بہت رسول گزرے کہ لوگو : نہ عبادت کرو اللہ کے سوا۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔ کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کے شہروں کے اردگرد رسول روانہ کیے ہیں۔

قرآن کی ان تصریحات کی موجودگی میں اس تاویل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ کہ ایک کی تکذیب چونکہ سب کی تکذیب ہے۔ اس لیے جمع لے کر آئے ہیں۔ بہت ڈرانے والے آئے انہوں نے سب کی تکذیب کی ہے۔ یہاں جمع مکسر ہے۔ دوسرے موقعہ پر جمع سالم آئی ہے۔ کذب عاد المرسلین۔ قرآن کی تصریح کے مطابق قوم عاد میں بہت رسول آئے ہیں۔ بہت ڈرانے والے آئے انہوں نے سب کی تکذیب کی ہے۔ عذاب کا حادثہ چونکہ حضرت ہود علیہ السلام کے زمانہ دعوت میں پیش آیا ہے اس لیے زعیم انبیاء کی حیثیت سے ان کا نام آیا ہے۔

(س) تیسرا جرم ان کا یہ بتایا گیا ہے۔ کہ انہوں نے سرکشوں اور متکبرین کے احکام کی پیروی کی اشارہ کر دیا کہ قوم عاد پر ظالم اور سرکش بادشاہ حکمرانی کرتے تھے۔ اور فراعنہ مصر کی طرح اپنی بندگی کراتے تھے۔ فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کا کہا نہ مانا اور سرکش وظالم حکمرانوں کا کہا مانا یعنی جو حق وعدالت کی طرف بلاتے تھے۔ ان سے تو منکر ہوئے اور جو ظلم و سرکشی کرتے تھے ان کے پیچھے چلتے تھے۔ اس سے پہلی آیات میں ہے کہ قوم عاد نے پرستش میں اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات توڑ کر

ارواح، اجسام، آثار سے قائم کرلیئے تھے۔ اس آیت میں بتایا کہ قوم عاد نے بندگی میں اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات یہ ہیں۔ کہ رسول کی اتباع کی جائے۔ اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں اللہ کا نائب سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے۔ اور رسول کے مقابلے میں جو اپنی اطاعت اور اتباع کی دعوت دے وہ اپنے دور کا طاغوت ہے۔ اس کا کفر اس سے روگردانی عین ایمان ہے۔ یہ پہلے سُن آئے ہو کہ جیسے پرستش میں شرک غلط ہے۔ ایسے ہی بندگی میں بھی شرک غلط ہے۔ بندگی میں شرک چونکہ اطاعت و اتباع کے لیے ہے۔ اللہ کے رسول کی اتباع وا طاعت چھوڑ کر فراعنہ، نمار دہ کے ذریعے قانونی، سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی میں ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن اس کے لیے مشاقہ اور محادرہ کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔

پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو عبادت کہتے ہیں۔ نبوّت جب اعلان کرتی ہے۔ یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ۔ تو وہ لوگوں سے جیسے یہ کہتی ہے۔ کہ لوگو! اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے۔ ایسے ہی وہ یہ بھی کہتی ہے۔ کہ لوگو! اللہ کے سوا بندگی کسی کی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں۔ پرستش کی حدود میں مشرک قومیں جو اپنے معبودوں سے دعاؤں اور طلبگاریوں میں مانگتی تھیں۔ وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً بارش برسائی جائے۔ مویشیوں کا دودھ اور نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداوار میں برکت آفتوں سے محفوظ رکھ کر باغوں کو پھلوں سے بھر دیا جائے۔ قحط کو دُور کیا جائے۔ اور وباؤں سے محفوظ رکھا جائے۔ اقبال مند اولاد بخشی جائے۔ دشمنوں پر فتح ہو۔ غیر اللہ کی پرستش دعا، عبادت و نذرو قربانی سے عموماً اسی قسم کی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اور غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو پوجتے تھے ان کی غرض یہی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اس مسلک کے جو پابند ہیں۔ ان کی غرض یہی ہوتی ہے۔ اور بندگی کی حدود میں ارباب اقتدار کو الٰہ بنانے والوں کا مقصد ان کے ذریعے جاہ واقتدار حاصل کرنا، عہدے اور مناصب کے لیے تگ ودو، متنازعات کا فیصلہ کرانا، مالیاتی مسائل اور فوجداری معاملات کو حل کرانا یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل بندگی میں شرک کرنے والوں کا پیش نہاد ہوتا ہے۔ نہ پرستش میں شرک کرنے والا اپنے الٰہ سے جنت مانگتا ہے۔ اور نہ بندگی میں شرک کرنے والے اپنے الٰہوں سے جنت مانگتے ہیں۔ کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ قبر پر کھڑے ہو کر یہ درخواست کرتا ہو۔ کہ اسے عذاب قبر سے بچایا جائے۔ حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی دی جائے۔

یہ صرف راہ نبوت ہے۔ جو بتاتی ہے کہ مالیاتی مسائل اور فوجداری مقدمات کا اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کراؤ اور جبار وعنید کی اتباع نہ کرو بلکہ اللہ کے رسول کی پیروی کرو اور اس کی اطاعت کرو۔ اور پرستش میں شرک کرنے والوں کو بتاتی ہے۔ کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے تم نے اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھے ہیں۔ ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے اللہ کو الٰہ بناؤ اور سب کچھ اس سے مانگو۔

اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ سبحانہٗ ہی ہے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا فریضہ متعین کرنے، اس کے معاملے کا فیصلہ کرنے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو جس کی رضا چاہی جائے کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے سامنے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں۔ اعتراف نعمت کیا جائے، کوئی اور نہیں جسے والی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے، کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف رکھا جائے۔ جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو۔ نہ شخص نہ جماعت اور نہ خواص نہ عوام کوئی نہیں جو بال برابر بھی کسی کو بھی نفع یا نقصان پہنچا سکے جو کسی کے لیے قانون بنانے اور حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

یہ راہ نبوت ہے قوم عاد اس راہ سے بھٹک گئی تھی۔ اور ان کا علم اس موضوع پر گمراہیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی علم کی تصحیح کے لیے تشریف لائے تھے۔ مگر انہوں نے علم کی تصحیح کی ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لے کر حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی۔

(۷۰) عاد کی بدکرداری کا نتیجہ

اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت پڑ گئی اور قیامت کے دن بھی۔ دیکھو قوم عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اور سن لو کہ عاد قوم ہود رحمت سے دور ہے۔ یعنی خدا کی لعنت دنیا میں ان کے پیچھے لگا دی گئی کہ جہاں جائیں ساتھ جائے اور قیامت کے بعد بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ لعنت کا طوق ان کے گلے میں پڑا رہے گا اور یہ جو فرمایا الا بعدا لعاد قوم ھود۔ تو بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قیامت

کے دن یوں پکارا جائے گا۔ الا ان عادا کفروا ربھم ۔ عاد کے ساتھ قوم ہود کا لفظ یا تو اس لیے بڑھایا کہ دونوں کا تصور سننے والے کے ذہن میں ساتھ ساتھ آئے یعنی ہود علیہ السلام کا کیا حال ہوا اور یہ اسی کی قوم تھی جس کا حشر یہ ہوا۔ اور ممکن ہے کہ اس پر متنبہ کرنا ہو۔ کہ عاد دو ہیں۔ عاد اولیٰ عاد اخریٰ ۔ اسی لیے ایک جگہ فرمایا۔ اھلک عادا الاولیٰ ۔ یہاں عاد اولیٰ مراد ہے۔ جس کی طرف ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ واللہ اعلم [۱] ابن زید نے تصریح کی ہے۔ کہ ان کو عاد اولیٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے بعد پہلی ہلاک ہونے والی قوم یہی ہے۔ اور صالحین قوم ہود علیہ السلام جنہوں نے ایمان کی بدولت نجات پائی تھی۔ اور ان کی اولاد عاد ثانیہ کہلاتی ہے۔ اور بات بھی خود بخود سمجھ میں آرہی ہے۔ کہ عذاب سے نجات پانے والوں کا عاد ثانیہ نام ہے۔ بچنے والے کون تھے۔ نجینا ھودا والذین اٰمنوا معہٗ ۔ حیرت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر عزیزی میں دو عاد بنا ڈالے ایک تو عاد بن عوص ابن ارم ابن سام ابن نوح۔ دوسرا ایک اور عاد جو کسی اور شخص کی اولاد ہے۔ قرآن میں عاد کا واقعہ تکرار کے ساتھ اسی دوسرے عاد کا ہے۔ اور پہلے عاد کا قصہ قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک احقاف میں اور دوسرا سورۂ نجم میں۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کا یہ خیال چونکہ عام مفسرین اور مؤرخین کی تصریح کے خلاف ہے۔ اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہود علیہ السلام عاد اولیٰ میں مبعوث ہوئے ہیں۔ اور جہاں بھی عاد کا ذکر آیا ہے۔ اس سے عاد اولیٰ مراد ہے۔ سورۂ احقاف میں عاد کا ہی واقعہ ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو روانہ کیا[۱] انھوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا: اسے میری قوم کے لوگو! اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اللہ نے تمہیں زمین سے نشوونما دی ہے۔ اور پھر اسی نے تمہیں زمین میں بسایا ہے۔[۱] لہذا تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف رجوع کرو۔ یقین کرو میرا پروردگار ہر ایک کے پاس ہے اور ہر ایک کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔[۲] لوگوں نے

کہا! اے صالح علیہ السلام پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اس بات سے روکتا ہے۔ کہ ہم ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے۔ جس کی طرف تم ہمیں دعوت دے رہے ہو۔ ہمارے دل میں بڑا خلجان ہے[۳]
حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: کہ اے میری قوم تم نے اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی رحمت عطا فرمائی ہو۔ تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں تو تم مجھے تباہی کے سوا کوئی فائدہ نہیں دے رہے ہو[۴]

انسان کی پیدائش اور اس کی آبادکاری

آیت میں موقعہ استدلال میں دو لفظ آئے ہیں۔ ایک انشار، دوسرے استعمار۔ انشار تخلیق سے الگ ہے۔ خلق کے معنے پیدا کرنا ہیں جیسے ربکم الذی خلقکم۔ انشار کے معنے صرف پیدا کرنا نہیں بلکہ بڑھانا اور نشوونما دینا۔ اسی لیے یہ لفظ باغات، نباتات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنے تو یہی ہیں جیسا کہ عام شارحین قرآن نے بتائے ہیں۔ کہ زمین سے غذائیں پیدا کیں۔ جن سے نطفہ بنایا جس نے زمین کے بے جان مادوں سے تمہیں یہ وجود بخشا۔ لیکن قرآن ہی میں انشار کی تعبیر باغات کے لیے بھی آئی ہے۔ انشار جنات۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کو اللہ نے صرف مٹی سے پیدا ہی نہیں کیا ہے۔ بلکہ زمین ہی کو اس کی نشوونما کا ذریعہ بنایا ہے۔ گویا انسان پوری کائنات میں

شجر حیات کی مرکزی شاخ ہے۔ اور زمین کے ذریعے نشو ونما کے بعد اللہ نے انسان کو زمین کا آباد کار بنایا۔ قوم ثمود زمین کی آبادی زراعت کے ذریعے کرتی تھی۔ اتترکون فیما ہٰھنا اٰمنین فی جنات وعیون وزروع ونخل یعنی باغات، کھیتیاں، نخلستان کے ذریعے زمین کی آباد کاری کرتے تھے۔ ٹھیک ایسے ہی وہ پتھروں سے تراش کر عمارتوں کے ذریعے بھی زمین کی آباد کاری کرتے تھے۔ اور نرم زمین پر محلات اور قصور بناتے تھے یعنی ان کی شہری اور دیہاتی زندگی زمین کی آباد کاری کے ذریعے بہت اونچی اور بلند تھی۔ قرآن نے یہاں قوم ثمود کی اس تمدنی ترقی کو موقع استدلال میں پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ تمہاری ان ساری تمدنی ترقیوں کا ذریعہ خود یہ مادہ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ ہے۔ تم اس مادیت میں پڑ کر صرف خدا فراموش نہیں ہوئے بلکہ اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کر کے تم نے اپنے عابدانہ تعلقات اللہ سے توڑ کر پرستش اور بندگی میں غیر اللہ سے جوڑ لیے ہیں۔ یہاں قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اپنی معاش کے لیے تم نے باغات، کھیتیاں کیوں لگائی ہیں۔ یا اپنی بدنیت کی برتری کے لیے محلات کیوں بنائے ہیں۔ بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں میں مگن ہو کر تم نے اپنے مالک وخالق سے پرستش اور بندگی کا رشتہ توڑ کر مخلوق سے کیوں جوڑ لیا ہے۔ یعنی قوم ثمود کا پرستش وبندگی میں اگر اللہ سے رشتہ استوار ہوتا تو قرآن کو ان کے محلات وباغات پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ یہ تو اینٹ پتھر اور مٹی کی بات ہے۔ اگر اللہ سے بندگی اور پرستش میں تعلقات صحیح ہوں تو قرآن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے شیش محل پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(۷۰) اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو روانہ کیا۔ سورۂ اعراف یعنی معالم القرآن کی آٹھویں جلد میں قوم ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام کا اجمالی چہرہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ لفظ ثمود کو کچھ علماء عربی کہتے ہیں اور کچھ عجمی۔ دونوں صورتوں میں علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ اگر عربی ہے تو ثمر سے فعول کے وزن پر ہے۔ ثمر عربی میں تھوڑے پانی کو کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اس کو عربی نہیں عبرمی بتاتے ہیں۔ عبری میں اس کے معنے دائم اور خالد کے ہیں۔

اس سے پہلے عاد کے چہرے میں یہ بات بتائی جا چکی ہے۔ کہ وہ عرب میں جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو خلیج فارس کے کنارے کنارے عراق تک وسیع ہے۔ اس پر قابض تھے۔ ثمود اس کے مقابل عرب مغربی وشمالی پر قابض ہوئے جس کا نام اس زمانہ میں وادی القریٰ تھا۔ وادی القریٰ اس لیے کہتے تھے۔ کہ اس زمانہ میں یہ وادی چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے جا بجا آبادی تھی۔ ان آبادیوں کے سنگی کھنڈر اور آثار

مسلمان جغرافیین نے دیکھے تھے ۔اور اب بھی باقی ہیں ۔

ثمود کے ملک کا دارالخلافہ حجر تھا ۔یہ شہر اس قدیم راستہ پر ہے ۔جو حجاز سے شام کو جاتا ہے ۔ اسی راستہ پر ثمود کا ایک دوسرا مقام فج الفاقہ ہے ۔لیکن اصلی شہر حجر ہی تھا ۔اب عموماً اس شہر کو مدائن صالح کہتے ہیں ۔

قوم ثمود کے سیاسی حالات بالکل نہیں معلوم ۔صرف اتنا معلوم ہے ۔کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی ۔فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا ۔پہاڑوں کو کاٹ کر بنانا ،پتھروں کی عمارات اور مقبرے تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا ۔یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں ۔ان پر آرامی ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں ۔لیکن ان میں سے اکثر آرامی کتبات نبطی اقوام کے ہیں ۔جنہوں نے مسیح سے پہلے اور بعد اسی مقام پر حکومت کی ہے ۔

قوم ثمود کا زمانہ ترقی قوم عاد کے بعد ہے ۔اس کی دلیل یہ ہے ۔کہ اس قوم کا نام اسیریا اور یونان نہایت صراحت کے ساتھ ملتا ہے ۔آٹھویں پارے کی یہ آیت واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد کا مفہوم بھی یہی ہے ۔اور اس ترقی کی انتہا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ شمالی عرب کے نام بڑے بڑے قبائل کے سیاسی تعلقات کی بنا پر تورات میں مذکور ہیں ۔لیکن اس فہرست میں ثمود کا ذکر نہیں ہے ۔قرآن سے یہی اشارہ مفہوم ہوتا ہے ۔

یاقوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل داب قوم نوح و عاد وثمود ۔

حضرت صالح علیہ السلام

یہ قوم ثمود کے پیغمبر کا نام ہے ۔قوم کی آخری زندگی میں جو مرض عام پیدا ہو جاتا ہے ۔ثمود بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے ۔خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر انہوں نے ستاروں کے مادی ہیکلوں کے سامنے سر جھکایا ۔حسب سنت الہی ایک پیغمبر صالح علیہ السلام نبی مبعوث ہوئے ۔تورات میں ارم کے بھائی ارفخشد کے ایک بیٹے کا نام صالح علیہ السلام ہے ۔جو تمام اولاد ابراہیمؑ اور عرب یقطانی کا باپ ہے ۔نصرانی پادری جو بزرگان تورات کی تاریخی ہستی کے اثبات کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے ۔روایات عرب اور قصص قرآن کا نام عام طور سے ان کی زبان میں افسانہ ہے ۔لیکن اگر خود ان کو ضرورت پیش آئے تو وہ تاریخ کی بلند ترین شہادت ہے ۔کہتے ہیں کہ صالح اور سالح ایک ہی شخص کے نام ہیں ۔تاریخ اگر اجازت دے تو اس اتحاد

کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کا پیغام پہنچایا۔ پیغام کیا تھا۔ وہی جو سب پیغمبروں کا ہوتا ہے۔

(۱۷) اللہ سے عابدانہ تعلقات

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اللہ نے تمہیں زمین سے نشوونما دی ہے۔ اور پھر اسی نے تمہیں زمین میں بسایا ہے۔ یعنی اول آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا پھر زمین سے غذائیں پیدا کیں۔ جن سے نطفہ وغیرہ بنتا ہے۔ جو مادہ ہے آدمی کی پیدائش کا۔ اور پیدا کرکے باقی رکھا۔ بقا کا سامان کیا۔ زمین کے آباد کرنے کی ترکیبیں بتلائیں۔ اور تدابیر الہام فرمائیں لے صرف اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے انسان کی نشوونما اور استعمار کو دلیل میں پیش کیا ہے۔ یہ توحید عبادت ہی کے لیے استدلال ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ جو ذات گرامی تمہاری نشوونما کر رہی ہے۔ اور جس نے تمہارے وجود کا پورا پورا سامان کیا ہے۔ وہی تمہارے نیازمندانہ اور عبادت گزاریوں کی مستحق ہے۔ یہ انتہائی کور باطنی ہے۔ کہ وجود کا انعام کوئی کرے، بقائے وجود کا سامان کوئی کرے اور گن گانے کے موقع پر کسی اور کے گن گائے جائیں۔ یاد رہے کہ قوم ثمود اللہ سبحانہٗ کے وجود کی منکر نہ تھی۔ وہ اللہ سبحانہٗ کی خالقیت کو بھی مانتی تھی۔ اس کی شان ربوبیت کا اعتراف بھی اس کی رگ و ریشہ میں تھا۔ اس کی ناشکری یہ اور صرف یہ تھی کہ پرستش اور بندگی میں شرک کرتی تھی۔ پرستش میں شرک کے لیے وہ ارواح کی اور ستاروں کی پوجا کرتی تھی۔ ان کے معبود ان کی قوت واہمہ کی تخلیقات کے سوا کچھ نہ تھے۔ اِن یتبعون الا الظن۔ افکار میں وہ توہمات کی پرستاری کرتے تھے۔ اور اعمال میں وہ اپنے میلانات کو اور رجحانات کو معبود بنائے ہوئے تھے۔ پرستش میں ان کی دعاؤں، طلبگاریوں، نذروں، نیازوں اور قربانیوں کا مرکز انتزائی ہستیاں تھیں۔ اور بندگی میں اللہ کو چھوڑ کر ان کے افترائی قواعد و رسوم تھے۔ قوم ثمود بھی اپنے پیشرو عاد کی طرح اللہ سبحانہٗ کے منکر نہ تھے۔ بلکہ اللہ سبحانہٗ کو مان کر اس کی پرستاری میں دوسرے معبودوں کو شریک کرتے تھے۔ اور یہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس لیے حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کی توحید عبادت سے دعوت توحید کا آغاز کیا۔ آپ نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور ان کے لیے توحید عبادت کی دوا تجویز کی اور معبودان باطل

لے افادات شیخ الاسلام

کے انکار کی تلقین کی اور طاغوت کی نافرمانی کی ہدایت کی۔ لوگوں میں علی روٴس الاشہاد فرمایا۔ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ۔ لوگوں نے اس پکار کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ کہ یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت ایسا تیر ہے جو شرک کے گھر ندے کو مسمار کردے گا۔ مشرکانہ تہذیب، مشرکانہ تمدن، مشرکانہ معاشرہ، مشرکانہ معاش، مشرکانہ سیاست اور مشرکانہ قانون درہم برہم ہوجائے گا۔

زمین کی آبادکاری فرض ہے

اس آیت سے امام ابوبکر الجصاص نے یہ لطیف استدلال کیا ہے۔ کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعے دین کے واجبات میں سے ہے۔

آیت سے یہ استدلال اس وقت صحیح ہے۔ جبکہ استعمار کے معنی کی وہ تفصیل پیش نظر ہو۔ جو ابوبکر بن العربی کے حوالہ سے علامہ قرطبی نے پیش کی ہے۔

استفعال کا وزن عربی وزن میں ایک سے زیادہ معانی دیتا ہے۔ اول طلب فعل جیسے استحملتہ میں نے اس سے اٹھانے کی درخواست کی دوسرے اعتقاد کے معنے میں جیسے استسہلتہ میں نے اس کو سہل و آسان سمجھا۔ التعظتہ میں نے اس کو عظیم جانا تیسرے اجابت اور درستگی جیسے استجدتہٗ میں نے اسے عمدہ پایا لہٰذا استعمرکم کے معنے یہ ہیں۔ کہ خلقکم لعمارتھا۔ اللہ نے تم کو زمین کی آبادکاری کے لیے پیدا کیا ہے اس کے اور کوئی معنے نہیں لیے جا سکتے ہیں۔

اب آیت کی مراد یہ ہوئی کہ زمین کی آبادکاری خواہ بہ شکل زراعت ہو یا بصورت باغبانی ہو یا عمارتوں اور مکانوں کی راہ سے ہو۔ انسان کا فرض ہے۔ گویا اس کام کی حیثیت ازروئے قرآن وہی ہے جو نماز، روزہ، زکوٰۃ کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد شاید اسی آیت سے استنباط ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسلمان کوئی کھیتی لگائے یا باغ لگائے پھر اس کھیتی اور باغ سے پرندے کھائیں یا آدمی یا جانور تو یہ باغ اور کھیتی لگانے والے کی جانب سے صدقہ ہوگا۔

وجہ ظاہر ہے کہ کھیتی یا باغ لگانے والے کو اگر نفع نہ ہوا تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا فرض تو ادا کیا ہے اور جو اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ وہ ثواب کا ضرور مستحق ہے۔ اور اسی ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ کاشتکار اور باغبان نے اللہ کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر معدوم کو موجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا ہے۔ اس لیے اگر فرد کو نفع نہیں پہنچا تو عوام کی خدمت کا فرض تو وہ بجا لایا اور عوام انسان ہی نہیں بلکہ عام مخلوقات بھی اس سے بہرہ یاب ہوئی۔ اس طرح بلا ارادہ اپنے وجود اور اپنی توانائیوں سے عمومی فائدہ پہنچایا اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ اللہ کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بے کار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

مدارس، مساجد اور خانقاہوں کے متعلق آج جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر کون یقین کر سکتا ہے۔ کہ جن مشاغل اور پیشوں کو خالص دنیا تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن اور قرآن کو لانے والے نے ان کو بھی وہ مقام عطا کر دیا ہے۔ جو عام دینی فرائض وعبادت کا ہے۔ کہاں یہ نظریہ کہ جو جس حد تک دنیا اور اس کے مشاغل سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اتنا ہی وہ خدارسیدہ ہوگا: اور کہاں یہ قرآن کا نقطۂ نظر کہ دنیا کے کاموں میں انہماک اور ان میں لگنے ہی کو اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ مذاہب کے ان غیر فطری اور غلط رجحانات کو مٹانے میں قرآن نے کیا کام کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر خاص علمی انداز میں کام کیا جائے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو ابن العاصؓ فاتح مصر کا طائف میں رہط جو باغستان تھا اس میں دس لاکھ ڈنڈے تھے۔ جن پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ تفصیل دیکھنی ہو شکیب ارسلان کے حواشی حاضر العالم الاسلامی میں پڑھیے۔ خیر یہ تو نبوت کے صحبت نافعہ اور پروردہ ہیں۔ ان کو جانے دیجیے۔ کہ ان کا دینی ذوق قرآن نے بتایا تھا۔ میں تو ان صوفیاء کرام کی بات سناتا ہوں۔ جن پر معاش گریزی کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ یہ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ ان کا شمار اساطین صوفیہ میں ہے۔ میری مراد مشہور حضرت شیخ ابوالکارم علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> حق تعالیٰ شانہٗ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ چاہتا ہے۔ کہ یہ زمین اور کھیت آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آبادکاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ یعنی فضول خرچی کے طور آبادی نہ ہو۔ نفع اور آمدنی کے لیے آبادکاری کے کام میں کتنا ثواب ہے تو ہر گھر آبادکاری

کے کام کو نہ چھوڑے۔ اسی طرح اگر لوگوں کو یہ پتہ ہوتا کہ آبادکاری کے کام کو چھوڑنے اور زمین کے بیکار پڑا رہنے میں کتنا گناہ ہے۔ تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔

آگے تمثیل سے اس قرآنی نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے۔

جو کوئی زمین کا کوئی قطعہ رکھتا ہے۔ کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی، کاہلی اور سستی سے بجائے ہزار من کے نو سو من غلہ پیدا ہوا تو قیامت کے روز اس سو من غلہ کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔

اللہ اکبر وہی ثواب آخرت جسے ترک دنیا اور معاشی کاروبار سے گریز پائی کے لیے دنیا کے مذاہب نے استعمال کیا۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے۔ کہ اسی ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لیے کرتا ہے۔ یقیناً یہ اسی قرآن کا پیغام ہے۔ جس نے استعمار الارض یعنی زمین کی آبادکاری کو ان ہی فرائض میں داخل کیا ہے۔ جس کی بجاآوری پر دوسرے مذاہب میں جنت کی آبادی کے وعدے ہیں۔ قرآن کا نظریہ یہ نہیں کہ آخرت کی آبادکاری کے لیے ترک دنیا کرو بلکہ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ آخرت کی آبادکاری کے لیے دنیا کی آبادکاری کرو۔ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ۔ کے لیے [illegible]کم من الارض واستعمرکم۔ میں دلیل بننے کی صلاحیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ انسانوں کی تخلیق دنیا کی آبادکاری کے لیے ہوئی ہو۔ اور بندگی و پرستش سے مقصود اللہ سبحانہٗ کی رضا کا حصول ہو۔ قرآن میں عبادت کا بنیادی تقاضا یہی ہے۔ کہ مومن اللہ کی بندگی اور عبادت کا فریضہ انجام دیتے وقت مقصود اپنے سامنے صرف اللہ سبحانہٗ کی رضا کو رکھے اور اس ادائے فرض منصبی کا نشانہ رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ عبادت و طاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اسی طرح لازم ہے۔ جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور اس لیے اگر نبوت کی دعوت کا بنیادی تصور اللہ کی عبادت ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عبادت سے مقصود اللہ رب العزت کی رضا ہے۔ قرآن عزیز نے اس حقیقت پر ہر ضروری پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ ویبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔ اور یہ بھی کہ عابد جو کام کرتا ہے۔ اس نیت سے کرتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس سے راضی ہو جائے۔ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ۔ اور آخری بات یہ کہ اللہ سبحانہٗ نے اس غایت و مقصد کو اپنے عمل عبادت کا ہدف بنانے کا صراحت سے حکم دیا ہے۔

ما کتبنٰھا علیہم الا ابتغاء رضوان اللہ

س تصورِ عبادت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان زندگی کے مسائل سے پوری طرح متعلق رہے، مناہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔

(۷۲) فراخیٔ دنیا کا قرآنی طریقہ

لہٰذا تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف رجوع کرو۔ یقین کرو میرا پروردگار ہر ایک کے قریب ہے اور ہر ایک کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ یعنی جب وہ ایسا منعم ہے۔ اور محسن ہے تو چاہیئے کہ آدمی تو اسی کی طرف ایمان و طاعت کے ساتھ رجوع کرے اور کفر و شرک کے جو گناہ کر چکا ہے۔ ان کی معافی چاہے وہ ہم سے بالکل نزدیک ہے ہر بات خود سنتا ہے۔ اور جو توبہ و استغفار صدق دل سے کیا جائے اسے سن کر قبول کرتا ہے[1]

یہاں استغفار و توبہ کا حکم دیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ سب سے ہٹ کر اور سب کو چھوڑ کر براہ راست اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو۔ یہ تنگ نظری چھوڑو کہ اللہ سبحانہٗ ہماری سنتا نہیں اور اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اللہ کی بارگاہ تک براہ راست رسائی نہیں ہے۔ پورے شعور و آمادگی اور سچی طلب کے ساتھ اس کی بارگاہ میں معافی کے لیے درخواست کرو۔ اور سب سے کٹ کر اسی کا ہو رہنے کا عہد کرو۔ قبولیت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کو اپنے راجوں، مہاراجوں، بادشاہوں پر قیاس نہ کرو جو شہریوں سے دور اپنے محلوں میں داد عیش دیا کرتے ہیں۔ جن کے دربار تک عام شہریوں میں سے کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانے کے لیے مقربین بارگاہ میں سے کسی کو درمیان میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اور پھر اگر کسی کی درخواست ان کی بارگاہ میں پہنچ بھی جاتی ہے۔ تو وہ خود جواب دینا گوارا نہیں کرتا بلکہ مقربین میں سے کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اللہ کی بارگاہ کو اور اس کی ذات گرامی کو بادشاہوں پر قیاس نہ کرو حضرت صالح علیہ السلام نے اس ساری عمارت کو صرف دو لفظ بول کر ان ربی قریب مجیب مسمار کر دیا۔ اللہ سبحانہٗ قریب ہے اور مجیب ہے یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ کہ وہ دور ہے۔ وہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ تم براہ راست پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کر سکتے وہ اگرچہ بہت بالا و برتر ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مگر اس کے باوجود اقرب من حبل الورید تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تم اس سے سرگوشی کر سکتے ہو۔ خلوت و جلوت علانیہ اور چھپکے سے تم خود اپنی درخواستیں اس کی جناب میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ براہ راست تمہاری دعاؤں کا خود جواب دیتا ہے۔ استغفار و توبہ کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فراخی دنیا کی بے شمار تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر توبہ و استغفار بھی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ توبہ و استغفار اخروی منافع کے ساتھ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں معاشی بہبود دنیوی فلاح و صلاح کے بھی وہ ذرائع اور اہم و مؤثر ذرائع ہیں۔

بہر حال جیسا البقاعی نے لکھا ہے کہ شیطان نے ان کے کان میں یہ بات پھونک دی تھی۔ کہ دنیا میں کامیابیوں کے لیے ہماری اللہ سبحانہٗ تک رسائی نہیں ہے۔ ان کی سرکار بڑی ہے۔ اس لیے ہم ان کے درباریوں کے ذریعے ان سے کچھ کہہ سکتے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے شرک کی اسی توجیہہ پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اور فرمایا۔ ان ربی قریب مجیب۔ یعنی اس کو پانے کے لیے یہ کافی ہے۔ کہ تم اخلاص کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرو۔ تمہارے ان واسطوں اور وسیلوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن کو تم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے شرط لازم سمجھتے ہو۔

عربی تعبیر کا یہ انداز بلاغت بے مثال ہے کہ ھو انشا کم من الارض و استعمر کم سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ اور قصر کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی چونکہ تمہارے انشا، استعمار کی زمین میں ذمہ داری صرف اللہ سبحانہٗ نے لی ہوتی ہے۔ اس میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اس لیے تمہارے عابدانہ تعلقات صرف اللہ سبحانہٗ سے ہونے چاہیں۔ اسی پر تفریع فا کے ذریعہ کی ہے کہ تمہیں اللہ سبحانہٗ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی طرف آئندہ کے لیے لوٹ آنا چاہیئے۔ گویا انشا و استعمار جیسے علت ہے عبادت کی ایسے ہی علت ہے توبہ و استغفار کی۔ استغفروا پر اور توبوا پر ثم لانے میں بہت بڑی معنویت ہے۔ استغفار کی حیثیت دوا کی ہے۔ اور توبہ کی حیثیت غذا کی ہے۔ پہلے دوا استعمال کرو پھر ذرا دیر سے غذا استعمال کرو گے تو صحت روحانی سے مالامال ہو جاؤ گے۔ آخر میں ان ربی قریب مجیب۔ تسلی دی ہے۔ کہ بے شک تمہارے جرائم میں معافی قبول کرنی کی صلاحیت نہیں مگر ؟

تو بگو مارا بدان شہ بار نیست
با کریماں کارہا دشوار نیست

یہ استیناف ہے اور اسی شبہ کا جواب ہے۔ کہ اللہ کی مغفرت و رحمت کا پائیدار سمندر قریب ہے۔ وہ اپنی رحمت سے تمہاری طلبگاریوں کا جواب دے گا۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

رب رحمتك ارجى عندى من عملى ومغفرتك
اوسع من ذنوبى

۷۳ حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت قوم کی نظر میں

لوگوں نے کہا اے صالح علیہ السلام ! پہلے تو ایک ایسا آدمی تھا۔ کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اس بات سے روکتا ہے۔ کہ ہم اپنے ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے۔ جس کی تو دعوت دے رہا ہے۔ یہ بات تو ہمارے دل میں اترتی نہیں ہے۔ یعنی تجھ سے امید تھی کہ آگے چل کر بڑا فاضل اور نیک مرد ہوگا۔ جس کو معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر قوم سر پر بٹھائے گی۔ تیری پیشانی سے رشد وصلاح کے آثار ہویدا تھے۔ سب کو توقع تھی۔ کہ مستقبل قریب میں تجھ سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ رائے تدبیر صلاح ومشورے سے اپنے قومی بھائیوں کی راہنمائی اور نہایت قوت قلب کے ساتھ آبائی مذہب کی حمایت وتائید کرے گا۔ یہ درست ہے کہ ابتدا سے تجھ کو بُت پرستی مبغوض تھی۔ اور عام قومی مذہب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ تاہم سمجھ اور فطری قابلیت پر اعتماد کر کے ہمیں اُمید رہی کہ آگے چل کر عقل وتجربے کی پختگی کے بعد یہ روش نہ رہے گی۔ لیکن افسوس یک بیک تو نے تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تو نے ہمارے آباؤ اجداد کے قدیم مذہب کے خلاف علانیہ جہاد شروع کر کے سب توقعات خاک میں ملا دی ہیں۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک خدا کو لے کر سارے پرانے دیوتاؤں کو چھوڑ بیٹھیں۔ ہمارے نزدیک، بزرگوں کی روش کے خلاف ایسا مسلک اختیار کرنا سخت شبہ کی چیز ہے جسے ہمارا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ موضح القرآن میں ہے یعنی ہونہار لگتا تھا۔ کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا۔ تو لگا مٹانے [1]

یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک قوم کی نظر میں حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت دوسرے قوم کی نظر میں حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت۔ حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت کی حد تک قوم کے احساسات کیا تھے۔ قرآن کا یہ فقرہ كنت مرجوًا قبل هذا۔ اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے عہدے پر سرفرازی سے پہلے پورے چالیس سالہ زندگی کے شب وروز قوم کے سامنے تھے۔ ان کی عقلی معرفت، مشاہدے اور فطری قابلیت کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنے کا انداز ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی زندگی کی پاکیزگی، ان کے کردار کی بلندی، ان کے اخلاق کی بے مثال برتری لوگوں کے سامنے تھی۔ ان کو نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی اخلاقی جرم نہیں۔ جھوٹ کا ان کو کوئی تجربہ نہ تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی پوری اس فقرے میں سمٹی ہوئی ہے۔ اگر ان کی پاک مطہر زندگی میں کوئی داغ بھی نظر آتا تو ان کے مخالف دعوت کو رد کرنے کے لیے ان داغوں کو سامنے لاتے۔ اور یہ حضرت صالح علیہ السلام کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ سب انبیاء کا نبوت سے پہلے یہی حال ہوتا ہے۔ یہ فقرہ اگر ایک طرف حضرت صالح علیہ السلام کی معصومیت کا اعلان کر رہا ہے۔ تو دوسری طرف یہ انداز حضرت صالح علیہ السلام کی محبوبیت کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ قبل ہذا کے زور پر غور فرمائیے یعنی دعوائے نبوت سے پہلے یعنی بار بار کے تجربے سے حضرت صالح علیہ السلام کی سچائی، صداقت اور راست بازی کا ان کو یقین تھا۔ شخصیت کی اسی معصومیت اور محبوبیت کی وجہ سے وہ مستقبل میں قوم کی اُمیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ نبوت پر سرفراز ہونے والی ذات نبی ہونے سے پہلے پوری قوم میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اپنے پاکیزہ اخلاق و اوصاف کی وجہ سے نہایت ممتاز ہوتی ہے۔ اس لیے لوگوں کو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے مطابق ان سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن جونہی وہ منصب نبوت پر سرفراز ہو کر دعوت نبوت پیش کرتے ہیں تو لوگوں کے توقعات کا بنا ہوا امکان گر جاتا ہے۔

حضرت صالحؑ کی دعوت قوم کی نظر میں

حضرت صالح علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے۔ اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ کا نعرہ بلند کیا۔ یعنی اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ کیونکہ اس دعوت کا خطاب جن لوگوں سے تھا اور جن کی غلطی کی تصحیح مقصود تھی۔ چونکہ وہ غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات معاشی مشکلات کی راہوں میں استعمال کرتے تھے۔ یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا۔ وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتیوں کی پیداوار میں برکت دی جائے، باغوں میں پھلوں کو آفتوں سے محفوظ رکھا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریاں دور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی کاموں کے لیے ایک سے زیادہ الٰہ بنا رکھے تھے۔ قوم ثمود کے لوگ اپنے الٰہوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ان کے نام کے چڑھاوے چڑھاتے، سفروں میں ان کے نام کی دھائی دیتے اور ہر کام کا الگ الٰہ بنا رکھا تھا۔ بارش کا الٰہ اور جانوروں کا محافظ اور بچوں کو بیماریوں سے بچانے والا اور ان ہی الٰہوں کی گرفت میں پوری قوم ثمود تھی۔ اور یوں ان الٰہوں سے

عابدانہ تعلقات نسل بعد نسل ان میں اس درجہ پیوست ہو چکے تھے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی یہ دعوت اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ ۔ سنتے ہی بول پڑے ۔ اتنھانا ان نعبد مایعبد آباءنا ۔ اے صالحؑ تو ہمارے بزرگوں کے طریقے کو برا کہتا ہے ۔ اور ہمیں اس طریقہ سے ہٹانا چاہتا ہے ۔گویا قوم ثمود اپنے بنائے ہوئے اور افترائی الٰہوں سے عابدانہ تعلقات قائم رکھنے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ باپ دادوں کے وقتوں سے یہ کام ہوتا آیا ہے ۔یعنی مکھی پر مکھی اس لیئے مارنی چاہیئے کہ پہلے کسی بیوقوف نے اس جگہ ماری تھی ۔ ہر نبی کی دعوت کو دیکھو اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے رکاوٹ بن کر آتی ہے ۔وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین ومذہب کی پابندی ہے ۔انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی چیز نہیں ۔ دوست وآشنا کا چھوٹنا ، ماں باپ سے علیحدگی ، آل اولاد سے کنارہ کشی ، مال وجائداد سے دست برداری ، جماعت کی مخالفت ، قوم سے انقطاع ، وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں ۔جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے ۔ملکی رسم ورواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیس وآئین کی دیرینہ الفت ، حق وباطل کی تمیز اور نیک وبد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے ۔ پہلے جس کو کنت مرجوا قبل ھذا کہہ رہے تھے ۔لیکن جب ان کے منہ سے یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ ۔کی بات نکلی تو باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہونے کی وجہ سے گردن موڑلی ۔ اور کہہ دیا کہ ہماری ساری اُمید تم نے خاک میں ملادی ہیں ۔ گویا بزرگی اور پیشوائی کا طریقہ یہ نہیں ہے ۔ کہ حق بات کی لوگوں کو دعوت دی جائے بلکہ یہ ہے کہ لوگ جسے دعوت سمجھتے ہوں اس کی پیروی کی جائے ۔ اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے آخر میں دعوت کے بارے میں اپنا فیصلہ یہ سنایا ۔واننا لفی شك مما تدعونا الیہ مریب ۔اس بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے جس نے غلجان میں ڈال دیا ہے ان کا شبہ اور غلجان کیا تھا ؟ یہاں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غلجان میں تو سب پڑ گئے تھے ۔ مگر ہر ایک غلجان الگ الگ نوعیت کا تھا ۔یہ دعوت حق کی خصوصیت ہے ۔ کہ جب اس کا آوازہ بلند ہوتا ہے ۔تو دلوں میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور ایک عام قسم کی دلوں میں ہلچل رونما ہو جاتی ہے ۔سب سوچنے لگتے ہیں ۔کہ یہ کیا ہے ؟ سوچ ہر ایک کی جدا ہوتی ہے مگر بے چینی میں سب ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں ۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لوگوں کی گمراہانہ ڈگر ایک تھی ۔ان کو اسی موضوع پر سوچنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی ۔کہ ہمارا کردار کیا ہے ۔ یکایک نبوت کی دعوت کا دھماکہ سب کا اطمینان ختم کر کے سب کے دلوں میں بے چینی ، بے قراری اور بے کلی پیدا کر دیتا ہے ۔ ان کے افکار واعمال پر نبوت کی بے لاگ تنقید حق کو بیان کرنے کے لیے اس کے دلائل

ان کی بے چینی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔ دعوت سے ان میں بیزاری ضرور ہوتی ہے۔ مگر داعی کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا حلم، اس کی شرافت، اس کا صادقانہ رویہ بڑے بڑے ضدی کے دل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر اسی ماحول میں سے صداقت پسند لوگوں کا اس سے متاثر ہونا ان کی بے چینی میں اور اضافہ کرتا ہے۔ اسی کیفیت، اسی حالت کو وہ اس انداز میں ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ تو جس طریقے کی ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ اس کے بارے میں صرف شک ہی نہیں ہے جس نے ہمیں خلجان اور بے چینی میں ڈال دیا ہے۔ اننا لفی شك مما تدعونا اليه مريب۔ مریب ارابت سے ہے۔ اور یہ شک میں زور پیدا کرنے کے لیے صفت بنا کر لایا گیا ہے۔

(۷۴) حضرت صالحؑ کا جواب

حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی رحمت عطا کی ہو۔ تو پھر کون ہے۔ جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا۔ اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں۔ تم مجھے تباہی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں دے رہے ہو۔ یعنی میں تمہارے شک و شبہ کی وجہ سے ایک صاف راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اللہ سبحانہٗ نے مجھے سمجھ دی ہے اور اپنی رحمت عظیمہ سے مجھے منصب نبوت عطا کیا۔ اب اگر فرض کیجیئے میں اس کی نافرمانی کروں اور جن باتوں کے پہنچانے کا حکم ہے نہ پہنچاؤں تو مجھ کو اس کی سزا سے کون بچائے گا۔ اور تم بجائے اس کے کہ اپنے سچے خیرخواہ اور محسن کے قدر کرتے مجھے فرائض دعوت و تبلیغ سے رُک جانے کا مشورہ دے کر ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ بعض سلف نے فما تزيدونني غير تخسير کا یہ مطلب بتایا ہے کہ تمہاری گفتگو سے مجھ میں کوئی چیز نہیں بڑھتی ہے بجز اس یقین کے کہ تم اپنا سخت نقصان کر رہے ہو۔ مگر سیاق کے مناسب پہلے معنی ہیں [۱]

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ میں جو دعوت دے رہا ہوں وہ وحی الہٰی ہے جو براہ راست مجھے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر میں اس سے ہٹ کر تمہاری امنگوں کی راہ اپناؤں تو مجھے اللہ سبحانہٗ کی پکڑ سے بچانے والا کون ہے۔ فما تزيدونني غير تخسير یعنی اگر میں یہ راہ چھوڑ دوں اور تمہاری توقعات پوری

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کرنے میں لگ جاؤں تو تم میری بدبختی اور نامرادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ اور اللہ سبحانہٗ کے مقابلے میں میری کوئی مدد نہ کر سکو گے۔ گویا حضرت صالح علیہ السلام نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ تم غور نہیں کرتے کہ اگر ایک شخص پر اللہ نے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہے۔ اور وہ دیکھ رہا ہے کہ سچائی وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہے۔ تو کیا محض لوگوں کے پاس خاطر سے اس کا اظہار نہ کرے۔ اچھا بتلاؤ اگر وہ حکم حق سے سرتابی کرے تو کوئی ہے جو اللہ سبحانہٗ کے مواخذہ سے اسے بچائے گا۔ اگر میں محض اس خیال سے کہ تمہاری اُمیدوں کو ٹھیس پہنچے گی سچائی کا اعلان نہ کروں تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ میں اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دوں۔

کچھ بزرگوں نے یہ تشریح بھی کی ہے کہ اگر تم میری نبوت کا انکار کرتے ہو اور تم مجھے دعوت کے کام پر دھکی دے رہے ہو تو پھر یقین کرو کہ میرا ایمان رب کی بینہ کی وجہ سے قوی ہے اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیا میں اپنا مقام یقین چھوڑ کر تمہارے شک کے مقام پر آجاؤں اور تم میرے سے اس بات کی کیسے توقع رکھتے ہو۔ حالانکہ تمہیں پتہ ہے۔ کہ میرا یقین خدا کی نافرمانی کی صورت میں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اس کا نتیجہ اللہ کی پکڑ ہے۔ اور اللہ کی پکڑ سے مجھے کوئی بچا نہیں سکتا۔ یعنی اگر میں اپنی بصیرت کے خلاف اور اس علم کے خلاف جو اللہ نے مجھے دیا ہے۔ محض تم کو خوش کرنے کے لیے گمراہی کا طریقہ اختیار کر لوں تو یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے تم مجھے بچا نہ سکو گے بلکہ تمہاری وجہ سے میرا جُرم اور زیادہ ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھے اس بات کی مزید سزا دے گا کہ میں نے تم کو سیدھا رستہ بتانے کی بجائے جان بوجھ کر غلط راستہ بتایا ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ
دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ
اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَ
اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾
كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا
لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

اور لوگو: تمہارے لیے یہ اللہ کی اُونٹنی ایک نشانی ہے[۶۴] بس تم اسے
چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور تم بُرائی سے اسے نہ چھُونا
تم نزدیکی عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے[۶۵] بس لوگوں نے اس کے پاؤں
کاٹ دیئے۔ پھر اس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب
تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو یہ وعدہ
جھوٹا نہیں ہے[۶۶] پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے حضرت صالحؑ

اور اُن کے ساتھ اہل ایمان کو اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا بلاشبہ تیرا رب ہی زور اور دبدبہ والا ہے اور آپکڑا ظالموں کو ہولناک چیخ نے بس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے گویا وہ ان گھروں کے باسی ہی نہ تھے۔ خبردار! قوم ثمود نے بلاشبہ اپنے رب کا کفر کیا اور دیکھو قوم ثمود کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے ۶۸

مفردات کے معانی

عقروا۔ انہوں نے کونچیں کاٹ دیں۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ باب ضرب عقر سے جس کے معنے کونچیں کاٹنے کے ہیں۔ کونچیں کہتے ہیں۔ پاؤں کے پٹھوں کو جو پیچھے کی طرف ایڑی کے پاس ہوتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا کہ عرب میں اُونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو پہلے اس کی کونچیں کاٹتے تاکہ بھاگ نہ جائے پھر اس کو نحر کرتے۔ فیومی نے مصباح میں لکھا ہے۔ کہ عُقر کا استعمال صرف کونچیں کاٹنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی نحر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ ازہری نے اس کی وجہ بھی یہی لکھی ہے چونکہ نحر عام طور پر عُقر کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اس سے نحر کرنا بھی مراد لے لیتے ہیں۔

حضرت صالحؑ کا معجزہ ہلاکت

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے۔ کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ کسی بات کو حُسن ظن پر محمول نہیں کرتا۔ اس کو اس کی ہر چیز میں شر، خبث اور بُرائی نظر آتی ہے جلی سے جلی واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسُن تعلیم اور دیگر علمی وعملی تلقینات کو ہادر نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دھوؤں کو بھی تسلیم کرلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ آخر المیل کے طور پر وہ اللہ کے رسول سے خارق

عادت معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسا عجیب وغریب کام نہیں کرسکتا۔ اس لیے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اسی طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہوجائے گی۔ لیکن اللہ سبحانہ آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے خارق عادت پیش کرتا ہے۔ تاہم ان کو دیکھ کر معاندانہ روح ان کے دلوں میں رسول کی سچائی کا اعتبار نہیں ہونے دیتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ قوم ثمود کو ان کی صداقت، امانت، دیانت ان کی فراست، دانائی ان کی فرزانگی اور قابلیت پر کوئی شبہ نہ تھا۔ بلکہ اس وجہ سے وہ مستقبل میں قوم کی امیدوں کا مرکز تھا۔ قوم کو ان کی دعوت اور دعویٰ سے اختلاف تھا۔ آغاز دعوت ہی میں دو فریق پیدا ہوگئے تھے۔ ایک گروہ ماننے والوں اور دوسرا منکرین کا۔ ماننے والے کمزور نادار اور غریب تھے۔ اور منکرین کے پاس بھرپور مادی طاقت تھی۔ قرآن نے دونوں کی گفتگو پیش کی ہے۔

قال الملاء الذین استکبروا للذین استضعفوا لمن امن منهم اتعلمون ان صالحا مرسل من ربه قالوا انا بما ارسل به مؤمنون۔ قال الذین استکبروا انا بالذی امنتم به کافرون۔

اس قوم کے جو سردار اپنی بڑائی پر گھمنڈ رکھتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے۔ اور حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ کہا کیا واقعی تم جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہمارا حضرت صالح علیہ السلام کی رسالت پر ایمان ہے۔ ان متکبرین نے آگے سے کہا کہ جس چیز کو تم مان چکے ہو۔ اس کو ہم نہیں مانتے ہیں۔

اسی نہ ماننے والے طاقتور گروہ نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا۔ کہ اگر تم دعویٰ رسالت میں سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا۔ لم تستعجلون بالسیئة قبل الحسنة۔ لوگو بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو۔ لولا تستغفرون الله لعلکم ترحمون۔ اللہ سے معافی کیوں نہیں مانگتے ہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے لیکن وہ اسی پر اڑے رہے۔ یاصالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین۔ یہاں واؤ عاطفہ لاکر اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۷۶) اور لوگو: تمہارے لیے یہ اُونٹنی اللہ کی نشانی ہے۔ یہ بات معجزہ کے مطالبے کے جواب میں کہی تھی۔ جیسے سورۃ الشعراء میں ہے۔ فات بآیۃ ان کنت من الصادقین۔ قال ھذہ ناقۃ۔ معجزے کے مطالبے پر اونٹنی کے پیش کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ محض اونٹنی نہ تھی جیسا کہ بعض شارحین کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

پالتو جانوروں کو اللہ کے نام پر چھوڑنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباع حق کی میں آزمائش ہو گئی۔

آیت میں صراحت کے ساتھ اس اونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں ایسی بات تھی۔ جسے معجزہ اور نشانی کے مطالبے پر پیش کیا گیا ہے۔ اگر حضرت صالح علیہ السلام مطالبے کے جواب میں یوں ہی کسی بھی اُونٹنی کو پکڑ کر کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی نشانی ہے۔ تو اس میں مخاطبوں کے لیے کوئی بات نہ ہوتی۔ آیت میں صراحتاً اونٹنی کو معجزہ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں آتینا ثمود الناقۃ مبصرۃً میں اونٹنی ہی کو بصیرت والی کہا ہے۔ اور یہ بات بھی اس اونٹنی کی اعجازی پیدائش کی نشان دہی کرتی ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کو پیش کر کے لوگوں کو دھمکی دی جیسا کہ آگے آ رہی ہے۔ یہ سب باتیں بے غبار ہیں۔ مگر قرآن عزیز سے صراحتاً صرف دو باتیں ثابت ہیں۔ ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے ان کی صداقت کی نشانی مانگی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کو بطور نشانی پیش کیا۔ دوسری یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو ہدایت کی تھی۔ کہ وہ اسے نقصان نہ پہنچائیں اور پانی کی باری مقرر کر لیں۔ واقعہ کی حیثیت سے پوری تفصیل معالم القرآن کی جلد ہشتم نوٹ نمبر ۱۰۱ میں آ چکی ہے۔

یہاں تو صرف یہ بتانا ہے۔ کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے۔ کہ ناقہ ثمود کے لیے اللہ سبحانہ کی ایک نشانی تھی۔ اور اپنے اندر ضرور ایسی کوئی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا اعجازی نشان بن سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے۔ اگر وہ عام اونٹنی تھی۔ اور حضرت صالح علیہ السلام نے سر راہ کسی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ تمہارے لیے

اللہ کی نشانی ہے۔ تو اس میں نہ معقولیت ہے۔ اور نہ معنویت اور نہ اس میں مخاطبوں کے مطالبے کا جواب ہے اور نہ اس میں عقلی طور پر جواب بننے کی صلاحیت ہے۔ جو علماء یہ کہتے ہیں۔ کہ اونٹنی کا حضرت صالح علیہ السلام کی دعاء کے ذریعے پہاڑ کی چٹان سے پیدا ہونا اعجاز ہے۔ اس موضوع پر روایات کی حیثیت کچھ ہو مگر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت ضرور ہے۔ اور قرآن میں واقعہ جس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے اشارات کا مقتضا یہی ہے۔ لیکن کچھ علماء اس اعجاز کی تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ آٹھویں جلد میں پڑھ چکے ہیں۔

(۷۷) عجیب و غریب اونٹنی

پس اسے تم چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور تم اسے برائی سے نہ چھونا اگر ایسا کرو گے تو نزدیکی عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے۔ ظاہر عبارت سے ظاہر ہے۔ کہ پہلے فقرے میں جس کھلی دلیل کا ذکر ہے اس سے مراد یہی اونٹنی ہے۔ جسے اس فقرے میں نشانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الشعراء میں تصریح ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام کے مخاطبوں نے خود حضرت صالح علیہ السلام سے ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا۔ جو اللہ کا رسول ہونے کی کھلی اور واضح دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ اونٹنی خرق عادت اور معجزے کے طور پر وجود پذیر ہوئی تھی۔ اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے ہے۔ جو اللہ کے رسول اپنی نبوت کے ثبوت میں پیش کرتے آئے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کے معجزانہ طور پر پیدا ہونے کی دلیل ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام اسے پیش کر کے اپنے مخاطبوں سے علی رؤس الاشہاد فرمایا کہ اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی وابستہ ہے۔ تاکل فی ارض اللہ۔ یہ آزادانہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے گی۔ سورۃ الشعراء میں ہے۔ کہ ایک دن یہ پانی پیئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پانی پئیں لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی ہے جس کی تخلیق غیر معمولی اور غیر معتاد ہو۔ اگر غیر معمولی اور غیر معتاد پانی پینا تقاضاء عقل کے منافی نہیں تو غیر معتاد پیدائش کیوں تقاضاء دانش کے منافی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کی یہ تاویل کی ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام کی امت نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک نشانی طلب کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمے یا کنویں کا تمام پانی پی جاتی تھی۔ اور دوسرے روز ان کے جانوروں کو ملتا تھا۔ لیکن

اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمے اور کنویں کا پانی پی جاتی ہے انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار دیا۔ حالانکہ قرآن نے اونٹنی کو معجزہ قرار دیا ہے نہ کہ اونٹنی کے پانی پینے کو۔ اگر پانی پینا معجزہ ہے تو پھرتا کل فی ارض اللہ کی وجہ سے اس کا آزادانہ چرنا بھی معجزہ ہوگا۔ جس بنیاد پر اونٹنی میں یہ اوصاف پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا انکار کرنا کون سی تحقیق ہے۔ اونٹنی کے یہ اعمال خود اونٹنی کے عجیب الخلقت ہونے کی دلیل ہے۔ اونٹنی میں یہ اوصاف اسی وقت متصور ہو سکتے ہیں۔ جب اس کی تخلیق میں اعجاز ہو۔ قرآن نے اونٹنی کو آیۃ کہا ہے اونٹنی کے پانی پینے اور چرنے کو آیۃ نہیں کہا ہے۔ اونٹنی میں شان اعجاز کی وجہ سے یہ حکم ہوا ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب قریب۔ اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی تھی۔ جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔

(۷۸) قوم ثمود کا اونٹنی کو ذبح کرنا

پس لوگوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے پھر اس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اپنے گھروں میں خوب فائدہ اٹھالو۔ یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ مانگا وہ انہیں دکھلا دیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل اور الفاظ کی تشریح سورہ اعراف آٹھویں پارے کے ختم پر گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ کرلی جائے[۱] آٹھویں پارے میں ہے کہ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو ہمیں وہ چیز دکھاؤ جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے رہے یہاں اس آیت میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کے لیے تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہے۔ تم شہر میں تین دن مزے کرلو۔ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا جھوٹا نہیں ہے۔

قرآن کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ انبیاء کے معجزات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت۔ انبیاء پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھلاتے ہیں۔ اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح عناصر ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آجاتا ہے کہ جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور کفر کے ڈھیر میں پھونس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت معجزہ ہلاکت، آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتا ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔

اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا اگرچہ ایک شخص ہے جیسا کہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ہے۔ لیکن چونکہ پوری قوم اس کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا۔ اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو۔ ایک قومی گناہ ہے۔ خواہ اس کا کرنے والا ایک فرد واحد ہو۔ گویا یہ قدم قوم کے متمردین کی جانب سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اور حضرت صالح علیہ السلام کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دی ہیں۔ اب وہ عذاب لاؤ اگر تم میں کوئی صداقت ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بتایا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ فتمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذالک وعد غیر مکذوب۔ تین دن مزے کر لو اس میں خلاف کا امکان نہیں ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا آگے بتایا جا رہا ہے۔

(۷۹) حضرت صالحؑ اور اہل ایمان کا بچاؤ

پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا بلاشبہ تیرا رب ہی زور اور زبردست والا ہے یعنی جب حکم عذاب پہنچا تو ہم نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچا دیا اور کاہے سے بچا دیا اس دن کی رسوائی سے ومن خزی یومئذ نجینا کی شرح و تفصیل ہے۔ القوی العزیز یعنی جسے چاہے ہلاک کر دے اور جسے چاہے بچا لے۔[۱]

جب معجزہ ہلاکت ظاہر ہوتا ہے۔ تو نبی کو اپنے مؤمنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے رفقاء کے ساتھ کشتی پر سوار کر کے کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ انی مھاجر الی ربی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت شعیبؑ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے ۔ معجزہ ہلاکت ظاہر نہیں ہوتا ہے ۔ اور جب وہ ہجرت کر جاتے ہیں ۔ تو یہ معجزہ ہلاکت مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوتا ہے اور مؤمنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوتی ہے ۔ حضرت صالح علیہ السلام اور اہل ایمان کی ہجرت کا ذکر یہاں نہیں ہے مگر سورہ اعراف میں یہ تصریح ہے کہ

فتولی عنهم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالة ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین ۔

پس حضرت صالح علیہ السلام یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکلے کہ اے میری قوم میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تمہاری بہت خیر خواہی کی لیکن تمہیں اپنے خیر خواہ پسند نہیں ہیں ۔

اسی کو یہاں قرآن نے نجینا صالحا والذین امنوا معہ برحمة منا ومن خزی یومئذ سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی اپنے خاص فضل سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو بھی نجات دی ۔ ورنہ یہ آفت ایسی بے پناہ اور ہمہ گیر تھی کہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کوئی چیز اس سے نجات دلانے والی نہیں ومن خزی یومئذ یعنی ونجیناهم من خزی یومئذ یہ انجار کا انجار پر عطف نہیں بلکہ احسان کا احسان پر عطف ہے ۔ اسی نکتہ کی وجہ سے فعل کا فعل پر عطف نہیں کیا بلکہ متعلق فعل کا عطف کیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی معمولی آفت سے نجات بخشی بلکہ اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی ہے جس کی رسوائی کہ وہ تم کو معلوم ہے ۔

آخر میں فرمایا ہے ۔ ان ربک ھو القوی العزیز یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے ۔ اسے اللہ کے رسول آپ کا بھی وہی رب ہے جس نے قوم ثمود کے ساتھ یہ کچھ کیا ہے وہ قادر ہے کہ تیرے مخاطبوں کے ساتھ وہ ہی کچھ کرے جو قوم ثمود کے ساتھ ہو چکا ہے کہ قوت وعزت کا اصل مالک تیرا رب ہی ہے ۔ تم مطمئن رہو جس طرح اس نے صالح علیہ السلام کے دشمنوں کو تباہ کیا ہے ۔ اسی طرح تمہارے دشمنوں کو بھی ایک دن رسوا کر دیگا ۔ اور کوئی بھی اس کے ارادے میں رکاوٹ نہ ہوگا ۔

(۸۰) قوم ثمود پر عذاب کی نوعیت

اور آ پکڑا ظالموں کو ہولناک چیخ نے بس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے ۔ گویا وہ ان گھروں

کے باسی ہی نہ تھے ۔خبردار قوم ثمود نے بلاشبہ اپنے رب کا کفر کیا اور دیکھو قوم ثمود کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے ۔یعنی بے نام و نشان ہو گئے ۔حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں ان پر عذاب آیا اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے فرشتے نے چنگھاڑ ماری سب کے جگر پھٹ گئے بعض آیات میں رجفۃ آیا ہے یعنی زلزلہ یا کپکپی سے ہلاک ہو گئے ۔سورہ اعراف میں ہم اس کے متعلق تطبیق کی صورت لکھ چکے ہیں ۔جو بھی اپنے پروردگار کے آیات و احکام سے منکر ہوا اس کی یہ گت بنتی ہے ۔اور ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ سن کر عبرت حاصل کرو[1] اس آیت میں صیحۃ فرمایا ہے دوسری جگہ رجیفہ کی تعبیر آئی ہے ۔سورہ حاقہ میں اسی کو طاغیہ کہا ہے ۔اور سورہ سجدہ میں اسی کو صاعقہ فرمایا ہے ۔یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہیں ۔تاکہ معلوم ہو جائے ۔کہ اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں ۔صاعقہ کے معنی بجلی کی کڑک کے آتے ہیں ۔ یرسل الصواعق اور عذاب کے معنی بھی آتے ہیں ۔کیونکہ صاعقہ فضائے آسمانی کی سخت آواز کا نام ہے ۔یا تو اس میں صرف آگ ہوتی ہے ۔یا عذاب امر موت بھی ۔پھر صاعقہ اپنی ذات کے اعتبار سے ایک چیز ہے ۔اور یہ چیزیں اس کے اثرات ہیں ۔طاغیہ کے بارے میں کئی قول ہیں ۔اول یہ کہ طاغیہ ایسا واقعہ ہے ۔جو شدت و قوت میں حد سے بڑھ گیا ہو اس صورت میں طاغیہ کسی موصوف کی صفت کے لیے محذوف کیا ہے ۔کچھ کے خیال میں صیحۃ ہے یعنی الصیحۃ الطاغیہ یعنی ایسی چنگھاڑ جو سب چنگھاڑوں سے قوت اور شدت میں زیادہ ہو ۔ارشاد ہے ۔انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ فکانوا کھشیم المحتظر ۔ ہم نے بھیجی ایسی چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی باڑ کانٹوں کی ۔اور بعض موصوف رجفۃ کو محذوف مانتے ہیں ۔زلزلہ اور بعض صاعقہ کی صفت بتلاتے ہیں ۔ بہر حال آپ ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کریں ۔جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی ہو کڑکتی ہو اور گرجتی ہو اور اس طرح کوند رہی ہو کہ کبھی مشرق میں اور کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی، کوندتی ، گرجتی، لرزتی ، لرزاتی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام کا اور اس کے نواح کا کیا حال ہو گا ۔یہ ایک معمولی سی جھلک ہے اس عذاب کی جو قوم ثمود پر آیا ۔اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا ۔بعض شارحین قرآن نے یہاں صیحۃ سے زلزلہ مراد لیا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ آتش فشاں کا زلزلہ ہو کیونکہ قدیم اور جدید جغرافیہ والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض ثمود آتش فشاں مادے

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بھری ہوئی ہے ۔

معجزے کی حقیقت

یہاں قرآن نے حضرت صالح علیہ السلام کی تقریر کا یہ جملہ پیش کیا ہے ۔ یاقوم ہٰذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ ۔ لوگو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے آیت بن کر آئی ہے ۔ اور یہ قوم ثمود کے اس مطالبے کے جواب میں ہے ۔ فات بآیۃ ان کنت من الصادقین ۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں ۔ آیات دو قسم کی ہیں ۔ ایک وہ آیات ہیں جو اللہ سبحانہ کے وجود اور اس کی صفات کمال کی علامتیں ہیں ۔ جس طرح ویرانے کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے ۔ اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے ۔ ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے ۔ اور زمین کے اندر و باہر بارش ، دن رات ، چاند ، سورج ، درخت ، پھول ، پھل اور غلہ کی اقسام وغیرہ زمین میں جانداروں کی زندگی کا سامان اس خالق کے رحم و کرم عطا بخشش اور دیگر اوصاف و کمالات کو ظاہر کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خالق کو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے ۔ کفر ان ہی دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور نہیں کرتے ہیں ۔ اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور اللہ سبحانہ کے تعلق کو نمایاں کرتی ہیں ۔ اسی طرح اللہ اپنے کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنی مخصوص علامات و آیات کے ذریعے نمایاں کرتا ہے ۔ یہ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں ۔ باطنی آیات اور ظاہری آیات ۔

نبوت کی باطنی آیات

باطنی اور روحانی آیات صاحب نبوت کی صداقت ، معصومیت ، تزکیہ ، تاثیر ، تعلیم ، ہدایت ، ارشاد و فلاح اور تائید ہے ۔ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و روایات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں ۔

ظاہری اور مادی دلائل وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں ۔ مثلاً مردے کا زندہ کرنا ، عصا کا سانپ بن جانا ، انگلیوں سے چشمہ اُبلنا ، بیمار کو اچھا کرنا ، پہاڑ کی چٹان میں اونٹنی کا پیدا ہونا تمام انبیاً کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں ۔ کہ باطنی نشانیوں کے ساتھ ان کو ظاہری آیات بھی ملی ہیں ۔

قرآن عزیز نے اکثر انبیاء کے واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن یہ مادی اور ظاہری آیات نبوّت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب پر نبوت کی زبان سے یہ جواب دیا۔ ھل کنت الا بشرا رسولا۔ اور اسی لیے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں جہاں نبی کی تعریف کی ہے اور نبی کی قسمیں بتائی ہیں۔ اور نبی شناسی کے تین پیمانے بتلائے ہیں۔ ایک اخلاقی، دوسرا لوئی، تیسرا تعلیمی، لیکن نبوت شناسی کے لیے اعجازی پیمانہ کوئی نہیں بتایا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ معجزہ نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہے۔ مقصود یہ ہے۔ کہ نبوت کی حقیقت معجزہ نہیں۔ بلکہ تبشیر و انذار ہے۔ لغت میں معجزہ کے معنے عاجز کر دینے والی اور تھکا دینے والی چیز کے ہیں۔ اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلہ اسباب کے بغیر وجود پذیر ہو اسی کو لوگ خرق عادت بھی کہتے ہیں۔

کیا خرق عادت ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ معجزے کی یہ تعریف کہ وہ خرق عادت کا نام ہے غلط تعریف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ قوانین جو علل و معلولات اور اسباب و مسببات کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی ہے۔ پانی خنکی پہنچاتا ہے۔ دوسرے وہ قوانین ہیں جن میں اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے کے لیے خالق اسباب نے سبب اور مسبب کے رشتہ کو کسی چیز سے ہٹا دیا اور یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا جیسے جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا یا دو انسانوں کی خوراک کا ایک جماعت کو کافی ہو جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہیں۔ اس لیے جب یہ یا اس قسم کی کوئی چیز رونما ہوتی ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ صرف قوانین قدرت کی پہلی قسم کے خلاف ہے۔ لیکن قانون خاص کے خلاف نہیں ہے۔ اس کا انکار صرف وہ کرتے ہیں۔ جو یا تو قطعاً خدا کے منکر ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ اللہ سبحانہٗ کو قادر مطلق نہیں مانتے ہیں۔ اور علت و معلول اور سبب و مسبب کے گورکھ دھندے پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کائنات کا نظم باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اس عقیدہ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا دلیل تسلیم کیے بیٹھے ہیں۔ اور اس لیے خرق عادت کو قبول کرنے کی ان میں جرأت نہیں ہوتی۔ گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے۔ کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لیے ہیں۔ وہ نظام کائنات چلانے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے لیے کسی اور کی دست اندازی کی ضرورت نہیں

کائنات کے چہرہ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شئی کی علت اور خاصیت انہوں نے دریافت کر لی ہے ۔ حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں زمین نام کی ایک آبادی کے چوتھے خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے ۔ اس مبلغ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ حکماء اعتراف کرتے ہیں ۔ کہ وہ صرف کیسے کا جواب دے سکتے ہیں کیوں کا جواب ان کے موضوع بحث سے خارج ہے ۔ فلاسفہ کا حال یہ ہے ۔ کہ دو فلسفی بھی ایک نظام خیال پر متفق نہیں ہیں ۔

حقیقی علت اللہ کی قدرت ہے

یہ ناممکن ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے ۔ کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجیے۔ جس کے ارادے اور مشیت سے سارا کارخانہ چل رہا ہے ۔ اسباب و علل صرف اس کی مشیت اور ارادے کے مظاہر ہیں ۔ اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے ۔ صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لیے عادت کے خلاف کوئی بات ظاہری کر دی ۔ علت و معلولیت کا جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے سمجھ لیا ہے ۔

بتانا یہ چاہتا ہوں ۔ کہ اللہ سبحانہ کی ایک عادت عام ہے یعنی وہ قوانین جو باہم علت و معلول کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ مثلاً آگ جلاتی ہے ۔

عادت خاص یہ ہے ۔ کہ اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے نے کسی مقصد کے لیے علت اور معلول کے باہمی رشتہ کو کسی چیز سے جدا کر دیا جیسے جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا یہ بات چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہے اس لیے جب یہ اور اس طرح کی کوئی شئے رونما ہوتی ہے یا اس کے وجود پذیر ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ قانون قدرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف ہوتا ہے مگر عادت خاص کے خلاف نہیں ہے یہ بھی قانون قدرت ہی کی ایک کڑی ہے ۔ جو عام حالات میں الگ ہو کر کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے ۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے رسول کی صداقت و حقانیت سرعام بتائے اور مکذبین کو باور کرائے کہ یہ اپنے دعوی رسالت میں سچا ہے۔

کیونکہ اگر مدعی رسالت اپنے دعویٰ میں صادق نہ ہو. تو اللہ سبحانہٗ کی تائید کبھی ساتھ نہیں ہو سکتی. اسی لیے اعجاز خود نبوت کی ماہیت میں داخل نہیں ہے. معجزہ ہی نبی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے معجزہ کے ساتھ مدعی نبوت کو انسانی اقدار، اخلاقی اقدار کے پیمانے میں رکھ کر دیکھا جائے گا. نبیوں کے ترازو میں تول کر دیکھا جائے گا. اور اس کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں سے اس کو ناپا جائے گا.

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے فرستادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں سلام فرمایا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ایک بُھنا ہوا بچھڑا لے آئے اور لا کر پیش کر دیا[۶۹] پھر جب حضرت ابراھیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام کچھ کھٹکے اور ان سے اپنے جی میں ڈرے۔ انہوں نے کہا کوئی اندیشہ نہ کرو ہمیں قوم لوط[۴]

کی طرف روانہ کیا گیا ہے۔[۸۲] اور اس کی بیوی بھی کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ ہم نے ابراھیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی۔ اور اس کی کہ اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کا ظہور ہوگا۔[۸۳] بولی ہائے افسوس کیا میرے بچہ ہوگا حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔[۸۴] انہوں نے کہا کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ سبحانہ کے کام پر۔ اے ابراھیمؑ کے گھرانے والو تم پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو۔ بلاشبہ اللہ ہی کی ذات قابلِ ستائش اور بڑائیوں والی ہے[۸۵]

مفردات کے معانی

بشریٰ۔ خوشخبری، ایسی خبر جس کو سُن کر بشرے پر مسرت و خوشی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ نفس انسانی کا خاصہ ہے۔ جب اس کو کوئی خوش کن خبر پہنچے تو دفور مسرت سے اس کے جسم میں خون دورہ کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے ایسی خبر کے سنانے کو جس کو سُن کر انسان کے چہرے پر فرحت و انبساط کے آثار ظاہر ہونے لگیں تبشیر کہتے ہیں۔

سلام۔ سلامتی، امان، سالم یہ سلم یسلم کا مصدر ہے۔ اس کے معنے عیوب و آفات سے محفوظ رہنے کے ہیں۔ اس کے معنے عیوب و آفات سے سالم رہنے ان سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں رقم طراز ہیں۔ سلم اور سلام کے معنے میں ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے ارشاد ہے بقلب سلیم۔ یعنی ایسا دل جو دغا سے خالی ہو۔ یہ باطن کے بارے میں ہے اور مسلمۃ لاشیۃ فیھا۔ بے عیب ہے۔ کوئی داغ اس میں نہیں۔ یہ ظاہر کے بارے میں ہے۔ آیت قالو سلاما قال سلام میں دوسرا پیش کے ساتھ اس لیے ہے۔ کہ دعا کے

باب میں رفع زیادہ بلیغ ہے۔ گویا اس ادب کی رعایت رکھی۔ جس کی اس آیت میں ہدایت ہے۔
واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا۔

حضرت لوطؑ کی دعوت اور اہل سدوم کی ہلاکت

قوم لوطؑ اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرق اردن کہتے ہیں۔ اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس قوم کا صدر مقام سدوم بتایا گیا ہے۔ جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ تلمود میں لکھا ہے۔ کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے۔ اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا۔ کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا۔ جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے۔ جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین اور مصر میں دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ چونکہ سدوم کی ہلاکت کی خبر پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ اس سرگزشت کی ابتداء بھی انہیں کے ذکر سے ہوئی۔

فرشتوں نے دو باتوں کی خبر دی۔ ایک یہ کہ قوم لوطؑ کی ہلاکت کا وقت آگیا دوسری یہ کہ سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش ہوگی اور ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوں گے۔

ان دونوں باتوں میں بظاہر کوئی علاقہ نظر نہیں آتا اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کیوں دونوں کی خبر بیک وقت دی گئی؟ کیوں دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا؟ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام جب کسریوں کے ملک سے آکر فلسطین میں مقیم ہوئے تو یہ ملک ان کے لیے اجنبیوں کا ملک تھا۔ لیکن مشیت الٰہی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ ایک دن اسی سرزمین پر ان کی نسل حکمرانی کرے گی۔ اس نسل کا ظہور کس سے ہوا۔ اسرائیل سے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام سے وہ کس کے لڑکے تھے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے۔ بس فرشتوں نے بیک وقت دو باتوں کی خبر دی۔ ایک میں ایمان و نیک عملی کی کامرانیوں کا اعلان تھا۔ دوسری میں انکار و بدعملی کی ہلاکتوں کا۔ یعنی جس دن اس بات کی

خبر دی گئی کہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ بدعملیوں کی پاداش میں ہلاک ہونے والا ہے۔ اسی دن اس کی بھی بشارت دے دی گئی کہ ٹھیک عملی کے نتائج ایک نئی نسل تیار کر رہے ہیں۔ اور وہ عنقریب اس تمام ملک پر حکمرانی کرنے والی ہے۔

پھر معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ سدوم اور عمورہ کا علاقہ فلسطین کا سب سے زیادہ شاداب علاقہ تھا۔ اور معلوم ہے کہ سارہ تمام عمر اولاد کی تمنائیں کرتے کرتے بالآخر مایوس ہو چکی تھیں۔ قدرت الٰہی نے بیک وقت دونوں کرشمے دکھلا دیئے جو زمین سب سے زیادہ شاداب ہے وہ بدعملیوں کی پاداش میں ایسی اجڑے گی کہ پھر کبھی سرسبز و شاداب نہ ہو سکے گی۔ جو شجر امید بالکل سوکھ چکا ہے وہ اچانک اس طرح سرسبز ہوگا کہ صدیوں تک اس کی شاخیں بارآور رہیں گی۔ چنانچہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ آتش فشاں مادے کے انفجار سے ایسا بنجر ہوا کہ آج تک بنجر ہی ہے اور بشارت پر پورا سال بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ حضرت اسحٰق ؑ کی پیدائش ہو گئی۔ اور پھر ان کی نسل روز بروز بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔

(۸۱) اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے فرستادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لیکر آئے۔ انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں سلام فرمایا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آئے اور لاکر پیش کر دیا۔ یہ اس سورت کے قصص کی ترتیب کے موافق ہے صرف قوم لوطؑ کے قصے سے پہلے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا تھوڑا سا قصہ بیان فرمایا ہے۔ مگر تعبیر ایسی رکھی کہ جو ظاہر کرتی ہے کہ مقصود اصل لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے۔ چونکہ اس میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں کئی طرح کی مناسبت اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس لیے بطور تمہید و توطئہ ابراہیم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہوا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ جو آپ کے ہمراہ عراق سے ہجرت کر کے آئے۔ فرشتوں کی ایک ہی جماعت دونوں کے پاس بھیجی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوطؑ کی ہلاکت کے مسئلے میں فرشتوں سے بحث کی جو آگے آئی ہے۔ یہ فرشتے نہایت حسین و جمیل نوجوانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا۔ اور اس بڑھاپے میں حضرت سارہ کے بطن سے بیٹا عطا کرنے والا ہے۔ نیز یہ کہ قوم لوطؑ کے بدمعاشوں اور ظالموں کے وجود سے عنقریب دنیا پاک کر دی جائے گی۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے متبعین کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا آپ نے جواب دیا مگر اول وہلہ میں پہچان نہ سکے جیسے ابتدا میں حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ان کو نہیں پہچانا بلکہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ ایک بار جبرئیل علیہ آدمی کی شکل میں آئے اور حضور اقدس ؐ

سے سوال وجواب کرتے رہے۔ جب اُٹھ چلے گئے تب آپ کو بتلایا گیا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔ گویا متنبہ کر دیا کہ نبی کو بھی فرشتہ وغیرہ کا علم ضروری اللہ سبحانہٗ کے دینے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت مخفی رکھنا چاہیے تو کسی کی قدرت نہیں کہ معلوم کر سکے۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں آدمی سمجھ کر مہمان نوازی کے لیے اُٹھے اور نہایت فربہ بچھڑا بھون تل کر سامنے حاضر کیا۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا معاملہ اصل موضوع کی تمہید ہے اور موضوع کے ساتھ اس تمہید کو کیا مناسبت ہے۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اصل موضوع تو بتانا یہ ہے کہ قوموں کا رسولوں کے ساتھ طرز عمل کیا رہا ہے۔ اور اس طرز عمل کا نتیجہ کیا رہا۔ لیکن چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم پر کوئی عذاب نہیں آیا تھا۔ اس لیے یہاں انداز تعبیر تبدیل کر دیا۔ عام انداز تو یہی تھا۔ والیٰ عاد اخاھم، والیٰ ثمود اخاھم، والیٰ مدین اخاھم مگر یہ انداز چھوڑ کر یہ انداز اختیار کیا۔ ولقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشری۔ واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ولقد تاکیدی تعبیر کا انداز اختیار کیا ہے۔ رسل رسول کی جمع ہے اور اس سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ فرشتے کتنے تھے۔ قرآن نے تعداد کی کوئی تصریح نہیں کی۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرشتہ نہیں تھا بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت تھی۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ ایک انداز بیان میں جمع کے صیغے ہیں دوسرے ضیافت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچھڑے کو ذبح کرنا قرینہ ہے کہ ایک نہیں متعدد تھے۔ اور انداز تعبیر سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ فرشتے جس قدر بھی تھے۔ انسانی شکل میں تھے۔ اور عذاب کے لیے نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دینے کے لیے آئے تھے۔ اور انہوں نے آداب ملاقات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان کو سلام کا جواب دیا۔ الجصاص نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے۔ کہ اہل ایمان میں جو سلام رائج ہے یہ فرشتوں کا طریقہ ہے۔ چونکہ وہ انسانی لباس میں تھے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ان کی میزبانی میں لگ گئے۔

فرشتوں کا تجسم و تشکل

تورات میں انبیاء بنی اسرائیل کے قصوں میں فرشتے کے تجسم و تشکل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں۔ انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

[1] افادات شیخ الاسلام

فرماتے ہیں ۔کہ ایک روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آکر آپ کے پاس بیٹھا اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ پر، اس کے فرشتوں پر، اللہ سبحانہٗ سے ملنے پر، اس کے پیغمبروں پر، اور قبر سے دوبارہ جی اُٹھنے پر تم یقین رکھو۔ اس نے پھر پوچھا کہ اسلام کیا ہے جواب میں فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ مفروضہ ادا کرو، روزے رکھو۔ اس نے پھر پوچھا کہ احسان کیا ہے ۔ارشاد ہوا کہ احسان یہ ہے کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات اس طرح رکھو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو یقین کرو کہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے ۔ اس نے پھر سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی ۔ آپ نے فرمایا کہ مجیب اس موضوع پر سائل سے زیادہ واقف نہیں ہے ۔البتہ میں تمہیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں ۔ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں ۔ قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے ۔ جن کو اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے ۔وہ شخص اس کے بعد اُٹھ کر چلا گیا۔آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اسے واپس بلاؤ لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے ۔

صحابہ میں دحیہؓ نامی صحابی بہت حسین تھے ۔جبرئیل علیہ السلام اکثر ان ہی کی صورت میں مجسم ہو کر آتے تھے ۔اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے تھے ۔حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں ۔کہ ایک بار میں نے دیکھا کہ دحیہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں اور آپ سے باتیں کر رہے ہیں ۔مجھے کچھ بھی شک نہیں ہوا کہ یہ دحیہ نہیں ہیں ۔ اتنے میں مسجد نبوی میں آپ کے خطبے کی آواز سنی کہ آپ فرما رہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبرئیلؑ آئے تھے ۔ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ تب میں سمجھی کہ وہ اصل جبرئیل علیہ السلام نہیں دحیہ کلبی تھے ۔چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے ۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ان کی میزبانی میں لگ گئے ۔

توریت میں یہ تفصیل درج ہے کہ

> یہ آنے والے تعداد میں تین تھے ۔ اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے باہر بیٹھا تھا ۔اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کیا اور کیا دیکھا کہ تین مرد اس کے پاس کھڑے ہیں ۔ پیدائش ۱۸ - ۱ - ۲

لیکن قرآن نے کوئی تعداد نہیں بتائی ۔مہمانوں کو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان نوازی اور اکرام مہمان کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ان جاء بعجل حنیذ اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ انہوں نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کر دیا ۔

(۸۴) حضرت ابراہیمؑ کا ڈرنا

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ کھٹکے اور ان سے اپنے جی میں ڈرے۔ آخر یہ کون ہیں؛ کس غرض سے آئے ہیں؛ ہم کھانا پیش کرتے ہیں یہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس وقت کے دستور کے موافق جو مہمان کھانے سے انکار کرتا سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی اچھے خیال سے نہیں آیا۔ ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ اگر آدمی ہیں تو کھانے سے انکار کرنا ضرور کچھ معنے رکھتا ہے۔ اور فرشتے ہیں تو نامعلوم کس مطلب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ آیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا میرے حق میں کوئی ناخوشگوار چیز لے کر آئے ہیں۔ اسی حیص وبیص میں زبان سے اظہار بھی کر دیا انا منکم وجلون۔ یعنی ہم کو تم سے اندیشہ ہے۔ عموماً مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی بھی توجیہات کی ہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے میرے نزدیک لطیف توجیہہ کی ہے۔ کہ فرشتوں کے ساتھ جو عذاب الٰہی تھا۔ اور شان غضب وانتقام بن کر قوم لوطؑ کی طرف جارہے تھے۔ اس کا طبعی اثر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ایک طرح کے خوف وخشیت کی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار انہوں نے انا منکم وجلون کہہ کر کیا یعنی ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے۔[۱]

توریت نے اس مہمانی کی مزید تفصیل بھی درج کی ہے۔

> اور ابراہیمؑ خیمہ میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ آٹا لے کر جلد گوندھ کے پھلکے پکا اور ابراہیمؑ گلے کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اس نے جلد اسے تیار کیا۔ پھر اس نے گھی دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انہوں نے کھایا۔

لیکن فرشتوں کے کھانے کا تصور یہودی تصور ہے۔ لیکن قرآن نے ملائکہ کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں۔ نہ وہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں۔ نہ پیتے ہیں، یہاں قرآن نے یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے انسانی ضروریات سے پاک ہیں چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا اہتمام کیا مگر فلما رآ ایدیہم لا تصل الیہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کو وہ انجان معلوم ہوئے۔ اب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال تھا۔ کہ قرب وجوار کے کسی علاقہ کے کچھ اچھے اور نیک آدمی ہیں لیکن ان کی اتنی محنت اور اتنے ذوق وشوق سے تیار کی ہوئی بھانی کی طرف جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا نہیں تو قدرتاً انہوں نے کچھ بیگانگی محسوس کی اور دل ہی دل میں ڈرے۔ نکرھم واوجس منھم خیفۃ۔ یہاں کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں۔ کہ یہ خوف اس لیے تھا کہ یہ کوئی دشمن یا کوئی ڈاکو تو نہیں۔ دستور یہ تھا کہ جو کوئی دشمن کسی کو اپنا ہدف بنانا چاہتا تھا۔ اس کے یہاں کھانا کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔ اور جس کے ہاں کھانا کھا لیتے پھر اس کو نہ ستاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہی خیال گزرا اور ان سے خوف وہراس طبعی طور پر پیدا ہوا قرطبی لکھتے ہیں۔ وکانوا اذا ارادوا الضیف لا یا کل ظنوا بہ شراً۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن کو اس سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ کھانے کی طرف ان کے ہاتھ نہ بڑھنے سے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے تھے۔ کہ یہ فرشتے ہیں آدمی نہیں۔ اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا غیر معمولی حالات میں ہی ہوا کرتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس بات پر خوف ہوا۔ وہ یہ تھی کہ کہیں بستی کے لوگوں میں سے کوئی کسی سے قصور تو نہیں ہو گیا۔ جس پر گرفت کے لیے فرشتے اس صورت میں آئے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ رقمطراز ہیں۔ کہ

سورہ ذاریات میں سلام قوم منکرون اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ فرشتے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ ان کو قوم پر عذاب کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔

یہ اگر بات وہ بات ہوتی جو کچھ شارحین قرآن نے لکھی ہے تو فرشتے یوں کہتے کہ ڈرو نہیں کہ ہم اللہ کی جانب سے آئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ انا ارسلنا الی قوم لوط۔ ہم تو قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا فرشتہ ہونا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہو گیا تھا پریشانی صرف یہ تھی کہ یہ حضرات جو آئے ہیں تو آخر وہ بدنصیب کون ہے جس کی شامت آنے والی ہے۔ فرشتوں نے یہ دیکھ کر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پریشان ہیں ان کو تسلی دی کہ آپ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم قوم لوطؑ کے لیے آئے ہیں۔ یعنی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم فرشتے ہیں۔ جو قوم لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ آپ کچھ اندیشہ مزرکا نہ کیجئے [1]

(۸۳) حضرت اسحٰقؑ کی ولادت

اور اس کی بیوی بھی کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحٰق علیہ السلام

[1] افادات شیخ الاسلام

کی بشارت دی اور اس کی کہ اسحٰق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔ یعنی حضرت سارہ جو مہمانوں کی خدمت یا اور کسی کام کے لیے وہاں کھڑی تھیں۔ اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنسیں۔ حق تعالیٰ نے خوشی پر اور خوشیاں سنائیں کہ تجھ کو اس عمر میں بیٹا ملے گا۔ اسحٰقؑ اور اس کی نسل سے ایک پوتا یعقوبؑ عطا ہوگا۔ جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل اُٹھنے والی ہے یہ بشارت حضرت سارہ کو شاید اس لیے سنائی گئی۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹا اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن سے پہلے ہی موجود تھا۔ سارہ کو تمنا تھی کہ مجھے بھی بیٹا ملے مگر بوڑھی ہو کر مایوس ہو چکی تھیں۔ اس وقت یہ بشارت ملی۔ بعض علماء نے حضرت سارہ کے ہنسنے کی اور بھی توجیہات کی ہیں۔ مگر ظاہر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ علماءٔ نے ومن وراء اسحٰق ویعقوب سے استدلال کیا ہے کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح نہ تھے اسماعیلؑ تھے۔ ظاہر قرآن بھی ہے کہ حضرت سارہ پہلے اس جگہ موجودہ نہ تھیں۔ فرشتوں کے آنے کی خبر سُن کر سارا گھر پریشان ہو گیا حضرت سارہ بھی اسی گھبراہٹ میں نکل آئیں۔ جیسا سورہ ذاریات میں ہے۔ فاقبلت امرأتہٗ وہ بھی آکر کھڑی ہو گئیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ سن لیا کہ ان کے گھر یا بستی پر فرشتوں کی جانب سے کوئی آفت آنے والی نہیں تو وہ ہنس پڑیں۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ مہمانوں کی خدمت کا فرض انجام دینے کے لیے موجود تھیں۔ اور کچھ کی رائے میں حضرت سارہ بشارت سن کر ہنسیں۔ یہ ہنسی پیش پا افتادہ احوال وظروف میں حیرت، تعجب اور مسرت کے گوناگوں جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس تعجب کا اظہار انہوں نے جس انداز میں کیا۔ آگے آرہا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی رحمت حضرت سارہ کے اس مسرت آمیز اظہار حیرت پر مزید جوش میں آگئی۔ فرشتوں نے ان کو مخاطب کر کے صرف بیٹے ہی کی نہیں بلکہ تعیین کے ساتھ بیٹے اور پھر پوتے کی بشارت دی۔ فبشرناھا باسحٰق ومن وراء اسحٰق ویعقوب۔ یہ ایک بشارت نہیں متعدد بشارتیں ہیں۔ اول اسحٰقؑ کی ولادت ہوگی۔ دوم وہ جوان ہوگا۔ سوم اس کی شادی ہوگی، چہارم اسحٰقؑ کے بچہ ہوگا۔ جس کا نام یعقوب ہوگا۔ پنجم پوتے سے نسل چلے گی۔ فرشتوں نے یہ خوشخبری سارہ کو اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ مگر حضرت سارہ اس وقت تک بے اولاد تھیں۔ اور اس بنا پر ان کا دل زیادہ غمگین تھا۔ ان کے اس غم کو دور کرنے کے لیے فرشتوں نے ان کو ایک نہیں متعدد خوشخبریاں سنائیں۔

حضرت ابراہیم کی تین بیویاں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں۔ سارا، ہاجرہ، قطورا۔ سارا کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ

تھے۔ قطورا کے بطن سے مدین اور ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام ہوئے۔ ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے۔ جس کے معنے بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ جب مصر گئے تو فرعون مصر نے دیگر انعام واکرام کے ساتھ یہ لڑکی بھی ان کو دی۔ اسی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اور سارہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام جن سے بنی اسرائیل کی نسل قائم ہوئی۔ بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ہاجرہ سارہ کی لونڈی تھیں۔ اس لیے بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے برابر نہیں۔ عرب سامیہ اولی کی تاریخ پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اس وقت مصر میں حکمران طاقت عرب کی ایک سامی قوم تھی۔ جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے۔ لفظ ہاجرہ کا عبرانی ہونا بھی اس کی دلیل ہے۔ اس بنا پر فرعون مصر کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرنا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ فی الواقع فرعون کا مقصد اس شادی سے نسبی تعلق کا استحکام تھا۔ اس تاریخی قیاس کی یہودی روایات سے کما حقہٗ تصدیق ہوتی ہے۔ سفر ایشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت ابراہیم کا ہموطن تھا۔ ربی شلوم۔ تورات کا ایک مفسر تکوین کی تفسیر میں لکھتا ہے۔ کہ

> ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے جب سارہ کی کرامات دیکھیں تو کہا کہ اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ سارہ کی خدمت گزار تھیں۔ سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی تھیں۔ مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ الیعرز نامی ایک دمشقی خانہ زاد گھر کا مالک تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرزند کے لیے دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ حضرت سارہ کو یہ دیکھ کر رشک آیا اور وہ ہاجرہ کو ستانے لگیں۔ ہاجرہ نے گھر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کیا وہ ایک چشمہ تک جو شور کے راستہ میں ہے آکر ٹھہر گئیں۔ اس وقت ایک فرشتہ نے ہاجرہ کے سامنے آکر کہا۔

> ہاجرہ اپنی بی بی کے پاس جا۔ میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت کی وجہ سے گنی نہ جائے گی۔ تو ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سنا۔

ہاجرہ کے بیٹا ہوا اور حسب تعلیم الٰہی اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھا گیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ سال تھی۔ ۹۹ سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سارہ کے بطن سے بھی ایک فرزند کے تولد کی بشارت ملی۔ لیکن اس بشارت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس بشارت

کے جواب میں انہوں نے یہ دعا کی ۔

اے کاش اسماعیل تیرے حضور زندہ رہے ۔ تکوین ۱۸

اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ۔

اسماعیل علیہ السلام کے حق میں مَیں نے تیری سُنی ، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا ۔ اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے ۔ اور میں اس کو بڑی قوم بنا دوں گا ۔

تیرہ برس کی عمر میں باپ نے بیٹے کی ختنہ کی ۔ اسی حال میں حضرت اسحٰق علیہ السلام بھی پیدا ہوئے۔[1]

(۸۴) ولادت پر حضرت سارہ کا استعجاب

بولی ہائے افسوس کیا میرے بچہ ہوگا حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میرے شوہر بوڑھے ہیں ۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے یہاں یا ویلتی کا لفظ ایسا ہے ۔ جیسے ہمارے محاورات میں عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ میں "نگوڑی" کیا اس بڑھاپے میں اولاد جنوں گی کہتے ہیں کہ حضرت سارہ کی عمر اس وقت ۹۹ سال تھی ۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۰۰ سال یا اس سے بھی زیادہ کے تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا ہوا تو بالکل انوکھی اور عجیب وغریب بات ہوگی[2] یہ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کی تفصیل ہے ۔ یہ اعتبار ظاہر کے حضرت سارہ کا یہ خوشخبری سُن کر اسباب ظاہری اور مادی کے اعتبار سے اس پر تعجب کرنا بالکل قدرتی تھا ۔ مولانا اشرف علیؒ نے یا ویلتی کا ترجمہ ہائے خاک پڑے اور حضرت شاہ صاحب نے اسے خرابی کیا ہے توریت میں ہے ۔

ابراہیم اور سرّہ بوڑھے اور بہت دن کے تھے ۔ اور سرّہ سے عورتوں کی معمولی عادت موقوف ہوگئی تھی ۔ تب سرّہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کہ بعد اس کے کہ میں ضعیف ہوگئی ہوں اور میرا خاوند بوڑھا ہے کیا مجھے خوشی ہوگی ۔ پیدائش ۱۸

یہ خالص زنانہ انداز میں کہا کیا میں نگوڑی بچہ جنوں گی یا ہائے خاک پڑے میرے بچہ ہوگا میں سن ایاس کو پہنچ گئی ہوں اور یہ میرے میاں بھی کھوسٹ ہوچکے ہیں ۔ یہ تو بڑے ہی اچنبھے کی بات ہوگی ۔ یعنی حضرت سارہ نے اولاد ہونے کی ساری رکاوٹیں اس فقرے میں بڑے بلیغ اور حکیمانہ انداز میں کہہ کر

---

[1] ارض القرآن ۔ [2] افادات شیخ الاسلام

یہ اطمینان کر لیا کہ ساری رکاوٹیں دور ہو کر اولاد ہوگی ۔ حضرت سارہ نے جو باتیں کہی ہیں ۔ وہ اولاد کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کے قانونِ عام کی باتیں ہیں ۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت قانونِ عام کے خلاف قانون خاص کے مطابق ہوئی ہے ۔ تخلیق میں اللہ کا قانونِ عام اور عادت جاریہ تو یہی ہے ۔ کہ پیداوار ہوتی ہے جب بیج صحیح ہو ۔ اور زمین میں قبول کرنے کی صلاحیت ہو ۔ یعنی فاعل میں تاثیر ہو اور مفعول میں تاثر و انفعال ہو لیکن قانون خاص یہ ہے کہ نہ زمین ہو اور نہ بیج ہو ۔ پھر پیداوار ہو جائے ۔ جیسے آدم علیہ السلام کی تخلیق ۔ صرف بیج سے بغیر زمین کے تخلیق ہو جائے جیسے حوا کی تخلیق ۔ زمین بنجر ہو ۔ بیج بیجا ہو پھر تخلیق ہو جائے جیسے عیسٰی علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی تخلیق ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسباب ظاہری کے لحاظ سے تعجب کرنا مسبب الاسباب پر یقین کامل رکھنے کے منافی نہیں ہے ۔

(۸۵) حضرت سارہ کو فرشتوں کا جواب

انہوں نے کہا کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ سبحانہٗ کے کام پر ۔ اے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے والو تم پر اللہ کی رحمت اور برکتوں کا نزول ہو بلا شبہ اللہ ہی کی ذات قابل ستائش اور بڑائیوں والی ہے ۔ یعنی جس گھرانے پر اللہ سبحانہٗ کی اس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل ہو رہی ہیں ۔ اور جنہیں ہمیشہ معجزات و خوارق دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ان کیلئے یہ کوئی تعجب کا مقام ہے انکا تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے انہیں لائق ہے کہ بشارت سنکر تعجب کی جگہ اللہ سبحانہٗ کی تحمید و تمجید کریں ۔ کہ سب بڑائیاں اور خوبیاں اسکی ذات میں جمع ہیں ۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود پڑھتے ہیں ۔ اس کے الفاظ میں اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے [1] حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے ۔

فرشتوں نے کہا کہ اے سارہ اللہ تعالیٰ کے کاموں پر حیران نہ ہو ۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے ۔ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے ۔ اس پر حیران ہونے کی کوئی بات نہیں تم بوڑھی ہو ۔ سن ایاس کو پہنچ گئی ہو اور تمہارے شوہر بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اللہ کے سارے اقوال و افعال قابل ستائش ہیں وہ اپنی ذات و صفات میں بزرگی والا ہے ۔

اور قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں ۔

اے نبوّت کے گھرانے والو تم بھی انکار کرتے ہو ۔ حالانکہ معجزات و خوارق اور کرامات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں تمہارے لیے یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ اس معاملہ میں تو کسی عقل مند کو بھی حیرت نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ تم جن کی نشو ونما ہی معجزات وخوارق کی آغوش میں ہوئی ہے۔

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ

فرشتوں کو حضرت سارہ کے تعجب پر حیرانی ہوئی کہ مہبط وحی، بیت النبوۃ، کرامات و معجزات کے گھرانے میں سے ہو کر اللہ کے الطاف پر حیران ہونا تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ تمہیں تو اللہ کی رحمت اور برکتوں کا نزول سُن کر اس کی تحمید وتمجید کرنی چاہیئے۔

مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت سارہ کے اظہار تعجب پر بڑے ادب و احترام سے کہا کہ اے اہلبیت نبی اللہ سبحانہٗ کے کسی کام اور اس کے ارادے پر تعجب کی کہاں گنجائش ہے پھر آپ پر تو اس کے خاص الطاف اور بے پایاں رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ وہ بڑا ہی سزاوار حمد اور بڑا ہی بزرگ و برتر ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اگرچہ یہ اللہ کی عادت عام اور سنت جاریہ کے خلاف ہے۔ اس عمر میں بلاشبہ اولاد نہیں ہوتی ہے۔ لیکن قانون عام اللہ کی شان حکیمی ہے۔ اور قانون عام کے خلاف ہو جانا اللہ سبحانہٗ کی شان قدیری ہے۔ اور جب یہ خوشخبری اللہ کی جانب سے دی جا رہی ہے تو تم جیسی کو جس کا تعلق نبوّت کے گھرانے سے ہے اس پر حیران نہ ہونا چاہیئے۔

ایک لطیف نکتہ

اس سے ایک لطیف بات یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اللہ سبحانہٗ کی بنائی ہوئی راہیں ہیں۔ اسی لیے قرآن میں ان کا نام سنۃ اللہ یعنی قانون عام ہے اور یہ حق تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ قدرت کے باوجود بندوں کی آسانی کے لیے جس چیز کی پیدائش کا جو قانون بنا دیا ہے عموماً اسے بدلا نہیں جاتا ہے۔ اسی عدم تبدیلی پر ہمارے تمام عقلی قوانین کی قانونیت قائم ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ پیدائش کی عام راہوں کے متعلق ہماری جو معلومات ہیں۔ سنۃ اللہ کے تمام گوشوں پر ان کے حاوی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ آگ جلاتی ہے بے شک عام آدمیوں کے لیے یہی اللہ کی سنت ہے لیکن کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنے رسولوں کے ساتھ یہی خدا کی بھی سنت ہے۔ سنۃ اللہ کی عدم تبدیلی کے معنے یہ نہیں ہیں۔ کہ جو علم سنۃ اللہ کے بارے میں ہمیں حاصل ہوا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر اسی کے مقابلے میں جو پیدا کر رہا ہے وہ خود بھی غیر متبدل اور اس کے متعلق جو ہمارا علم ہے وہ بھی غیر متبدل

ہے۔ قرآن ان تدبیروں کا بھی احترام کرتا ہے جو تغیر پذیر معلومات پر قائم ہیں۔ جنہیں آپ عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ لیکن تدبیری کا وہ شعبہ جو ناقص معلومات پر نہیں بلکہ علم کے لازوال ٹھوس، غیر متبدل اساس پر قائم ہے۔ جس میں بہتوں سے نہیں بلکہ اس تدبیر میں صرف ایک ہی سے کہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے ایک ہی سے پاتا ہے جو کچھ پاتا ہے اسی کے ساتھ اگر یہ بھی پیش نظر ہو کہ اس راہ میں جس سے ہمارا تعلق ہے وہ حمید مجید، حیی قیوم زندہ و توانا، دانا و بینا ذات ہے صرف یہ ہی نہیں بلکہ رحم و کرم سے معمور ہے۔ اپنے رسول کے ذریعے اس نے خود اپنی اس خصوصیت کا اعلان کیا ہے۔ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ سبحانہٗ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔ جس کا کام ہی دینا ہے اگر اسی کے حکم کے مطابق

ربُ المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا۔

کی تعمیل کرتے ہوئے براہ راست اس سے مانگیں اور وہ اس کے جواب میں اپنے قانون قدرت کا ہم سے معاملہ کرے، بانجھ عورت کو بچہ دے دے۔ انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری کر دے تو اس میں عقلاً، دیناً، ایماناً اور فطرۃً حیرت کی کون سی بات ہے۔ یہی بات فرشتوں نے حضرت سارہ سے نبوت کے گھرانے کا حوالہ دے کر فرمائی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ ٱلْبُشْرَىٰ يُجَٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ﴿٧٥﴾ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾

پھر جب حضرت ابراھیم علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہو گئی اور ان کو خوشخبری مل گئی۔ تو ہم سے قوم لوطؑ کے بارے میں جھگڑنے لگے[۸۶] فی الواقع حضرت ابراھیمؑ علیہ السلام بڑے ہی بردبار بڑے ہی نرم دل اور اللہ کی طرف رجوع کرنیوالے تھے[۸۷] ہمارے فرشتوں نے کہا کہ اے ابراھیم علیہ السلام اس کا خیال چھوڑ دے تیرے رب کا حکم آچکا ہے۔ ان پر عذاب آکر رہے گا جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔[۸۸]

مفردات کے معانی

اوّاہ۔ نرم دل، بہت آہ کرنے والا اوہ سے جس کے معنے آہیں بھرنے کے ہیں۔ مبالغہ کا صیغہ بروزن فعال ہے۔ اوّاہ سے کیا مراد ہے۔ علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں ۱۶ معانی لکھے ہیں۔ آخر میں لکھا ہے کہ لغت کے اعتبار سے اوّہ کے یہ معانی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ کہ اوّاہ وہ ہے جو اپنے گناہوں پر

بہت زیادہ آہیں بھرے مثلاً یہ کہے کہ آہ میرے گناہ، آہ مجھے اس پر کیا سزا ملے گی۔ فراء کا بھی یہی بیان ہے اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ ان سب اقوال میں اولیٰ اس شخص کا قول ہے جو اس کے معنے بہت زیادہ دعا کرنے والے کے بیان کرتا ہے۔ سیاق قرآنی کے بھی یہی مناسب ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی سفارش

حسن ادب اور محبت و اعتماد کے ساتھ کسی سے اپنی بات اصرار اور الحاح کے ساتھ منوانے کی کوشش کرنا مجادلہ حسن کہلاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب تک اصل منصوبہ فرشتوں کے آنے کا واضح نہ ہوا تھا۔ اس وقت تک وہ متردد اور فکرمند رہے لیکن جب ان کو بیٹے کی بشارت مل گئی اور اپنے بارے میں اطمینان ہو گیا۔ تو اب ان کو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور اللہ سبحانہٗ سے انکی سفارش شروع کردی۔ اور اپنی بات کی پذیرائی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایسے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم تورات سے مجادلہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ البقاعیؒ نے بھی تفسیر میں تورات سے نقل کیا ہے۔

> تب وہ مرد وہاں سے اٹھے اور انہوں نے سدوم کا رُخ کیا اور ابراہیمؑ ان کو رخصت کرنے کو ان کے ساتھ ہو لیا اور خداوند نے کہا کہ کیا جو کچھ میں کرنے کو ہوں کیا اسے ابراہیمؑ سے پوشیدہ رکھوں۔ ابراہیمؑ سے تو یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہو گی۔ اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹے اور گھرانے کو جو اس کے پیچھے رہ جائیں گے۔ وصیت کرے گا کہ وہ خداوند کی راہ پر قائم رہ کر عدل اور انصاف کریں تاکہ جو کچھ خداوند نے ابراہیمؑ کے حق میں فرمایا ہے اس کو پورا کرے۔ پھر خداوند نے فرمایا کہ چونکہ سدوم اور عمورہ کا شور بڑھ گیا ہے اور ان کا جرم نہایت سنگین ہو گیا ہے۔ اس لیے میں جا کر دیکھوں گا کہ کیا انہوں نے سراسر ویسا ہی کیا ہے جیسا شور میرے کان تک پہنچا ہے۔ اور اگر نہیں کیا تو میں معلوم کروں گا۔ سو وہ مرد وہاں سے مڑے اور سدوم کی طرف چلے پھر ابراہیمؑ خداوند کے حضور کھڑا رہا تب ابراہیمؑ نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کر دے گا۔ شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں کیا تو انہیں ہلاک کر دے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا۔ ایسا کرنا تیرے سے بعید ہے کہ نیک

کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا۔ اور خداوند نے فرمایا اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہیمؑ نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کر دے گا۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہ کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہ کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس ملے تو بھی میں ایسا نہ کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں اس نے کہا کہ میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہ کرونگا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا کہ دس کی خاطر بھی اسے میں نیست نہ کروں گا۔ جب خداوند ابراہیمؑ سے بات کر چکا۔ تو چلا گیا اور ابراہیمؑ اپنے مکان کو لوٹا۔ پیدائش۔ باب ۱۸ - ۱۶ تا ۳۳

تورات نے مجادلہ کی یہ تصویر پیش کی ہے۔ قرآن نے اس ساری داستان کو کیسے پیش کیا ہے یہ ہم آگے تشریح میں بتائیں گے۔

(۸۶) پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہو گئی اور ان کو خوش خبری مل گئی۔ تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ تورات میں اس مجادلہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ وہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ عام شارحین نے مجادلہ کی بھی تشریح الفاظ کے اختلاف سے نقل کی ہے۔ کہیں سعید بن جبیرؓ کے حوالہ سے، کہیں قتادہ کے واسطہ سے لیکن خود قرآن نے اسی مجادلہ کی دوسری جگہ جو تفصیل دی ہے۔ وہ ہی صحیح ہے۔

ولما جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرىٰ قالوا انا مهلكوا اهل هذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين ٥ قال ان فيها لوطا۔ قالوا نحن اعلم بمن فيها لننجينه واهله الا امرأته كانت من الغابرين۔

جب ابراہیمؑ کے پاس ہمارے رسول خوشخبری لے کر آئے تو رسولوں نے بتایا کہ ہم اس بستی کو ہلاک کرنے آئے ہیں کیونکہ اس کے باشندے سب ظلم کار لوگ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بستی میں حضرت لوط علیہ السلام بھی ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ اس بستی میں جو بھی ہیں۔ ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم لوط علیہ السلام اور ان کے گھرانے کو ضرور بچائیں گے ہاں مگر لوط علیہ السلام کی بیوی کو نہیں بچایا جائے گا۔

تورات کے بیان کردہ اور قرآن کے پیش کردہ مجادلہ کا بغور تقابلی مطالعہ فرمایئے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تورات جس بات کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف کر رہی ہے قرآن اسی کی نسبت ملائکہ کی طرف کر رہا ہے۔ تورات خود اللہ سبحانہٗ کے بار بار آنے اور سدوم جانے کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اسی لیے گھبرا کر اپنے فوائد میں لکھا ہے۔ کہ

تفاسیر میں اس بحث کی جو تفاصیل بیان ہوئی ہیں۔ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔

اور علامہ آلوسیؒ نے قرآن کے پیش کردہ مجادلہ کا حوالہ دے کر تورات کی تفصیلات کو ناقابل پذیرائی قرار دیتے ہوئے لکھ دیا ہے۔ وھٰذا القدر من القول ھو المتیقن۔

(۸۷) حضرت ابراہیمؑ کا مقام

فی الواقع حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے ہی بردبار، بڑے ہی رحمدل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ بہرحال فرشتوں سے مکالمہ کو مبالغۃً یجادلنا سے تعبیر فرمایا۔ جس سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحم دلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ شانہٗ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے[1]

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال انابت کی مثال ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت دردمند نہایت غم گسار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرشتوں کے ساتھ مجادلہ ان کی صفات کا مظاہرہ تھا۔ اس مجادلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم لوط نابکار قوم کی سفارش اس طرح کرتے ہیں کہ اپنے دل کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ تو ان کے حلم اور ان کی دردمندی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اور کمال انابت کی اس سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ معلوم ہے کہ قوم لوط کا پیمانہ لبریز ہے۔ لیکن وہ برابر سرگرم التجا ہیں۔ التجا چونکہ اپنے اندر محبت، اعتماد، ناز اور دردمندی کے پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لیے اسے بطور مبالغہ مجادلہ فرمادیا۔ بظاہر مجادلہ کے لفظ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بندے اور اللہ سبحانہ کے درمیان دیر تک ردوکد جاری رہی۔ بندہ اصرار کررہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط سے عذاب ہٹ جائے اور اللہ سبحانہ فرمارہے ہیں۔ کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے۔ تورات میں اس مجادلہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ وہ اللہ اور بندے کے درمیان مادی اور جسمانی تعلق کی تصویر ہے۔ اور قرآن نے اس کی جو تصویر پیش کی وہ اس سے دور ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح اللہ سبحانہ اور بندے کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کرسکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعے ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر تورات کے مصنفین نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بہترین اسلوب سمجھا چنانچہ تورات نے ابراہیمؑ اور اللہ کے مجادلہ کی ایک جسمانی اور مادی تصویر یہ کہہ کر پیش کی کہ ابراہیم خدا کے حضور کھڑا ہی رہا تب ابراہیم نے نزدیک جاکر کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اور بندے کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعے ظاہر کرنے ہی سے انسانی فکر میں بے راہ روی پیدا ہوئی ہے۔ اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ خواص تک کو گمراہ کردیا جو لفظ کی اصلی روح چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں پڑ گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ سبحانہ کا بیٹا بنادیا۔ قربان جائیے قرآن کی بلاغت کے حضرت ابراہیمؑ کی محبت کے اللہ سے تعلقات کو صرف اس ایک فقرے میں سمو دیا کہ

ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب

اس فقرے کو پڑھیئے اور تقابلی مطالعہ کے لیے تورات کے باب ۱۸ پیدائش کی ۸ سے آیت نمبر ۳۳ تک پڑھیئے قرآن کے اس اجمال نے تمام معنوی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خطا کاروں سے انتقام میں جلد باز نہ تھے۔ حلم و وقار ان کی طبیعت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ لوگوں کی خطاؤں پر بہت زیادہ آہیں بھرنے والے تھے۔ مخلوق کے لیے دردمندی اور دل سوزی ان کی عادت تھی۔ وہ اس کے ساتھ منیب تھے۔ یعنی اللہ سبحانہ کی جناب میں التجائیں کرنے والے دعائیں مانگنے والے تھے۔

(۸۸) قوم لوط پر عذاب آکر رہے گا

ہمارے فرشتوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ اس کا خیال چھوڑ دے تیرے رب کا حکم آچکا ہے۔ ان پر

عذاب آکر رہے گا جو کبھی ٹل نہیں سکتا ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا یہ جواب ہے کہ اس خیال کو چھوڑیئے ان ظالموں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ۔ اب اللہ سبحانہٗ کا حکم واپس نہیں ہو سکتا عذاب آکر رہے گا ۔ جو کسی سفارش وغیرہ سے ٹل نہیں سکتا [1] پہلا دارالجزا یہی دنیا ہے ۔ اگرچہ ہر نیک و بد کو پوری جزا آخرت میں ملے گی ۔ لیکن اس نیک و بد کے مماثل اس موجودہ زندگی میں مل جاتی ہے ۔ انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین و اطمینان، سرور، فارغ البالی حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں ۔ ان کے برخلاف ذلت و رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم وخوف، محکومیت، آفات و زلازل اس کے اعمال بد کے اثرات ہیں ۔ قوم لوط اپنے بھیانک کردار کی وجہ سے ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی اور بدکاریوں میں مست ہو رہی تھی ۔ اور نبوت کی نصیحتوں پر کان نہ دھرتی تھی ۔ اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ ہوا ۔ کہ اس بدکار قوم کے وجود کی نجاست سے زمین کو پاک کر دیا جائے ۔ اس واقعہ کو پیش کر کے قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے ۔ کہ اللہ کا قانون جزا سب کے لیے یکساں اور برابر ہے اور اس میں کسی کی رعایت نہیں ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے پیغمبر کی سفارش التجا اور دعا بھی اسے روک نہیں سکتی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ کے قانون مکافات میں رنگ، نسل، وطن اور زبان بے معنے چیزیں ہیں ۔ اصلی قیمت ایمان و عمل کی ہے ۔ نہ نبی کی صاحبزادگی عذاب سے بچاتی ہے ۔ اور نہ نبی کی شفاعت اور التجا ۔ یہ قانون مکافات کا مظاہرہ ہے ۔ کہ ایک طرف ابراہیم علیہ السلام ہیں ۔ جو حق و صداقت کی خاطر گھر سے بے گھر ہوئے ۔ ایک اجنبی ملک میں مقیم ہیں ۔ اور بظاہر کوئی طاقت ان کے پاس نہیں ہے ۔ مگر اللہ سبحانہٗ ان کے حسن عمل کی یہ جزا ان کو دیتا ہے ۔ کہ بانجھ بیوی کے پیٹ سے بڑھاپے میں اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں ۔ پھر ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے ۔ جس کی عظمت کے ڈنکے صدیوں تک بجتے رہے ۔ دوسری طرف قوم لوط ہے جو اسی سرزمین کے ایک حصہ میں اپنی خوشحالی پر مگن اور اپنی بدکاری میں مست ہے ۔ دور دور تک کہیں اس کو اپنی شامت اعمال کے آثار نظر نہیں آتے مگر جس تاریخ کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بڑی اقبال قوم اٹھانے کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ ٹھیک اسی تاریخ میں اس بدکار قوم کو دنیا سے نیست و نابود کیا جاتا ہے ۔ اور وہ ایسے عبرتناک طریقے سے فنا کی جاتی ہے ۔ کہ آج اس کی بستیوں کا نشان تک نہیں ملتا ۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے ۔ کہ مقبول سے مقبول بندے کی بھی دعا یا سفارش کا قبول ہو جانا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لازمی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام معمولی ہستیاں نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بیٹے کے بارے میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قوم لوط کے بارے میں قبول نہیں ہوئی۔ خود سید الانبیاء والمرسلین کو خطاب کر کے قرآن ہی میں بتایا گیا ہے۔ کہ منافقین کی مغفرت کی درخواست اگر ستر بار بھی پیش کرو گے۔ تو اسے منظور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حصول مقاصد کی دعا کی تدبیر سے کسی درجہ میں غفلت کر لی جائے قبول کرنا نہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ مانگنا بندے کا کام ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر میں نصرت کا وعدہ کر لیا گیا تھا۔ مگر باوجود وعدے کے صرف اس لیے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ سب سے غنی ہے۔ کیا معلوم ایفائے عہد کب کیا جائے گا۔ کس حال میں کیا جائے گا۔ اللہ کے وعدوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والی ہستی کو میدان بدر میں دیکھا گیا تھا۔ کہ سر مبارک خاک پر پڑا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

> میں نے بدر کے دن لڑائی میں حصہ لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ سجدے میں پڑے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یاحی یا قیوم میں پلٹ آیا اور لڑائی میں شریک ہو گیا۔ پھر آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حالت میں پایا۔

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں ہے۔ مونڈھے مبارک سے چادر ڈھلک کر گر گئی ہے۔ لیکن پورے انہماک کے ساتھ دل کی ساری قوت و توجہ الحاح واصرار کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

> یا اللہ آپ کو آپ کا عہد آپ کا وعدہ یاد دلاتا ہوں اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو اے اللہ اگر اہل ایمان کی یہ جماعت تباہ ہو گئی تو آپ کی زمین میں پوجا نہ ہو گی۔

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی نصرت کو جس بے کلی اور اضطراب کے ساتھ آج مانگا جا رہا ہے۔ کہ بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

> ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم گشتہ چیز کوئی تلاش کر رہا ہو اس طرح جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کو تلاش کر رہے تھے۔ یعنی اس کی نصرت کو تلاش کر رہے تھے۔

اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں آپ کی بے قراری دیکھ کر دیکھنے والوں سے رہا نہیں جاتا تھا۔ اور جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ

> حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے دست مبارک کو پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے۔

اسی کی تفصیل صحیح مسلم میں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے اور آپ کی چادر پکڑ لی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مونڈھے پر ڈال دی۔ اور پھر ابو بکرؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے۔ آپ کے پیچھے سے اور یوں کہہ رہے تھے کہ اللہ کے رسول آپ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کیا جائے گا۔

وعدہ تو جو کیا گیا تھا۔ بہر حال پورا ہونا تھا پورا ہو کر رہا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حصول مقاصد کی دعائی تدبیر کی جو تعلیم نبوت کی راہ سے ملی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں اپنی معاشی ضرورتوں میں بھی دعائی طریقہ عمل کو پوری قوت کیساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ دعائی تدبیر میں لگ کر عقلی تدبیر سے تعلق ہوجائے۔ بدر کی جنگ میں دعائی تدبیر کیساتھ اتنا انہماک تھا مگر اسکے ساتھ دوسری طرف جن راہوں سے حق سبحانہ جنگ میں کامیاب ہونے والوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں۔ ان ضوابط و قوانین کے اختیار کرنے میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ میدان جنگ میں بہترین جگہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال کی ترکیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ٹیلوں کا استعمال کب کیا جائے۔ غنیم پر کس وقت حملہ کیا جائے۔ مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک دشمن کی ہر حرکت کو منقطع کرنے کی تدبیر کی گئی۔ اس سارے کام کی نگرانی خود فرما رہے تھے۔ یہاں تک کہ دست مبارک میں تیر لے کر صفوں کی ترتیب درست فرما رہے تھے۔

راہ حق اور راہ اعتدال یہی ہے کہ جو پیدا کر رہا ہے۔ اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں آرہی ہیں۔ ان میں بھی تلاش کیا جائے۔ تعلیم کی یہی جامعیت قرآن کی خصوصیت ہے۔ ہم اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ معالم القرآن کی تیرھویں جلد میں کریں گے۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ قَالَ يَا قَوْمِ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي ۖ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾

اور جب ہمارے فرشتادے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمزدہ ہوئے اور دل تنگ ہو گئے اور بولے کہ آج کا دن بڑا ہی سخت ہے [۸۹] اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ بے اختیار دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور وہ پہلے ہی سے بدکاریوں کے متوالے تھے [۹۰] حضرت لوط علیہ السلام ان کی آمد کا مقصد بھانپ کر بولے لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں اللہ کی نافرمانی سے بچو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو کیا تم

میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے ۹۱ وہ بولے تمہیں تو پتہ ہی ہے۔
کہ تمہاری بیٹیوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ اور تمہیں یہ بھی
علم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں ۹۲

مفردات کے معانی

سیئ بسا یسوء سے قبل کے وزن پر ماضی مجہول کا واحد مذکر غائب ہے۔ اسی سے سوء اسم ہے۔ بُرائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے۔ کہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے امام راغب فرماتے ہیں۔ سوء ہر وہ چیز ہے جو آدمی کو غم میں ڈال دے خواہ دنیا کے کاموں میں سے ہو یا آخرت کے، احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ سے، یا ان حالات میں سے ہو جو جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ سیئ کے معنے ہیں۔ وہ غمگین ہوا، اسے برا معلوم ہوا ہے۔

ضاق بھم ذرعًا۔ یعنی ان سے عاجز ہوگیا۔ عربی محاورہ ہے۔ علامہ جوہری فرماتے ہیں جب آدمی میں کام کرنے کی طاقت نہ رہے۔ تو بیچارگی کے اظہار کے لیے بولتے ہیں۔ ضقت بالامر ذرعًا۔ کام کرنے کی طاقت ہو تو محاورہ میں رحب الذراع۔ کہتے ہیں اور طاقت نہ ہو تو ضیق الذراع کہتے ہیں۔

یوم عصیب۔ سخت دن عصب سے ہے۔ جس کے معنے خوب کس کر باندھنے کے ہیں۔ عصیب فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں۔ فراء کہتے ہیں۔ کہ یوم عصیب کے معنے سخت گرم دن کے یا سخت دن کے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں۔ کہ یہ عصب القوم امر یعصبھم عصبا سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ کسی سخت بات کا پیش آ کر لوگوں کو اکٹھا کر دینا اسی سے عصابۃ جماعت کو کہتے ہیں۔

یھرعون، جمع مذکر غائب مضارع مجہول اھراع باب افعال سے تیز دوڑتے ہوئے۔ اس کا مجرد ہرع ہے۔ اگر باب فتح سے ہو تو تیز چلانا اور اگر باب سمع سے ہو تو تیز چلنا اور خون بہنا۔

قوم لوطؑ اور اس کی بدکاری

یہ بات پہلے سُن چکے ہو کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادے ہیں۔ ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ گزرا ہے۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت میں پہلے مسلم ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی اہلیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ مصر میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

تورات میں ہے۔ کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی سازوسامان اور مویشیوں کے بڑے ریوڑ تھے۔ اس لیے ان کے چرواہوں میں باہم کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا۔ اور طے یہ پایا کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقے سدوم اور عامورہ میں چلے جائیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس فلسطین چلے جائیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب سدوم آکر قیام کیا دیکھا کہ یہاں کے شہری بدکاریوں اور گناہوں کے اس قدر شکار ہیں۔ کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں جس کے وہ دلدادے نہ ہوں۔ دنیا کی سرکش متمرد اور بداخلاق اور بداطوار کے سارے عیوب کے علاوہ ان میں ایک خبیث عمل بطور فیشن اور تہذیب کے موجود ہے۔ اور اس کی ایجاد کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ یعنی وہ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عورتوں کی جگہ مردوں اور لڑکوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اور اس میں زیادہ شرارت اور خباثت یہ تھی کہ یہ بدکرداری اور خباثت ان میں ایک فیشن تھا وہ کرتے تھے اور علی الاعلان کرتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ تو ان کی اخلاقی حالت تھی اور معاملات میں ان کا حال کیا تھا۔ عبدالوہاب نجار کی زبانی سنیئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں پڑھا ہے۔ کہ

> اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی۔ کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا۔ کہ جب کوئی سوداگر باہر سے سدوم آتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیز اٹھاتا اور لے کر چل دیتا۔ بیچارہ تاجر حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا۔ اب اگر وہ مال کے ضائع ہونے پر زبان سے شکوہ کرتا۔ روتا شور مچاتا تو یہ لٹیرے دوسری عیاری کرتے

ان میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی ایک چیز دکھا کر کہتا کہ میں تو یہ لے گیا تھا ۔ تو یہ تمہاری چیز موجود ہے ۔ تاجر رنجیدہ آواز میں کہتا ۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا ۔ جہاں میرا سارا مال لٹ گیا ہے وہاں یہ بھی سہی جا تو بھی اپنے پاس رکھ لے بعد دیگرے سب لٹیرے یہی پارٹ ادا کرتے بالآخر اس طرح سوداگر کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ۔

یہ واقعہ تاریخی اور روایتی اعتبار سے کیا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے ۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے ۔ کہ سدوم کے شہری اس قدر ظلم ، فحش ، بے حیائی ، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے ۔ کہ اس دور میں ان کے بارے میں لوگوں کے خیالات یہ ہیں ۔

اس شہر میں حضرت لوط علیہ السلام تبلیغ و دعوت کا کام کر رہے تھے ۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور بدکرداریوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی ۔

(۸۹) اور جب ہمارے فرستادے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمزدہ ہو گئے اور دل تنگ ہو گئے اور بولے کہ آج کا دن بڑا ہی سخت ہے ۔ فرشتے نہایت حسین و جمیل بے ریش و بروت نوجوانوں کی شکل میں تھے ۔ ابتداءً حضرت لوط علیہ السلام نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں ۔ معمولی مہمان سمجھے ادھر اس قوم کی بے حیائی اور خوئے بد معلوم تھی ۔ سخت فکرمند اور تنگ دل ہوئے کہ یہ بدمعاش ان مہمانوں کا پیچھا کریں گے ۔ مہمانوں کو چھوڑنا بھی مشکل اور ان خبیثوں کے ہاتھ سے چھڑانا بھی مشکل ۔ گویا ساری قوم سے لڑائی مول لینا ہے[1]

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت پہنچانے اور قوم لوط کے انجام بد سے باخبر کرنے کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کی خدمت میں آئے حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ چند خوبرو چہرے دروازے پر ہیں ۔ قرآن کے انداز بیان سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے ۔ کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے ۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اس بات سے بے خبر تھے ۔ کہ یہ فرشتے ہیں ۔ انکم قوم منکرون ۔ آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔ ان اجنبی مہمانوں کی آمد سے آپ کو بہت پریشانی ہوئی ۔ پریشانی کی وجہ ظاہر ہے ۔ کہ جب پوری قوم فسادِ اخلاق میں مبتلا ہے تو ایسے خوش شکل نوواردوں کا دروازے پر آنا گویا شہر کے سارے اوباشوں کو دعوت مبارزت دینے کے

[1] افادات شیخ الاسلام

مترادف ہے۔ یعنی حالات کا مقابلہ کرنے میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیچارگی اور اس بیچارگی میں دل کی پریشانی کی بھرپور نمائش ہو رہی تھی۔ پریشان تھے۔ کہ حالات کا مقابلہ کیسے کیا جائے اور کس تدبیر سے مہمانوں کو غنڈوں کی دستبرد سے بچایا جائے اسی بیچارگی اور دل کی پریشانی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ ھذا یوم عصیب۔ یہ بات حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے جی میں کہی۔ آیت میں حالات کی کیسی بلیغ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار معاملے میں سب سے پہلی چیز اندر کی کڑھن اور گھٹن ہوتی ہے۔ سیئ بھو اسی کی تعبیر ہے۔ گھٹن ہوتی ہے تو آدمی بچنے اور چھٹکارے کیلئے پریشان ہوتا ہے پریشانی میں جب بیچارگی کا شدید دباؤ ہوتا ہے۔ تو بیچارگی اور پریشانی کو بہت زیادہ محسوس کرکے جی ہی میں کہتا ہے کہ دن بڑا کٹھن ہے۔ کیا کیا جائے

(۹۰) قوم لوط کی آوارگی

اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ بے اختیار دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور وہ پہلے ہی سے بدکاریوں کے متوالے تھے یعنی اس قوم کو نامعقول حرکتوں اور خلاف فطرت فواحش کی جو عادت پڑی ہوئی تھی۔ کہاں چین سے بیٹھنے دیتی۔ وہ ایسے خوبصورت لڑکوں کی خبر پاتے ہی نہایت بے حیائی کے ساتھ لوط علیہ السلام کے مکان پر اندھا دھند چڑھ دوڑے اور قوت اور شدت سے مطالبہ کیا کہ مہمان ان کے حوالے کر دیئے جائیں کیونکہ ہم پہلے ہی منع کر چکے ہیں کہ تم کسی مرد کو اپنا مہمان نہ بنایا کرو۔ یہاں آنے والے مہمانوں کو ہم پر چھوڑ دو ہم جو چاہیں کریں[1]۔ یہ دو فقرے یھرعون الیہ اور ومن قبل کانوا یعملون السئیات۔ قوم لوط کی بد اخلاقی کی پوری تصویر پیش کر رہے ہیں۔ جو بات ان دو فقروں میں کہہ دی گئی ہے۔ وہ پوری ان کی زندگی کی تاریخ ہے۔ غور فرمایئے۔ کہ بستی میں ایک شخص کے گھر چند مہمان آئے ہیں خبر سنتے ہی میزبان کے گھر پر ہلہ بول دینا، اوباشوں کے ایک گروہ کا آجانا اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ میزبان سے مطالبہ کرنا کہ اپنے مہمانوں کو بدفعلی کے لیے ہمیں دے دو۔ اور ان غنڈوں کی پوری شہری زندگی میں اتنی طاقت تھی کہ پوری آبادی میں کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں کو کھلم کھلا زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ ہوتی تھی۔ سوچیئے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام جیسے معلم اخلاق اور پاکیزہ انسان کے گھر پر بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو رہا ہے تو عام شہریوں کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ سب ایک ہی حمام میں ننگے تھے ۔ اور برائی کو برائی نہیں بلکہ اچھائی سمجھ رہے تھے ۔ قرآن ومن قبل کانوا یعملون السیات کے ذریعے یہ انکشاف بھی کر رہا ہے ۔ کہ ان میں صرف یہ ایک ہی برائی نہ تھی بلکہ اور بھی بہت زیادہ برائیوں کا گہوارہ بنے ہوئے تھے ۔ ان برائیوں کا جو نقشہ تلمود میں پیش کیا گیا ہے ۔ ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ۔

ایک مرتبہ ایک جیلانی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا ۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھہرنا پڑا اس کے پاس اپنا زاد راہ تھا ۔ اس نے کسی سے میزبانی کی درخواست نہ کی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا ۔ ایک سدومی اصرار کے ساتھ اسے اپنے گھر لے گیا ۔ رات اسے اپنے گھر رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا ، اس کی زین اور مال تجارت چھین لیا ۔ اس نے شور مچایا مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی ۔

ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے الیعزر نامی غلام کو سدوم روانہ کیا ۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے ۔ الیعزر نے اس کو شرم دلائی کہ بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو ۔ جواب میں سر بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا ۔

ایک بار ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا ۔ کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا ۔ فاقہ سے بدحال ہو کر ایک جگہ گر پڑا تھا ۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اسے کھانا پہنچایا ۔ اس پر حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی ۔ اور دھمکی دی گئی کہ اس طرح کہ ہمارے شہر میں نہیں رہ سکتے ہو ۔

اسی طرح کے متعدد واقعات لکھنے کے بعد تلمود کا مصنف لکھتا ہے ۔ کہ یہ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں سخت ظالم ، دھوکہ باز ، اور بدمعاملہ تھے ۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا ۔ کوئی فقیر ان کی آبادی سے روٹی کا ٹکڑا نہ پا سکتا تھا ۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کے کپڑے اتار کر اسے برہنہ دفن کر دیتے ۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو سر عام لوٹ لیے جاتے ۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاری کرتے تھے ۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوا انکو کوئی ٹوکنے والا نہ تھا ۔ اللہ سبحانہ نے اس تاریخ کی پوری داستان کو صرف ایک فقرے میں بیان کر دیا ہے ۔ ومن قبل کانوا یعملون السیئات ۔ وہ پہلے ہی سے بہت بُرے بُرے کام کرتے تھے ۔

(۹۱) پوری قوم گندگی کا سنڈاس

حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی آمد کا مقصد بھانپ کر فرمایا لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کی۔ آخری بات اس شہوت پرست قوم سے حضرت لوط علیہ السلام نے یہ کہی کہ ظالمو! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے حاضر ہیں نکاح ہونے پر بطریق حلال ان سے تمتع کر سکتے ہو۔ جو نہایت پاکیزہ اور شائستہ طریقہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ سے ڈرنا چاہیئے کہ پاک اور مشروع طریقے کو چھوڑ کر ایسے خلاف فطرت گندے کام میں مبتلا ہوتے ہو۔ کم ازکم میری ہی رعایت کرو۔ کہ میں ان مقدس مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ مہمان کی بے عزتی میزبان کی بے عزتی ہے۔ کیا تم میں ایک شخص بھی نہیں جو سیدھی سیدھی باتوں کو سمجھ کر نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے[1]

ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ ۔ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا ۔ کہ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں ۔ اس کے مطالب میں شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ باتیں کہی ہیں۔ لیجئے اس دستر خوان نعمت سے آپ بھی استفادہ کر لیجئے۔ آخر اس پیشکش کا مطلب کیا ہے۔ ایک باعصمت اور باعزت آدمی اور وہ بھی گناہوں سے پاک پیغمبر کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اپنی معصوم لڑکیوں کو غنڈوں کی ہوس رانی کے لیے پیش کرے؟

۱۔ یہ پیشکش نہیں بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوط علیہ السلام کی آخری بیتابانہ فریاد تھی۔ کہ وہ سوچیں کہ اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے۔ کہ اس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شئے کو بھی قربان کرنے کو تیار ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کہہ کر گویا پوری طرح ان پر حجت تمام کر دی۔ اس لیے کہ کسی کے اندر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اس فقرے کے بعد تو اس کو ضرور حرکت میں آجانا تھا لیکن جب اس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہ ہوا تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہ رہی تھی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

۲۔ حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت کار ثابت ہو یا انکار کر کے متمرد و منحرف دونوں صورتوں میں وہ نبی کی امت ہے۔ جو مان لیتی ہے وہ امت اجابت ہے اور جس نے نہیں مانا وہ امت دعوت ہے۔ اور اس لیے پوری امت نبی کی اولاد ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت لوط علیہ السلام یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ بدبختو تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں۔ تمہارے لیے حلال ہیں۔ پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو۔ اس بات میں اور زیادہ وزن ہو جاتا ہے۔ جب یہ بھی پیش نظر ہو۔ کہ اس بدکاری میں پڑ کر شہری آبادی نے عورتوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

۳۔ تورات اور دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دے کر قوم لوط کو تباہ کرنے آئے تھے۔ تین تھے۔ یہ تو بالکل خلاف عقل ہے۔ کہ تین لڑکوں کے لیے پوری شہری زندگی طالب ہو بلکہ اصل یہ ہے۔ کہ قوم کے دو سردار تھے اور ان دونوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا۔ باقی قوم اپنی اس عام بدکاری کی وجہ سے ان کی حمایت میں آ گئی تھی۔ اور چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں تھیں۔ اور دونوں غیر شادی شدہ تھیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا ہے کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ۔ اور [illegible] کے لیے تیار رہوں۔ کہ اپنی دو لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں۔ لفظ اطہر کا استعمال قرینہ ہے کہ آپ نے نکاح کی پیش کش کی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

۴۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہ جملہ اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق فرمایا تھا۔ مگر اس کی حیثیت اس بزرگ کے مقولے کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا دیکھے اور کہے کہ اسے نہ مارو مجھے مار لو۔ اس کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو عار اور شرم کرنے کے لیے یہ فقرہ فرمایا۔

افادات میں شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ الخ سے مُراد عام طور پر اس قوم کی لڑکیاں ہیں جن کو تجوزاً بیٹیاں کہہ دیا ہے کیونکہ پیغمبر امت کے حق میں روحانی باپ ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی قوم کے بڑے بوڑھے سب کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اگر خاص لوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہوں تو شاید ان میں سے بعض ممتاز لوگوں کے نکاح کے لیے پیش کی ہوں گی۔ اس وقت کافر کا نکاح مسلمان عورت سے جائز تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ لوط علیہ السلام کا مقصود اس سے نکاح وغیرہ نہ تھا۔ بلکہ ان کی زیادتیوں سے عاجز آ کر مہمانوں کی آبرو بچانے

کی دُھن میں انتہائی تواضع سے یہ بات فرمائی تاکہ ان میں غیرت وحیاء کا کچھ شائبہ اور آدمیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو تو یہ لفظ سُن کر جھینپ جائیں اور نرمی اختیار کرلیں مگر وہ ایسے حیادار کہاں تھے کہ کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ پہلے سے زیادہ بے باک ہوکر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے[1]

امام رازی اور ابوالسعود نے آخری توجیہہ کو پسند کیا ہے۔ مگر میرے خیال میں دوسری توجیہہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے۔

(۹۲) قوم لوط کے اخلاق کی پوری تصویر

وہ بولے تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ اور تمہیں یہ بھی علم ہے۔ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ یعنی اتنی حجت وتکرار کیوں کر رہے ہو ہم اپنا ناپاک ارادہ پورا کیے بغیر نہ جائیں گے[2] یہ فقرہ ان لوگوں کے اخلاق کی پوری تصویر پیش کر رہا ہے کہ وہ بگاڑ میں کس حد تک پہنچ گئے تھے، بات صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندے اور خلاف فطرت راستے کو اپنا چکے تھے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اسی کی ہوکر رہ گئی تھی۔ اور وہ پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہتے ہوئے کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے۔ کہ مالنا فی بناتک من حق۔ حلال طریقہ اور فطرت کی پاکیزہ راہ ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہ زوال اخلاق کا وہ آخری مقام ہے۔ جس سے کمتر کسی مقام کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ اس شخص کی اصلاح تو آسان ہے جو محض طبیعت کے دباؤ سے حرام کا مرتکب ہوجائے مگر حرام کو حرام جانتا ہو مگر ایسے شخص کی اصلاح ناممکن ہے جس کا ذہن حرام کے تصور ہی سے خالی ہوجائے۔ اور سمجھ لے کہ حلال اس کے لیے نہیں ایسے شخص کو انسانوں میں ہی شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ تو غلاظت کا جرثومہ خبیث ہے۔ گھر میں پیدا ہوجائے تو پہلی فرصت میں گھر میں صفائی کی جائے۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی کب گوارا کرسکتی ہے کہ ان کیڑوں کو اپنی زمین میں پلنے اور پھولنے کا موقعہ دے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] افادات شیخ الاسلام

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ
شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ
اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ
الصُّبْحُ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا
عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ
مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ
بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾

حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تمہارے مقابلے کی مجھ میں طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا۔ جس کا میں آسرا لے لیتا[۹۲] فرشتوں نے کہا اے لوط علیہ السلام ہم آپ کے رب کے روانہ کردہ ہیں۔ ان لوگوں کی رسائی آپ تک ہرگز نہ ہوگی[۹۴] بس اب آپ کچھ رات رہے اپنے اہل وعیال کو لے کر چل دیں۔ اور آپ لوگوں میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری

بیوی نہ جائے بلاشبہ اس پر وہی آفت آئے گی جو ان پر آئے گی ان کے وعدے کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے؟[۹۵] پھر جب ہمارے حکم کا وقت آگیا تو ہم نے بستی کی بلندیوں کو پستی میں بدل دیا اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے[۹۶] جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے حضور نشان کردہ تھا۔ اور یہ بستی ان ظالموں سے دُور نہیں ہے[۹۷]

مفردات کے معانی

رکن۔ آسرا، زور، قوت کسی شئے کی وہ جانب جس کا آسرا لیا جائے۔ رکن کہلاتی ہے۔ استعارۃً زور و قوت کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے رکن سے مراد قلعہ یا زوردار قبیلہ ہے۔

سجیل۔ کنکر یہ فارسی کا لفظ ہے۔ اصل میں سنگ وگل ہے۔ جو عربی میں آکر سجیل ہوگیا ہے۔ مجدالدین نے بصائر ذوی التمیز میں ایسا ہی لکھا ہے۔

قوموں کی ہلاکت کا پس منظر

قوموں پر عذاب ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اُصول ہیں۔ وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت کے بھی ہیں۔ جس طرح ایک حکیم کا کام ان مادی اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت اور سائنس ہے۔ اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے آثار روحانی اور نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی

تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے جب کائنات کے ہر گوشہ میں نتائج اعمال کا قانون کام کر رہا ہے تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے۔ اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں ہیں۔

جب ہم کائنات اور زندگی کے مظاہر پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں۔ کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے جنم اور ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں۔ تو ہمیں قرآن کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی۔ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ عالم مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادی عمل سے ناآشنا ہیں۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے۔ جنہیں تجربے اور مشاہدے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس عالمِ انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے۔ لیکن انسانی اعمال اخلاق اور تہذیب و تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ انسانی اعمال کی دنیا میں اگر کسی واقعہ کی مختلف توجیہیں کی جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان میں سے کسی ایک توجیہہ کو ہم ٹھوس دلائل اور قطعی ثبوت کی بنا پر اس طرح ثابت کر دیں کہ آپ کا مد مقابل بے بس ہو کر مان لے۔ مثلاً قوم لوط کی بربادی ایسا واقعہ ہے۔ جس کے اسباب و علل پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ اور غلط بھی۔ قرآن کی شہادت اور وحی الٰہی کے سوا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کے بل بوتے پر ہم کوئی رائے قائم کر سکیں۔ یہ قرآن کا انکشاف ہے کہ اخلاقی انحطاط اور عیش پرستی میں آوارگی ان کی تباہی کی علت ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ قوم لوط کی بربادی کی علت ان کا ظلم و فساد ان کی آوارگی اور ان کے اخلاق کا درجہ صفر کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے۔

(۹۲) حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ کاش تمہارے مقابلے کی مجھ میں طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا جس کا میں آسرا لیتا۔ لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش مجھ میں بذاتِ خود تم سب سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی۔ یا کوئی طاقتور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا یعنی میرا کنبہ اور قبیلہ یہاں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یرحم اللہ لوطا لقد کان یاوی الی رکن شدید۔ اللہ سبحانہٗ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک وہ مضبوط اور مستحکم پناہ حاصل کر رہے تھے۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کی۔ مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بیحد ضیق کی وجہ

سے ادھر خیال نہ گیا بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی۔ لوط علیہ السلام کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے [۱]

اس سے یہ بات پوری صراحت سے معلوم ہو رہی ہے۔ کہ حضرت لوط علیہ السلام کو بدمعاشوں کے اس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے مہمان فی الواقع فرشتے ہیں۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ یہ چند مسافر ہیں۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کو اس وقت ظاہر کیا جب بدمعاشوں کا ہجوم مہمانوں کی قیام گاہ پر پل پڑا۔ اور حضرت لوط علیہ السلام نے بیقراری میں فرمایا لو ان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید۔ اس کے بعد فرشتوں نے اپنا فرشتہ ہونا ظاہر کیا۔ یہ فقرہ حضرت لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی اضطراب اور بے چینی میں نکلا ہے۔ یہ فقرہ بھی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کے ضمیر کو جھنجوڑنے کے لیے فرمایا۔ یہ فقرہ بول کر آپ نے گویا آخری حجت تمام کر دی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی زبان سے نکلے ہوئے اس فقرے پر شارحین قرآن نے بڑی دور از کار بحثوں کا دروازہ کھول دیا۔ کیا حضرت لوط علیہ السلام کو العیاذ باللہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت پر بھروسہ نہ تھا۔ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔
پہلا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

یغفر اللہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید۔
وھو ربہ وخالقہ۔

اللہ سبحانہٗ لوط علیہ السلام کی بخشش کرے بلا شبہ وہ مضبوط سہارے کی پناہ میں تھے یعنی اللہ جو حضرت لوط علیہ السلام کا رب بھی ہے خالق بھی۔

مطلب یہ ہے۔ کہ حضرت لوط علیہ السلام اللہ سبحانہٗ کو بھول کر کسی اور قوت کے طالب نہ تھے۔ بلکہ اس درجہ پریشان تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کہ کاش اللہ سبحانہٗ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا۔ اور رکن شدید یعنی اللہ سبحانہٗ نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اَو اٰوی میں اَو بمعنے بل ہے مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے منہ سے بیقراری میں لو ان لی بکم قوۃ نکلا تو اس سے ہٹ کر فرمایا نہیں بلکہ میں اپنے اس حال میں رکن شدید یعنی اللہ سبحانہٗ کو اپنا ماوی بناتا ہوں۔ علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ اس کی تائید اس موضوع پر آئی ہوئی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

روایات سے نہیں ہوتی ہے۔

(۹۴) فرشتوں نے اپنے کو ظاہر کر دیا

فرشتوں نے کہا اے لوطؑ ہم آپ کے رب کے روانہ کردہ ہیں ان لوگوں کی رسائی آپ تک ہرگز نہ ہوگی۔ جب لوط علیہ السلام کے اضطراب وقلق کی حد ہوگئی تب مہمانوں نے کہا کہ حضرت آپ کس فکر میں ہیں مطلق پریشان نہ ہوں۔ ہم اللہ سبحانہ کے روانہ کردہ فرشتے ہیں۔ ان کو تباہ و برباد کرنے آئے ہیں۔ یہ خبیث ہمارا تو کیا بگاڑ سکتے ہیں آپ تک بھی ان کی رسائی نہ ہوگی۔ تفاسیر میں یہ ہے کہ وہ شریر لوگ دروازہ توڑ کر یا دیوار توڑ کر اندر گھسنا چاہتے تھے تب جبرئیل امین نے اللہ سبحانہ سے اجازت لے کر لوط علیہ السلام کو علیحدہ بٹھا دیا۔ اور ایک ذرا بازو ان کی طرف ہلایا تو سب کے سب اندھے ہوگئے اور کہنے لگے کہ بھاگو لوطؑ کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ اس وقت مہمانوں کا فرشتہ ہونا حضرت لوطؑ کو معلوم ہوا۔ یہاں تک تو قرآن کا انکشاف ہے۔ کہ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں اور ان لوگوں کی رسائی کسی بھی نقصان کے لیے آپ تک نہ ہوگی۔ اس کے بعد جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ اسرائیلی علم ہے۔ اور یہ داستان صرف اتنی نہیں جو تفاسیر کے حوالے سے شیخ الاسلام نے پیش کی ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے کہ اندھا ہو جانے کے بعد لوگوں نے پھر حضرت لوط علیہ السلام سے گفتگو کی۔ گفتگو میں لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا کہ اچھا جادوگر لے کر آئے ہو اور حضرت لوط علیہ السلام کو ڈرایا دھمکایا۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اپنا اندیشہ ہوگیا اور ڈر کر جی میں کہنے لگے کہ مہمان تو چلے جائیں گے اور مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا لا تخف انا رسل ربك لیکن قرآن اس داستان کا مؤید نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تورات کی کتاب پیدائش میں جو کچھ ہے اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ تورات میں ہے۔

> انہوں نے (حضرت لوطؑ) سے کہا کہ یہاں سے ہٹ جا پھر کہنے لگے یہ شخص ہمارے درمیان قیام کرنے آیا تھا۔ اور اب حکومت جتاتا ہے۔ سو ہم تیرے ساتھ ان سے زیادہ بدسلوکی کریں گے۔ تب وہ اس مرد یعنی لوط پر پل پڑے اور نزدیک آئے تاکہ کواڑ توڑ ڈالیں لیکن ان مردوں نے ہاتھ بڑھا کر لوطؑ کو اپنے پاس کھینچ لیا اور دروازہ بند

[1] افادات شیخ الاسلام

کردیا۔ اور ان مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے اندھا کردیا کیا چھوٹے کیا بڑے سو وہ دروازہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے۔ تب ان مردوں نے لوط سے کہا کیا یہاں تیرا اور کوئی ہے۔

آپ غور کریں کہ برائی برائی میں فرق ہے ایک برائی تو وہ ہوتی ہے جو انسانوں میں پائی جاتی ہے یا پائی جاسکتی ہے خواہ کتنی سنگین ہو۔ دوسری برائی وہ ہے جس کا گھناؤنا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کے طور پر اور کسی سوسائٹی میں فیشن کے طور پر اسکا پایا جانا اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ کہ اس انسان یا سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہوگئی جہاں اس قسم کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ وہی برائی ہوتی ہے۔ دوسری باتیں خواہ کتنی اہمیت رکھتی ہوں۔ سب ثانوی درجہ میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کے لیے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا میلا کھا رہا ہے تو کیا آپ اسے فضائل کی دعوت دیں گے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اسی صورت حال سے سابقہ پڑا۔ ان کی قوم میں شرک، کفر، تکذیب نبوت کی برائی بھی موجود تھی۔ اور دوسری تمام برائیاں بھی جو شرک وکفر کے لوازم ہیں۔ لیکن جن کی فطرت اتنی اندھی ہو چکی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کے دلدل سے نکالنے کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کی نظر میں اس سے عمل قوم لوط کی شناخت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہی عمل آج بھی اسی طرح منفوضیت کا سامان ہے۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔

(۹۵) حضرت لوطؑ کو ہجرت کا حکم

بس اب آپ کچھ رات رہے اپنے اہل وعیال کو لے کر چل دیں۔ اور آپ لوگوں میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی نہ جائے بلاشبہ اس پر وہی آفت آئے گی جو ان پر آئے گی۔ یعنی صبح کو عذاب آنے والا ہے تھوڑی رات رہے آپ اپنے متعلقین کو لے کر یہاں سے تشریف لے جائیے اور اپنے ہمراہیوں کو ہدایت کر دیجئے کہ جلدی کریں اور کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے ہاں تیری عورت کہ وہ ساتھ نہ جائیگی یا پیچھے پھر کر دیکھے گی: اس طرح اس عذاب کی لپیٹ میں آجائیگی۔ جو سب قوم کو پہنچنے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی عورت نے قوم کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کیا تھا۔ آگے فرمایا کہ الیس الصبح بقریب۔ یعنی خوش ہو جائیے اب ان ظالموں کے ہلاک ہونے میں کچھ دیر نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی سب کا صفایا ہو جائے گا[1] سورہ حجر میں یہ اضافہ اور ہے۔ کچھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ واتبع ادبارھم۔ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو یعنی اس لیے کہ ان میں کوئی رہ نہ جائے پلٹ کر نہ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر بن جاؤ گے جیسا کہ تورات میں آیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشہ دیکھنے کے لیے نہ ٹھہر جانا۔ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے اور نہ مرنے والوں پر آنسو بہانے کا۔ دراصل یہ حضرت لوط علیہ السلام کو ہجرت کا حکم ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ کے رسول کو اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام حضرت صالح علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی۔ اور جب تک یہ ہجرت ہو نہیں لیتی اور اللہ کا رسول کافروں سے الگ نہیں ہو جاتا معجزہ عذاب نہیں آتا۔ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر بیٹھ کر علیحدہ نہ ہوئے طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا اسی طرح حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہوئے ہلاکت کا عذاب نہیں آیا اسی قانون الٰہی کے مطابق یہاں حضرت لوط علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے۔ فاسر باھلک الخ۔ تورات میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے صنغر کی بستی میں چلے گئے۔ جو سدوم سے قریب ہی تھی۔ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام کی اس ہجرت کا تذکرہ اس انداز سے پیش کیا ہے۔

> جب صبح ہوئی تو فرشتوں نے لوط سے جلدی کرائی اور کہا کہ اُٹھ اپنی بیوی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو جو یہاں ہیں لے جا ایسا نہ ہو کہ تو بھی اس شہر کی بدی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو جائے مگر اس نے دیر لگائی تو ان مردوں نے اس کا اس کی بیوی اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا کیونکہ خداوند کی مہربانی اس پر ہوئی اور اسے نکال کر شہر سے باہر کر دیا۔ باب ۱۹ - ۱۵ - ۱۶

(۹۶) عذابِ الٰہی سر پہ آ گیا

پھر جب ہمارے حکم کا وقت آ گیا تو ہم نے بستی کی بلندیوں کو پستی میں بدل دیا۔ اور اس پر آگ کے پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے۔ جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک

دیا اس طرح سب بستیاں تہہ و بالا ہوگئیں۔ پھر ان کی نہایت اور ذلت و رسوائی کی پوری تکمیل کے لیے اوپر سے جھانویں اور پتھر برسائے گئے شہر کی آبادی سے الگ جو افراد اس قوم کے جس جگہ تھے وہیں پتھروں سے ہلاک کیئے گئے العیاذ باللہ جو سزا اس قوم کو اوپر نیچے کرنے کی ملی وہ ان کی شرمناک حرکت سے ظاہری مناسبت بھی رکھتی ہے۔ منضود کے معنے مترجم نے تہ بر تہ کیئے ہیں۔ بعض نے معنے یہ لیئے کہ پتھر مسلسل پکے بعد دیگرے برس رہے تھے[۱] شارحین قرآن نے تفصیل اس سے بھی زیادہ دی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت جبرئیل نے قوم لوط کو ان کے مکانوں کو ان کے جانوروں کو اور ان کے سامانوں کو زمین سے اٹھایا اور آسمان والوں نے کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنی وہیں سے سب کچھ الٹ دیا یہ اور اسی قسم کی تشریحات شارحین نے مجاہد، قتادہ اور سدی کے حوالہ سے پیش کی ہیں مگر ان کی پشت پر کوئی ارشاد نبوت نہیں ہے۔ صرف اسرائیلی داستانیں ہیں نہ عذاب کا انکار ہے۔ تورات میں ہے۔

تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور اس نے ان شہروں کے سب رہنے والوں کو ان شہروں کو اور اس ساری ترائی کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا غارت کر دیا۔ باب ۱۹ - ۲۵ - ۲۶

اور قرآن میں ہے کہ ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی۔ دونوں بیانوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسی حالت پیش آئی ہوگی کہ ایک سخت زلزلہ آیا اور یہ آتش فشاں لاوے کی صورت میں تھا۔ زلزلے نے بستیوں کو زیر و زبر کر دیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا اور اس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ بستیاں تلپٹ ہوگئیں۔ آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

قوم لوط کے ساتھ جو کچھ ہوا یعنی آسمان سے گندھک اور آگ برسی، زلزلے نے آتش فشاں پہاڑوں سے لاوے نکالے ان لاوں سے پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کا پتھراؤ ہوا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے ہوا اعمال انسانی کے بھی نتائج ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اللہ کا وہی قانون کام کر رہا ہے۔ جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے۔ غور کرو قرآن نے ان کے اعمال کا کیا نقشہ پیش کیا ہے۔

۱۔ ایسی بدکاری اور قابل نفرت فعل میں اس قوم نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ کما سبقکم بھا من احد من العالمین۔ پوری تاریخ انسانی میں اسکی مثال نہیں۔ یعنی عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اپنی شہوانی خواہشات پوری کرتے تھے۔ اتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء۔
۲۔ اس کام میں اس قدر وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے کہ اس کے خلاف بھی سننے کو تیار نہ تھے بلکہ اس کے خلاف بات کرنے والوں کا بستی میں ہونا بھی ان کو برداشت نہ تھا۔ اخرجوھم من قریتکم ان پر پاکیزگی کی پھبتی کستے تھے انھم اناس یتطھرون۔ یعنی اخلاقی پستی میں اس قدر گر گئے کہ انہیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا
۳۔ رہزنی، ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور راہ گیروں اور مسافروں کی جان اور مال تک ان سے محفوظ نہ تھے وتقطعون السبیل۔
۴۔ بدکاری کا یہ فعل چھپ کر نہیں بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ وتاتون فی نادیکم المنکر۔
۵۔ وہ خباثت نفس میں اس قدر ڈوب گئے تھے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کی ساری رغبت اور اور تمام دلچپی اب اسی گندی راہ میں تھی ان کے نفس میں اب طلب اس گندگی ہی کی رہ گئی تھی۔ اور فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ انك لتعلم ما نرید۔ ہماری پسند یہی ہے۔ ہماری چاہت یہی بدکرداری اور بدفعلی ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے۔ جس سے فروتر مرتبہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وجعلنا عالیھا سافلھا ہم نے اس بستی ہی کو تلپٹ کر دیا اور ان پر تہ بر تہ سنگ گل کی بارش کی اور بالآخر یہ بستیاں صفحۂ ہستی سے ایسی ناپید ہو چکی ہیں کہ ان کا نام و نشان نہیں ہے۔ وہاں اب بحر لوط بہہ رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اعمال کے نتائج عالم انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے قوانین عالم غیب میں بنتے ہیں۔

(۹۷) اعمال کے نتائج کا ظہور

جن میں سے ہر پتھر تیرے پروردگار کے حضور نشان کردہ تھا۔ اور یہ بستی ان ظالموں سے دور نہیں ہے۔ یعنی کوئی خاص علامت ان پر تھی جو عام پتھروں سے ممتاز کر کے ظاہر کرتی تھی۔ کہ یہ عذاب الٰہی کے پتھر ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر پتھر پر اس کا نام درج تھا جس کی ہلاکت کا وہ سبب بنا اور وما ھی من الظلمین ببعید کا مطلب یہ ہے کہ باعتبار زمانہ کے قریب ہے کیونکہ عاد ثمود اور قوم نوح کے بعد یہ واقعہ ہوا اور باعتبار مکان کے بھی کیونکہ ان کی بستیاں شام اور مدینہ کے درمیان تھیں۔ گزرنے والے قافلے وہاں کھنڈرات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ یا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا عذاب ایسے ظالموں سے کچھ دور نہیں

ہے۔ ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہیئے[۱] مسومہ، اسم مفعول ہے۔ تسویم مصدر ہے معنے ہیں وہ پتھر جن پر خزانہ الٰہی میں علامت لگا دی گئی تھی۔ یعنی عالم غیب میں ان پر نشان لگائے گئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ علم الٰہی میں پہلے سے مقدر اور مقرر تھے۔ گویا ان کا انبار لگا کر پہلے ہی سے ان پر نشان لگا دیئے گئے تھے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر پتھر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نامزد کیا ہوا تھا۔ کہ اسے تباہ کاری کا کون سا کام کرنا ہے۔ اور کس پتھر کو کس شخص پر پڑنا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ کہ نشان زدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ان لوگوں کے نام کندہ تھے۔ جن کی ان کے ذریعے ہلاکت ہوتی تھی۔ گویا ان پتھروں کی یہ خصوصیات تھیں۔

۱۔ یہ سنگ گل کی آگ میں پک کر پتھر بنے تھے۔

۲۔ یہ مسلسل تہ بر تہ لگاتار تھے۔

۳۔ ان پر خاص نشانات تھے جو ان کو باقی پتھروں سے ممتاز کر رہے تھے ان پر مجرمین کے نام کندہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔ وما ھی من الظالمین ببعید۔ شارحین قرآن نے ہی ضمیر مؤنث کا رُخ مقرر کرنے میں تین راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع حجارۃ ہیں مطلب یہ ہے کہ پتھروں کے یہ مچان ان ظالموں سے کچھ دور نہیں تھے۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر لانے میں وقت لگتا بلکہ وہیں سے قدرت الٰہی نے اٹھا کر بارش بنا دیا۔

کچھ نے ضمیر کا مرجع مدینہ اور بستی کو قرار دیا ہے اور ظالمین سے اہل مکہ مراد لیے ہیں مطلب یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی بستی قریش سے کچھ دور نہیں۔ وہ اپنے سفر شام میں برابر اسی راہ سے آتے جاتے تھے۔ اگر دیدہ عبرت نگاہ رکھتے ہیں تو اس سے عبرت حاصل کریں۔ ان آبادیوں کی آسمانی ہلاکت کا زمانہ دقوع جدید تحقیق کے مطابق ۲۰۶۱ سنہ قبل مسیح ہے۔ افادات میں شیخ الاسلامؒ نے بھی ضمیر کا مرجع بستی ہی کو قرار دیا ہے۔

کچھ نے ضمیر کا مرجع عقوبت قرار دیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ ظالموں سے یہ سزا دور نہیں ہے یعنی جو لوگ آج ظلم کر رہے ہیں وہ بھی اس عذاب کو اپنے سے دور نہ سمجھیں۔ عذاب اگر قوم لوط پر آسکتا تھا۔ تو ان پر بھی آسکتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا مقابلہ نہ قوم لوط کر سکی تھی اور نہ یہ قریش مکہ کر سکیں گے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ
اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ وَ
يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝

اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ کیا[۹۸] انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔[۹۹] اور پیمانے اور ترازو میں کمی نہ کیا کرو[۱۰۰] میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے[۱۰۱] اور اے میری قوم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کرو اور لوگوں کو چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔[۱۰۲] ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو[۱۰۳] اگر تم ایمان والے ہو تو جو کچھ اللہ کا دیا

بچ رہے۔ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے[۱۰۴] اور دیکھو میرا کام صرف تمہیں پیغام پہنچانا ہے میں تمہارا رکھوالا نہیں[۱۰۵]

مفردات کے معانی

لا تعثوا تم فساد نہ کرو۔ مضارع مجزوم صیغہ جمع مذکر حاضر از باب سمع ، عُثیٰ سے جس کے معنے فساد کرنے کے ہیں۔ جس فساد کا ادراک حسی ہو۔ عیث اور عثو کہلاتا ہے۔ اور جس فساد کا ادراک حکمی ہو اسے عثی کہتے ہیں عیث اور عثو باب نصر کے مصدر ہیں۔ اور عثی باب سمع کا مصدر ہے۔

شعیبؑ کا چہرہ

حضرت شعیب علیہ السلام کا نام تورات میں شیرو اور حوباب ہے۔ تورات کی شرحوں میں لکھا ہے کہ شیرو کے دس نام تھے۔ دس ہوں یا نہ ہوں دو نام تو خود تورات میں ہیں۔ ایک جرمن فاضل کہتا ہے کہ

اصلی نام حوباب تھا۔ اور شیرو ایک اعزازی لقب تھا۔ جس کے لغوی معنے کامل کے ہیں۔ جس طرح یہودیوں کے ہاں اور مسلمانوں میں لفظ امام ہے۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

حوباب کا نام قرآن میں اور عموماً مسلمانوں میں شعیبؑ ہے یہ نام حوباب کی تصحیف ہے۔

مسلمان شارحین قرآن بھی علی العموم شیرو حوباب اور شعیبؑ کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے۔ شعیب ابن یکمل ابن یشجر مدین ابن ابراہیم کی اولاد سے ہیں۔ سریانی میں انکا نام یشردن تھا۔ علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں شعیب ابن میکیل ابن یشجر ابن مدین ابراہیم علیہ السلام لکھا ہے علامہ آلوسیؒ نے ابن عساکر کے حوالہ سے بتایا ہے۔ کہ شرقی ابن القطامی جو انساب کے بڑے ماہر تھے کہتے ہیں کہ آپ عبرانی میں یشروب اور عربی میں شعیب ہیں صنعانی کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہے ممکن ہے کہ شعیب کی تصغیر ہو یا شعب بہت چوڑے سینے والا کی جیسے اہل عرب اسود کو سویدہ کہتے ہیں۔ صحیح ابن حبان میں حضرت

ابوذرؓ کے حوالہ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے ۔ کہ چار پیغمبر عربی ہیں ۔ ہودؑ ، صالحؑ ، شعیبؑ اور تمہارے نبی علیہم السلام اے ابوذرؓ ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے حضرت شعیب علیہ السلام عرب عاربہ میں سے ہیں ۔ آپ نے جس حسن اسلوب کے ساتھ قوم کے سامنے دعوت حق رکھی تھی اور پھر اس سلسلے میں جو کچھ باہمی سوال و جواب ہوئے اس کے لفظ لفظ سے آپ کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت کے جوہر ٹپکتے ہیں ۔ اسی لیے آپ کو خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے ۔

(۹۸) اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ کیا ۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مدین قبیلے کا بھی نام ہے اور شہر کا بھی ۔ سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگوں کے نام سے موسوم کرتی ہیں ۔ مدین قبیلہ ہو یا شہر ۔ اپنے بانی و مؤسس خاندان مدین ابن ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں ۔ مدین قطورا نامی عورت کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حرم میں تین بیویاں تھیں ۔ ایک ہاجرہ ان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام دوسری سارہ ان سے حضرت اسحٰقؑ اور تیسری قطورا ان کے پیٹ سے مدین ہیں ۔ انہوں نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسماعیلؑ کے پہلو میں قائم کی ۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ کے ساحل پر دہانہ خلیج سے بحر احمر تک واقع تھا ۔ مدین کا آغاز ۲۰۰۰ء قبل مسیح ہے ۔ مدین بن ابراہیم کا زمانہ ۲۱۰۰ء یا ۲۲۰۰ء قبل مسیح ہے ۔ ایک خاندان کو قوم بننے کے لیے کم ازکم سو دو سو سال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس لیے مدین سب سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے یعنی ۲۰۰۰ء قبل مسیح میں سوداگروں کے بھیس میں نظر آتے ہیں ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کاروان تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ بھی اہل مدین اور اسماعیلی عرب تھے ۔ شارحین قرآن نے یہی سمجھا ہے تفصیل آپ سورہ یوسف میں آیت

وجاءت سيارة فارسلوا واردهم فادلى دلوه

کی تشریح میں پڑھیں گے ۔ مدین کی قوم جو کاروبار کرتی تھی وہ وہی ہے جو تمام سامی قوموں کا ہمیشہ پیشہ رہا یعنی گلہ بانی یہی وہ شغل ہے جو ابراہیم ، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا پیشہ تھا ۔ اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی متمدن زندگی میں میسر نہ تھا ۔ اولاد سام کے عظیم الشان پیغمبر کے لیے ضروری تھا کہ وہ جہاں بانی سے پہلے گلہ بانی کا سبق لے اس لیے قضائے الٰہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کے تمدن زار سے عرب کے بے تکلف اور سادہ ملک میں بھیج دیا ۔ جہاں شرفاء سام نے اپنے آبائی عادات و اخلاق کو نہیں چھوڑا تھا ۔

مدین کے قبائل ایک باقاعدہ منظم زندگی رکھتے تھے ۔ شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین و محافظت کے لیے کاہن و مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے ۔ اور اکثر حالات میں یہی کاہن شہر کے قانونی حاکم بھی ہوتے تھے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس کا نام تورات میں کہیں راعویل، کہیں شیرو کہیں حوباب ہے۔ اکثر شارحین قرآن کی رائے میں یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے ہجرت کرکے شہر مدین آئے تو حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے اور ان کے ہاں بکریاں چرانے کی خدمت قبول کی اور اس کے عوض حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجیت میں دی۔

(۹۹) عبادت کا عہد و میثاق

انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے ان دو فقروں کے ذریعے ایک طرف توحید فی العبادت کا نقشہ کھینچ دیا کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات ہے اگر عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسرے کے سامنے سر جھکا دیا۔ اگر اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، دعا واستعانت رکوع و سجود، نذر و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اعمال میں رشتہ کسی اور کے ساتھ قائم ہو گیا تو توحید عبادت کا تصور قائم نہ رہا دوسری طرف مالکم من الٰہٍ غیرہٗ۔ مقام علت میں لاکر اشتراکی تصور کا کلی انسداد کر دیا یعنی اللہ کی عبادت اس لیے کرنی چاہیئے کہ اگر اللہ سبحانہٗ اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اس کی یگانگت قائم نہیں رہ سکتی اگر کوئی دوسری اس کی صفت الوہیت میں شریک و سہیم مان لی جائے۔ ۲۔ اعبدوا اللہ اگر ایجابی پہلو ہے تو مالکم من الٰہٍ غیرہٗ سلبی ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ عبادت کے لائق اللہ ہے۔ سلبی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ جب اس کے علاوہ الٰہ کوئی نہیں ہے تو صفت الوہیت میں کوئی دوسری شریک نہیں ہے۔ یعنی صفت الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ اگر اسم ذات ہے۔ تو الٰہ اسم صفت ہے۔ پہلی توحید فی الذات ہے تو دوسری توحید فی الصفات ہے یہ صرف حضرت شعیب علیہ السلام کی پکار نہیں بلکہ سارے رسولوں کی ہمیشہ سے یہی ایک پکار رہی یہ پکار دراصل ایک معاہدہ اور میثاق ہے۔ غور فرمایئے کہ ایک شخص نبوت کی دعوت کو قبول کرکے اس کی امت میں کیسے داخل ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی توحید عبادت کا اسے اقرار کرنا پڑتا ہے یعنی وہ ڈنکے کی چوٹ پہ کہتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ یہ اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے گویا اس اقرار کے بعد وہ اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جب لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے۔ تو اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ، اس کی عقل، اس کے جذبات وخواہشات قانون اور احکام خداوندی

کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں گے۔ اللہ کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے کو تیار رہے گا۔ اس اطاعت وسپردگی کے معاوضہ میں اسے رضاء الہٰی اور قرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ یہ ایک عہد و میثاق ہے۔ یہ محض تخیل آرائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جس کا ثبوت قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ قرآن میں اکثر جگہ اس میثاق کا ذکر آتا ہے۔ جو اللہ سبحانہٗ نبیوں کی وساطت سے قوموں سے لیتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر اس میثاق پر پڑتی ہے جو بنی اسرائیل اور اللہ سبحانہٗ کے درمیان واقع ہوا۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ

اور مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہٖ اذ قلتم سمعنا واطعنا

مسلمانوں اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس میثاق کو جو تم سے لیا گیا تھا جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ نے ہمیشہ انبیاء کے ذریعے قوموں سے اپنی عبادت کا عہد و پیمان لیا ہے۔ یعنی وہ اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔ جو اللہ سبحانہٗ نے اپنے رسولوں کے ذریعے ان تک پہنچایا ہے اور جب تک وہ اس میثاق پر قائم رہیں گے۔ دنیا و آخرت کی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔ یہی عہد و پیمان حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے لے رہے ہیں۔ اور یہی عہد و پیمان حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں سے اپنے اپنے وقت میں لیا ہے۔ بلکہ قرآن نے بتایا ہے۔ کہ ہر نبی یہی میثاق و معاہدہ لے کر آیا ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔

اور یہی عہد و میثاق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ ان لا تعبدوا الا اللہ اننی لکم منہ نذیر و بشیر۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ مسلمانوں سے پہلے جس قدر میثاق لیے گئے تھے۔ وہ کسی خاص نسل قوم یا خطہ ارض کے متعلق تھے۔ اور صرف اسی تک محدود تھے۔ اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو میثاق لے کر آئے ہیں۔ اس کا دروازہ اس وقت بھی ہر اس فرد یا قوم پر کھلا ہوا تھا۔ اور

آج بھی کھلا ہوا ہے جو اس کے لازمی نتائج اور مضمرات کو تسلیم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی نئے میثاق کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخی حیثیت سے اسی میثاق کے نتیجہ میں اسلامی مملکت وجود پذیر ہوتی ہے۔ تفصیل انشاء اللہ سورت کے آخر میں آرہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سے عابدانہ روابط قائم کرنے کا اور غیر اللہ سے عابدانہ روابط توڑنے کا ہر نبی اپنی قوم سے عہد و میثاق لیتا ہے۔ یہی نبوت کے مشن کا اہم اور بنیادی نصب العین ہے۔ اور اسی پر نبوت کی دعوت کی ساری عمارت بنتی اور اٹھتی ہے۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ مدین سے قوم مدین مراد ہے دوسرے یہ کہ حضرت شعیب علیہ السلام مدین کے خاندان سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔

(۱۰۰) معاملاتی بددیانتی

اور پیمانے اور ترازو میں کمی نہ کیا کرو۔ مدین قوم ایک تاجر قوم تھی اور غالباً دنیا کی تاریخ میں اس پیشہ کی سب سے پہلی قوم ہے۔ اس بنا پر ان میں کم دینے کی مذموم صفت ہوگی جو حالات کے لحاظ سے مطابقت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل جب مصر سے حدود عرب میں داخل ہوئے۔ تو اس کے ساتھ رسد کا سامان نہ تھا۔ قرب وجوار کی قوموں سے بقیمت خریدتے تھے یا بالجبر چھین لیتے تھے۔ شاید مدین کی صفت تجارت کا بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے بھی تعلق ہو۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے توحید عبادت سے روگردانی کا فساد سب سے زیادہ کاروبار میں نمایاں ہوا۔ انہوں نے ناپ تول میں کمی کرنے کو اپنا پیشہ ورانہ ہنر بنا لیا۔ اس فن کے ایک سے ایک ماہر ان میں پیدا ہو گئے اور کسی میں اس کا احساس بھی باقی نہ رہا کہ یہ ترقی اور کامرانی کی راہ نہیں بلکہ بگاڑ کی راہ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اس کی اصلاح کی دعوت دی۔ قرآن میں سورہ اعراف میں ان کے اس طرز عمل کو ملک میں فساد قرار دیا ہے۔ ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔ اس میں بعد اصلاحها کی تعبیر بتا رہی ہے کہ کاروبار کی ترقی کی وجہ سے ملک میں خوشحالی تھی۔ چونکہ جہاں یہ رہتے تھے۔ یعنی خلیج عقبہ کے کنارے۔ چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطۂ اتصال تھی۔ اس لیے اشیاء تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی تھی اور لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ اسی خوشحالی کو آگے آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام نے علی رؤس الاشہاد فرمایا ہے۔

(۱۰۱) خوشحالی سے بدحالی کا انقلاب

میں تمہیں خوشحال دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو تم سب پر

چھا جائے یعنی اللہ سبحانہٗ نے فراغت اور آسودگی عطا فرمائی تو ڈرتے رہو کہیں نافرمانی سے چھن نہ جائے اور آسائش و خوشحالی سلب ہو کر دنیوی و اُخروی عذاب نہ مسلط کر دیا جائے [1] اس کا مطلب یہ ہے کہ مدین قوم تجارت میں ترقی کی وجہ سے بہت زیادہ خوشحال تھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ صرف خوشحالی نہ تھی بلکہ اس خوشحالی کی وجہ سے ان کی عددی طاقت بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر کا یہ جملہ اگر ایک طرف حال کا نقشہ پیش کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے لہذا کفران نعمت سے بچو مقصد یہ ہے کہ اس وقت جو تمہیں رفاہیت اور خوشحالی حاصل ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ اپنے رب کے شکرگزار بندے بنو اللہ سبحانہٗ رفاہیت و خوشحالی بخشتا ہی اس کام کو اس لیے ہے کر دیکھے کہ وہ قوم اللہ سبحانہٗ کی شکرگزار بنتی ہے یا ناشکری کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ دوسری راہ اختیار کر لیتی ہے تو یہی خوشحالی و رفاہیت اس کے لیے عذاب کا بہانہ بن جاتی ہے جو اس طرح گھیر لیتا ہے کہ کوئی اس کے گھیرے سے باہر نہیں آسکتا۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ تجارت کی وجہ سے یہ قوم بہت زیادہ متمول اور خوشحال تھی یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی۔ اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں۔ اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات کو اس کے آثار قدیمہ سے گزرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ قوم اپنے زمانہ عروج میں بہت زیادہ متمول اور خوشحالی تھی۔

(۱۰۲) کاروباری بددیانتی

اور اے میری قوم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو چیزوں میں گھاٹا نہ دو یعنی اب تک جو ظلم و عدوان کا معیار و قانون تھا۔ اس کی اصلاح کرو اور صرف ناپ تول میں نہیں بلکہ کسی چیز میں بھی لوگوں کے حقوق تلف نہ کرو [2]

عام شارحین قرآن نے اس کی تشریح میں صرف خرید و فروخت میں کمی و بیشی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام
[2] افادات شیخ الاسلام

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے صرف خرید و فروخت کی کمی و بیشی مراد نہیں ہے بلکہ بٹہ اور دیگر اصناف تجارت ممنوعہ مراد ہیں۔ جن کے ذریعے سے تاجر و صاحب معاملہ لوگوں کو انکے حق جائز سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں۔ اس رائے کی تائید شارحین قرآن کی کچھ روایات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ قوم شعیب کو بٹاون لینے کے جرم میں عذاب ہوا۔ پھر مجھے قرآن میں یہ آیت ملی۔ (طبری)

یا حضرت زید بن اسلم کہتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام ان کو بٹاون لینے سے روکتے تھے۔

امام بغویؒ نے بھی معالم القرآن میں اس آیت کی تشریح میں ایک رائے یہ بھی نقل کی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو درہم و دینار میں بٹہ لینے میں منع کیا تھا اور کہا تھا یہ حرام ہے۔

بٹاون کا یہ معاملہ حکومت کے مختلف سکوں میں عدم مساوات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً کویت کے دینار سے اگر پاکستانی روپیہ کوئی خریدنا چاہے تو ایک دینار کے معاوضہ میں ۷۰ روپے دینے پڑتے ہیں۔ اور بٹاون کا یہ بھاؤ ایک حال پر نہیں ٹھہرتا۔ کبھی کبھی بجائے ۷۰ روپے کے ۸۰ روپے دینے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ گھٹ کر بٹاون کا یہ قصہ پندرہ اور تیرہ روپے تک آجاتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ بٹاون کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں بلکہ دو حکومتوں کے ایسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے۔ مختلف اسباب کی وجہ سے تبادلہ کے وقت بسا اوقات بٹاون ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کی قلمرو دوسری حکومت کی قلمرو میں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی اور تجارتی کاروبار رکھنے والوں کو بھی بٹاون کے جھگڑوں کی وجہ سے شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی حکومت کے ایسے دو ملاقے جہاں مختلف سکے رائج ہیں وہاں بھی بٹاون اور ایکسچینج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں میں عام طور پر چیز ہی چیز خریدنے یعنی بارٹر کا طریقہ یا فقہ کی زبان میں مقایضہ کا دستور تھا۔ اسلام یہ کہہ کر الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثل بمثل بتدریج اس رواج کو گھٹانا چاہتا تھا۔ جیسے اس ارشاد کا انسداد ربوٰا اور دولت کے اکتناز سے تعلق ہے۔ ایسے ہی اس ارشاد سے سکہ کی برابری بھی منطوقاً نہ سہی مدلولاً معلوم ہو رہی ہے۔

مدت ہوئی یعنی ۱۹۲۵ء مصر کے مشہور رسالہ الہلال نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع

کیا تھا۔ مضمون نگار نے مرحوم انجمن اقوام جنیوا کو یہ تجویز پیش کی تھی ۔

انجمن اقوام کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا کی قوموں کا اتفاق ہو جائے ۔

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو اساسی سکہ مان لیا جائے لکھا ہے ۔ کہ

سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں ۔ اس کے انسداد کی یہی ایک شکل ہے ۔ کہ ڈالر کو ایک ہی سکہ مان لیا جائے تاکہ دنیا کی ساری قوموں میں ایک ہی معیار کے سکہ کا رواج ہو جائے ۔

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے ۔

یہ بات قطعاً نہیں بتائی جا سکتی ہے کہ بازار میں سکہ کا بھاؤ کل کیا ہو گا ۔

مثال دے کر یوں سمجھایا ہے ۔

ایک شخص فرانس میں کوئی مال لیتا ہے اور فرانک اور ڈالر دونوں کا حساب کر کے خیال کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہے گا کیونکہ مال اس نے امریکہ میں نہیں خریدا ہے ۔ لیکن ایک ہفتہ بھی اس مال کی خریداری پر گزرنے نہیں پاتا کہ اب جو دوسری دفعہ حساب کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس نے سخت غلطی کی بجائے امریکن بازار کے فرانسیسی بازار پر اس نے اعتماد کیا ۔

بہرحال کرنسی کے اس اختلاف کی وجہ سے دنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن اور معیار ایک کر دیا جائے اپنی اس تجویز کا نام اس نے نظریہ توحید نقد اساسی رکھا ہے آخر میں مضمون کو ختم کر کے لکھا ہے کہ اگر اس پر اقوام عالم کا اتفاق ہو جائے تو

دنیا میں لین دین اور کاروبار کا سارے عالم میں ایک نظام ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے تجارت میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور بہت سے خسارے جو بیچارے تاجروں کو صرافوں کے دلالوں کی وجہ سے اٹھانے پڑتے ہیں اس سے دنیا محفوظ ہو جائے گی ۔

یہ لکھنے کے بعد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسلامی معاشیات میں جو بات لکھی ہے ۔ وہ بھی سنانا چاہتا ہوں ۔ فرماتے ہیں ۔

کیا یہ سارا مشورہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک الذهب بالذهب والفضة بالفضة سواء بسواء مثلا بمثل کا ترجمہ نہیں ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ مدین والے صرف خرید و فروخت میں کمی بیشی نہیں کرتے تھے بلکہ سود بٹہ کا بھی کاروبار کرتے تھے اور لوگوں کو بٹا دن کے ذریعے گھاٹا دیتے تھے۔ چیزوں میں گھاٹا دینے کا مطلب یہی ہے کہ ان کو قیمت کم دے کر گھاٹا نہ دو۔

(۱۰۳) حضرت شعیبؑ کی دعوت اصلاح

ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو یعنی شرک و کفر سے یا کم ناپنے اور تولنے سے یا دوسری طرح اتلاف حقوق اور ظلم و ستم کرکے زمین میں فساد مت مچاؤ۔ کہتے ہیں وہ لوگ ڈکیتی ڈالتے تھے۔ اور امانت میں خیانت کرتے تھے[۱] عام شارحین قرآن نے ملک میں فسادی بن کر رہنے کا یہی مطلب بتایا ہے کہ یہ لوگ چونکہ تجارت پیشہ تھے اس لیے ان میں اخلاقی بگاڑ ناپ تول میں خیانت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہ خیانت صرف ناپ تول ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس سے ان کا پورا نظام تمدن و تہذیب متاثر ہوا۔ قرآن میں اسی کی طرف لا تعثوا فی الارض مفسدین کہہ کر اشارا کیا ہے۔ یعنی ظالمانہ طرز عمل اختیار کرکے سیاسی نظام کو لوگوں کے اموال پر غاصبانہ قبضہ، لوٹ مار، چوری اور راہزنی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ فواحش کا ارتکاب کرکے نظام اخلاق تباہ نہ کرو۔ فساد سے مراد صرف فساد افکار نہیں بلکہ اخلاق معیشت، معاش، معاشرت، سیاست اور قانون کا فساد بھی اس میں داخل ہے۔ سورہ اعراف میں تعبیر اس طرح ہے۔ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔ بعد اصلاحها کی قید فساد کی شناعت کو بتانے کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد کرنا بجائے خود بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو۔ اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو اور درست اور صالح کو بگاڑنا ہے مطلب یہ ہے کہ دین حق اور اخلاق صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیاء سابقین کی ہدایت و راہنمائی میں قائم ہو چکا تھا۔ اب تم اسے اپنے اعتقادی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور قانونی گمراہیوں سے خراب نہ کرو۔ یہ تعبیر لا تعثوا فی الارض مفسدین مفاسد کی ساری قسموں اور صورتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بلکہ بعض نت نئی اور ناقابل تصور شکلوں میں آج دنیا کے ملکوں میں مظاہرہ ہو رہا ہے۔ انہیں کون گن سکتا ہے معصوم بچوں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کو اُڑا اُڑا کر لے بھاگتا اور ان کی ماؤں اور باپوں کو یہ دھمکی دے کر بڑی بڑی رقمیں طلب کرتا کہ اگر روپیہ نہ دیا جائیگا تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا فساد فی الارض کی ایک نوع ہے۔

یہاں پیر محمد کرم شاہ بڑی اچھی بات فرما گئے۔ آپ بھی استفادہ کریجئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ خطبہ کتنا حکیمانہ اور مدلل ہے پہلے فرمایا کہ ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو کیونکہ یہ گھٹیا حرکت تو وہ کرتے ہیں۔ جو نادار وغریب ہوں۔ لیکن انی اراکم بخیر تمہاری مالی حالت بہتر ہے۔ تم آسودہ حال ہو، کاروبار بڑے عروج پر ہے۔ اتنے متمول ہونے کے باوجود تمہارا ان رذیل ہتھکنڈوں کو استعمال کرنا تمہارے شایان شان نہیں۔ کس عمدہ طریق سے انہیں شرم دلائی جا رہی ہے اور اس فعل سے انہیں روکا جا رہا ہے۔ غیرت و حمیت کو مہمیز لگانے کے ساتھ ہی یہ بھی تنبیہ کر دی کہ تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ تم اس چابکدستی سے ڈنڈی مارتے ہو کہ تم لوگوں کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ نفع کما لو اور تھوڑی سی مدت میں امیر کبیر بن جاؤ اور تمہارا خیال ہے کہ تم نے بہت دولت اکٹھی کر لی تو امن وسلامتی اور راحت و شادمانی کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن تمہارا یہ خیال درست نہیں ناجائز معاشی استحصال کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اس سے آخر کار فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے وہ لوگ جو تمہیں کمزور اور بے زبان نظر آرہے ہیں اور جن کے متعلق تمہارا یہ نظریہ ہے کہ ان کے جسم سے جتنا بھی خون نکال لیا جائے یہ اُف تک نہیں کرتے اُن میں تو احتجاج کی سکت بھی نہیں لیکن جب ظلم وتشدد کی انتہا ہو جائے گی تو ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جائے گا اور پھر خاموشی ٹوٹ جائے گی۔ ان کا بے نور آنکھوں سے غیظ وغضب کے انگارے چھوٹیں گے۔ ان کی زبان شعلہ نوا بنے گی اور تمہارے عشرت کدوں اور تمہارے سامان تعیش کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ تم انہیں باغی کہو گے۔ فسادی اور فتنہ باز کہو گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ وفساد کے باعث تم ہو۔ سارا ایندھن تم نے فراہم کیا انہوں نے صرف آگ لگا دی۔ یہ ہلاکت خیز بم تم نے تیار کیا انہوں نے تو جوشِ انتقام میں صرف اس کا بٹن دبا دیا۔

معاشی میدان میں ناجائز وسائل سے نفع اندوزی کرنے والوں کو فسادی کہہ کر ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ آج ہر ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی کا سیلاب امڈا چلا آرہا ہے۔

(۱۰۴) قناعت کی تعلیم

اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ کا دیا جو کچھ بچ رہے اس میں تمہارے لیے بہتری ہے ایک ایماندار آدمی کے لیے اللہ کا دیا ہوا جو ٹھیک ٹھیک حقوق ادا کرکے بچ رہے۔ اس کثیر سے بہتر ہے جو حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا جس میں لوگوں کے حقوق مارے جائیں مال حلال میں جو ٹھیک ناپ تول کر لیا دیا جائے فی الحال

برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں اجر ملتا ہے [۱] عام شارحین قرآن نے یہی مطلب بتایا ہے کہ وہ مال جو جائز طریقہ سے کمایا جائے اس مال سے اچھا ہے جو ناجائز ذرائع سے حاصل ہو اس میں برکت ہوتی ہے اور انجام بہتر ہوتا ہے۔ امام مجاہدؒ بقیۃ سے طاعت مراد لیتے ہیں۔ امام ربیعؒ اللہ کی وصیت بتاتے ہیں۔ اور ابن زیدؒ اللہ کی رحمت کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ اللہ کا رزق بتاتے ہیں حاصل سب کا ایک ہے۔ تاجر اگر ناپ تول میں ٹھیک ٹھیک عدل کو پیش نظر رکھے جھوٹ، فریب، ملاوٹ اور اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں سے بچے۔ دوسروں کی ریس میں غلط راستے نہ اختیار کرے تو گو وہ اتنا زیادہ منافع نہ لوٹ سکے جتنا دوسروں نے جنہوں نے حلال وحرام کی تمیز اٹھا دی۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہوا منافع برکت بھی ہے، اللہ کی طاعت بھی ہے، اللہ کی وصیت بھی اگرچہ وہ قلیل ہی ہو دوسروں کے کثیر سے ہزار درجہ افضل ہے۔ عام شارحین قرآن نے یہی مطلب بتایا ہے لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جو بات ارض القرآن میں فرمائی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے فرماتے ہیں۔

ان آیات میں مدین کے جن حالات کی طرف تلمیح ہے۔ چونکہ مدین کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیش نظر نہ تھی اس لیے بہت سے عقدے ناکشودہ رہ گئے۔ سب سے اول یہ کہ وہ اہل مدین و بنی اسرائیل کے باہمی واقعات و منازعات سے بجز واقعہ قرابت حضرت موسیٰ و شعیب علیہما السلام ناواقف ہیں۔ اس بنا پر ان آیات کی تفسیر میں ان واقعات کا وہ کوئی تعلق ظاہر نہیں کرتے حالانکہ ہماری رائے میں یہ آیات تمام تر ان ہی واقعات سے متعلق ہیں۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مدین ایک تاجر قوم تھی اس بنا پر اس میں یہ مذموم صفت ہوگی جو حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔ بنی اسرائیل جب مصر سے حدود عرب میں داخل ہوئے تو ان کے پاس رسد کا کوئی سامان نہ تھا۔ قرب وجوار کی قوموں سے بقیمت خریدتے تھے اس خرید و فروخت میں وہ صرف کمی بیشی نہیں کرتے تھے بلکہ سود، بٹہ اور دیگر اصناف محرمہ کے بھی مرتکب تھے۔

عموماً مفسرین تاآنکہ امام رازی بھی فتنہ و فساد سے کفر مراد لیتے ہیں حالانکہ اس سے بعد صلح و امان، بنی اسرائیل کے ساتھ مخالفت و منازعت اور سازش و خونریزی ہے اور بقیہ کا مطلب بھی ہمارے مفسرین یہ بتاتے ہیں کہ حرام کے بعد جو حلال چیزیں باقی رہ گئی ہیں وہ تمہارے لیے کافی ہیں حرام کی طلب کیوں کرتے ہو لیکن اس صورت میں اول آیت لاتعثوا فی الارض الخ کا بقیۃ اللہ الخ سے تعلق کیا رہے گا۔ ملک میں فساد نہ کرو حلال چیزیں باقی تمہارے لیے کافی ہیں۔ ملک میں فساد اور حلال چیزوں پر قناعت دونوں بے ربط باتیں ہو جاتی ہیں۔
ہمارے نزدیک مدین کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر مطلب نہایت صاف اور واضح ہو جاتا ہے اہل مدین چاہتے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

تھے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر ملک کا جو حصہ لے لیا ہے واپس لے لیں حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فتنہ و فساد سے فائدہ نہیں خدا نے جو کچھ باقی رکھا ہے ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے ۔ جنگ کی غرضیں دو تھیں ۔

ایک یہ کہ اپنے دیوتا بعل فعور کی اہانت کا انتقام اسرائیل کے خدا کا مقابلہ ۔

دوسرے یہ کہ جن راہوں سے بھی ہو چاہے وہ حرام ہی ہوں بنی اسرائیل سے ملک و دولت کی واپسی ۔

(۱۰۵) میں تمہارا نگران نہیں

اور دیکھو میرا کام پیغام پہنچانا ہے ۔ میں تمہارا رکھوالا نہیں ہوں یعنی میں نے تم کو نصیحت کردی آگے اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم سے زبردستی عمل کرا کے چھوڑوں[۱] یعنی میں نے نیک و بد تمہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے اور یہی میری ذمہ داری تھی مانو گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے نہ مانو گے تو تم بھی اس کا انجام بھی دیکھ لوگے ۔ دیکھو مجھے اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا ۔ میں تو صرف تمہیں اس کے نتائج سے خبردار کرنے والا ہوں ۔ تم پر نگران نہیں ہوں ۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں ہے ۔ میں تو صرف ایک خیر خواہ ناصح ہوں ۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمہیں سمجھا دوں ۔ آگے تمہیں اختیار رہے چاہے مانو چاہے نہ مانو ۔ سوال میری بازپرس سے ڈرنے نہ ڈرنے کا نہیں ہے اصل چیز اللہ سبحانہٗ کی بازپرس ہے ۔ جس کا اگر تمہیں کچھ خوف ہو تو اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

قَالُوْا

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ
نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ
مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ
اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿٨٨﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ
اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ
قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿٩٠﴾

قوم مدین نے کہا کہ اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ رکھیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور ہم اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ بلاشبہ تم تو بہت ہی بھولے بھالے اور راست باز ہو ﴿۸۷﴾ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا

کہ اے میری قوم کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں اور اس نے مجھے اچھی روزی سے نوازا[107] اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تم کو روکوں خود اس کے خلاف کروں[108] میں تو صرف اپنی بساط کے مطابق تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور میرا یہ کام صرف اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ میرا بس اسی پر بھروسہ ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں[109] اے میری قوم میری مخالفت تمہیں ایسا نہ بنا دے کہ تم پر بھی قوم نوحؑ، قوم ہود، اور قوم صالح علیہم السلام کی افتاد کا سبق دہرایا جائے اور قوم لوط کا معاملہ تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے[110] اور تم اللہ سبحانہٗ کی جناب میں اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگ لو اور آئندہ کے لیے اللہ کی طرف پلٹ آؤ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت کار اور شفقت والا ہے[111]

مقاصد کی تکمیل کے لیے اللہ سبحانہٗ کی عبادت

اللہ سبحانہٗ کی عبادت مقصد تخلیق کی تکمیل کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا اس کے وجود کی بقا کے لیے غذا، پانی، ہوا ضروری ہے۔ لیکن اللہ سبحانہٗ کی عبادت کے کچھ متضمنات ہیں۔ جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ الوہیت کا ہر تصور اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے الٰہ ہونے کا اعتقاد بے معنے ہے۔ اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی، اس کی

رحمت اور اس کے غضب کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں۔ جس اللہ سبحانہٗ کی پسند اور ناپسندیدگی، جس کی خوشی اور ناخوشی کا کوئی اصول و معیار نہ ہو۔ جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو۔ کہ وہ کس قسم کے اعمال سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سا اس کے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجا کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ کی الوہیت کا اعتقاد خیر و شر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے۔ اس لیے ہم اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور ہیں۔ کہ عبادت کا نظام الٰہی اساس پر مبنی ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کی خوشنودی یا ناراضی کے اسباب کا علم انسان کو صرف نبوّت کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کنتم مؤمنین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مردم شماری کے مسلمان ہیں مادیت پسن کر نبوّت کی تعلیم سے اتنے بے خبر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو یہ احساس بھی نہیں رہا۔ کہ اللہ کو ماننے کے تقاضے کیا ہیں۔ دو باتوں کا ان کے خیال میں ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایک یہ کہ ایک اللہ سبحانہٗ کی عبادت کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے دوسری یہ کہ ہمارے مالیاتی معاملات پر بھی ہماری رضا اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اس پر بھی کوئی قدغن ہے اس لیے وہ طنزاً کہتے ہیں کہ تمہاری نماز پڑھنے کا نتیجہ یہ کیوں ہے کہ ہمیں بھی اپنی راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہو۔ یعنی بنار نزاع نماز نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم دوسروں کو کیوں دعوت دیتے ہو۔ یعنی اگر حضرت شعیب علیہ السلام ان کی آبائی رسوم عبادت اور ان کے مالیاتی معاملات پر حلال و حرام، جائز و ناجائز کی بات نہ کریں تو ان کو ان کی نماز پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(۱۰۶) قوم مدین نے کہا اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ رکھیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور ہم اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا چھوڑ دیں بلاشبہ تم تو بہت ہی بھولے بھالے راست باز ہو۔ یہ بطور استہزار و تمسخر کہہ رہے تھے۔ کہ بس زیادہ بزرگ بنے بیٹھے ہو۔ کیا ساری قوم میں ایک تم ہی بڑے عقلمند، باوقار، نیک چلن رہ گئے ہو۔ باقی سب ہم اور ہمارے بزرگ سب جاہل اور احمق ہی رہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نماز کثرت سے پڑھتے تھے کہنے لگے کہ شاید آپ کی نماز یہ حکم دیتی ہے۔ کہ ہم سے باپ دادا کا دین چھڑا دیں اور ہمارے اموال میں ہمارا مالکانہ اختیار نہ رہنے دیں۔ بس آپ اپنی نماز پڑھے جائیے۔ ہمارے مذہبی اور دنیاوی معاملات اور ناپ تول کے قصوں میں دخل نہ دیجئے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں" جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکی کے کام آپ نہ کر سکیں تو انہی کو چڑانے لگے۔ یہ ہی خصلت ہے کفر کی۔ بعض مفسرین نے انک لانت الحلیم الرشید

کو استہزاء پر نہیں بلکہ واقعیت پر محمول کیا ہے۔ یعنی تو ایک سمجھدار، باوقار اور نیک چلن آدمی ہے۔ پھر ایسی بے موقع باتیں کیوں کرنے لگا۔ جیسے صالح علیہ السلام کو کہا تھا۔ قد کنت مرجوًا قبل هذا اتنهانا ان نعبد ما یعبد آباءنا الخ [1]

فی الواقع اکثر شارحین قرآن نے اسے استہزار تکلم، تعریض، طنز ہی پر محمول کیا ہے۔ مگر قرآن کا سیاق و سباق اس کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ اسی لیے کچھ شارحین نے عام شاہراہ سے ہٹ کر اسے واقعہ اور حقیقت قرار دیا ہے۔ غالباً جن بزرگوں نے اسے طنز و تعریض قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطب ناخدا شناس اور منکرین حق ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ خدا شناس ہیں اور حق کو مانتے ہیں لیکن علوم نبوّت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے مادی زندگی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کنتم مؤمنین۔ اس کا قرینہ ہے۔ یعنی اخلاقی اور اعتقادی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم مؤمن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راستبازی اور دیانت میں ہونی چاہیئے اور تمہارا خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیئے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں کہ بلاشبہ آپ راستباز اور عالی ظرف ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ جملہ انك لانت الحليم الرشيد پر غور فرمایئے۔ کتنی تاکیدیں جمع کی گئی ہیں۔ پہلے ان لائے پھر لام تاکید لائے پھر خبر کو معرفہ لا کر قصر پیدا کیا یعنی وقار، دانائی اور دیانت، راستبازی کا بلاشبہ صرف آپ کی ذات پوری قوم میں مرکز ہے۔ اور آپ کی عابدانہ زندگی کا بھی ہمیں اعتراف ہے۔ لیکن آپ کی عابدانہ زندگی آپ کو یہ بتا رہی ہے کہ آپ ہمیں بھی اپنے ہی جیسا بنا لیں۔ ہمیں آپ کی دیانت، آپ کی فراست، اور آپ کی عبادت کا انکار نہیں۔ لیکن عبادت گزاری کا یہ مطلب کیوں ہے؟ کہ آپ ہمیں بھی دعوت دیں۔ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زندگی اور قوم کی زندگی کے باہمی اختلاف تفاوت کا ایک نمونہ ہے۔ اس قسم کی باتیں وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا سے غافل اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ چونکہ نماز دینداری کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ اس لیے وہ پوچھ رہے ہیں کہ نماز کا یہ مطلب کب ہے کہ ہمارے عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی سے نہ ہوں اور مالیاتی مسائل میں ہمیں اپنے منشار کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہ ہو۔ اس میں طنز اور تعریض اور استہزاء کی کون سی بات ہے۔ یہ تو حقیقت اور واقعہ ہے اسی لیے علامہ قرطبی نے فرمایا ہے۔۔

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اس سب سے اچھا اور جسے سیاق کی تائید حاصل ہے۔ یہ ہے کہ جب تم عقلمند بھی ہو ، راست باز بھی ہو تو پھر ہم سے تم مطالبہ کیوں کرتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ کیا تمہاری نماز تم سے یہ کہہ رہی ہے۔ استفہام انکاری ہے یعنی نماز تو یہ کام نہیں کرتی پھر خبر نہیں تم ہم سے یہ کیوں کہہ رہے ہو۔

قوم مدین کے معبود

تورات بتاتی ہے کہ مدین بعل دیوتا کو پوجتے تھے۔ اس دیوتا کا ذکر حضرت الیاس ؑ کے تعلق سے بھی قرآن میں آیا ہے۔ شارحین قرآن نے عکرمہؓ، مجاہدؒ، اور قتادہؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ بعل یمن کی زبان میں آقا، مالک کو کہتے ہیں، اسی لیے عربی میں شوہر کو بعل کہتے ہیں۔ یہ صرف یمن کی زبان ہی کا لفظ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ تمام سامی زبانوں میں پایا جاتا ہے اور بعل اکثر مشرقی سامی قوموں میں پوجا جاتا تھا۔ بعلبك ملک شام کا ایک مشہور قدیم شہر ہے۔ جو اسی بعل دیوتا کی طرف منسوب ہے۔ روایتوں میں ہے کہ یہ دیوتا سونے کا تھا، چودہ ہاتھ لمبا تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ تورات میں اس کے تین نام آئے ہیں۔ بعل، بعل فغور اور بعل بریث۔ بعل کے لیے مذبح، قربان گاہ اور ہیکل بنتے تھے۔ لوبان اور دیگر بخورات ان میں جلائے جاتے تھے۔ اولاد کو اس کی خاطر آگ میں ڈال دیا جاتا تھا اور یہ بہترین قربانی سمجھی جاتی تھی۔ بعل کی پوجا کے لیے خاص قسم کے برتن اور ظروف ہوتے تھے سامی قوموں میں اور مدین کے ہمسایوں میں بعل کی پوجا کی یہی رسوم تھیں۔ غالباً مدین میں بھی رسوم عبادت ہوں گی۔

مستشرقین یورپ کی تحقیق کے مطابق بعل ستارہ زحل کا نام تھا۔ اس کی مدین میں پرستش کی جاتی تھی مدین اور مدین کے قریب موآب تھا۔ مذہباً اور اخلاقاً دونوں قوموں کی بدترین حالت تھی۔ تمدن کے جراثیم جن بیماریوں کو جنم دیتے ہیں۔ وہ ایک ایک کرکے پیدا ہو چکے تھے۔ بتوں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی ان کا مذہب تھا۔ تمام بتوں کا سردار بعل فغور تھا۔ اخلاقی حالت اس قدر پست تھی کہ شرفاء خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں مردوں کا یہ حال تھا کہ ظلم و ستمگری ان کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا۔

بنی اسرائیل مصر سے نکل کر موآب و مدین کے میدانوں میں خیمہ زن تھے۔ ان بدکاروں نے بنی اسرائیل کے لیے سازشوں کا جال پھیلایا۔ عورتوں نے تو جوانان بنی اسرائیل کو جو اصل میں فوج کے سپاہی تھے اپنے قابو میں کر لیا۔ ان حالات میں قوم مدین نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا کہ آپ ہیں تو بڑے زیرک، عقلمند، باوقار مگر یہ باتیں کیا کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم اپنے ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات ختم کر دیں جن کی ہمارے باپ دادے

عبادت کرتے تھے۔ کیا آپ کی نماز آپ کی یہ راہنمائی کر رہی ہے۔ یہ بات اس وقت کہی جاتی ہے۔ جب عام زندگی اللہ سبحانہٗ سے غافل اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے چونکہ نماز دینداری کا سب سے بڑا شاہکار ہے اور نماز پر مبنی دینداری کی عمارت کو فاسق و فاجر لوگ اپنی بدکار زندگی کے لیے سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہیں فی الواقع نمازی کی نماز کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ سوسائٹی کی برائیوں پر کھلی تنقید کرے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی نگاہ صرف پرستش کی حد تک ان کے مشرکانہ کردار پر ہی نہ تھی بلکہ بندگی کی حدود میں ان کی نظر ان تمام برائیوں پر جو تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی تھیں! انہوں نے مدین قوم کے مالیاتی مسائل پر بھرپور تنقید کی اور بتایا کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی کو حضرت شعیبؑ نے انی اخاف علیکم عذاب یوم محیط۔ مگر نشہ میں مخمور قوم مدین نے بجائے اس کے کہ اس سے باز آئے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ کی نماز ہمیں اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی چاہت اور مرضی کے مطابق تصرف سے روکتی ہے۔ ان نفعل فی اموالنا ما نشاء۔ یہ خرید و فروخت میں کمی بیشی کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ سود اور سٹے کے ذریعے تاجروں کو ان کے جائز حق سے محروم کرتے تھے۔

حضرت زید بن اسلمؓ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلمؓ آیت اصلاتک الخ کی تشریح میں فرماتے ہیں۔ کہ حضرت شعیبؑ ان کو ان کے بٹاون میں سے روکتے تھے۔

(۱۰۷) اللہ سبحانہٗ کی روشن دلیل

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میری قوم کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں اور اس نے مجھے اچھی روزی سے نوازا ہو۔ یا ظاہری روزی مراد ہے۔ یعنی ناپ تول میں کمی بیشی کے بغیر حلال و طیب طریق سے روزی عطا فرمائی یا باطنی روزی یعنی علم و حکمت اور نبوت عطا کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ کو فہم و بصیرت دے کر وہ صاف راستہ دکھلا دیا جو تم کو نظر نہیں آتا اور اس دولت سے مالا مال کیا جس سے تمہیں حصہ نہیں ملا۔ تو کیا اس کا حق یہ ہے کہ میں معاذ اللہ تمہاری طرح اندھا ہو جاؤں اور خدا کے احکام سے روگردانی کرنے لگوں یا تمہارے استہزاء و تمسخر سے گھبرا کر نصیحت کرنا

اور سمجھانا چھوڑ دوں ہرگز نہیں [1]

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی جانب سے قوم کو جواب ہے ان کنت علی بینۃ الخ کی شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہے۔ لوگو! تمہاری کیا رائے ہے اگر میں فی الواقع اللہ کا رسول ہوں تو کیا میرے لیے اس کی گنجائش ہے کہ میں تمہیں غیر اللہ کی عبادت سے نہ روکوں اور گناہوں سے باز رہنے کی تلقین نہ کروں جبکہ تم مان رہے ہو کہ میں ہمیشہ سے تمہاری راہنمائی کا کام کر رہا ہوں اور حلم و وقار کا حامل ہوں۔ تم فوری انصاف کرو کہ اگر میں تمہارے لیے ارشاد کا کام نہ کروں تو اور کیا کروں۔ نبوّت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔ اور پھر جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مجھے دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ اور یہ مال و دولت مجھے راہ حلال سے ملی ہے۔ جن لوگوں نے پہلی آیت میں معنے مجازی لے کر آیت کو تعریض بتایا ہے۔ انہوں نے اس کے معنے نبوت اور علم حق کے کیے ہیں۔ اور جن لوگوں نے آیت میں معنے حقیقی لیے ہیں۔ وہ رزق حسن سے وہی معنی مراد لیتے ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی یہی معنے لیے ہیں۔ اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ موقع و مقام کے مناسب یہی ہے کہ رزق حسن سے مراد وہ مال ہے جو اللہ سبحانہٗ نے ان کو دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ شعیب علیہ السلام کثیر المال تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہونے کے ساتھ کثیر المال بھی ہوں۔ دولت کی فراوانی کا اللہ کی جانب سے انعام یہی ہے۔ اب میرے لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جان بوجھ کر ان گمراہیوں اور بد اخلاقیوں میں تمہارا ساتھ دوں۔ جن میں تم مبتلا ہو۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی بے رخی دیکھ کر یہ بات فرمائی۔ کہ تم مجھ سے بلا وجہ ناراض ہو رہے ہو۔ تمہیں شاید یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میں تمہاری دولت اور خوشحالی پر حسد کر رہا ہوں تمہارا یہ خیال غلط ہے مجھے تمہاری خوشحالی پر حسد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں کوئی مفلس و نادار تو نہیں ہوں کہ تمہاری دولت کو دیکھ کر حسد کروں۔ مجھے اللہ سبحانہٗ نے اپنی رحمت کے خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔

(۱۰۸) نبوّت کی بے داغ زندگی

اور نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تمہیں روکوں خود اس کے خلاف کروں یعنی جن بری باتوں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم سے علیحدہ ہوکر اس کا خود ارتکاب کروں۔ مثلاً تمہیں تارک الدنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹ کر گھر بھرلوں۔ میں جو نصیحت تم کو کرتا ہوں۔ میں تم سے پہلے خود اس کا پابند ہوں تم یہ الزام مجھ پر نہیں رکھ سکتے کہ میری نصیحت کسی خودغرضی اور ہوا پرستی پر محمول ہے[1] بات تو اونچی ہے مگر شیخ الاسلام کا انداز تعبیر کچھ انوکھا سا ہے۔ جن باتوں سے تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں کہ اس کا خود ارتکاب کروں مثلاً تمہیں تو تارک دنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹوں۔ اسی بات کو اگر یوں کہہ دیا جاتا کہ تم کو مال حرام کھانے سے روکوں اور خود سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے کاروبار میں بے ایمانیاں کروں۔ تو بلاشبہ تم کہہ سکتے تھے کہ میں خودغرض ہوں۔ تو اس میں کوئی وزن ہوتا۔ شیخ الاسلام کی تعبیر سے محسوس ہوتا ہے کہ نبوت لوگوں کو تارک الدنیا بنانے آئی ہے۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ یہ نبوت کا قرآنی تصور نہیں اشتراقی تصور ہے اور اس تصور کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان دنیا کو مایا کا جال سمجھ کر اس سے دور بھاگے۔ اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو۔ زندگی کے مسائل پر اک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو۔ بستیوں سے اسے وحشت اور وحشت کدوں سے اُنس ہو۔ مادی رشتوں کو، مادی ضرورتوں اور مادی خواہشوں کو سرتاسر شیطنت تصور کرے۔ ایک ایک دنیوی نعمت کو اپنے لیے حرام قرار دے لے۔ فلاطینوس صاف لفظوں میں لکھتا ہے۔

> جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ تو وہ ہر چیز ترک کر دیتی ہے۔ (تاریخ تصوف قبل از اسلام) ص۶۳

اور یہ کہ

> حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان میں تبدیلی سے نہیں آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔ ۶۹

عرفانی حکما، تو اس انداز فکر کے منطقی تقاضوں کی انتہا تک پہنچ گئے تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ

> انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔ ۶۷

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن اور ترک دُنیا

اس کے برعکس قرآن کا تصور یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے مادے کو اپنی روح کا قفس گمان نہ کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے دو لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو رہنے دنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پالینے کے لیے گوشوں میں بیٹھ رہنے کی وہ روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسے چاہیئے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو قانون کی حدود میں پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے۔ اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے اپنے فریضۂ حیات کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھ کر کرے۔ دینی ذوق کے ساتھ کرے اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف کرنے میں دینداری کا نقص ہے۔ کمال بندگی سے محرومی ہے عتاب الٰہی کا اندیشہ ہے۔

قرآن کی اس آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کا جواب بتا رہا ہے کہ تمول و مالداری منصب، رسالت اور مقام نبوّت کے منافی نہیں ہے۔ پھر مقام ولایت کے کیسے منافی ہو سکتی ہے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریا بن وجیہ الدین ابو محمد ملتانی جن کی ولایت کے موضوع پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے منحۂ اللہ اموالاً غزیرۃً۔ سرمایہ اور دولت اللہ کی جانب سے بڑی فراوانی سے ملا تھا۔ بہت زیادہ سرمایہ کے مالک تھے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ کتنا مال اور کس قدر دولت ان کو ملی تھی۔ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو وارثوں میں انہوں نے سات بیٹے اور کچھ بیٹیاں چھوڑی تھیں۔ جب ان کی میراث تقسیم ہوئی۔ تو گھروں اور گھروں کے سامان کو چھوڑ کر جو نقدی ان میں تقسیم ہوئی۔ وہ کس قدر تھی بتانے والوں نے بتایا ہے کہ ایک صاحبزادے کو صرف ستر لاکھ دینار ملے تھے۔ یعنی ساتوں لڑکوں کو چار کروڑ نوے لاکھ ملے تھے۔ لڑکیاں الگ ہیں۔

قرآن دنیا سے نہیں دنیا کے غلط استعمال سے روکتا ہے۔ دنیا کے غلط استعمال کو دیکھ کر دنیا ہی کو ترک کرنا صحیح نہیں۔ دنیا جب بھی غلط ہاتھوں میں ہوگی غلط ہوگی۔ اور جب بھی دنیا خدا شناس لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی تو اچھی ہوگی۔ آخر قرآن نے سلیمانؑ، داؤدؑ اور یوسف علیہم السلام کا بطور بادشاہ کے ذکر کیا ہے۔

(۱۰۹) دعوت میں داعی کا سرمایہ

میں تو صرف اپنی بساط کے مطابق تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور میرا کام صرف اللہ کی توفیق سے ہونا

ہے میرا بس اسی پر بھروسہ ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔ میری تو تمام تر کوشش یہ ہے کہ تمہاری دینی اور دنیاوی حالت درست ہوجائے ۔ موجودہ ردی حالت سے نکل کر بام ایمان وعرفان پر چڑھنے کی کوشش کرو ۔ اس مقصد اصلاح کے سوا دوسرا کوئی مقصد نہیں جسے میں اپنے مقدور د استطاعت کے موافق کسی حال میں چھوڑ نہیں سکتا باقی یہ کہ میری بات بن آئے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاؤں یہ سب اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے ۔ اسی کی امداد توفیق سے سب کام انجام پا سکتے ہیں ۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے ۔ اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں [1] اس سے معلوم ہوا کہ اتباع کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی خود متبع ہوجائے بلکہ ضروری ہے کہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے ۔ دوسروں کو دعوت دینے کے لیے ان آیات سے جو کچھ منطوقاً ، مدلولاً اور مفہوماً معلوم ہو رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ۔

اول یہ کہ جو دعوت کی ذمہ داری لے کر عوامی زندگی کو مخاطب بناتا ہے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دعوت کے حق ہونے کا اس دلائل کی قوت سے بھرپور یقین ہو ایسا یقین کہ کسی پہاڑ کا وزن بھی اس کے یقین میں جنبش نہ پیدا کرے ۔ كنت على بينة من ربي کا یہی منطوق ہے یعنی اس معاملہ میں میرا موقف سرتاسر بصیرت ہے بینة کے معنے روشن دلیل اور واضح حجت کے ہیں ۔ یہ روشن دلیل اذعان و یقین کا سرمایہ ہوتی ہے ۔

دوم یہ آیت بتا رہی ہے کہ داعی اپنی معاشی زندگی میں اپنے مخاطبوں کا دست نگر نہیں ہوتا ہے وہ خود کفیل ہوتا ہے ۔ اور مخاطبوں کی نظر میں معاش کے لحاظ سے کمتر نہیں ہوتا ہے ۔ اللہ کا دیا اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے ۔ وہ اپنے مخاطبوں سے کسی اجرت کا طالب نہیں ہوتا ہے وہ اس معاملے میں کھلے طور پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ رزقني رزقا حسنا ۔ میں اسی طرف اشارہ ہے ۔

سوم داعی کے علم وعمل میں تضاد نہیں ہوتا ہے وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کچھ کرتا ہے ۔ اس کی دعوت کے پس منظر اور پیش منظر میں کوئی مادی غرض نہیں ہوتی ہے وہ لوگوں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے خود بھی اس کی عملی تصویر ہوتا ہے اور جس چیز سے روکتا ہے خود بھی اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے ۔ قاضی ضیاء الدین نصاب الاحتساب میں لکھتے ہیں ۔

> اس آیت میں احتساب کے موضوع پر محتسب کے لیے یہ راہنمائی ہے کہ محتسب کے علم وعمل اور قول وفعل میں تضاد اور دو رنگی نہ ہو تاکہ محتسب لوگوں کی تنقیدات کا نشانہ نہ بنے قرآن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ ما ارید ان اخالفکم الی ما انھٰکم عنہ۔ جن جن باتوں اور کاموں سے میں تمہیں روکتا ہوں اس کا خود ارتکاب کرنا نہیں چاہتا ہوں۔

علامہ عبدالرحمٰن بن نصر الشیزری المتوفی ۵۸۹ھ جنہوں نے احتساب کے موضوع پر کتاب نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی درخواست پر لکھی ہے وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ

محتسب کا اولین فرض یہ ہے کہ اس کے علم وعمل میں موافقت ہو اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات اس کے کردار کے مخالف نہ ہو۔ قرآن میں علماء بنی اسرائیل کی مذمت میں آیا ہے۔ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم الخ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے معراج والی رات میں ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا۔ کہ یہ آپ کی اُمت کے وہ خطیب ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ بات نقل کی ہے۔ ما ارید ان اخالفکم الخ

چہارم یہ آیت بتا رہی ہے کہ داعی کا پیش نہاد اپنی دعوت میں صرف معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور اصلاح بھی استطاعت کے موافق۔ علم الاحتساب کے علماء نے اسی محتسب کے لیے یہ نکتہ آفرینی کی ہے۔ کہ

محتسب کو چاہیئے کہ اس کا احتساب میں مقصود صرف اصلاح ہو۔ قرآن میں ہے۔ ان ارید الا الاصلاح الخ (نصاب الاحتساب)

اور اس اصلاح کا پس منظر رضاء الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس کی عقل، اس کا ارادہ اور اس کے جذبات وخواہشات رضاء الٰہی اور منشاء خداوندی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ علامہ شیزری لکھتے ہیں۔

محتسب کے فرائض میں داخل ہے کہ اس کی کوئی بات اور اس کا کوئی کام رضاء الٰہی سے خالی نہ ہو۔ اس کی نیت خالص ہو، اس میں نمائش اور برتری کا نام ونشان نہ ہو۔ احتساب میں لوگوں سے مناقشہ اور معاشرے میں برتری سے بچ رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

اللہ سبحانہٗ اسے عوامی زندگی میں شرف قبولیت عطا فرمائے گا۔ دلوں میں اس کی ہیبت ہوگی۔ لوگوں

کے دلوں کے دروازے اس کی پذیرائی کے لیے کھل جائیں گے۔ (نہایۃ الرتبۃ)

کیونکہ نبوت کی دعوت کی اصل غایت یہ ہے کہ دنیا میں اخلاق و روحانیت کے اصولوں کو فروغ دیا جائے۔ اور انسان کو ایک ایسے آئین حیات اور ضابطۂ عمل کا پابند بنایا جائے جو اُسے تسخیر نفس اور تسخیر فطرت کے نصب العین سے قریب تر کردے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وحی الٰہی پر مبنی نظام زندگی کا مقصد وجود انسان کی ایسی اخلاقی تربیت اور اس کی شخصیت کا ایسا ارتقا رہے جو بالآخر انفس و آفاق کی تسخیر پر مبنی ہو۔ محض مادی ترقی اور اقتصادی فلاح کا حصول نبوت کا مقصود نہیں ہے۔ مادی فلاح اور امن و فارغ البالی کا قیام وحصول اس اخلاقی تربیت کا لازمی نتیجہ ہے جو نبوت روحانی اقدار اور معاشی تقاضوں کو عبادت الٰہی کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ جہاں روحانی قدروں اور اقتصادی ضرورتوں میں عبادت کی پیوندکاری ہوگی وہاں یہ نتائج خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت نے جس چیز کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اس سے صرف وہی حالت مراد نہیں جس میں افراد کا ارادہ بالکل بے قید اور آزاد ہو بلکہ اس کا اطلاق اس تمدن و معاشرت پر بھی ہوتا ہے جس کے پیش نظر محض مادی ارتقا اور امن و فارغ البالی کا حصول ہو اور جس میں اللہ سبحانہٗ سے عبادت کے ذریعے قرب اور صفات الٰہی سے مشابہت پیدا کرنے کی خواہش انفرادی و اجتماعی اعمال کی محرک نہ ہو۔

پنجم یہ آیت بتا رہی ہے کہ دعوت کے کام میں داعی کو اپنی محنت عرق ریزی پر قطعاً اعتماد نہیں ہوتا خواہ محنت کتنی ہو اور کیسی ہو بلکہ اس میں اس کی نظر اللہ سبحانہٗ کی توفیق پر ہوتی ہے یعنی اسے یقین ہوتا ہے خیر کے لیے اسباب پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔ میرے کام اور محنت کی حیثیت اس راہ میں صرف ایک بہانے کی ہے اور اس بہانے کے لیے بھی توفیق دینا اللہ سبحانہٗ کا انعام ہے اگر اس کی رحمت یاوری نہ کرے تو یہ بہانہ بھی میرے بس سے باہر ہے۔ بہرحال داعی کی، محتسب کی اپنی جدوجہد، اپنی جانفشانی اور محنت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ اللہ سبحانہٗ کی دین پر ہوتی ہے۔ مولانا سنائیؒ لکھتے ہیں۔

محتسب کو احتساب میں اللہ کی توفیق پر نظر رکھنی چاہیئے قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اس میں محنت کے ساتھ دلیری اور بے باکی بھی ضروری ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی اس ماستطعت میں اس طرف بھی اشارہ ہے یعنی بلا خوف لومۃ لائم۔ پوری دلیری اور بے باکی سے میں یہ کام اپنی استطاعت کے مطابق بجان عمر کھوں میں ڈال کر کروں گا۔ لکھا ہے۔

۵۵۵ھ میں اتابک طغتگین بادشاہ شام کو ایک محتسب کی ضرورت ہوئی بادشاہ کو بتایا گیا کہ ایک صاحب علم شخصیت شہر میں موجود ہے آپ ان سے یہ کام لے سکتے ہیں۔ فرمایا بلاؤ۔ آئے۔

بادشاہ نے ان سے کہا کہ آپ کو محتسب مقرر کیا جاتا ہے آپ کا کام شہری زندگی میں لوگوں کو برائی سے روکنا اور نیکی کی تلقین کرنا ہے۔ بادشاہ ریشمین غالیچے پر ریشمیں تکیہ لگائے بیٹھے تھے بننے والے محتسب بولے اگر میں محتسب ہوں تو براہ مہربانی یہ ریشمیں گدا اور تکیہ ہٹایئے اور ہاتھ سے یہ سونے کی انگوٹھی اتاریئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو اس کے استعمال سے منع کیا ہے۔ بادشاہ نے فوراً غالیچہ اور تکیہ اٹھا دیا اور ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور کہا کہ اب پولیس پر احتساب بھی آپ کا کام ہے لوگوں نے ایسا دلیر اور بے باک محتسب کوئی نہیں دیکھا تھا۔

ششم یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ داعی میں کمال عبدیت ہونی چاہیئے نتائج کے معاملے میں نظر اپنے کام پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی ذات اور اس کی صفات پر ہونی چاہیئے۔ نبی اور سربراہ مملکت، داعی اور لیڈر میں یہی وہ جوہری فرق ہے۔ جس سے دونوں کی راہیں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ نبی اور داعی اسباب کی پوری پا بجائی کے بعد اور سب کچھ کرنے کے بعد نتائج کے لیے اللہ سبحانہٗ پر توکل و اعتماد کرتا ہے اور بیقراری و اضطراب کی تصویر بن کر اللہ سے بھیک مانگتا ہے۔ لیڈر کی نظر اپنے مجمع عوام، مادی طاقت، مالی وسائل پر ہوتی ہے برخلاف نبی اور داعی کے کہ اس کی نظر اول اور آخر اللہ سبحانہٗ پر ہوتی ہے علیہ توکلت والیہ انیب میں اسی طرف اشارہ ہے۔ جو بات یہاں حضرت شعیب علیہ السلام بتا رہے ہیں اسی کا عملی نمونہ آپ بدر میں دیکھ سکتے ہیں۔

(۱۱۰) تاریخ کے حوالہ سے تنبیہ

اے میری قوم میری مخالفت تمہیں ایسا بنا دے کہ تم پر بھی قوم نوحؑ، قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ کی افتاد کا سبق دہرایا جائے اور قوم لوطؑ کا معاملہ تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے یعنی میری ضد میں اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں مت کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنا دیں۔ نوح، ہود، صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب و عداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں اور لوط علیہ السلام کا قصہ تو ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے۔ اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی ان نظائر کو فراموش نہ کرو[۱] قرآن کی یہ آیت اپنے منطوق اور مدلول کے ذریعے دو تصویریں پیش کر رہی ہے۔ منطوق میں یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام قوم کے لیے دردمند تھے اور قوم کے لیے سراپا رحمت اور شفقت تھے۔ تعبیر

[۱] افادات شیخ الاسلام

کا یہ انداز لا یجرمنکم شقاقی دل سوزی اور دردمندی کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسری طرف آیت کا مدلول بتا رہا ہے کہ قوم شعیبؑ نہایت سرکشی اور تمرد کا مظاہرہ کر رہی تھی اور حضرت شعیب علیہ السلام سے انتہائی کد وعداوت رکھتی تھی۔ اور ان کی یہ سرکشی اور تمرد اس درجہ ترقی کر چکا تھا۔ کہ ان کے کردار کے آئینہ میں قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح علیہم السلام اور قوم لوطؑ کے مناظر حضرت شعیب علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میری ضد میں تم نے جو روش اختیار کی ہے کہیں یہ روش تمہارے لیے اس عذاب کا سبب نہ بن جائے جو تم سے پہلے قوم نوحؑ، قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ پر آچکا ہے۔ اور قوم لوطؑ تو تم سے دور نہیں ہے یعنی قوم لوطؑ کا واقعہ تو ابھی تازہ ہے اور تمہارے قریب ہی کے علاقہ میں ہوا ہے۔ غالباً اس وقت تک قوم لوطؑ کی بربادی پر سات صدیاں نہ گزری تھیں اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قوم لوطؑ کا مسکن اس علاقہ سے بالکل متصل تھا جہاں حضرت شعیب علیہ السلام رہتے تھے۔

(۱۱۱) قوموں کے فیصلہ کی بنیاد

اور تم اللہ سبحانہ کی جانب میں اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اللہ سے معافی مانگو۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت کار اور شفقت والا ہے۔ کیسا ہی پرانا اور کٹر مجرم ہو جب صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع ہو کر معافی چاہے وہ اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے بلکہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے[۱] محبت کا وہ جذبہ جو خالق کو مخلوق کے ساتھ نیکی، احسان، درگزر اور عفو وبخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام رحم اور رحمت والا ہے اللہ سبحانہ تمام تر رحم وشفقت ہے اس کی رحمت کے فیضان سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان ورحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے: سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہیں تو کچھ نہیں اسی لیے اس کی رحمت سے مایوسی جرم اور ناامیدی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ گنہ گاروں اور مجرموں کو وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے یہ پیام بھیجتا ہے۔ استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ۔ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ اخلاق بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا
نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ وَلَوْلَا
رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
أَرَهْطِيٓ أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۖ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ
إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ
إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ يَّأْتِيهِ عَذَابٌ يُّخْزِيهِ وَ
مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوٓا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ
أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ
جٰثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا ع
بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

انہوں نے کہا کہ اے شعیب ؑ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے زیادہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ہیں[۱] اور بلاشبہ ہماری رائے میں آپ ایک کمزور شخص ہیں[۲] اگر آپ کی پارٹی موجود نہ ہوتی تو ہم آپ

کو سنگسار کر ڈالتے اور آپ کا ہماری نگاہ میں کوئی مقام نہیں ہے[۱۱۳] حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا لوگو : کیا اللہ سبحانہٗ سے زیادہ تمہارے نزدیک میری پارٹی کا دباؤ ہے اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ یقین کرو کہ میرا رب تمہارے اعمال کا گھیراؤ کیئے ہوئے ہے[۱۱۵] لوگو، تم اپنی جگہ کام کرو میں بھی کام کر رہا ہوں۔ تمہیں مستقبل میں پتہ لگ جائے گا کہ رسوا کن عذاب کی پکڑ میں کون آتا ہے اور جھوٹا کون ہے۔ اور تم بھی باٹ دیکھو میں بھی باٹ میں ہوں[۱۱۶] اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھی اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے بچا لیا۔ اور ظلم پیشہ لوگوں کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا لہذا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا وہ ان گھروں کے کبھی آباد کار ہی نہ تھے۔ خبردار مدین کے لیے پھٹکار ہے جیسی پھٹکار ہوئی قوم ثمود پر[۱۱۷]

مفردات کے معانی

رھط امام راغب اصفہانی اور علامہ زمخشری دونوں نے لکھا ہے کہ دس سے کم آدمیوں کی جماعت رھط کہلاتی ہے، اور بعض کا قول ہے کہ چالیس تک کے لیے رھط کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے قوم اور برادری کے

معنے میں بھی استعمال کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی تعداد کے لیے لفظ رھط استعمال ہوتا ہے۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمیز میں اس کے معنے جماعت، آدمی کی قوم اور قبیلہ بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ رھط میں عورت داخل نہیں ہوتی ۔

حق کے مقابلے میں باطل کا آخری ہتھیار

اتباع حق کی راہ میں ذاتی خصومت اور شخصی حسد سے بڑھ کر کوئی روک نہیں۔ مکالمہ سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ قبیلہ کے سرداروں کو حضرت شعیب علیہ السلام سے ذاتی خصومت ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ میری ضد میں آکر ایسا نہ کرو کہ پیام حق کے مخالف ہو جاؤ اور اللہ سبحانہ کے مواخذہ میں گرفتار ہو جاؤ۔ اور اسی ذاتی خصومت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم تجھے سنگسار کر دیتے لیکن تیری پارٹی کے خیال سے نہیں کرتے حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ افسوس ہے کہ انسانوں کا پاس کرتے ہو لیکن حق اور سچائی کا پاس نہیں کرتے ہو۔ انسانوں کے خیال سے ایک کام چھوڑتے ہو لیکن خدا کے خیال سے نہیں چھوڑتے ہو۔ طاقت کا نشہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہ انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے۔ حق قبول کرنا تو بڑی بات ہے حق کو نہ صرف خود سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ وہ دوسروں کو حق کی دعوت کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ قوم شعیبؑ کو حضرت شعیب علیہ السلام کی نیکی سے کد نہ تھی بلکہ ان کو اس سے کد تھی کہ دوسروں کو دعوت کیوں دیتے ہو۔

۱۱۲ انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے زیادہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ سمجھتے تو سب کچھ تھے۔ لیکن عناد اور حق پوشی سے ایسا کہتے تھے۔ کہ تیری بات کچھ نہیں سمجھتے نہ معلوم کیا مجذوبوں کی بڑ ہانک رہا ہے (العیاذ باللہ) اور اگر واقعی وہ ایسی اور سیدھی صاف باتیں بے توجہی یا غباوت کی وجہ سے سمجھتے نہ تھے تو یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہوگا۔ [۱]

حضرت شعیبؑ علیہ السلام کے دو مکالمے ہیں۔ ایک مکالمہ وہ ہے جو ارباب اقتدار اور حضرت شعیب علیہ السلام کے درمیان ہوا ہے۔ یہ قرآن نے نویں پارے میں ذکر کیا ہے۔

> طاقت کا گھمنڈ رکھنے والے قوم کے سربراہوں نے کہا اے شعیبؑ دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی۔ یا تو تجھے اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان والے ہیں ہم اپنے شہر سے نکال دیں گے اور یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ ۷ - ۸۸

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس پر حضرت شعیب ؑ نے جواب دیا ۔

شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں ۔ اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اللہ کے بارے میں باتیں جھوٹ بولیں ہیں حالانکہ اللہ نے ہم کو تمہارے دین سے بچا لیا ہے ۔[1]

یہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ارباب اقتدار کے درمیان گفتگو تھی اب یہاں ان آیات میں جو مکالمہ قرآن پیش کر رہا ہے ۔ وہ حضرت شعیب علیہ السلام اور عام شہریوں کے درمیان ہے ۔ شہری حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں ۔ کہ تمہاری بات کی تہہ کو ہم نہیں پہنچ رہے ہیں ۔ ان کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ باتیں بالکل مہمل، بے جان اور دور از کار ہیں ۔ ورنہ ہم سے زیادہ سمجھدار کون ہو سکتا ہے ۔ مشرکین مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات دوسرے پیرائے میں کہی تھی ۔

قالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ وفی اذاننا وقر ۔

یعنی آپ کی بات کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ۔ جیسے یہودیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا وقالوا قلوبنا غلف ۔ یعنی آپ کی دعوت ہم پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے یعنی کچھ بھی کہیں ہم پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے یعنی کچھ بھی کہیں ہم آپ کے کہے میں نہیں آئیں گے ۔ یہی بات قوم شعیب ؑ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہی ہے کہ آپ کی باتوں میں کوئی گہرائی نہیں ہے ۔ اس لیے ہماری گرفت میں نہیں آتی ہے ۔ اگر اس میں عقلیت کچھ بھی ہوتی تو بلاشبہ ہم اسے تاڑ جاتے ۔ یہ سمجھ نہ آنا کچھ اس بنا پر نہ تھا ۔ کہ حضرت شعیب علیہ السلام کسی غیر زبان میں باتیں کر رہے تھے ۔ یا ان کی باتیں بہت مغلق اور پیچیدہ ہوتی تھیں ۔ باتیں تو صاف اور سیدھی ہی تھیں اور اسی زبان میں کی جاتی تھیں جو یہ لوگ بولتے تھے لیکن ان کا ذہن مادیت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گیا تھا اور ایسا ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی سیدھی باتیں کسی طرح اس میں نہ اتر سکتی تھیں ۔ قاعدے کی بات ہے کہ جو لوگ تعصبات اور خواہش نفس کی بندگی ۔ میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوتے اور کسی خاص انداز فکر کے ہو کر رہ جاتے ہیں وہ اول تو کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتے جو ان کے خیالات سے مختلف ہو اور اگر سن بھی لیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہاں کی باتیں ہو رہی ہیں ۔

---

[1] دیکھو پارہ ۹ سورہ اعراف ۔ قال الملاء الذین استکبروا من قومہ لنخرجنک یاشعیب والذین امنوا معک من قریتنا اولتعودن فی ملتنا قال اولو کنا کارھین قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجانا اللہ منھا

(۱۱۳) قوم مدین کی نظر میں حضرت شعیبؑ کا ضعف

اور بلاشبہ آپ ہماری رائے میں ایک کمزور شخص ہیں۔ یعنی ایک کمزور اور بے حقیقت آدمی خواہ مخواہ سارے جہاں کو اپنا دشمن بنا رہا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے حال پر رحم کرے۔ بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے۔ بعض سلف نے بمعنے ضعیف معنے نابینا کے لیے ہیں۔ شاید کسی وقت میں عارضی طور پر بینائی جاتی رہی ہو۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال ہوا تھا۔ مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں۔ کہ حضرت شعیب علیہ السلام روتے بہت تھے حتی کہ نگاہ جاتی رہی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قدر کیوں روتا ہے۔ جنت کے شوق میں یا دوزخ کے خوف سے۔ عرض کیا پروردگار! تیری لقا کا خیال کر کے روتا ہوں کہ جس وقت آپ کا دیدار ہوگا نہ معلوم میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے! ارشاد ہوا کہ تجھ کو ہماری لقا مبارک ہو اے شعیبؑ! اسی لیے میں نے اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تیری خدمت کے لیے کھڑا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے بینائی واپس کر دی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بصحتہ [1]

بلاشبہ حمیری زبان میں ضعیف بمعنے نابینا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں نابینا کے معنے میں ہونے کی حیثیت ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور اگرچہ شارحین قرآن نے اس کی تائید میں متقدمین کا روائتی سہارا بھی پیش کیا ہے لیکن بقول علامہ آلوسیؒ کہ ان روایات کی تاریخی اور روائتی حیثیت محتاج تصحیح ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے کچھ ذرائع کی حاکم نے تصحیح کی ہے لیکن حاکم کی تصحیح کو، ابن الجوزیؒ کی تضعیف کو محققین کی بارگاہ میں صف نعلین میں بھی جگہ نہیں ملتی ہے۔ اور پھر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن کا سیاق بھی اس تشریح کا ہمنوا نہیں ہے اگر ضعیف سے نابینا مراد ہو تو انداز بیاں میں فینا لانے کی معقولیت نہ رہے گی۔ عام شہریوں کا تأثر یہ ہے کہ آپ کا شہری زندگی میں کوئی باوقار، باعزت مقام نہیں ہے بلکہ آپ کمزور ہیں۔ آپ کے پاس کوئی مادی طاقت نہیں اور آپ کو کوئی نفع ونقصان پر کوئی قدرت نہیں ہے۔ آپ نہ خود کسی پر حملہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی حملے کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے آپ ہم سے نہ بگاڑیئے اور ہماری ناراضگی مول نہ لیجئے۔ آپ ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے اور ہمارے وار کا جواب دینے کی آپ میں قدرت نہیں ہے۔

(۱۱۴) قوم کی جانب سے حضرت شعیب کو دھمکی

اگر آپ کی پارٹی موجود نہ ہوتی تو ہم آپ کو سنگسار کر ڈالتے اور آپ کا ہماری نگاہ میں کوئی مقام

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے یعنی تیرے کنبہ کے لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ۔ان کا خیال ہے ورنہ اب تک تجھے سنگسار کر ڈالتے [1] یہاں رھط کے معنے شیخ الاسلام نے عام شارحین قرآن کی پیروی میں خاندان کے لیے ہیں۔ قرآن میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی مرفوع روایت ہے۔ قرآن نے قوم مدین کے ذکر میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ قوم مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبوں میں سے ایک جماعت حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لائی تھی۔ اور ایک جماعت نے راہ کفر اختیار کی تھی ۔

وان کان طائفۃ منکم آمنوا بالذی ارسلت بہ وطائفۃ لم یؤمنوا ۔

اور یہ بات ہوئی ہے کہ تم میں سے اے اہل مدین ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں خدا کی جانب سے لیکر آیا ہوں اور ایک گروہ نے اس کو نہیں مانا ہے ۔

اسی طرح جب ارباب اقتدار نے حضرت شعیب علیہ السلام کو شہر بدر کرنے کی دھمکی دی تو صرف حضرت شعیب علیہ السلام کو ہی دھمکی نہیں دی بلکہ اس دھمکی میں اہل ایمان کا بھی پوری صراحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے ۔

لنخرجنك یاشعیب والذین آمنوا معك من قریتنا

اے شعیبؑ تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے اہل ایمان ہیں ہم ضرور اپنی آبادی سے نکال دینگے

اور یہاں بھی قرآن نے عذاب کے موقعہ پر حضرت شعیب علیہ السلام کے بچانے کا ذکر کیا ہے تو صرف حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا بلکہ اہل ایمان کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے ۔

لما جاء امرنا نجینا شعیبا والذین آمنوا معه برحمة منا.

جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیبؑ اور انکے ساتھ اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت سے بچا لیا ۔

جب یہ تصریح قرآن میں موجود ہے تو رھط سے ان کا خاندان مراد لینا اور اس کو کافر کہنا کچھ بھی اپنے اندر معنویت نہیں رکھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں عام لوگوں کے ساتھ کچھ ارباب ثروت بھی تھے ۔ جن کا عام شہری زندگی میں ایک ممتاز مقام تھا۔ ان ہی کی طرف قوم مدین کے عوام اشارا کر کے کہہ رہے ہیں کہ اگر تمہیں ان کی ہمنوائی حاصل نہ ہوتی تو ہم تمہیں سنگسار کر ڈالتے ۔ تم تو ہمارے نزدیک کسی غلبہ، دبدبہ اور عزت والے نہیں ہو۔ ہماری راہ میں تمہاری عزت وجاہ رکاوٹ نہیں بلکہ اس تمہاری پارٹی کی عزت شہری زندگی، اس کا ممتاز مقام ہمارے راستہ کی رکاوٹ ہے ۔ البقاعی لکھتے ہیں۔ ما

[1] افادات شیخ الاسلام

انت علینا بعزیز میں اشارہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی پارٹی مخالفین کی نظر میں عزت وجاہ کا ممتاز مقام رکھتی ہے۔ ان کا یہ امتیازی مقام ہی قوم مدین کی راہ میں مانع ہے۔ اگر یہ مانع نہ ہوتا تو ہم تمہارا کام کر دیتے۔

(۱۱۵) حضرت شعیبؑ کا اللہ پر اعتماد

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا لوگو! کیا اللہ سبحانہٗ سے زیادہ تمہارے نزدیک میری پارٹی کا دباؤ ہے اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ یقین کرو میرا رب تمہارے اعمال کا گھیراؤ کیئے ہوئے ہے یعنی افسوس اور تعجب ہے کہ خاندان کی وجہ سے میری رعایت کرتے ہو۔ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور صاف وصریح نشانات اپنی سچائی کے دکھلا رہا ہوں گویا تمہاری نگاہ میں میرے خاندان کی عزت اور دباؤ خداوند قدوس سے زیادہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی عظمت وجلال کو ایسا بھلا دیا کہ کبھی تمہیں تصور بھی نہیں آتا جو قوم اللہ سبحانہٗ کو بھلا کر معاذ اللہ پس پشت ڈال دے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے تمامی اعمال وافعال اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کے احاطہ میں ہیں۔ تم کوئی کام کرو اور کسی حالت میں ہو ایک آن کے لیے بھی اس کے قابو سے باہر نہیں ہو[1] مطلب یہ ہے کہ اے میری قوم کیا میری پارٹی اور ساتھیوں کا خوف ولحاظ تمہیں اللہ سبحانہٗ سے زیادہ ہے کہ تم اشخاص کو تو اہمیت دیتے ہو اور اللہ سبحانہٗ کو نظر انداز کر رہے ہو یاد رکھو میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کیئے ہوئے ہے یعنی میرا بھروسہ افراد واشخاص پر نہیں اللہ سبحانہٗ پر ہے جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان انسانوں کا پاس کرتا ہے لیکن سچائی کا پاس نہیں کرتا ہے وہ لوگوں کے خیال سے ایک بات چھوڑ دیتا ہے لیکن اللہ سبحانہٗ کے خیال سے نہیں چھوڑتا ہے اصل چیز اشخاص نہیں حق ہے۔ حق کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ حق حق ہے نہ اس لیئے کہ اس کی پشت پر افرادی قوت ہے حق شناس نگاہ اہل حق کو تلاش کر لیتی ہے۔

(۱۱۶) نتیجہ کا انتظار کرو

لوگو! تم اپنی جگہ کام کرو میں بھی کام کر رہا ہوں تمہیں مستقبل میں پتہ لگ جائے گا۔ کہ رسواکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عذاب کی پکڑ میں کون آتا ہے اور جھوٹا کون ہے ؟ اور تم بھی باٹ دیکھو میں بھی باٹ میں ہوں یعنی اچھا تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر جمے رہو میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی توفیق سے راہ ہدایت پر ثابت قدم ہوں عنقریب پتہ لگ جائے گا کہ ہم میں سے کس کو اللہ سبحانہٗ کا عذاب فضیحت کرتا ہے ۔ اور کون جھوٹا ثابت ہوتا ہے ۔ اب ہم اور تم دونوں آسمانی فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں[۱] مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جگہ کام کر رہا ہوں ۔ تم میری ضد اور مخالفت میں جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو ۔ اپنے رب کی جانب سے انذار و تبشیر کے جس مشن پر مامور ہوں کرتا رہونگا ۔ جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے ۔ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں یعنی غیب کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے کہ تعین کے ساتھ بتا سکوں کہ عذاب کس وقت آئے گا لیکن یہ واضح ہے کہ تم میں مستحق عذاب ہونے کی ساری علامتیں نمودار ہو چکی ہیں ۔ اس وجہ سے میں بھی اب اسکے ظہور ناگہانی کا منتظر ہوں ۔ بتانا یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خلقیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے ۔ تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ اسی طرح انسان کے اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے اچھے نتائج اور بُرے اعمال کے بُرے نتائج ہوتے ہیں ۔ رسول بشیر اور نذیر ہوتے ہیں ۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج کی خوشخبری بشیر ہونے کی حیثیت میں دیتے ہیں ۔ اور بُرے اعمال کے برے نتائج سے آگاہ نذیر ہونے کی حیثیت سے کرتے ہیں ۔

(۱۱۷) قوم مدین پر عذاب

اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیبؑ اور ان کے ساتھی اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے بچا لیا اور ظلم پیشہ لوگوں کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا ۔ لہذا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے تھے ۔ یوں لگتا تھا کہ گویا وہ ان گھروں کے کبھی آباد کار ہی نہ تھے ۔ خبردار مدین کے لیے پھٹکار ہے جیسی پھٹکار ہوئی قوم ثمود پر ۔ یہاں قوم شعیبؑ کا کڑک (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے ۔ اور اعراف میں رجفۃ کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی زلزلہ سے ہلاک ہوئے اور سورہ شعراء میں عذاب یوم الظلۃ جس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہو گئے ۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کے عذاب اس قسم کے حق میں جمع کر دیئے گئے ۔ پھر ہر سورت میں وہاں کے سیاق کے مناسب عذاب کے موافق عذاب کا ذکر کیا گیا ۔ اعراف میں تھا کہ ان لوگوں نے شعیب علیہ السلام سے کہا کہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے وہاں بتلایا

[۱] افادات شیخ الاسلام

کہ جس زمین سے نکالنا چاہتے تھے اسی زمین کے زلزلہ سے ہلاک ہوئے۔ یہاں ان کے سخت گستاخانہ مقالات کا ذکر تھا اس لیے بالمقابل آسمانی صیحہ کڑک کا ذکر فرمایا۔ گویا عذاب الٰہی کی ایک کڑک میں سب آوازیں گم ہوگئیں۔ سورہ شعراء میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے

فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصادقین

اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گرا دے

اس کے مقابلے میں عذاب یوم الظلۃ کا ذکر فرمایا ہے [1]

شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیرؒ کی ہمنوائی میں عذاب یوم الظلۃ اور رجفۃ وصیحۃ کے عذاب کو اہل مدین کے لیے قرار دیا ہے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ توجیہات کا سہارا لیا ہے اگرچہ یہ مقام تفصیل کا متحمل نہیں ہے پوری تفصیل تو ان شاء اللہ معالم القرآن جلد ۱۹ میں سورۃ الشعراء کی تشریحات میں آرہی ہے۔ مگر اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

مدین اور اصحاب الایکہ دو اُمتیں ہیں۔ جن کی طرف اللہ سبحانہ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ فرمایا تھا۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۱۳۵)

متقدمین اور متاخرین شارحین قرآن کی اکثریت کا یہی میلان ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ دو جداگانہ قومیں تھیں۔ تاریخ طبری، مستدرک حاکم میں حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہ نے شعیب علیہ السلام کو دو قوموں کی طرف مبعوث فرمایا۔ ایک اہل مدین جو خود ان کی قوم تھی دوسرے اصحاب الایکہ۔ جب اللہ نے اصحاب الایکہ کو عذاب دینا چاہا تو ان پر سخت گرمی مسلط کردی اور عذاب بادل کی شکل میں لایا گیا جیسے ہی بدلی قریب ہوئی لوگ اس کی طرف چل پڑے کہ شاید کچھ ٹھنڈک ملے جب اس کے نیچے پہنچے تو اس میں سے آگ برسنے لگی۔ فاخذھم عذاب یوم الظلۃ میں اسی کا بیان ہے۔ بعد کے علماء میں بغوی، خازن، بیضاوی، زمخشری، ابوحیان اندلسی، علامہ عینی، علامہ شوکانی، علامہ محمود آلوسیؒ، امام فخرالدین رازی اور سید رشید رضا کی یہی تصریح ہے۔ قرآن عزیز کے مطالعہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں اسی کو تاریخی طور پر ثابت کیا ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور دونوں کا مقام سکونت الگ الگ ہے۔ متاخرین میں صرف حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کو اس پر اصرار

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ اہل مدین اور اہل ایکہ دونوں ایک ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ سورۃ الشعراء کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ صحیح القول کے مطابق اصحاب الایکہ اور اہل مدین ایک ہیں اور وہ مفسرین کے استدلال کا کہ

> اصحاب الایکہ کے ذکر میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر بغیر برادرانہ نسبت کے ہونا اور اہل مدین میں برادری کی نسبت کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل مدین اور اصحاب الایکہ دونوں الگ الگ ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ

> ایکہ ایک درخت تھا جس کی یہ لوگ پرستش کرتے تھے۔ اسی لیے ان کو اصحاب الایکہ کہا گیا ہے اس وجہ سے قرآن میں ان کے تذکرے میں حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کا بھائی نہیں کہا گیا ہے۔

مگر حافظ ابن کثیرؒ کی اس نکتہ آفرینی کا متقدمین شارحین قرآن کے اقوال میں کہیں کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا ہے اور نہ کسی صحابی کے قول میں اور نہ کسی حدیث مرفوع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان کو اصحاب الایکہ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ درخت ایکہ کے پرستار تھے بلکہ اس لیے کہتے ہیں کہ ایکہ کے معنے جنگل اور بن کے ہیں۔ اور ان کا مسکن جنگل میں تھا اس لیے ان کو اصحاب الایکہ کہا گیا ہے۔ مولانا شیخ الاسلامؒ نے اپنے افادات میں چونکہ حافظ ابن کثیرؒ سے ہمنوائی کی ہے۔ اس لیے ان کو ہر قدم پر قرآن کے مطالب کے لیے نیا جامہ اور نئے جامہ کے لیے نت نئی توجیہات سے کام لینا پڑا ہے۔ ہم اس پر انشاء اللہ ۱۴ ویں اور ۱۹ ویں جلد میں تفصیلی بحث کریں گے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ
مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَ
مَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾ وَأُتْبِعُوا فِي
هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

اور فی الواقع ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات اور واضح سند دے کر روانہ کیا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف [118] مگر انہوں نے فرعونی اقتدار کی پیروی کی اور فرعون کی حکومت حکومتِ راشدہ نہیں [119] قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا اور دیکھو وہ برا ہی گھاٹ ہے جس پر وہ جائیں گے [120] اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی ہے اور قیامت کے دن بھی۔ تو دیکھو! کیا ہی برا انعام ہے جو اُنکے حصہ میں آیا ہے [121]

فرعون اور حضرت موسیٰ ؑ

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے

شروع ہو کر عہد اسکندر تک فراعنہ کی اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا۔ ۳۳۲ قبل از مسیح اسکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون ہکسیس عمالقہ کے خاندان سے ہے جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون کون ہے؟ اور اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔

عام مؤرخین اور مفسرین اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا ایک فرد بتاتے ہیں۔ اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان اور کوئی مصعب بن ریان بتاتا ہے۔ ان میں سے محققین کی رائے میں نام ریان ہے حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو سدہ تھی۔

یہ سب قدیم مؤرخین کی تحقیق ہے مگر اب جدید مصر کی اثری تحقیقات کی وجہ سے جو رائے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمیس ثانی کا مفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی رائے کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقبل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دارالآثار کے مصور ہیں اور اثریات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ عبدالوہاب النجار نے قصص الانبیاءؑ میں نقل کیا ہے۔[1]

(۱۱۸) اور فی الواقع ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات اور واضح سند کے ساتھ روانہ کیا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ نشانیوں سے غالباً معجزات اور وہ نو آیتیں مراد ہیں جن کا ذکر ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات میں ہوا ہے۔ ان میں سے معجزہ عصا کو جو نہایت ظاہر و قاہر معجزہ تھا سلطان مبین واضح سند فرمایا اور شاید سلطان مبین سے وہ روشن دلائل مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اللہ سبحانہ کے وجود و توحید کے متعلق پیش کیئے جن کا ذکر دوسرے مقامات پر آئے گا۔ اور ممکن ہے۔ کہ سلطان مبین سے اس کے لغوی معنی مراد لیے گئے ہوں کیوں کہ فرعونیوں کے مقابلے پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی تھیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو باتیں بتائی ہیں ایک آیات دوسرے سلطان مبین۔

آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرمائے ہیں وہ فی الواقع صرف آیات وعلامات کی شناخت ہے۔ دنیا میں جس قدر خبریں ہیں۔ سب کا علم صرف آیات وعلامات ہی کا علم ہے۔ یہ گھوڑا ہے یہ انسان ہے نشانیوں کی مدد سے آپ کہتے ہیں کہ یہ رشید ہے یہ وحید ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میری کار ہے، یہی آیات وعلامات کی جان پہچان اور شناخت ہے جو حیوان وانسان اور عقل و بیوقوف میں فرق کرتی ہے۔

ہمارا تمام فن استدلال دراصل ان آیات وعلامات کے گرد گھومتا ہے۔

قرآن حکیم میں آیات کا لفظ اس معنے میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم ان کو شمار بھی نہیں کرسکتے قرآن میں اس معنے میں آیات اللہ یعنی اللہ کے وجود کی نشانیاں اور اس کے صفات کمالیہ کی علامات ہیں جسطرح ویرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام وآسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم وکرم کی صفات کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے۔ ایک خالق وصانع کے وجود کو بتاتی ہے اور زمین کے اندر وباہر ابر، بارش، دن رات، چاند سورج، درخت، میوے، پھل، غلہ کے اقسام وغیرہ، زمین کے جانداروں کی زندگی کے سامان، آرام وآسائش اس خالق عالم کے رحم وکرم، عطا وبخشش اور دیگر اوصاف کمال کو نمایاں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ کفران ہی دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور وفکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور اللہ کے تعلق کو نمایاں کرتے ہیں اسی طرح اللہ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنی مخصوص علامات وآیات کے ذریعے سے نمایاں کرتا ہے۔ نبوت اللہ سے اسی خصوصی تعلق کا نام ہے۔ نبی نور الٰہی کی مشعل لیکر آتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کے باوجود نور الٰہی کی یہ مشعل اپنی چمک پھیلاتی رہتی ہے۔ نبی کا صحیفۂ زندگی ہر قسم کے اخلاقی نقائص سے پاک ہوتا ہے اس کی دعوت میں دین الٰہی کی نصرت کی خاطر مخالفین کی ناکامی اور ہزیمت کے لیے ساتھیوں کو مزید ایمان وتسکین کے حصول میں عجیب وغریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں۔ غرض یہی وہ امور ہیں جو خالق فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطۂ خاص اور علاقۂ مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادہ الٰہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو ایک سے زیادہ معجزات دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں ان کو یہی سننا پڑا کہ یہ کھلا جادو ہے۔ ھذا سحر مبین۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی مان لیا مگر فرعون یہی کہتا رہا انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر۔

تورات میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے۔ تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہ باقی رہتی تھی۔ چنانچہ تورات میں تقریباً ہر معجزے کے بعد یہ مذکور ہے۔ لیکن فرعون کا دل سخت رہا اور ان کی نہ سنی۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف متعدد معجزے ہی نہیں دکھائے بلکہ قرآن نے بتایا ہے کہ ہر بعد میں آنے والا پہلے سے زیادہ عظیم ہوتا تھا۔ وما نریھم من آیۃ الا ھی اکبر من اختھا۔ اسی آیت میں قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ہماری آیات لے کر آئے تو فرعون اور اس کے ہمنواؤں نے اس کا مذاق بنایا فلما جاءھم بآیاتنا اذا ھم منھا یضحکون۔ گویا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا ہے مگر یہ مخصوص نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر نبی کے مخالفین کی نفسی کیفیت یہی رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو نشانیاں لے کر آئے وہ صرف متعدد یا ایک سے زیادہ اور دوسری نشانی پہلی سے بڑی نہ تھی بلکہ ان آیات کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ سلطان مبین یعنی ایسی دلیل جو عقل انسانی پر چھا جائے۔ ایسی دلیل جو صحیح معنے میں سلطان مبین ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا ایسے مقدمات سے مرتب ہوتی جن کی بنیاد مشاہدات و محسوسات پر قائم ہو یا وحی کے ذریعے جو باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش فرمائی ہیں ان پر مبنی ہو۔ یہ واضح، کھلی اور عقل پر چھا جانے والی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لگاتار اور تابڑ توڑ معجزات تھے۔ جن کی قوت کے سامنے ان کی عقلیں درماندہ اور ان کی طاقت بیچارہ تھی۔ اس درماندگی و بے چارگی کا مظاہرہ انہوں نے ان کو جادو کہہ کر کیا تھا۔ ان کا یہ کہنا ھذا سحر مبین۔ معجزات کی حیرت انگیز تاثیر کی شہادت ہے۔ یعنی ان معجزات کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود انکار و جحود کے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور رہ جاتے تھے۔ علامہ بقاعیؒ نے یہ کہہ کر

والایۃ نعم الاسادۃ والدلیل القاطع والسلطان یخص القاطع والمبین یخص ما فیہ جلاء۔

اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ آیات سے مراد تو وہ عام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قدم قدم پر پیش کی ہیں اور سلطان مبین سے مراد خاص طور پر وہ نشانی ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے درباریوں اور جادوگروں پر کھلا ہوا غلبہ حاصل ہوا یعنی عصا گویا یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر کیا ہے۔ اس کو سلطان مبین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک حجت قاہرہ کی تھی جس کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں کی ساری ساکھ خود اپنے آدمیوں کی نگاہ میں اکھڑ گئی۔

بتانا یہ ہے کہ ایسی صریح علامات کے ساتھ جن سے یہ بات بے غبار ہو کر سامنے آگئی کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ان کی پشت پر اللہ رب العالمین کی طاقت ہے ۔ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کی جو تفصیل آئی ہے اس کا غور سے مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کونسی آیات تھیں جن کو یہاں ان کے رسول ہونے کی کھلی سند دلیل قرار دیا جا رہا ہے ۔ اول تو یہی بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ جو شخص چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ملک سے فرار ہو گیا تھا اور جس کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے ۔ وہ اچانک ایک لاٹھی لیے ہوئے سیدھا فرعون کے بھرے دربار میں چلا جاتا ہے ۔ اور بڑی بے باکی کے ساتھ بادشاہ اور اس کے عیانِ حکومت کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ کا نمائندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں اور کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی ۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ اس بُری طرح غلامی کے جوئے تلے پس رہی تھی کہ اگر الزام قتل کی بنا پر ان کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا تو ان کی قوم بغاوت تو در کنار احتجاج ہی کے لیے زبان کھول سکے گی ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور یدِ بیضا کے معجزے سے پہلے فرعون اور اس کے اہل دربار محض حضرت موسیٰؑ کی باطنی نشانیوں سے مرعوب ہو چکے تھے ۔ اور ان کو محسوس ہو گیا کہ اس شخص کی پشت پر کوئی اور ہی طاقت ہے ۔ پھر جو معجزے پے در پے ان سے صادر ہوئے ۔ اُن میں سے ہر ایک یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ یہ جادو نہیں ہے ۔ اللہ سبحانہٗ کی طاقت کا کرشمہ ہے ۔

(۱۱۹) جبر و ظلم پر مبنی حکومت راشدہ نہیں

مگر انہوں نے فرعونی اقتدار کی پیروی کی اور فرعون کی حکومت قطعاً حکومت راشدہ نہ تھی یعنی کھلے کھلے نشان دیکھ کر بھی فرعونیوں نے اللہ کے رسول کی بات نہیں مانی بلکہ اسی دشمن خدا کے حکم پر چلتے رہے ۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا[1] اصل ارشاد میں ما امر فرعون برشید ہے رشید غویؔ کی ضد ہے رشید کا لفظ ہر اس کام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو قابل تعریف اور پسندیدہ ہو مطلب یہ ہے کہ فرعونی امر یعنی حکومت رشد و ہدایت سے بیگانہ تھی ۔ اس کے طاغوت بننے سے لے کر بنی اسرائیل کے غلام بنانے تک کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس میں اچھائی ہو یا جو عقل و دانش کے پیمانے پر پوری اترتی ہو ۔ یعنی حکومت فرعون کی پالیسی ہر قسم کی خیر و صلاح سے خالی تھی ۔ ابن کثیرؒ

[1] افادات شیخ الاسلام

لکھتے ہیں لیس فیہ رشد ولا ھدی اور علامہ شوکانی لکھتے ہیں۔ لیس فیہ رشد قط بل ھو غی وضلال یاد رہے کہ رشد کے معنے میں وسعت ہے۔ فکر صحیح، گفتار اچھی، کردار میں صلاحیت ہو تو رشید بولا جاتا ہے۔ فکری غوایت ہو یا عملی ضلالت گمراہی ہو تو رشید نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ فرعونی حکومت فکری لحاظ سے غوایت عملی اعتبار سے ضلالت کا نمونہ تھی اور ضلالت وغوایت کے مجموعہ کو طغیان کہتے ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہے۔ اذھب الی فرعون انہ طغی۔ تعبیر میں مجاز عقلی کا پیرایہ اختیار کیا ہے یعنی یہ کہنے کی بجائے کہ فرعون نہیں تھا فرمایا کہ فرعون کی حکومت راشدہ نہ تھی یا فرعون گمراہ تھا۔ یہ انداز تعبیرِ حکومت کی شناعت اور قباحت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں عالم دو ہیں۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی عالم مادی سب بے جان چیزوں کے مجموعے کا نام ہے اور عالم انسانی اعمال وافکار اور اخلاق پر اٹھی عمارت کو کہتے ہیں۔ عالم مادی عقل انسانی کی جولانگاہ ہے۔ یہ عالم ارادہ کی صفت سے محروم اور آزادیٔ عمل سے ناآشنا ہے اس کے معین قوانین ہیں جنہیں تجربے، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے اس لیے اس عالم میں اختلاف رائے کا امکان اس قدر کم ہے گویا نہ ہونے کے برابر ہے اس کے برخلاف عالم انسانی میں اس قطعیت اور صحت کے ساتھ اسباب ونتائج کا تعین بہت دشوار ہے۔ یہاں انسان کی آزاد فطرت ہے۔ اور انسان اپنے اعمال میں مادے کی طرح اضطراری طور سے کسی معین قانون کا محکوم نہیں ہے۔ اس کا آزاد ارادہ ہر قانون توڑ سکتا ہے۔ اور ہر نظریہ کو باطل کرسکتا ہے۔ علت ومعلول کا تعلق یہاں اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ فلاں فلاں علت ہی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انسانی امور ومعاملات اور تمدنی زندگی میں واقعات وہ ظاہر کی توجیہہ ایک دشوار عمل ہے۔ جس میں قدم قدم پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ایسی کوئی تدبیر نہیں کہ جس سے اس اختلاف کا سدباب ہوسکے۔ اسباب وعلل کی طرح نتائج کی نسبت بھی عالم انسانی میں صحت اور قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ عالم مادی اور عالم انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ عالم مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اشیاء مادی کے حیثیت مشہود کی۔ برعکس عالم انسانی میں خود ہی انسان شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس فرق کی وجہ سے عالم طبعی اور مادی کے مشاہدات وتجربات اور نظریات وعقائد میں خالص معروضی نقطہ نظر اختیار کیا جاسکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن انسانی امور ومعاملات میں اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے جہاں انسان خود اپنی زندگی اور تمدن کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اس کی ذہنی خصوصیات، اس کا ماحول، اور اسکے شخصی یا قومی جذبات ومیلانات کے عمل کی تشکیل پر

اثر انداز ہوتے ہیں۔

عالم انسانی اور عالم مادی کا فرق معلوم کرنے کے بعد کوئی دیانتدار اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ عالم طبعی اور مادی دنیا میں صحت وصداقت کی تلاش اور اتفاق رائے کا اصول جتنا آسان ہے عالم انسانی اور تمدنی معاملات میں اتنا ہی دشوار ہے۔ تمدنی زندگی کے مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک راہنمائی نہیں کر سکتے۔ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں فرعون اور اس کے ہمنوا۔ فرعون اور اس کے ہمنوا حریت فکر اور عقلیت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام انسانی مسائل اور تمدنی معاملات میں الہامی ہدایات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ فرعون جو نظام حیات قائم کیے ہوئے ہے اور اس کے پیروکار فرعون کی جس میں پیروی کر رہے ہیں اس میں انسانیت کے لیے کوئی صلاح ورشد اور خیر نہیں ہے۔ اس میں انسان انسان کی بندگی کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جن اصول وعقائد کی دعوت لے کر آئے ہیں اس میں انسان انسان کی بندگی نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی انسان کے ساختہ پرداختہ نہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے۔ جو ہمہ تن حق وصداقت ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ گیر آنکھ زمین وآسمان کی ہر شئے کو محیط ہے اس میں سرتاسر اللہ کی بندگی ہے یہ اس کی آزاد مرضی اور غیر جانبدار قوت فیصلہ پر مبنی ہے اور جبر وتشدد سے پاک ہے کیونکہ کوئی شخص اس یقین کے بغیر دعوت نبوت صداقت کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا۔

(۱۲۰) نبوت کی اپوزیشن کا آخرت میں انجام

قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا اور دیکھو وہ بڑا ہی گھاٹ ہے جس پر وہ جائیں گے یعنی جس طرح یہاں کفر وتکذیب میں فرعون ان کا امام تھا قیامت کے دن بھی امام رہے گا۔ جو لوگ دنیا میں اس کی اندھی تقلید کر رہے تھے وہ اس کے پیچھے پیچھے آخری منزل تک پہنچ جائیں گے یہ ہی وہ گھاٹ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کی جگہ بھسم کر دینے والی آگ ہے۔[1] ورد کے معنی کسی گھاٹ پر پانی پینے پلانے کے لیے اترنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ فرعون ان تمام لوگوں کا لیڈر ہو گا۔ جنہوں نے اس جہاں میں اس کی پیروی کی اور وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر لا کے

[1] افادات شیخ الاسلام

گا جس سے زیادہ کوئی برا گھاٹ نہیں ہے ۔

یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ عالم انسانی میں نبوّت کی الہامی دعوت کے مقابلے میں عقلیت پر مبنی دعوت لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں قیامت کے روز بھی ان کی راہ نمائی وہی کریں گے ۔ اگر اس دنیا میں نبوّت کی یا نبوّت کو ماننے والوں کی پیروی کی ہے تو قیامت کے دن بھی انہی کے جھنڈے تلے ہوں گے اور ان کی راہ نمائی میں کامیابی سے ہمدوش ہوں گے ۔ اور اگر دنیا میں نبوت کی الہامی دعوت سے ہٹ کر کسی عقلیت پر مبنی انسانی معاملات کو حل کرنے کی تحریک میں کا کام کیا ہے تو قیامت کے روز بھی وہ ان ہی کی راہنمائی میں ہونگے ۔ اور ان ہی کی سرگردگی میں جہنم کی طرف جائیں گے ۔ نبوت کے مقابلے میں ہر تحریک کا حکم یہی ہے خواہ اس کا عنوان کوئی ہو ۔ قرآن عظیم عالم انسانی میں الہامی تحریک کے مقابلے میں ہر اس تحریک کے داعی کو طاغوت کہتا ہے جس کا آغاز عقلیت پرستی سے ہوا چاہے اسے نظریہ اضداد اور جدلی عمل کہا جائے اور چاہے اس کو حرّیت فکر کی تحریک کا نام دیا جائے ۔ سب کا انجام یہی ہے ۔ قیامت میں دونوں کی بھرپور نمائش ہوگی ۔ ظاہر ہے کہ جن راہنماؤں ، جن دانشوروں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور نبوت کے مدمقابل بن کر رہے ان کے پیروان کے پیچھے پیچھے ہوں گے ۔ اور سب دوزخ کا رُخ کریں گے ۔

(۱۲۱) نبوّت کے مخالفین پر پھٹکار

اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی ہے اور قیامت کے دن بھی ، تو دیکھو کیا ہی برا مقام ہے جو ان کے حصے میں آیا ہے یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجیں گے ۔ اور بھیجتے رہیں گے پھر قیامت میں اللہ کے فرشتے اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی بغرض لعنت کا سلسلہ لگاتار ان کے ساتھ چلتا رہیگا ۔ گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا ہے[۱] اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو دنیا میں آنکھیں بند کرکے ان سربراہوں ، لیڈروں ، دانشوروں کے پیچھے لگ جاتے ہیں ۔ جو اس دنیا میں الہامی ہدایات کے مقابلے میں عقلیت اور حریت فکر پر مبنی نظام قائم کرتے ہیں اُن کو بتایا جارہا ہے کہ ان پر دنیا میں بھی پھٹکار پڑتی ہے ۔ اور قیامت کے روز بھی وہ پھٹکار سے دوچار ہوں گے ۔ ان کو بتایا جارہا ہے کہ کیا یہ تمہارے پیشوا تمہیں عالم انسانی کے نتائج اعمال سے بچا سکتے ہیں ۔ نہ آج بچا سکتے ہیں اور نہ قیامت کے دن ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾

اے اللہ کے رسول یہ آبادیوں کے حالات ہیں۔ جو ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دنیا میں اب تک موجود ہیں اور کچھ کی بالکل جڑ کٹ چکی ہے[۱۲۲] اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے جب اللہ کی گرفت میں آگئے تو ان کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔ اور ان کے حق میں انہوں نے ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا[۱۲۳] اور دیکھو ایسے ہی آپ کے مالک کی گرفت ہوتی ہے جب وہ آبادیوں کی ظلم کی پاداش میں گرفت کرتا ہے اس کی گرفت بڑی ہی سخت ہوتی ہے[۱۲۴]

تاریخی واقعات سے استدلال

سورت کے آغاز میں قوم کو اتباع حق کی دعوت دی تھی۔ اور سرکشی و فساد کے نتیجہ سے خبردار کیا تھا۔ نیز واضح کیا تھا۔ کہ اس موضوع پر بنیادی امور کیا ہیں؟ پھر ان سب کا آیت نمبر ۲۴ میں خلاصہ بیان کیا۔ یہاں راہیں دو ہیں۔ ایک نبوت کی اور دوسری نبوت کے مخالفوں کی۔ اور ضروری ہے کہ دونوں کے چلنے والے اپنی حالت اور اپنے نتیجہ میں ایک ہی طرح کے نہ ہوں۔ پھر اس حقیقت پر دلیل پیش کی تھی۔ یہ گزشتہ ایام و وقائع کا بیان تھا۔ جو حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ سے شروع ہوا اور حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ پر ختم ہوا۔ اب اس آیت سے لے کر آخر سورت تک ان نتیجوں اور عبرتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو اس سلسلہ استدلال سے واضح ہوتی ہے۔ ان قوموں کو جو کچھ پیش آیا تو اس لیے پیش نہیں آیا۔ کہ اللہ سبحانہٗ نے ان پر زیادتی کی ہے۔ اس کا قانون جزا و سزا تو سرتا سر عدل و رحمت ہے۔ بلکہ اس لیے کہ انہوں نے خود اپنے اُوپر ظلم کرنا چاہا اور نجات کی راہ سے منہ موڑ کر ہلاکت کی طرف چلنے لگے۔ اس موضوع پر اللہ سبحانہٗ کا قانون ایسا ہی ہے۔ اس کی رحمت نے مہلت پر مہلتیں دی ہیں۔ اور روشنی کو تاریکی سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ لیکن اگر ایک قوم روشنی سے یک قلم منہ موڑ لے تو پھر نتائج و عواقب کا ظہور کبھی نہیں رک سکتا ہے۔ ان کے ظہور کی شدت و دردناکی کبھی دور نہیں ہو سکتی ہے۔ ہر اس انسان کے لیے جو آخرت کے خیال سے بے خوف نہ ہو۔ اس بات میں حقیقت کی بڑی نشانی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزاءِ عمل کا قانون یہاں نافذ ہے اور اللہ کے رسولوں کا پیغام جھوٹا نہیں ہے۔

(۱۰۰) اے اللہ کے رسول یہ آبادیوں کے حالات میں سے کچھ حالات ہیں جو آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دنیا میں اب تک موجود ہیں اور کچھ کی بالکل جڑ کٹ چکی ہے یعنی پچھلی قوموں کے جو قصے تم کو سنائے گئے ہیں کہ کس طرح انہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی اور گستاخیاں کیں۔ پھر کس طرح تباہ ہوئے ان میں سے بعض کی بستیاں ابھی آباد ہیں جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا اور بعض اُجڑ گئیں مگر ان کے کچھ کھنڈرات باقی ہیں۔ جیسے قوم لوطؑ کی بستیاں اور بعض کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا[1]

بتانا یہ ہے کہ پیچھے جن قوموں کی تاریخی داستانیں سنائی گئی ہیں۔ ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قریش کو توجہ دلائی ہے منها قائم وحصید یعنی ان بستیوں میں بعض قائم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ جن کو دیکھ سکتے ہو اور کچھ ان میں سے بالکل ملیا میٹ ہو گئیں۔ حصید کٹی ہوئی کھیتی کو کہتے ہیں جیسے حدیث میں ہے مالناں الا حصائد السنتکم۔ دوزخ تو نام ہی تمہاری زبانوں کی لگائی ہوئی کٹی ہوئی کھیتیوں کا ہے یہاں لفظ حصید ان بستیوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو عذاب الہی سے یکقلم نیست ونابود ہو گئیں قائم کی ایک مثال مصر ہے جس سے فرعون اور اس کی فوج کو نکالا اور سمندر میں غرق کر دیا مکان قائم رہ گئے مکین کا نام و نشان نہ رہا حصید سے مراد قوم ہود اور قوم لوط کی بستیاں ہیں جن کے مکان اور مکانوں کے ساتھ سارے مکین سب ملیا میٹ کر دیئے گئے۔ صرف کسی کے کچھ کچھ آثار اپنے مکینوں کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔ یہ بات اہل مکہ حضور اقدس ﷺ کے مخاطبوں کو سنا کر اس لیے کہی گئی کہ اگر انہوں نے ان قوموں کی روش کو اپنایا تو لازماً ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو تاریخ میں ان قوموں کا ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل پیش کی ہیں ان میں ایک نمایاں استدلال ایام و وقائع کا ہے۔ قرآن نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تاریخی داستان کو بیان کیا جائے بلکہ بتانا یہ ہے کہ قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا ایک قانون ہے اور جیسے اللہ سبحانہٗ کے تمام قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں زمانوں اور مکانوں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی ہے۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ظالم قوموں کو اپنے ظلم کی لگائی ہوئی کھیتی کاٹنی پڑتی ہے۔

(۱۴۳) اللہ کا قانون مجازات

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ جب اللہ پاک کی گرفت میں آگئے تو ان کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔ اور ان کے حق میں انہوں نے ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ یعنی اللہ سبحانہٗ نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جو ظلم کا وہم ہو سکے۔ جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے نکل گئے اور اس طرح اپنے آپ کو سزا کا کھلم کھلا مستحق ٹھہرایا تب خدا کا عذاب آیا پھر دیکھو جن معبودوں دیوتاؤں کا انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ باطل معبود کام کیا آتے الٹے ہلاکت کا سبب بنے جب انہیں نفع و ضرر کا مالک سمجھا، اُمیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھاتے، تعظیم اور ڈنڈوت کی تو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا تھا شرک و بت پرستی کا عذاب اس پر مزید رہا[۱] یعنی یہ جو کچھ ہوا قانون مجازات

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کا ناگزیر تقاضا تھا یہ ان کے ظلم کا نتیجہ تھا۔ اللہ کے ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو سننے کے لیے کان دیئے، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ اور سمجھنے کے لیے دل عطا فرمایا ہے۔ کوئی بھی ایسی چیز ان کو دینے میں کمی نہیں کی جو حق و باطل کا فرق سمجھنے کے لیے ضروری تھی۔ مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے برے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور روح کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

یہ اس بات کیلئے ایک قسم کا استدراک ہے کہ آخر ان لوگوں کا یہ حال کیوں ہوا کہ وہ ایسے اندھے بہرے ہو گئے کہ بالآخر اللہ سبحانہ کے ابدی عذاب کے مستحق ہوئے۔ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے تو انسان کو بہترین صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اگر وہ ان سے کام لے تو نبیوں اور رسولوں کی آواز اس کو اپنے دل کی آواز معلوم ہو لیکن اپنی اپنی چاہتوں کے پیچھے پڑ کر اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔

> ہم نے ان کو ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنی ہلاکت کے اسباب فراہم کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔

اور علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں۔

> ہم نے ان پر بالکل ظلم نہیں کیا ہے انہوں نے اپنے افترائی معبودوں پر سہارا کر کے اور ان کی عبادت کر کے اور ہم سے روگردانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے۔

اور علامہ محمد طاہر ابن عاشورؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ کی جانب سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا کیونکہ ان پر جو افتاد بھی پڑی ہے وہ ان کے اعمال بد کا ناگزیر نتیجہ ہے۔

اور علامہ آلوسیؒ نے اس سے زیادہ خوبصورت بات فرمائی ہے۔

> ان بستیوں کو ہلاک کر کے ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن چونکہ انہوں نے خود ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کے نتیجے میں اللہ کے قانون حکمت کے مطابق ان کی ہلاکت ہوئی۔ تو ظلم خود کمانے والے وہ ہیں۔

ان بزرگوں کا منشا یہ بتانا ہے کہ جس طرح یہاں عالم مادی میں ہر بات میں اللہ سبحانہ کے مقرر کردہ قوانین ہیں اسی طرح عالم انسانیت میں بھی قوموں اور جماعتوں کے لیے سعادت و شقاوت حیات و ممات کے بھی

قوانین ہیں۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے سارے قوانین میں یکسانی ہے۔ عالمگیری ہے۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کارہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوسکتی ہے۔ جس طرح عالم مادی میں سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے۔ اسی طرح عالم انسانی کے قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہوں گے خواہ کسی ملک یا کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اب سے ہزار برس پہلے تو سنکھیا کا خاصہ کا ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ یہاں ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی بار کا حادثہ نہیں ہے خواص و نتائج دائمی ہیں۔ یعنی جو بات ایک بار ظہور میں آتی ہے ہمیشہ ظہور میں آتی رہے گی۔ جب مادی عالم میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے تو عالم انسانی یعنی اعمال کے لیے اس کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے اگر سنکھیا کا کھانا موجب ہلاکت ہے تو اعمال انسانی کا نتیجہ بھی یقیناً ہلاکت ہے۔ عالم مادی میں قانون عقلی کو ماننا اور عالم انسانی میں قانون معنوی سے روگردانی بہت بڑی بے انصافی ہے۔

آگے ان کے اپنی جانوں پر ظلم کو بنیاد بنا کر تفریع کی ہے کہ جب ان کی تباہی کا اللہ کی جانب سے حکم آیا تو ان کے وہ سارے افترائی معبود جن کو وہ حاجت روا سمجھ کر پکارتے تھے، دعائیں مانگتے تھے، دہائیاں دیتے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے اور جن کے نام کے بکرے، بھیڑ اور اس قسم کی بیسیوں خرافات کر رہے تھے وہ بھی ان کے کچھ کام نہ آئے۔ کیونکہ وہ سب ان کے وہم کی ایجاد تھے اور وہمی تخلیقات حقیقت کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتے اس جملے پر غور کیجئے اور بار بار کیجئے فما اغنت عنھم الھتھم التی یدعون من دون اللہ من شئ یعنی ان کے وہ سارے معبود جن سے وہ اللہ سے ورے دعائیں مانگتے تھے۔ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے۔ عام شارحین قرآن نے یدعون کو یعبدون کا مترادف قرار دیا ہے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ عجز و نیاز اور دعا، وطلبگاری کے تعلقات قائم کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ ارشادات نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الدعاء مخ العبادۃ دعاء عبادت کا مغز ہے اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الدعاء ھو العبادۃ دعا بھی عبادت ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔

وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون

عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔

تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ ضرور جہنم میں جائینگے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ زمان ومکان بدلنے اور قوموں کی تبدیلی سے قوانین نہیں بدلتے ہیں تو جو دعائیں، نیازیں، دہائیاں، نذریں اور چڑھاوے آج مسلمانوں میں دینداری کے نام پر رائج ہیں۔ قرآن کی آیت یدعون من دون اللہ کا ضرور مصداق ہیں۔

علماء کرام کا وہ طبقہ جو عام مسلمانوں میں شیخ سدو کے بکروں خواجہ خضر کے بیڑوں، شیخ جیلانیؒ کی گیارہویں، شیخ بلخیؒ کی سترھویں اور از من قبیل بیسیوں واہی خرافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے اور منبر ومحراب کو اپنی ڈانٹوں اور جھڑکیوں سے ہلاتا رہتا ہے اس کا پس منظر یدعون من دون اللہ کے سوا کیا ہے مگر ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیئے کہ باوجود سب کچھ کہنے کے، سب کچھ سنانے کے ان کی تقریروں کا اثر ان کے مصلّوں سے باہر کیوں محسوس نہیں ہوتا ان کی آواز مساجد سے نکل کر مشاہد تک کیوں نہیں پہنچتی ہے ان کی دھمکیاں صرف مسجدوں کی دیواروں سے ٹکرا کر کیوں واپس ہو رہی ہیں کیا بات ہے کہ ایصال ثواب کی آڑ میں کرنے والے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو یقیناً غلط ہے کہ مسلمانوں کی یہ عمومی زندگی جو ان خرافی اوہام میں مبتلا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی توحید عبادت سے منکر ہے یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ان کو شک ہو گیا ہے اور یا ان کے نزدیک قرآن اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اس ارتداد کا میں قطعاً قائل نہیں ہوں۔ مرض کے اسباب کی یہ تشخیص غلط اور قطعاً غلط ہے مشاہدہ اور معائنہ کے خلاف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ان علماء نے مسلمانوں کے سامنے اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات کو صرف اور صرف آخرت میں نجات تک محدود کر رکھا ہے ان کو یہ بتانا گوارا ہی نہیں کیا کہ آخرت میں نجات کے ساتھ دنیا میں کامیابی کیلئے جو کچھ مانگا جائے مساجد میں اللہ سے مانگا جائے۔ مشاہد اور مقابر عبرت کی جگہ ہیں، طلب و دعا کا مقام نہیں ہیں۔ صرف معاشی دشواریوں اور دنیاوی حاجتوں ہی نے عام مسلمانوں کا رُخ مساجد میں اللہ سبحانہٗ سے ہٹا کر مشاہد اور مقابر کی طرف کر دیا ہے۔ عموماً ساری بدعات اور مشرکانہ کاروبار کے پیچھے معاشی محرکات ہی کارفرما ہیں۔ یہ بے جان بات ہے کہ ان اعمال واشتغال کی پشت پر کوئی دینی یا اعتقادی، اخلاقی یا روحانی محرک ہے۔ محض ایک وسوسہ ہے یقین کیجئے اللہ سبحانہٗ کو جب تک مسلمانوں کے سامنے الٰہ المعاش بنا کر پیش نہ کریں گے اس وقت تک صرف الٰہ المعاد والے اللہ سے وہ تعلق ان کا قائم نہیں ہو سکتا جس کا سب

نبیوں نے اپنے مخاطبوں سے اور قرآن نے ہر مسلمان سے مطالبہ کیا ہے۔ جنت اور دوزخ کا مالک خدا
ان اختراعی اور افترائی الہوں سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے جن کے متعلق بتانے والے بتاتے ہیں کہ ان میں کوئی
نوکری دلاتا ہے کوئی اولاد تقسیم کرتا ہے، کوئی جنوں کو بھگاتا ہے، کوئی دشمنوں کو شکست دیتا ہے ۔

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست
او پیاز گندہ را ند دہ ز دست

سیب دیئے بغیر آپ اگر چاہتے ہیں کہ بچہ بدبودار پیاز کو چھوڑ دے تو یہ آپ کا غیر فطری مطالبہ ہے۔
اگر مسلمانوں کو واقعی ارحم الراحمین مالك الملك کے قدموں پر لوٹنے کی دعوت دی جائے
تو کیا وہ اس سے روگردانی کر سکتا ہے۔ لاپرواہیوں کی انتہا ہے کہ عوام ہی نہیں اچھے پڑھے لکھے مولویوں سے
جب کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ کا مطلب پوچھا جاتا ہے تو بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے بس یہی اس کا حاصل ہے۔
حالانکہ نہ یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے نہ یہ اسکا مفاد ہے آخر اگر اللہ ایک ہے تو اس میں غریب بندوں کا کیا فائدہ!
کس قدر عجیب بات ہے کہ بچھڑے ہوئے بندوں کو جس لفظ الٰہ کے ذریعے اللہ سے جوڑا گیا تھا اور اسے
باور کرایا گیا تھا کہ زندگی کی تمام ضرورتوں اور کشمکش حیات کی تمام مشکلات اور دشواریوں میں انتہائی عاجزی اور
نیازمندی، مسکنت وخاکساری، تذلل وابتہال کے ساتھ جان و دل کی پوری قوت سے جس کی طرف بھاگنا چاہیئے
وہ اللہ سبحانہٗ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اسی کلمہ دعوت کو جب سمجھا گیا تو بس یہی بتایا گیا کہ اللہ ایک
ہے اور اس کی تعبیر واجب الوجود سے کر کے دلائل کا انبار لگا دیا۔ جس چیز کا کسی کو انکار نہ تھا ساری طاقتیں
اسی ملنے ہوئے اقرار کے منوانے پر خرچ کر دی گئیں لیکن دعوت کے اس جملہ میں الٰہ کا لفظ طاق نسیاں بنا
دیا گیا حالانکہ یہی لفظ اس سارے کلمے کی جان تھا۔ یہی عبد کو اپنے معبود سے ملاتا تھا۔ اسی کو ہر قسم کی تشریح
سے بے نیاز سمجھ لیا گیا اور ساری توجیہات کا مرکز صرف یہ رہ گیا کہ اللہ ایک ہے گویا جس نے اللہ کو ایک
مان لیا اس نے اپنے اس فرض کو ادا کر دیا جس کی ذمہ داری لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے اس پر ڈالی گئی کیسی عجیب
بات ہے کہ اسلام کی عمارت کی جو پہلی اینٹ تھی اسی کے متعلق غفلت سے کام لیا گیا حتیٰ کہ کچھ نے لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ ہی یہ کر دیا کہ خدا کے سوا کوئی
خدا نہیں ہے اور مالکم من الٰہ غیرہ کے معنی یہ بتلائے گئے کہ اللہ کے سوا تمہارا خدا کوئی نہیں ہے۔ الی اللہ تعالیٰ المشتکی۔

آخر میں فرمایا کہ ما زادوھم غیر تتبیب یعنی ان الہوں نے جن سے وہ دعائیں
کرتے تھے لوگوں کی ہلاکت میں اضافہ کیا یعنی ان سے دعائیں مانگنا عذاب میں اضافہ کا سبب بنا کیونکہ
جھوٹے سہارے ضرورت کے وقت میں مصیبت اور محرومی ہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ آیت ایس انداز تعبیر
بتا رہا ہے کہ وہ جن سے دعائیں مانگ رہے تھے صرف دیوتا، بت ہی کے نام پر ڈھانچے اور اشخاص

نہ تھے بلکہ ان اشخاص کے پس منظر میں کچھ شخصیتیں تھیں۔ جن سے وہ عجز و نیاز دعا اور طلبگاری کی درخواستیں کرتے تھے اسی لیے علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ التی اس آیت میں بمعنے الذین کے ہے پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ نہیں کام آئیں لوگوں کے وہ ہستیاں جن سے اللہ کے سوا دعائیں مانگتے تھے۔ کچھ بھی جب عذاب کے بارے میں حکم الٰہی آگیا۔ اور کام تو کیا خاک آتے بلکہ ان کا افترائی سہارا ان کی مزید تباہی کا سامان بن گیا۔

(۱۲۴) قریش مکہ کو تنبیہ

اور دیکھو ایسے ہی آپ کے مالک کی گرفت ہوتی ہے جب وہ آبادیوں کی ظلم کی پاداش میں گرفت کرتا ہے اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے یعنی ظالموں کو بڑی حد تک مہلت دی جاتی ہے جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے۔ مجرم چاہے کہ تکلیف کم ہو یا اس کی پکڑ سے چھوٹ کر بھاگ نکلے این خیال است و محال است و جنوں[۱] مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ آبادیوں اور آبادکاروں کو ان کے ظلم، ان کی سرکشی اور ان کے بن سرے ہونے کی سزا دیتا ہے تو اسی طرح دیتا ہے جس طرح ان قوموں کو دی جن کی تاریخی داستانیں پہلے بیان ہوئی ہیں۔ اس وقت اللہ سبحانہٗ کی گرفت بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے قریش مکہ کو سنائی گئی ہے کہ وہ آگاہ ہو جائیں اب ان کو بھی اسی میزان میں تولا جائے گا۔ جس میں پہلی قوموں کو تولا گیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے جو معاملہ تاریخ میں ان قوموں کے ساتھ کیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ قریش کے ساتھ اس سے الگ معاملہ ہو۔ اس باب میں اللہ کا قانون ایسا ہی ہے۔ اس کی رحمت نے مہلتوں پر مہلتیں دی ہیں اور روشنی کو تاریکی سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم روشنی سے یک قلم منہ موڑے تو نتائج و عواقب کا ظہور کبھی نہیں رک سکتا۔ ان کے ظہور کی دردناکی و شدت کبھی دور نہیں ہو سکتی حافظ ابن کثیرؒ نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

> اللہ سبحانہٗ بتا رہے ہیں کہ جیسا ہم نے ان ظالم اور نبوت کی تکذیب کرنے والی قوموں کے ساتھ اہلاک کا معاملہ کیا ہے ایسے ہی ہم ان جیسوں کے ساتھ ہلاکت کا معاملہ کریں گے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے قانون امہال پر استدلال کیا ہے حافظ ابن کثیرؒ نے صحیحین کے حوالہ سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت پیش کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لیملی لاظالم حتی اذا اخذہ لم یفلتہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے تاآنکہ جب اس کی گرفت کرتا ہے تو ظالم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

اس کے بعد ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زیر تشریح آیت کی تلاوت فرمائی۔ یعنی وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ الخ اگر قوانین قدرت کی ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھا کر نقصان وفساد کی اصلاح کر لی جائے۔ قرآن اسی فائدہ اٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو ودرگذر کرنے اور ایک خاص مدت تک فرصت حیات بخشنے کو املا روامہال اور تمتیع کا نام دیتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ کائنات میں فضل ورحمت کام کر رہی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہر غلطی کو درستگی کے لیے ہر نقصان کی تلافی کے لیے، ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت اصلاح ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔ اسی لیے پیغمبروں کے مخاطبوں کے مطالبہ پر معجزات میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ مہلت اور فرصت کی گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں اور منکرین کو ہلاک کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس کی مثالیں قوم نوحؑ، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش مکہ تک کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ اور قرآن نے اسے بتصریح یہاں بیان کر دیا ہے۔ جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ مقرر ہے اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے۔

إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ
لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ
مَّعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ
شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا
زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَ
الْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَ
أَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ
السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾
فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا
يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ
مَنقُوصٍ ﴿١٠٩﴾ ع

بلاشبہ اس میں بڑی عظیم نشانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو آخرت
میں ہونے والی گرفت سے اندیشناک ہے[125] وہی تو ایک دن ہے جس
میں سب اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور وہی تو ایک دن جس میں

نمائش ہوگی[۱۲۶] اور ہم اس دن کے لانے میں صرف ایک مقررہ مدت کی
خاطر تاخیر کر رہے ہیں[۱۲۷] وہ دن جب آجائے گا تو کسی کو یارائے سخن بغیر
حکم الہٰی نہ ہوگا۔ لوگوں میں کچھ محروم و بد بخت ہوں گے اور کچھ بانصیب
اور نیک بخت[۱۲۸] بدبختوں کی آماجگاہ دوزخ ہے۔ اس میں اُن کی چیخ
اور دھاڑ ہوگی سدا رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین قائم ہیں
مگر ہاں اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے بے شک تیرا رب جو
چاہتا ہے کر ڈالتا ہے[۱۲۹] اور بانصیب و سعادت مند لوگ جنت میں ہوں گے
جب تک آسمان و زمین قائم ہیں سدا اسی میں رہیں گے مگر ہاں اس صورت
میں کہ تیرا پروردگار چاہے۔ یہ دین اور عطا ایسی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی
نہیں ہے[۱۳۰] لہٰذا اے اللہ کے رسول تو ان معبودوں کی جانب سے کسی شبہ
میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں ان معبودوں سے ان کے عابدانہ
تعلقات اپنے پہلے باپ دادوں کے عمل کی کاپی ہیں ہم ان کو بھی ان کا
حصہ پورا پورا دیں گے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی[۱۳۱]

مفردات کے معانی

شقی بد بخت اور محروم شقاوت سے بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے جمع اشقیاء سعید نیک بخت
بانصیب سعادت سے جس کے معنے نیک بخت ہونے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ ہے جمع سعداء

زفیر چلانا زفر یزفر کا مصدر ہے۔ علامہ خازن بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ زفیر کی اصل سانس کی اتنی آمد رفت ہے کہ پسلیاں اس سے پھولنے لگیں۔ اور شہیق سینے کی طرف سانس کا لوٹانا ہے یا زفیر سانس کھینچ کر اس کو سینے سے نکالنا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ زفیر زور کی آواز ہے اور شہیق پست آواز۔ ضحاک و مقاتل کا بیان ہے کہ زفیر گدھے کی پہلی آواز کو اور شہیق اس کی آخری آواز کو جب کہ وہ اسے سینے کی طرف لوٹاتا ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ زفیر حلق سے ہوتی ہے اور شہیق پیٹ سے

آخرت کی یاد دہانی

یہاں کچھ شارحین قرآن نے غلط مبحث کر دیا ہے اور آیت قرآنی کا منشا یہ سمجھ لیا ہے کہ تاریخ کے ان واقعات میں ایک ایسی نشانی ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ عذاب آخرت ضرور پیش آنے والا ہے اگر یہ بات سمجھانی ہوتی تو تعبیر یہ ہوتی کہ ان فی ذالک لآیۃ لعذاب الآخرۃ۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ان تاریخی واقعات میں اس شخص کے لیے جو آخرت کو مانتا ہے اور آخرت کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہے بہت بڑی نشانی اور عبرت ہے یعنی ہر اس شخص کے لیے جو آخرت کے خیال سے بے خوف نہ ہو اس میں حقیقت کی بڑی نشانی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزائے عمل کا قانون دنیا میں نافذ ہے اور اللہ کے پیغمبروں کا پیغام جھوٹا نہیں ہے۔ اس کے بعد سمجھایا ہے کہ ہر انسان کو آخرت کا خوف کیوں رکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اعمال انسانی کے بھی خواص و نتائج ہیں اور یہاں مادیات کی طرح معنویات کے بھی قوانین کام کر رہے ہیں۔ اچھے اعمال کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ اور برے اعمال کا نتیجہ برا ہوگا۔ یہ اچھے برے نتائج کس شکل میں پیش آئیں گے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ سعادت مند جنت میں ہوں گے ان کے لیے اس زندگی میں خوش حالیاں ہوں گی اور بقار الٰہی کی دائمی نعمت ہوگی۔ اہل شقاوت اور بدعمل انسان دوزخ میں ہوں گے ان کے لیے دوزخی زندگی کی بدحالیاں ہوں گی۔

یہ مادی و جسمانی زندگی علت و معلول اور عمل رد عمل کے جس اصول پر قائم ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام قرآن میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے۔ ان دو لفظوں ہی پر اگر غور کر لیا جائے تو آخرت میں جزا و سزا کے اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔
اشخاص کی نیکو کاری و بدکاری کے باسعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں۔ وہی جماعتوں کی صلاح و

فساد اور سعادت و شقاوت کے اصول ہیں۔ جس طرح ایک حکیم کا ان مادی اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری زبان میں حکمت اور سائنس ہے اسی طرح عالم انسانیت میں اعمال کے معنوی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا نبوت کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام اسلام ہے نبوت کی راہنمائی میں عالم انسانیت کے متعلق اعمال سے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہوتا ہے۔ جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ آخرت میں جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے رد عمل کا نام ہے قرآن عزیز کی یہ تصریحات گواہ ہیں۔ الیوم تجزون ما کنتم تعملون اور لتجزی کل نفس بما تسعی۔ ان میں یہ صاف تصریح ہے کہ آخرت کی اچھی یا بری جنت یا دوزخ والی زندگی تمام تر دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں۔ بہرحال آخرت نام اس زندگی کا ہے جہاں اجسام کی تخلیق مادی عناصر سے نہیں بلکہ اعمال و اخلاق سے ہوگی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ فرمائیں گے۔ اے میرے بندو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تمہیں لوٹا کر دے رہا ہوں تو جو جزائے خیر پائے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود ہی کو ملامت کرے [۱]

(۱۲۵) بلا شبہ اس میں بڑی عظیم نشانی ہے اس شخص کے لیے جو آخرت میں ہونے والی گرفت سے اندیشناک ہے یعنی دنیا جو دار عمل ہے جب شرک، کفر، تکذیب انبیاء پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں۔ تو یہ ایک نشان ہے اس بات کو معلوم کرنے کا کہ آخرت میں جو خالص دار جزا ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی۔ اور کیا صورت رستگاری کی ہوگی عقلمند آدمی کے لیے جو اپنے انجام کو سوچ کر ڈرتا ہے اس میں بڑی عبرت و نصیحت ہے [۲]۔

اس پر شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ ان فی ذالک میں مشار الیہ قوموں کی سرگزشتیں ان سرگزشتوں پر غور کرو جتنے رسول آئے وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی پکار کیا تھی اور پکار کی نوعیت کیا تھی، ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے۔ انہوں نے اپنے قدم جہاں جمائے تھے وہ جگہ کون سی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھا۔ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا قول کیا تھا۔ پھر ان قوموں کی طرف نظر اٹھاؤ جن میں ان دعوتوں کا ظہور ہوا۔ کس طرح ہر قوم اپنے طرز عمل میں دوسری قوم کی کاپی ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک طرح کا رہا۔ سب نے دعوت

---

[۱] صحیح مسلم [۲] افادات شیخ الاسلام

کا انکار کیا، سب نے دعوت کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلیلوں سے منہ موڑا سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں، سب نے جبر و تشدد سے راستہ روکنا چاہتا۔

پھر نتیجہ دیکھو ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے فیصلے کا انتظار کیا گیا۔ اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا۔ کہ مؤمنون نے نجات پائی، سرکشوں کو ہلاک کیا ان سب میں آخرت کے عذاب سے اندیشہ رکھنے والوں کے لیے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے ان کو سوچنا چاہیئے کہ عالم انسانی میں جب اعمال کے نتائج کا یہاں یہ حال ہے تو عالم آخرت میں جس کی ترکیب وتکوین ہی اعمال کے آثار و نتائج سے ہوگی وہاں صورت حال کیا ہوگی!

خاف عذاب الآخرۃ کی قید لگا کر قرآن نے اشارہ کردیا کہ یہاں سوچنے والے دو طرح کے ہیں۔ ایک عالم طبعی پر غور کرنے والے دوسرے عالم انسانی پر فکر کرنے والے عالم طبعی پر غور کرنے والے یعنی عقلیت پسند یقیناً ان حوادث و واقعات کا پس منظر یہی بتائیں گے کہ طبعی اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ زلزلہ آیا اور آبادی کی بلند عمارتیں پیوند زمین ہوکر رہ گئیں۔ بارشیں کثرت سے ہوئیں، دریاؤں میں پانی آیا اور سیلاب بن گیا۔ جس نے تمام علاقہ کو ویرانہ بنادیا۔ ہر زمانہ کے عقل پرستوں کا یہی انداز فکر رہا ہے۔ جیسا کہ قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے واقعی عقلیت کی گود میں بیٹھ کر ان مسائل پر جب بھی غور کیا جائے گا تو مادی نگاہ رکھنے والے اسی فکری آوارگی کا شکار ہوں گے۔ اصل میں ان مسائل کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ عالم انسانی سے ہے۔ اس میں عقل کی راہنمائی پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا عالم انسانی اور عالم مادی دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ کوئی دیانت دار آدمی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ عالم طبعی میں اور مادی دنیا میں صحت وصداقت کی تلاش کا حصول جتنا آسان ہے عالم انسانی میں اتنا ہی دشوار ہے عالم انسانی کے مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک راہنمائی نہیں کرسکتا ہے۔ عالم مادی اور عالم انسانی کے اسی فرق کو بتانے کے لیے خاف عذاب الآخرۃ کی قید لگادی ہے اور بتادیا ہے جن کی نگاہ مادی ہے وہ واقعات کے سربستہ راز کو عقل کے ذریعے نہیں حل کرسکتے ہاں جو اعمال کے آثار و نتائج سے آگاہ ہیں اور عالم انسانی میں اعمال کے لوازم سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آخرت مین اعمال کے نتائج عذاب و ثواب کا لبادہ پہن کر اٹھیں گے ان کے لیے اس دنیا میں ہونے والے اعمال کے نتائج میں بہت بڑی عبرت ہے۔

آیئے اب ذرا شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سُن لیجئے۔ حافظ ابن جریرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

آبادیوں میں سے جن کی ہم نے گرفت کی ہے اور جن کے واقعات اور داستانیں سنائی ہیں ان

میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جن کو آخرت میں ہونے والے عذاب کا اندیشہ ہے۔ یہ واقعات ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایک حجت ہیں اور اس میں ان کو نصیحت ہے کہ دنیا کی زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہیں ۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ

اللہ سبحانہ، فرماتے ہیں ۔ ہمارے نبیوں کو بچانے اور ان کے مقابل طاقتوں کو ہلاک کرنے میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آخرت میں ہونے والے واقعات صحیح ہیں

علامہ بقاعیؒ اپنی تفسیر نظم الدرر میں فرماتے ہیں ۔

اس خبر اور واقعات میں اس شخص کے لیے بہت بڑی علامت ہے جسے عذاب آخرت کا اندیشہ ہے کیوں کہ جب وہ ظالموں کی ہلاکت آنکھوں سے دیکھ رہا ہے تو یہ بات اس کی راہنمائی کرے گی کہ آخرت میں جزا یقینی ہے ۔

علامہ ابو حیان اندلسیؒ اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیر میں اسی کے قریب قریب کہا ہے لیکن علامہ شوکانیؒ نے اس کو دوسرے پہلو سے دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

عذاب آخرت کا اندیشہ رکھنے والے کے لیے ان واقعات میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ، آخرت میں بھی اعمال کی جزا پر مبنی وعدہ کو وفا کریں گے جیسا کہ یہاں انبیاء سے اپنا وعدہ وفا کیا ہے ۔

(۱۲۶) آخرت سب کی حاضری کا دن ہے

وہ ہی تو ایک دن ہے جس میں سب اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور وہی تو ایک دن ہے جس میں نمائش ہوگی یعنی تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا گویا خدائی عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہی ہوگا [۱] یعنی یہ ایسا دن ہوگا کہ جس میں سب اکٹھے کیئے جائیں گے ۔ نیکی کی دعوت دینے والے بھی اور برائی کی راہ دکھانے والے بھی ۔ حاکم بھی اور محکوم بھی ، شاہد بھی اور مشہود بھی ۔ اسی لیے اس دن کو یوم الجمع کہا گیا ہے ۔ وتنذر یوم الجمع لاریب فیہ ۔ اس دن میں لوگوں کو حساب اور جزا و سزا کے لیے جمع کیا جائے گا ۔ قل

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم ۔ قرآن میں قیامت کے ناموں میں دوسرے ناموں کے ساتھ یوم الجمع بھی آیا ہے ۔ یوم یجمعکم لیوم الجمع ۔ قرآن میں قیامت کے ایک سے زیادہ نام آئے ہیں ۔ ان میں سے ہر نام قیامت قیامت کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے سب سے پہلا نام سورۃ فاتحہ میں یوم الدین آیا ہے ۔ یعنی جزا کا دن جس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا کا دن اور زبانی عدالت کا دن ہوگا ۔ اس کے علاوہ اور بھی اس کے چند نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں ۔

یوم القیامۃ	کھڑے ہونے کا دن
الیوم الحق	سچا دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۔
یوم معلوم	جانا ہوا دن یا مقرر دن
الیوم الموعود	موعود دن
الیوم الآخر	پچھلا دن
یوم الآزفۃ	مصیبت کا دن
یوم عسیر	سخت دن
یوم عظیم	بڑا دن
یوم عصیب	دشوار دن
یوم البعث	اُٹھنے کا دن
یوم التغابن	افسوس کا دن
یوم التلاق	باہم ملنے کا دن
یوم التناد	پکار کا دن
یوم الحساب	حساب کا دن
یوم الحسرۃ	حسرت کا دن
یوم الخروج	قبروں سے نکلنے کا دن
یوم الفصل	فیصلہ کا دن
القارعۃ	کھڑکھڑانے والی
الغاشیۃ	چھا جانے والی
الطامۃ الکبریٰ	بڑی مصیبت

انباء العظیم	بڑی خبر
الحاقۃ	ضرور آنے والی
الواقعۃ	واقع ہونے والی
الصاخہ	بہرا کرنے والی

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں آئے ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ بکثرت آئے ہیں۔ جن سے اس ہولناک دن میں انسان کی بے کسی عاجزی اور اپنے اعمال کے کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعاً مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

اس موقع پر آخرت کا ذکر ذالك يوم مجموع له الناس سے کرکے قرآن نے اشارا کردیا ہے کہ آخرت کا معاملہ کائنات ہستی کے عام قوانین سے الگ نہیں ہے بلکہ اسی کے ماتحت ہے یعنی دنیا میں جس طرح ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں ٹھیک اسی طرح پوری انسانی زندگی کے اچھے بُرے اعمال کے بھی خواص اور نتائج ہیں نتائج کے اسی عمومی اور بلا استثنا ظہور کا نام قیامت ہے

دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئی ہیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی طاقت، مالی وسعت، تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی۔ پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور بقا کے لیے ضروری نہیں مخالفت کی تو وہ فنا کردی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا گیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق، شام، مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں، قوم لوط اور قوم مدین کی عظیم الشان حکومتیں کہاں ہیں فرعون اور اس کی عظمت کا کیا حال ہوا ذالك من انباء القرىٰ الخ جس طرح عوام جو صرف افراد کو مرتے اور جیتے دیکھتے ہیں وہ قوموں کے فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھتے اسی طرح جن کی نظر عالم انسانیت کی تاریخ خلق پر نہیں ہے وہ کائنات کے فنائے کامل پر اپنی نادانی سے اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ جیسے فنا ہونے کے لیے یہ جزئیاتی اور تاریخی واقعات ایک حقیقت ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو جائے گی۔ کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اس موجودہ عالم کا قانون طبعی دوسرے قانون طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور پوری انسانیت سمٹ کر آجائے گی ذالك يوم مجموع له الناس آگے فرمایا ذالك يوم مشهود یہ دن سب کی حاضری اور پیشی کا دن ہوگا کوئی بھی غیر حاضر نہ ہوگا تاکہ ہر معاملے کے سارے فریق سامنے موجود ہوں اور پورے انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ ہو سکے۔

۱۲۷ ایک واقعہ ایک حقیقت

اور ہم اس دن کے لانے میں صرف ایک مقررہ مدت کی خاطر تاخیر کر رہے ہیں یعنی اللہ کے علم میں جو مدت مقرر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تب وہ دن آئے گا تاخیر سے یہ گمان مت کرو کہ یہ محض فرضی اور دہمی باتیں ہیں [1] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں ہر بات کے لیے ایک حساب ہے اور ہر معاملہ کے لیے ایک مقررہ معیاد ہے جب تک وہ وقت نہ آئے اس بات کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ آخرت کے لیے یہی ایک اجل معدود ہے یعنی یہ مدت غیر محدود نہیں بلکہ شمار کی ہوئی مدت ہے۔ شمار کی ہوئی مدت سے ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے یہاں جیسے ہر فرد کی بھی اجل مقرر ہے اس میں بھی تاخیر نہیں ہو سکتی ہے۔ لن یؤخر اللہ نفسًا اذا جاء اجلہا اور ہر امت اور ہر قوم کی بھی اجل مقرر ہے ولکل امۃ اجل۔ جب وہ وقت نمودار ہو جاتا ہے۔ تو اللہ سبحانہٗ کا آخری اور اٹل اور بے پناہ فیصلے کی گھڑی آجاتی ہے نہ تو اس میں ایک لمحہ کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ اور نہ یہ اپنے وقت مقررہ سے ایک لمحہ پہلے آسکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کائنات کی بھی ایک اجل مقرر ہے اور علم الٰہی نے یہ تقرر روز اول ہی میں کر دیا ہے فرد کی اجل اور قوموں کی طرح یہ بھی ایک روز ظاہر ہو کر رہے گی فرد کی اجل کی تاخیر سے جیسے استدلال اجل نہ ہونے کا غلط ہے ٹھیک اسی طرح کائنات کی اجل کی تاخیر سے قیامت نہ آنے پر بھی استدلال کرنا غلط ہے۔ جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدّت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پورے عالم انسانی کے اعمال کے نتائج کے لیے یہی مقدار اور وقت کا پیمانہ ہے اور ضروری ہے کہ نتائج وقت مقرر پر ظاہر ہوں اس صورت حال سے تاخیر کی حالت پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ تاخیر تاجیل کی وجہ سے ہے اللہ کی رحمت کا مقتضا یہی ہے کہ تاجیل ہو۔ اصل یہ ہے کہ مادی زندگی کے احساسات کی زنجیروں میں ہم اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر جمال حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے بس اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو کچھ بتلایا گیا ہے۔ اس پر یقین کریں اور بس

۱۲۸ روز قیامت کی ہولناکی

وہ دن جب آئے گا تو کسی کو یارائے سخن بغیر حکم الٰہی نہ ہوگا لوگوں میں کچھ محروم و بدبخت ہوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گے اور کچھ بانصیب اور خوش بخت ہوں گے یعنی کوئی ایسی بات جو مقبول و نافع ہو بدون حکم الٰہی سے نہ کر سکے گا محشر کے بعض مواقف میں تو ایک حرف بھی اذن و اجازت بدون منہ سے نہ نکال سکے گا ۔ یہاں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ مکہ کے قریش جو قرآن کی اس سورت میں مخاطب ہیں وہ قیامت کے صرف منکر ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے انکار پر شدید اصرار ہے ۔ قرآن نے ان کے انکار کو پورے زور و قوت سے پیش کیا ہے اور انکار کی شدت اور اصرار ہی کے پس منظر میں قیامت کے موضوع پر بیانات میں انداز تعبیر وہ اختیار کیا ہے جو منکرین کے لیے ہوتا ہے قرآن نے قیامت کے موضوع پر تکرار کے ساتھ ان کا انداز فکر یہ بتایا ہے کہ أإذا متنا وكنا ترابا ذالك رجع بعيد یہ حقیقت ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبوں کو مکہ میں توحید کے بعد جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار تھا ۔ جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہ آتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے اس لیے قرآن نے ان کے سامنے عقیدہ توحید کے بعد جس عقیدے کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا ۔ قرآن عزیز کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی موضوع کو مختلف تعبیروں اور مؤثر طریقوں روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے جب صورت حال یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب قیامت کو مانتے ہی نہ تھے تو اس کہنے میں کوئی معنویت نہیں ہے کہ

> یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے کہ ان معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و اعتماد کا وہ مقام حاصل ہے کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے پجاریوں کو بہر حال چھڑا ہی لیں گے ——— فرشتوں کی نسبت ان کا گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ناز اور تدلل سے اپنی ہر بات اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں ۔ اس طرح یہ اپنے باپ یعنی خدا سے ان سارے لوگوں کو بخشوا لیں گے جو دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہے ۔ (تدبر قرآن)

سوال یہ ہے کہ جب وہ معبودوں کی عبادت کرنے والے اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والے قیامت ہی کو نہیں مانتے ہیں تو ان کے بارے میں یہ نظریہ کیسے قائم ہو سکتا ہے ۔ اگر مان لیا جائے کہ ان کا اپنے معبودوں کے بارے میں یہ خیال ہے کہ قیامت میں وہ ان کو بخشوا لیں گے تو ثابت ہوا کہ مشرکین مکہ قیامت کا انکار نہیں کرتے بلکہ قیامت کو مانتے ہیں ۔ یہ صریح منطوق قرآنی کے خلاف ہے قرآن کا دعویٰ ہے ۔ انهم كانوا لا يرجون حسابا ۔ ماننا تو بڑی بات ہے ان کو تو حساب ہی کی امید نہیں

لہ افادات شیخ الاسلام

ہے وہ قیامت کا انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی کھلم کھلا تکذیب کرتے ہیں جیسے آیت کی اس تشریح میں کوئی معنویت نہیں ہے ایسے ہی یہ تفسیر بھی بے موقعہ غیر مناسب اور بے معنی ہے۔

یعنی یہ بیوقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسہ میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچالیں گے۔ فلاں بزرگ اُٹھ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک متوسل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستہ میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ (تفہیم القرآن)

یہ بھی مشرکین مکہ کے نظریات کی عکاسی نہیں ہے وہ قیامت ہی کو نہیں مانتے اس لیے قیامت میں بخشنے اور بخشوانے کا ان کے ذہن میں کوئی تصور نہیں ہے۔ قیامت میں بخشنے کا تصور قیامت کو ماننے کے لوازم میں ہے۔ دراصل ان بزرگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مشرکین مکہ کے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات معادی تھے یعنی ان کا پس منظر آخرت میں نجات تھی حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے کیونکہ وہ قیامت کو، حشر کو، جنت کو، دوزخ کو سرے سے مانتے ہی نہیں اس لیے ان کے بتوں اور فرشتوں سے عابدانہ تعلقات جنت اور دوزخ کے لیے نہیں ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں اور آپ کو پوچھنا چاہیئے کہ مشرکین کے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات کا پس منظر کیا تھا؟

مشرکین کا اپنی عابدانہ نیازمندیوں میں پیش نہاد معادی نہیں بلکہ معاشی تھا یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداوار میں برکت دی جائے، باغوں کے پھلوں کو آفتوں سے محفوظ رکھ کر ان میں اضافہ کیا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریوں اور وباؤں سے محفوظ رکھا جائے، صاحب نصیب اولاد بخشی جائے، دشمنوں پر فتح ہو الی غیر ذالک من الامور المعاشیۃ۔ بلاشبہ غیر اللہ کی عبادت سے ان کی غرض یہی ہوتی تھی۔ اور اسی لیے مشرک قوموں کا یہ نظام جس کا دوسرا نام اضافی نظام ہے۔ یہ اضافی نظام ان کا ایک مستقل معاشی نظام تھا اس کا معاد سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ کوئی بت پرست ایسا نہ تھا جو اپنے معبودوں سے عذاب قبر سے خلاصی مانگتا ہو یا کہتا ہو کہ حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی عطا کی جائے ان نیک کاموں کی توفیق دی جائے جن سے مرنے کے بعد سکون حاصل ہو بہرحال جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ اسی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق مانگا جاتا تھا خیر یہ تو سرراہ بات آ گئی۔ آیئے اب آیت کی وہ تشریح سُنیئے جو شارحین قرآن نے پیش کی ہے۔

دراصل جس روز کی ذالك يوم مجموع له الناس میں خبر دی گئی ہے اس جملہ میں اسی کے مدلول کی تفصیل بیان ہو رہی ہے یعنی جس وقت وہ دن آئے گا تو وہ اس قدر عظیم الہیبت اور دہشتناک ہوگا کہ کسی بھی شخص میں کچھ کرنا تو بڑی بات ہے کچھ کہنے کا بھی یارا نہ ہوگا اور کسی میں مجال دم زدن نہ ہوگی یہ اس دن کی دہشت کے لیے تعبیر ہے۔ اس روز کی ہولناکی کی وجہ سے سب ہی دم بخود ہوں گے اور کوئی بھی بات نہ کرسکے گا اور کچھ بھی نہ کہہ سکے گا۔ یہ دن طویل بھی ہوگا۔ ایک سے زیادہ اس کے رُوپ ہوں گے۔ صرف وہی بات کرسکے گا جسے بات کرنے کی اجازت ہو گی دوسری جگہ فرشتوں کا ذکر ہے۔

لا يتكلمون الا من اذن له الرحمان وقال صوابا ۔

یعنی فرشتوں میں سے بھی اس کے دربار میں جو بولے گا اس کے حکم سے بولے گا۔ اور بات وہی کہے گا۔ جو ٹھیک اور معقول ہوگی ۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن میں اس موضوع پر مختلف باتیں کہی گئی ہیں ۔ یہاں لا تکلم نفس الا باذنه دوسرے موقعہ پر هذا يوم لا ينطقون ولا يؤذن لهم فيعتذرون یعنی یہ وہ دن ہے جس دن میں یارائے گفتگو نہ ہوگا اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کی اجازت ہوگی ۔

ایک اور جگہ ہے واقبل بعضهم على بعض يتساءلون باہم متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے ایک اور موقعہ پر ہے يوم تاتي كل نفس تجادل عن نفسها جس روز ہر جان سوال و جواب کرے گی اپنی طرف سے ۔ ایک اور جگہ ہے وقفوهم انهم مسئولون ان کو ٹھہراؤ ان سے سوال کیا جائے گا ۔ ایک اور موقعہ پر ہے فيومئذ لا يسئل عن ذنبه انس ولا جان ۔ یعنی کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا ۔

شارحین قرآن نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں ۔ علامہ آلوسیؒ اور علامہ قرطبیؒ نے اس مقام پر اچھی داد تحقیق دی ہے ۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ میدان حشر کا زمانہ ایک طویل زمانہ ہے اور اس میں مختلف منظر ہوں گے۔ سب سے پہلا منظر اس دن کی ہولناکی اور دہشت کا ہوگا۔ اس ہولناکی سے سب دم بخود ہو جائیں گے صرف وہی کچھ بول سکیں گے جن کو بولنے کا رب ذوالجلال حکم دے گا مثلاً

يوم يجمع الله الرسل فيقول ماذا اجبتم قالوا لا علم لنا انك أنت علام الغيوب ۔

جس روز سب رسولوں کو اکٹھا کرکے پوچھے گا تمہاری دعوت کو لوگوں کی جانب سے

کس قدر پذیرائی ملی ۔ رسول جواب میں کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں ہے آپ ہی دانائے غیب ہیں ۔

ایک منظر وہ بھی ہوگا جس میں گنہگاروں کے لیے شفاعت کا حکم اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوگا یہ شفاعت وہ کریں گے جن کو شفاعت کا حکم ہوگا اور ان کی شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ سبحانہ شفاعت پسند کریں گے ۔ ولایشفعون الا لمن ارتضیٰ ۔

ایک منظر وہ ہوگا جب حساب ہو رہا ہوگا اس وقت بھی وہ بولے گا ۔ جسے بولنے کا حکم ہوگا عذر و معذرت ناقابل قبول ہوگی ۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں مطلق گویائی کی نفی نہیں ہے بلکہ اس گویائی کی نفی جو قابل قبول اور نافع ہو علامہ قرطبی نے بھی اس کو پسند کیا ہے اور شیخ الاسلام مولانا عثمانیؒ نے یہ کہہ کر اسی کو اپنے افادات میں اپنایا ہے کہ

کوئی شخص ایسی بات جو نافع اور مقبول ہو بغیر حکم الٰہی نہ کر سکے گا ۔

آگے ارشاد ہے عنهم شقی وسعید یعنی اس روز جو شقی ہوگا اس کے لیے شقاوت ہوگی ۔ جو سعید نکلیں گے ان کے لیے سعادت ہوگی ۔

(۱۲۹) اہلِ شقاوت کا انجام دوزخ ہے

بدبختوں کی آماجگاہ دوزخ ہے اس میں ان کی چیخ اور دھاڑ ہوگی ۔ سدا رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ۔ مگر اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے ۔ زفیر اور شہیق دونوں گدھے کی آوازیں ہیں ۔ زفیر اس کے شروع کی آواز شہیق اس کے آخر کی آواز ۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ دوزخ طرح طرح کی بڑی بڑی دردناک آوازوں سے چیختے چلاتے رہیں گے ۔ ما دامت السماوات والارض ۔ محاورہ ہے ۔ اس سے مراد ابدیت اور دوام ہے ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین و آسمان تو اس وقت ختم ہوں گے اس لیے لفظی معنی مراد ہو ہی نہیں سکتے ۔ زمخشریؒ ، آلوسیؒ ، بیضاویؒ اور ابن جریرؒ نے بھی بتایا ہے الا ما شاء ربك یہ استثناء الذین شقوا سے ہے یعنی ہر شقی دوزخ میں جائے گا اور ہمیشہ اس میں پڑا رہے گا عام قاعدہ اور ضابطہ تو یہی ہے لیکن فعال لما یرید کی مشیت اس پر بھی غالب ہے کہ وہ جس مجرم کو جس طرح جس حد تک چاہے بچائے ۔

یہاں یہ سوال کلامی کتابوں میں بڑے زور شور سے اٹھایا گیا ہے کہ کیا دوزخیوں کے عذاب کا بھی

کوئی آخر ہے ۔ دوزخ جو عذاب الٰہی کا گھر ہے کیا ہمیشہ آباد رہے گا ۔ یہ بات پہلے ذہن میں رکھیے کہ آیت قرآنی کا مدعا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے اختیارات غیر محدود ہیں ۔ اس کا اقتدار اعلیٰ سب پر حاکم ہے اسکے ارادے کو قید میں رکھنے کی نہ کوئی اور قوت ارادی ہے نہ کوئی اور بے جان ضابطہ ہے کوئی قانون اس پر حاکم نہیں وہ خود قانون پر حاکم ہے اب یہ بات سمجھیے کہ دوزخ جو عذاب الٰہی کا گھر ہے کیا ہمیشہ آباد رہے گا ۔ ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بلا شبہ قطعیت کے کا ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں قدرے اختلاف ہے عام اہل السنۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ دوزخ اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے ۔ لیکن اہل سنّۃ کا ایک مختصر سا گروہ جس میں صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پر جوش حامی حافظ ابن القیم جوزیؒ ہیں ۔ یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائیگی ۔ حافظ ابن القیمؒ نے دینی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن حدیث آثار صحابہ اور بہیں عقلی دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے اور بقول حافظ ابن القیمؒ حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل السنۃ کے ایک فریق کا خیال بتایا ہے ایک زیدی یمنیؒ عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے ۔ صوفیاء میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت محسوس ہو گی ۔

آیئے اس موضوع پر جمہور کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا عثمانیؒ نے اپنے افادات میں جو تحقیق فرمائی ہے اس سے بہرہ اندوز ہو جائیے فرماتے ہیں ۔

ان آیات کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان و زمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں رہیں گے مگر جو زیادہ چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے کیونکہ جب ہم طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہی خیال میں آتی ہے اسی لیے مادامت السماوات والارض وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولے جاتے ہیں ۔ باقی دوام و ابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیئے وہ حق تعالیٰ ہی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص ہے جس کو ماشاء ربک سے ادا کیا دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ مادامت السماوات والارض کو کنایہ دوام سے مانا جائے یا آسمان

زمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے جیسے فرمایا یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات۔ مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے تیرا رب موقوف کردے وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اس کی مشیت و اختیار سے ہے لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار و مشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی ختم نہ ہوگا چنانچہ فرما دیا۔ وما ھو بخارجین من النار اور یریدون ان یخرجوا من النار وما ھو بخارجین منہا اور لایخفف عنہم العذاب ولا ھم ینظرون اور ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشاء اسی پر تمام اہل اسلام کا اتفاق رہا ہے اور ہمارے زمانے کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کیں ہیں وہ یا روایات ضعیفہ و موضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ و مؤولہ یا بعض آیات و احادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بدفہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے اگر خدا کی توفیق سے مفصل تفسیر کا موقع ملا اس میں مفصل کلام کیا جائے گا اختصار کی وجہ سے یہاں گنجائش نہیں ہے رہا عصاۃ مؤحدین کا مسئلہ یعنی جو مسئلہ گناہوں کی بدولت دوزخ میں ڈالے جائیں گے العیاذ باللہ ان کے متعلق احادیث صحیحہ نے ہم کو اللہ سبحانہ کی مشیت پر مطلع کردیا ہے کہ لیکن ضرور ان کو نکال کر جنت میں پہنچائیں گے شاید اسی لیے جنتیوں کے ذکر میں عطاء غیر مجذوذ اور اشقیاء کے ذکر میں ان ربک فعال لما یرید ارشاد ہوا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ بعض اشقیاء دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر سعید کوئی جنت سے نہیں خارج کیا جائے گا۔[1]

جو لوگ اللہ سبحانہ کی رحمت عمومی کے قائل ہیں ان کا اس آیت سے استدلال یوں ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اپنی مشیت کو اپنی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو لفظ رب سے تعبیر کیا ہے جس سے اشارا ملتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہو جانا تقاضائے ربوبیت ہے۔

ان دونوں آیتوں یعنی فاما الذین شقوا اور واما الذین سعدوا میں اہل جنت اور اہل دوزخ کے لیے خلود کی تعبیر آئی ہے پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثناء،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرمایا۔ مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جو چاہے کر ڈالتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم کر دے لیکن اہل جنت کے ذکر میں بتصریح فرمایا ہے مگر جو چاہے رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف وغیرہ نے کہا ہے مثلاً ابن زیدؒ اور شعبیؒ کہ اللہ سبحانہ نے اہل جنت کے بارے میں تو اپنی مشیت ظاہر کر دی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن دوزخ والوں کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے پوشیدہ رکھا۔ یہ اس آیت کے بارے میں ان بزرگوں کا خیال ہے جو اللہ سبحانہ کی رحمت عمومی کے معتقد ہیں جمہور کا مسلک وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلامؒ نے اپنے افادات میں فرمادی ہے کہ جنت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوئے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔ رحمت عمومی کے معتقدین اس آیت سے جو معنے نکالتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں ہیں وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے ہیں۔

(۱۲۰) اہل جنت کی ارتقائی منزل

اور با نصیب و سعادت لوگ جنت میں ہوں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔ سدا اسی میں رہیں گے مگر اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے یہ دین اور عطا ایسی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے الا ماشاء ربك میں ارشاد کر دیا کہ اللہ سبحانہ کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے۔ کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے نیز یہ بتلا دیا کہ جزا و سزا دینا اس کے اختیار و مشیت کے تابع ہے آریہ سماج وغیرہ کے عقیدے کے موافق وہ اس پر مجبور نہیں[1] یعنی اللہ سبحانہ کی مشیت کے سوا اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی۔ اکلها دائم وظلها۔ اور فاكهة كثيرة لا مقطوعة ولا ممنوعة۔ فلهم أجر غير ممنون۔ فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ایک یہ کہ راحت ومسرت کے اسباب ختم ہوجائیں اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ پہلی صورت کی نفی تو ان آیات میں کردی گئی دوسری صورت تو گو خالدین فیھا کہہ کر زیر تشریح آیت میں کی گئی ہے مگر ایک جگہ صراحتاً لایذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ کہہ دیا ہے کہ اس کے احاطہ میں موت کا گزر نہ ہوگا لیکن تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی بھی قائم ہوں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائمی ہو مگر کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔ لایمسھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین یعنی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے نہیں نکال سکے گا۔اور عطاء غیر مجذوذ میں اس طرف اشارہ ہورہا ہے یہ بھی ممکن ہے۔ کہ خود جنتی جنت سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا ان کی طبعی افتاد ایسی ہوگی کہ وہ خود ہی جنت سے نکلنا پسند نہ کریں گے خالدین فیھا لایبغون عنھا حولا۔ نیز آیت میں الا ما شاء ربك سے یہ بھی اشارۃ معلوم ہورہا ہے کہ جنتیوں کے احوال ومراتب میں بھی ارتقاء ہوگا لیکن یہ ارتقائی منزلیں خوب سے خوب تر کی طرف ہوں گی۔

(۱۳۱) مشرکین کو سرکشی کے نتیجے سے دوچار ہونا ہے

لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ ان کے معبودوں کی جانب سے کسی شبہ میں نہ رہیں جن کی یہ لوگ عبادت کررہے ہیں۔ان معبودوں سے ان کے عابدانہ تعلقات اپنے پہلے باپ دادوں کے عمل کی کاپی ہیں ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا دیں گے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ یعنی اتنی مخلوق کا شرک وبت پرستی کے راستہ پر پڑنا اور اب تک سزایاب نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دھوکہ کھا کر آدمی شبہ میں پڑجائے یہ لوگ اپنے باپ دادا کی کورانہ تقلید کررہے ہیں وہ جھوٹے معبود ان کے کیا کام آئے جو ان کے کام آئیں گے۔ یقیناً ان سب کو آخرت میں عذاب کا پورا حصہ ملے گا جس میں کوئی کمی نہ ہوگی یا کبھی کم نہ کیا جائے گا گویا لفظ غیر منقوص یہاں عطاء غیر مجذوذ کے مقابل ہوا بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں رزق وغیرہ کا جو حصہ مقدر ہے وہ پورا ملے گا پھر شرک کی سزا پوری بھگتیں گے[1] مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے شرک پر جماؤ سے تمہیں کہیں یہ غلط فہمی نہ لاحق ہو کہ ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل موجود ہے بس جس طرح ان کے باپ دادا لیے بھے بوجھے ان پتھروں اور خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے آئے اسی طرح اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ ان کو پوج رہے ہیں اور دلیل سے کام لینے کی زحمت نہ انہوں نے اٹھائی نہ یہ اٹھانا چاہتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں تھے بلکہ دراصل یہ باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جارہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی معقول آدمی کو اس شک میں نہ رہنا چاہیئے کہ یہ لوگ جو ان معبودوں کی پرستش کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں تو آخر کچھ تو انہوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی اُمیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں کسی علم کسی تجربے اور کسی حقیقی مشاہدے کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ اندھی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی موجود تھے مگر جب اللہ سبحانہ کا عذاب آیا تو وہ تباہ ہوگئیں اور یہ آستانے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے اور آپ کے مخاطبوں کو دھمکی ہے یعنی آپ اس خیال میں نہ رہیں کہ مشرکین عرب کیوں شرک سے باز نہیں آتے اور کیوں انہیں مہلت مل رہی ہے جواب میں فرمایا وہ تو اسی راہ پر چل رہے ہیں جن پر ان کے باپ دادے چلے اور انہیں ان کی سرکشیوں کا نتیجہ پورا پورا ملنے والا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ
لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ
شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ
اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور بلاشبہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی ہے پھر اس میں اختلاف کیا گیا اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ایک بات طے شدہ نہ ہوتی تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور یہی لوگ اس کتاب کے بارے میں بھی خلجان میں ڈالنے والے شک کا شکار ہو رہے ہیں[۱۴۳] اور بلاشبہ سب ہی کو تیرا رب ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا یقیناً وہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے[۱۴۴]

نتائج عمل کے قانون کی یکسانی

پہلی آیت میں انا لموفوھم نصیبھم اور اس آیت میں وانّ کلا لما لیوفینھم ربک اعمالھم ان دو فقروں کی یکسانی پر غور کرو۔ ان دو فقروں میں کس قدر بلیغ انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزاء عمل کے موضوع پر کہا جا سکتا ہے اور اس سے قرآن کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے نبوت کو نہیں مانا اور اس لیے نبوت کی دعوت کو نہیں اپنایا اور جنہوں نے مان لیا

اور مان لینے کے بعد ان میں اختلاف کا شکار ہو گئے نتائج میں دونوں کے لیے ہم آہنگی ہے۔ نسب اور نسبت سے اعمال کے نتائج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قانون کی نظر اعمال پر ہوتی ہے۔ خواہ ماننے والے یا نہ ماننے والے ہوں۔ اگر ماننے کے بعد بدعملیوں کا رُخ کریں گے تو اللہ کا قانون مجازات بھی پاداش و عقوبت کی طرف لوٹے گا۔ عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں نتیجہ عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا اس کا سایہ ساتھ آگیا۔ جنہوں نے اچھے اعمال کیے نتائج بھی اچھے رہے اور جنہوں نے بُرے اعمال اپنائے بُرے نتائج کے قدم بھی ان کی طرف اٹھ گئے قانون کی نظر اعمال اور صرف اعمال پر ہوتی ہے۔ خواہ کوئی ہو۔

انسان کا پہلا دار الجزار دنیا ہے اگرچہ اس کے ہر نیک و بد کام کی پوری جزار تو آخرت میں ملے گی۔ لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو اپنے اعمال کے نتائج سے ہمدوش ہونا پڑتا ہے۔ انسان کی عزت، شہرت ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان سرور، فارغ البالی، حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں۔ ان کے برخلاف ذلت و رسوائی بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی بے اطمینانی، غم خوف، محکومیت اس کے اعمال بد کے اثرات ہیں قرآن نے ایمان و عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا میں کامیابی اور آخرت کی کامیابی بھی۔ زمین کی حکومت بھی، اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کا باغ و بہار بھی۔

فاتاهم الله ثواب الدنيا وحسن ثواب الاخرة

بس اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی

لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے آخرت کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے اسی طرح اس دنیا میں ہونے والے اعمال کے نتائج سے آخرت میں ہونے والے اعمال کے نتائج کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے۔

للذين احسنوا فى هذه الدنيا حسنة ولدار الآخرة خير

(۱۱۰) اور بلاشبہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی ہے پھر اس میں اختلاف کیا گیا۔ اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ایک بات طے شدہ نہ ہوتی۔ تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور بلاشبہ یہ لوگ بھی اس کتاب کے بارے میں خلجان میں ڈالنے والے شک کا شکار ہو رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ کسی نے قبول کیا اور کسی نے نہ کیا۔ جس طرح آج قرآن حکیم کے متعلق بھی اختلاف ہو رہا ہے۔ بے شک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف و تفریق نہ پیدا ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے

کے بعد تمام مکذبین کا استیصال کردیتا اور سارا جھگڑا ایک دم چکا دیتا مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی۔ ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے۔ آیا خالق و مخلوق کا ٹھیک ٹھاک حق پہچان کر اللہ سبحانہٗ کی رحمت و کرامت کا مستحق ہوتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی راہنمائی کو خیرباد کہہ کر اپنے کو غضب و سخط کا مظہر ٹھہراتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نیکی یا بدی کے اختیار کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں خیر و شر اور نیکی و بدی کی باہمی آویزش جاری رہے بعدہٗ مرحوم و مغضوب علیحدہ کئے جائیں۔ تاکہ الا من رحم ربک کے ساتھ لاملئن جہنم من الجنۃ والناس اجمعین والی بات بھی پوری ہو غالباً یہی وہ کلمہ ہے جو اگر نہ فرما چکا ہوتا تو سب اختلافات کا ایک دم خاتمہ کر دیا جاتا۔ عام لوگ ان حکمتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ آئندہ بھی ان اختلافات کا فیصلہ ہوگا یا نہیں [1]

اصل موضوع تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جس طرح آپ کی قوم کے لوگ آپ کے اس کتاب کے پیش کرنے پر آپ سے اختلاف کر رہے ہیں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے افراد نے بھی تورات کے معاملے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قدم قدم پر اختلاف اور جھگڑا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس صورت حال سے آپ کو سابقہ پڑ رہا ہے اسی صورت حال سے آپ سے پہلے نبیوں کو بھی سابقہ پیش آیا ہے انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے اور اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کردیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو۔ ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دی جائے وہ اگر اُونچا ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اُونچا ہو سکے۔ پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے۔ اسی تنوعِ استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے مختلف گوشوں میں مختلف حالتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک فرد اور جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی سمجھ دوسری طرف گئی۔ ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اسی سے انکار کیا کہ حق نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے پھر اسی اختلاف فکر وعمل نے ہدایت و سعادت اور شقاوت وضلالت کی وہ کشمکش پیدا کردی جسے قرآن آزمائش حیات سے تعبیر کرتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا ۔ حاصل اس کا یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو کوئی خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان اور ابتلا کی زندگی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسان کی فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے ۔ فی الواقع اسی اقتضا کے صحیح استعمال کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی امتحان کی زندگی ہے مطلب یہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں سب کے سامنے سعادت و شقاوت کی راہیں کھول دی گئیں جس کا عمل جیسا ہوگا ویسے ہی نتائج رونما ہوں گے اور ان نتائج میں نہ آپ کے مخاطبوں میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے جو نبوت کو مان کر بدعملیوں کی راہ پڑ گئے ۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتا دیا کہ اہل ضلالت وشقاوت کو دنیا میں پنپنے کا موقعہ کیوں دیا جاتا ہے فرمایا ایسا بھی کر دیا جاتا اگر اللہ سبحانہٗ کا یہ قانون یہ نہ ہوتا کہ برائی ہو یا اچھائی انسان کے ارادہ و اختیار کے سائے میں اس کو پروان چڑھنے کا موقعہ دیا جائے تا آنکہ وہ اپنے بقا کی مقررہ مدت تک پہنچ جائے ۔ عالم طبعی کی طرح عالم معنی میں بھی قانون ہے ۔ یہاں بھی قضا و قدر ہے ۔ جس طرح مادیات میں چھانٹی ہوتی رہتی ہے جو چیز نافع ہوتی ہے باقی رہتی ہے اور جو نافع نہیں ہوتی وہ محو ہو جاتی ہے ایسا ہی قانون معنویات میں بھی جاری ہے جو عمل حق ہوتا ہے قائم اور ثابت رہتا ہے جو باطل ہے ۔ وہ مٹ جاتا ہے اور جب کبھی حق و باطل میں مقابلہ ہوتا ہے تو بقا حق کے لیے ہوتا ہے نہ کہ باطل کے لیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے نہیں بلکہ جیسے مادیت تدریج و امہال کا قانون نافذ ہے ایسے ہی معنویات میں بھی تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے اور اس لیے جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح عالم معنے میں اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے ۔ اسی صورت حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہوگی اور حق و باطل کے نتائج کے ظہور کے لیے تاجیل ضروری ہوگیا اسی تاجیل کا نام کلمہ رب ہے یہاں تو جملہ بلا قید ہے ۔ ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم ۔ لیکن سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۴ میں الی اجل مسمیٰ کا اضافہ ہے پوری آیت یہ ہے ولولا کلمۃ سبقت من ربک الی اجل مسمیٰ لقضی بینھم ۔ معلوم ہوا کہ کلمہ سے مراد اللہ سبحانہٗ کا قانون تاجیل ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اعمال میں بھی مادیات کی طرح قانون تاجیل نہ ہوتا تو ان کا کام تمام کر دیا جاتا یعنی اللہ سبحانہٗ نے

ہر چیز کے لیے پہلے سے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے اس وجہ سے ہر کام اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگا آپ کی قوم کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے جب وہ مدت پوری ہوگی ان کا بھی فیصلہ کر دیا جائیگا ۔ انھم لفی شك مريب یعنی یہ لوگ آپ کی دعوت کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں ۔ شک بھی ایسا کہ جس نے آپ کو الجھن میں ڈال دیا ہے ۔ مریب اراب یریب ارابۃ اسم فاعل ہے اس کے معنے الجھن میں ڈالنے والے کے ہیں ۔ یہاں اس صفت کے لانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ انکار کا جو انداز انھوں نے اپنایا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور آپ جو کچھ پیش فرما رہے ہیں اس کی قوت واضح ہے لیکن وہ اسے ماننا نہیں چاہتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفادات خطرے میں پڑتے ہیں اس وجہ سے وہ سخت خلجان میں ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں ۔

(۱۴۳) بلا استثنار سب کو اعمال کی جزار

اور بلاشبہ سب ہی کو تیرا رب ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا یقیناً وہ ان کے عمل سے پوری طرح باخبر ہے یعنی ابھی وقت نہیں کہ ہر ایک کے عمل کا پورا بھگتان کیا جائے لیکن جب وقت آئے گا تو یقیناً ذرہ ذرہ کا حساب کر دیا جائے گا تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھو کہ اسے تمہارے اعمال کی خبر نہیں ہے[1] آیت میں لمّا آیا ہے اس میں لام تاکید اور قسم کا ہے اور ما زائد بھی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہ ما کبھی کبھی محض کے انداز کو ٹھیک کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً ان كل ذالك لما متاع الحياة الدنيا ۔ بلاشبہ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے ۔ سورہ طارق میں ہے ۔ ان كل نفس لمّا عليها حافظ ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے ۔ سورہ یٰس میں ہے ۔ وان كل لمّا جميع لدينا محضرون ۔ بے شک سب ہی کو ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے ۔ لفظ کل عام ہے ۔ گزشتہ قومیں ہوں یا موجودہ قریش مکہ اور یہود ہوں ۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ہو آپ کے مخاطب ہوں یا آپ سے پہلے انبیاء کے مخاطب ہوں سب کے اعمال کے نتائج رونما ہو کر رہیں گے اور سب کو اعمال کی جزار نتائج کے مطابق ضرور مل کر رہے گی اور پوری پوری مل کر رہے گی ۔ ان کو ملی ہے اِن کو بھی ملے گی ۔ ہر بات کے لیے اللہ کے قوانین مقرر ہیں ۔ قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت ہدایت و ضلالت اور موت و حیات کا بھی ایک قانون ہے اور جیسے اللہ سبحانہٗ کے سارے قوانین میں یکسانی ہے عالمگیری ہے اور غیر مبدل ہیں ۔ یہ قانون ہمیشہ ایک طرح

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام ونتائج ظاہر ہوئے زبانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوسکتی ہے لہذا جو کچھ جزا عمل کا قانون ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اسی قانون کا نام قرآن میں سنۃ اللہ ہے۔ قرآن میں سنۃ اللہ کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے خیر و شر حق و باطل نور و ظلمت اور ظلم وانصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ سبحانہ خیر کو شر پر حق کو باطل پر نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح وکامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتی ہیں اور پند و موعظت ان کے لیے مؤثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک وبرباد ہو جاتی ہیں یہی اعمال کے نتائج اور ان کی جزا ہے یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اس میں کبھی کوئی فرق نہ ہوگا۔ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ قرآن کی یہ بات فی الواقع انسانی طبیعت کا وجدانی کمال ہے کیونکہ انسانی ذہن حوادث سے بالطبع متأثر ہوتا ہے اور اس کا اندرونی احساس پکارتا ہے۔ کہ یہاں ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں ہے خواص و نتائج دائمی ہیں یعنی جو بات ایک بار ظہور میں آئے گی ہمیشہ ظہور میں آئے گی اور جس چیز کا خاصہ ایک مرتبہ ظاہر ہوا وہی ہمیشہ ظہور میں آئے گا۔ طبیعت انسانی کا یہی وجدانی تأثر ہے جس نے ہمارے ذہن میں استقرار کا اعتقاد پیدا کیا یعنی جزئیات کا تجربہ کرنا اور اس کے ذریعہ سے کلیات تک پہنچنا اب ہمارے تمام علوم و معارف کا سنگ بنیاد یہی ہے۔

قرآن نے لیوفینھم ربک اعمالھم۔ تیرا رب ضرور ان کے اعمال کی جزا دے گا کے ذریعے بتا رہا ہے کہ نتائج کا تسلسل ایک حقیقت ہے اور اعمال انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل نہیں ہوسکتی یہی بات ہے کہ قرآن بتاتا ہے۔ کہ تم سے پہلے بھی بے شمار قومیں ہوئی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں، قوتیں اور شوکتیں تھیں، سربفلک عمارتیں تھیں، فکر وعمل کی سرگرمیاں تھیں ان کے اعمال کے نتائج کے مطابق ان کو جزا ملی ہے آئندہ بھی لوگوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی بلا استثناء سب کو ملیگی خواہ نبی کو نہ ملتے ہوں جیسے قریش اور خواہ نبی کو مان کر اس کی دعوت سے ہٹ گئے ہوں سب برابر ہیں یہاں جزا اعمال کی ملتی ہے اور پوری پوری ملتی ہے۔ نسب اور نسبت پر جزا کا مدار نہیں ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا
اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ اور وہ جو راہِ کفر سے توبہ کر کے آپ کے ہمنوا ہوئے ہیں جیسا حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہو اور حد سے نہ بڑھو یقین کرو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے[۱۳۴] اور دیکھو ظلم کار لوگوں کی طرف نہ جھکنا اس کے نتیجے میں تمہیں بھی آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز نہ ہوگا پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی[۱۳۵]

مفردات کے معانی

لا تطغوا یہ طغیٰ مضارع مجزوم ہے طغیان اور طغی مصدر ہے اس کے معنی حد سے نکل جانا، سرکشی کرنا، سر اٹھانا، جب نگاہ اپنی حد سے گزر جاتی ہے تو بہکنے لگتی ہے۔ مازاغ البصر وما طغیٰ۔ اسی طرح جب پانی اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو طغیانی آجاتی ہے۔ انا لما طغی الماء حملنٰکم فی الجاریۃ۔ اور انسان اپنی بدعملیوں، بداخلاقیوں اور فکری آوارگی میں حد سے گزر جاتا

ہے تو یہ اعمال کی طغیانی ہے ۔ اذھب الی فرعون انہ طغیٰ ۔ اسی لیے معصیت میں جھوٹ اور حد سے گزرنے والے کو طاغوت کہتے ہیں ۔

لاترکنوا یہ بھی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے مضارع مجزوم بلائے نہی کارکن یرکن سے اس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں ۔

سورت کی موعظت کا خلاصہ

اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اہل ایمان کو دعوت دین کی کامیابی کے لیے راہنما اصول بتائے ہیں اور ان کو لفظ استقامت سے تعبیر کیا ہے استقامت کے لفظی معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلنے کے ہیں ۔ قرطبیؒ لکھتے ہیں ۔

استقامۃ نام ہے دائیں بائیں سے ہٹ کر سیدھا چلنا اور بس اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو ۔ مشکلیں پیش آئیں ۔ مخالفتیں ہوں ۔ ستایا جائے ہر خطرے کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستے پر ثابت قدمی سے چلا جائے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے ۔

انما الٰھکم الٰہ واحد فاستقیموا الیہ واستغفروہ

تمہارا معبود ایک ہی ہے لہذا اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے معافی مانگو ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو اس سے کسی حال میں اِدھر اُدھر نہ ہو ۔ سیدھے اسی کی طرف چلے چلو ۔

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ۔ ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق صلعم کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہو رہی ہے ۔ اس موضوع پر رسول اللہ صلعم کی وساطت سے مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے اس لفظ استقامت کے ذریعے بتایا گیا کہ یہ راستہ خطرناک ہے کامیابی کی شرط یہ ہے کہ مشکلات و مصیبتوں میں اضطراب نہ ہو ۔ راہِ حق میں جو مشکلات پیش آئیں ، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن و تشنیع کریں ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ ۔ درگذر کرتے جاؤ اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اپنے آپ پر قابو رکھو اور ضبط سے کام لو ۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کی بجا آوری کرو ۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے استقامت کی ترکیب ہوتی ہے اور یہی وہ عظیم راہنما اصول ہے جس کے ذریعے مقاصد پروان چڑھتے ہیں ۔ استقامت فتح مشکلات کی چابی ہے ۔ صحیح مسلم میں ہے ۔ سفیان بن عبداللہ الثقفیؓ کہتے

ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجھے ایسی کوئی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد میں کسی سے نہ پوچھوں فرمایا قل امنت باللہ ثم استقم۔ یعنی ایمان لانے کے بعد ایمان میں استقامت کا مظاہرہ کرو۔

(۱۳۴) لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ اور وہ جو راہِ کفر سے توبہ کر کے آپ کے ہمنوا ہوئے ہیں جیسا حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہو اور حد سے نہ بڑھو یقین کرو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے آپ ان مشرکین کے جھنجھٹ میں نہ پڑیئے آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے کفر سے توبہ کر کے آپ کی معیت اختیار کی ہے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا ہے۔ احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہیئے۔ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، دعوت و تبلیغ وغیرہ ہر چیز میں افراط و تفریط ہے۔ علیحدہ ہو کر توسط و استقامت کی راہ پر سیدھے چلو۔ کسی معاملہ میں افراط و تفریط اختیار کر کے حد سے نہ نکلو اور یقین کرو کہ اللہ سبحانہٗ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے [1] خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اُنکے ان ساتھیوں کو جو ابتدائے عہد کی بے سروسامانیوں اور مظلومیتوں میں ایمان لائے تھے مخاطب کیا ہے اور حسب ذیل امور کی تلقین کی ہے۔ یہ ان کے لیے اس سورت کی موعظت کا خلاصہ ہے جو راہ بتلائی گئی ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور اپنا کام کیئے جاؤ اپنی حد سے تجاوز نہ کرو یعنی استقامت کار کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اپنے مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے کا خیال کرنے لگو یا لڑنے جھگڑنے لگو اپنے دائرے کے اندر رہو مگر اپنے طریقے پر قائم رہو۔

اس آیت کی پیشانی پر فا آئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فا نتیجہ ہے مطلب یہ ہے کہ چونکہ ان تاریخی واقعات میں آپ سے پہلے تمام نبیوں نے اپنی اپنی قوموں میں جم کر اور ڈٹ کر کام کیا ہے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس کام میں استقامت کا دامن تھامنا چاہیئے یہ بات کہ استقامت کا مظاہرہ کس بات میں ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا متعلق پورا دین ہے اور دین کی وہ اصلی بنیاد جو سارے نبیوں کا اشتراکی سرمایہ ہے توحید عبادت ہے یہ سب نبیوں کی دعوت کی بنیادی اینٹ ہے اس اینٹ کے ہل جانے کے بعد دین کی پوری عمارت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تاریخی حقائق میں سب سے زیادہ اہمیت جس بات کو دی گئی ہے وہ صرف اور صرف اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ اس معاملے میں نوح علیہ السلام جیسی استقامت ہو کر پورے ۹۵۰ سال اسی کی دعوت دیتے رہے اور سخت سے سخت حالات میں بھی اس پکار سے ایک لمحہ کے لیے بھی دستبردار نہ ہوئے یہاں تک کہ بیٹا بھی اس راہ میں چھوڑ دیا یہ پہاڑ جیسی استقامت ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

توحید کی دعوت دن رات قوم کو دیتے رہے۔ دعوت قومی لیلا و نھارا ۔ قوم نے حضرت نوح کی آواز سننی گوارا نہیں کی۔ کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ جعلوا اصابعھم فی اذانھم حضرت نوح علیہ السلام کا چہرہ دیکھنا گوارا نہیں کیا اور منہ پر پلہ لے لیا واستغشوا ثیابھم اور کسی طرح اپنے طریقہ سے قوم نے ہٹنا پسند نہیں کیا واصروا اور قوم کے غرور نے اجازت نہیں دی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات پر غور کریں واستکبروا ان حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں استقامت کا حال یہ ہے کہ فرداً دعوت دے رہے ہیں مجالس میں اور مجامع میں پکار رہے ہیں۔ خلوت اور جلوت میں للکار رہے ہیں اور ایک دن، ایک ہفتہ، ایک ماہ اور ایک سال نہیں بلکہ پورے ۹۵۰ سال جم کر اور ڈٹ کر صرف شہری زندگی میں عوام ہی میں نہیں بلکہ ارباب اقتدار کے ایوانوں میں للکارتے رہے ہیں۔ ان لاتعبدوا الا اللہ ۔ یہ ہے دین کی دعوت میں استقامت ان ہی تاریخی واقعات میں حضرت ہود علیہ السلام کی شخصیت آتی ہے حضرت ہود علیہ السلام نے عام شہری کو مخاطب کیا اور بہت بڑی متمدن متمول اور طاقتور قوم کو بھی توحید عبادت کی دعوت دی۔ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ۔ ٹھاکروں نے اپنے وہمی معبودوں کی مار کی دھمکی دی لیکن حضرت ہود علیہ السلام کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہیں آئی وہ لگاتار دعوت ہی دیتے رہے اور یہی کہتے رہے۔ اعبدوا اللہ۔

حضرت ہود علیہ السلام کے بعد قرآن نے حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ یہ قوم ثمود میں گئے ہیں پوری قوم مادیت میں غرق تھی۔ فن تعمیر میں ان کو کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا پتھروں کی عمارتیں اور مقبرے تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے سامنے توحید عبادت پیش کی [illegible] خوب زور سے پیش کی اور قوم [illegible] ارباب اقتدار کی ساری دھمکیوں سے ان کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہ آئی۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی ایک بگڑی ہوئی اُمت ہے اور خبیثانہ عمل کی گرویدہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو کن کن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور قوم نے کس کس انداز سے ان کو تکلیفیں دیں مگر دعوت کے میدان میں حضرت لوط علیہ السلام نے جس استقامت کا مظاہرہ کیا وہ کوئی راز نہیں ہے۔ آخر میں حضرت شعیب علیہ السلام ہیں انہوں نے قوم کو دعوت توحید کے ساتھ مالیاتی مسائل کی طرف توجہ دلائی لوٹ مار، ڈکیتی سے روکا۔ قوم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا ذکر قرآن میں ہے مگر حالات کی ساری سنگینی کے باوجود ان کی استقامت میں کبھی بھی رخنہ نہیں آیا ہے۔ یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ ان کا مخاطب خود اپنے کو لوگوں کے سامنے بطور الٰہ پیش کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کٹھن حالات میں اس کا زندگی کے ہر موڑ پر مقابلہ

کیا اور پوری استقامت سے کیا۔ آپ ان کو تاریخی واقعات کہتے ہیں لیکن قرآن ان کو صرف تاریخی واقعات نہیں بلکہ وہ حقائق اور دلائل ثابت کرتا ہے جن کی روشنی میں ایک داعی کو دعوت کا کام کرنا چاہیئے اسی وجہ سے فا تفریعیہ لا کر فرمایا ہے فاستقم کما امرت یہاں صرف استقم ہے لیکن سورہ شوریٰ میں دعوت کی تصریح ہے۔ فلذالك فادع واستقم۔ بس اسی سے دعوت کا کام کیجئے اور استقامت کا مظاہرہ کیجئے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھئے۔ پوری لگن پورے دھیان اور پورے جوش سے لگاتار کام کرتے جائیے۔ ان دونوں مقامات میں یہ بات کھول کر نہیں بتائی ہے کہ استقامت کس بات میں ہو۔ کیونکہ حقائق و دلائل سے یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے۔ لیکن سورہ سجدہ میں یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

یوحیٰ الیّ انّما الٰھکم الٰہ واحد فاستقیموا الیہ

میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے لہٰذا تم سیدھے اس کی طرف ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ استقامت کے لیے اصلی اور بنیادی چیز توحید عبادت ہے اس میں اِدھر اُدھر نہ دیکھو یہی اسلام کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے اور یہی بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ توحید کی جو راہ آپ کو بتلا دی گئی ہے اس پر جمے رہو اور خوب جم کر لوگوں کو اس کی دعوت دو۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت انسان کی تکمیل ذات کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کے بقاء وجود کے لیے عناصر کا ہونا ضروری ہے اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا تصور اپنے متضمنات رکھتا ہے جو اُس سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ الوہیت کا ہر تصور اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا اعتقاد بے معنی ہے اگر اس کی خوشنودی، ناخوشی، اس کی رحمت اور اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں، جس خدا کی پسند و ناپسندیدگی، جس کی خوشنودی و ناخوشی کا کوئی اصول معیار نہ ہو، جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے اعمال سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سا اس کے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجاء کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رگانہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا اعتقاد خیر و شر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے اگر استقامت کی ماہیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ استقامت نام ہے یمین و یسار سے بے نیاز ہو کر ناک کی سیدھ میں کام کرنے کا۔ استقامت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اگر اس میں یمین و یسار ہو۔ استقامت کا یمین و یسار استقامت نہیں زیغ ہے۔ یہاں سمجھنے کی ایک اور بات ہے وہ یہ کہ آیت میں کَمَا اُمِرْتَ کا مقصود کیا

ہے جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے تو کچھ لوگوں کی طرف یہاں اس نکتہ کی نسبت کی ہے کہ مقصد
یہ ہے کہ ایسی استقامت دکھاؤ جس قسم کی استقامت کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن میں ایسی
کوئی آیت نہیں ہے سوائے ایک آیت کے جو سورہ شوریٰ میں ہے وہاں بھی تعبیر یہی ہے کہ واستقم کما
سورت اس لیے انہوں نے قرآن سے باہر وحی کا سہارا لیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں
استقامت کا جو حکم دیا ہے وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ آپ کے ساتھ اہل ایمان کو بھی ہے اور
قرآن میں دونوں کو استقامت کا حکم سورہ حٰم السجدہ میں ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام
لانے سے پہلے نازل ہوئی ہے اس میں

يوحىٰ الىّ انما الٰهكم اله واحد فاستقيموا اليه

یہی وہ حکم ہے جسے شوریٰ اور ہود میں کما امرت سے تعبیر کیا ہے اور اسی سورت میں اہل استقامت
کی تعریف کی ہے ۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا

بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر اس پر استقامت دکھائی
یعنی ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اسی پر قائم رہے اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ
اختیار نہیں کیا نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں عقیدہ توحید
عبادت کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے توحید عبادت پر استقامت کی تشریح خود صحابہ سے منقول ہے حضرت
ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی عبادت میں کبھی شریک نہیں کیا اللہ کے سوا کسی کے الٰہ ہونے
کا ان کو کبھی خیال نہیں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا خدا کی قسم
استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ لومڑیوں کی طرح
ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔ شاید اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے دوسروں کی بات لکھ کر
اپنا یہ فیصلہ لکھا ہے کہ ارشاد گرامی کا مقصود یہ ہے کہ استقامت پر دوام اور ہمیشگی فرمائیے۔ کیونکہ سیدھی
راہ سے چمٹ جانے کا نام استقامت ہے اور لکھا ہے کہ لفظ استقامت میں بہت بڑی جامعیت ہے
اس میں علم، عمل، افکار، اعمال اور اخلاق غرض سب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ شارحین قرآن نے یہاں
طویل مباحث سپرد قرطاس کیے ہیں ۔

آگے ارشاد ہوا ہے ولا تطغوا حد سے نہ بڑھو یعنی اللہ سبحانہ کے اوامر کی مخالفت کی جرأت نہ کرنا،
اہل ایمان کو یہاں اللہ کے احکام کی مخالفت سے ایسا ہی روکا ہے جیسا بنی اسرائیل کو کہا گیا ہے ۔

كلوا من طيبات ما رزقنكم ولا تطغوا فيه فيحل عليكم غضبي .

جو کچھ ہم نے تمہیں اچھی چیزیں دی ہیں ان کو استعمال کرو اور اس میں احکام کی مخالفت کی جرأت نہ کرو ۔

مطلب یہ ہے کہ حالات سے مرعوب ہوکر یا ترغیبات سے متاثر ہوکر ذرا اس راہ سے کج نہ ہونا۔ طغیان ہیں سب صورتیں داخل ہیں ۔ سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں ہوجانا اور سیدھی راہ سے آگے ہوجانا یا پیچھے رہ جانا۔ جن کی نگاہ میں استقامت میں یمین و یسار کی طرف ہونا طغیان ہے ۔ انہوں نے اسے کجی کے معنے میں لیا ۔ اس کجی کے پیٹ سے اختلاف جنم لیتا ہے ۔ اسی لیے کچھ بزرگوں نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے آیت کا مدلول یہ بتایا ہے کہ اتبع ولا تبتدع دین کی زندگی میں اتباع کو اپناؤ ابتداع سے بچ کر رہو اور جن کی نگاہ آگے ہونے پر گئی انہوں نے اس کے معنے ظلم وجبر کے کیے اور بتایا کہ کسی پر زیادتی نہ کرو یعنی استقامت کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے لگو ۔ بہرحال یہ آیت اس حیثیت سے اپنے اندر شان جامعیت رکھتی ہے ایک طرف اس میں اگر پوری زندگی میں اسلام پر جمنے اور ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا حکم ہو رہا ہے تو دوسری طرف مصادر فساد سے دور رہنے کی ہدایت ہو رہی ہے ۔ آخر میں فرمایا انه بما تعملون بصير اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ نتائج کا فیصلہ دعوؤں ، نعروں ، تمناؤں ، آرزوؤں ، نسبتوں اور نسبوں سے نہیں ہوگا بلکہ اعمال سے ہوگا جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج ہوں گے ۔ یہ جملہ استیناف بیانی بھی ہے اور ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دین کی زندگی میں علانیہ اور جلوت میں پارسائی اور دینداری کا لبادہ پہن لیں مگر خلوت میں دیندار نہ ہوں ۔ فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال پر ہے تمہاری صورتوں پر نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرو گے سب کچھ دیکھ رہا ہے وہ مشکلات میں تمہاری راہنمائی فرمائے گا اور جب مدد کے محتاج ہوگے تو تمہاری مدد کرے گا ۔

یہاں اس فقرے کے ذریعے سے اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال انسانی میں خواص و نتائج کا تسلسل و برابر ایک حقیقت ہے ۔ ان ہی کے ذریعے سعادت اور شقاوت اور حیات و ممات کا فیصلہ ہوتا ہے اور جیسے عالم طبیعت میں اللہ کے قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں ایسے ہی عالم انسانی میں اللہ کے قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے ۔

(۱۳۵) ظالموں کی طرف جھکاؤ بھی نہ ہو

اور دیکھو ظلم کار لوگوں کی طرف تمہارا جھکاؤ نہ ہو اس کے نتیجے میں تمہیں بھی آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز نہیں ہے پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی پہلے لا تطغوا میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم حد سے نکلنے والے ہیں ان کی طرف تمہارا میلان بھی نہ ہو انکی موالات، مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو۔ مبادا آگ کی لپیٹ تم کو لگ جائے پھر نہ اللہ سبحانہٗ کے سوا تمہیں کوئی مددگار ملے گا اور نہ اللہ کی جانب سے کوئی مدد پہنچے گی[۱] یعنی مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے کا خیال نہ کرو لیکن یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ظالموں کی طرف جھک جاؤ اور نتیجہ یہ نکلے کہ ان کی گمراہی کی چھینٹیں تم پر بھی پڑ جائیں نہ تو بتائی ہوئی حد سے آگے اور ادھر ادھر ہونا چاہیئے اور نہ ظالموں کی طرف جھکنا چاہیئے۔ یہ اہل ایمان کو تنبیہ ہے کہ خوف یا طمع کسی چیز سے متاثر ہو کر ان کی طرف مائل نہ ہونا چاہیئے جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ قرآن میں الذین ظلموا مطلق آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے دامن ظلم سے داغدار ہوں خواہ کوئی ہوں۔ اس ممانعت میں سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سے مداہنت کرنا قدرت کے باوجود ظلم کو تبدیل کرنے کے لیے تیاری نہ کرنا۔ ان سے ربط و ضبط رکھنا۔ مدار ممانعت ظلم ہے ظلم کار لوگوں کا طرف دار ہونے کا نہیں بلکہ ان کی طرف ذرا سا میلان ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ظلم کی پاداش میں جو آگ ان کی طرف آئے گی اس کی لپیٹ میں تم بھی آجاؤ گے پھر تمہیں نہ کوئی بچانے والا ہوگا اور نہ اللہ کی جانب سے تمہاری کوئی مدد ہوگی۔

ظالموں سے کون لوگ مراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں ہر ظالم داخل ہے خواہ مشرک ہو یا مسلم ہو۔ ظلم خواہ خالق کا حق مار کر کیا جائے یا مخلوق کا مطلب یہ ہے کہ با انصاف لوگوں کو چھوڑ کر ظلم پیشہ اور ظلم کار لوگوں سے ربط و ضبط اور تعلقات نہ رکھو، ظالموں کے ظلم کی حمایت نہ کرو نہ کردار سے نہ گفتار سے اور نہ سکوت و خاموشی سے بلکہ اس کے خلاف جہاں تک ہو سکے کوشش کرو۔ نرمی و شفقت سے اسے سمجھاؤ۔ سختی کا موقعہ ہو تو لب و لہجہ کی سختی سے فہمائش کرو۔ اس طرح بھی نتیجہ نہ نکلے تو ظالم کے خلاف عملی قدم اٹھاؤ اور کسی طرح کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو ترک تعلقات کرو۔ ظالم کو اچھا کہو گے اس کی حمایت میں آوازیں بلند کرو گے تو ظالم کے ساتھ تم بھی آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے علامہ آلوسیؒ نے یہ بات

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

بڑے درد انگیز لہجے میں لکھی ہے
آج اس آیت کی تشریح لوگوں کے لیے کس قدر دشوار ہے ۔

پھر لکھتے ہیں کہ ظالموں کی طرف اگر صرف میلان کا نتیجہ دوزخ ہے تو پھر تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ظلم کار اور ظلم پیشہ لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں ۔ مجالس میں ان کے ندیم وجلیس ہیں ۔ از سرتاپا ان کی مسرتوں اور شادمانیوں کا سامان کرتے رہتے ہیں ۔ یہ لوگ ظالموں کی طرف میلان ہی رکھنے والے نہیں بلکہ ظالم ہیں اور ظالموں کے ساتھ ظلم میں برابر کے شریک ہیں ۔ سفیان ثوری رضی اللہ عنہ امویوں کے زمانہ میں ہیں ۔ امویوں کی ظالمانہ حکومت کا آنکھوں سے تماشا دیکھ رہے ہیں کسی نے حضرت سفیان ثوری رض سے دریافت کیا کہ میں ان ظالموں کے کپڑے سیتا تو کیا میں بھی ان کے مددگاروں میں سمجھا جاؤں گا فرمایا کہ تو صرف مددگار نہیں بلکہ تیرا شمار ظالموں میں ہوگا اور جو کپڑے سینے کے لیے تیرے ہاتھ سوئی فروخت کرے گا اس کا شمار ظالموں کے مددگاروں میں ہوگا ۔

اس آیت کی تشریح وتفسیر کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن میں یہ آیات نازل ہو رہی ہیں ۔ اہل ایمان بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہیں ۔ اقتدار پر ظالمانہ قبضہ مشرکین کا ہے اور اقتدار کی ساری قوتیں اسلام، داعی اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں حالات کی ناخوشگواری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سورت کے آغاز میں قرآن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر کہہ رہا ہے ۔

فلعلك تارك بعض ما يوحى اليك وضائق به صدرك ان يقولوا لولا انزل عليه كنز ـ

جن حالات میں یہ بات کہی گئی ہے ۔ ان کو پیش نظر رکھیئے مکہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت وتجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے ۔ عین اس وقت جب یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں ۔ اس بستی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے ۔ اللہ سبحانہ کی سنگین گرفت تم پر آنے والی ہے اور اس سے بچنے کی تمہارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس دین حق کو قبول کرو جو میں اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آیا ہوں ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا انجام اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ پھر صحیح الفطرت لوگوں کے سوا بستی کے سب ہی لوگ اس داعی کے پیچھے پڑ جائیں ۔ کوئی ظلم وستم سے اسے دبانا چاہتا ہے، کوئی جھوٹے الزامات اس پر لگاتا ہے ۔ کوئی متعصبانہ بے رخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے کوئی مذاق اڑا کر

آوازے کس کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑانا چاہتا ہے۔ یہ ایک دن، ایک ہفتہ، ایک ماہ یا ایک سال کی بات نہیں بلکہ کئی سالوں تک نبوت کی دعوت سے یہ سلوک ہوتا رہا۔ اسی صورت حال میں نبوت کو اور اس کی وساطت سے اہل ایمان کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ ان پر آشوب حالات کا جم کر اور ڈٹ کر پوری پامردی اور استقامت سے مقابلہ کریں اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ان ظالموں کی طرف اپنے اندر ذرا بھی جھکاؤ نہ آنے دیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی انفرادی مسئلہ نہیں ہے جب سب نے مل کر اس دعوت کو بجبر و استبداد نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور اہل ایمان پر محض اختلاف عقائد کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے قدرتی طور پر دو کیمپ بن گئے۔ ایک کیمپ اہل ایمان کا تھا جو بچاؤ کر رہا تھا دوسرا ارباب اقتدار کا تھا جو ظلم کر رہا تھا ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ اہل ایمان سے کہا جائے ولاتركنوا الى الذين ظلموا۔ دشمنوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں میلان بھی نہ آنے دیں، ورنہ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان سے معاملہ کرنے کا تعلق ہے اس میں قرآن نے سازگاری و باہمی تعاون کی تلقین کی ہے۔ معیشت و معاشرت کے احکام اور ہیں اور مبارزت کے احکام اور ہیں۔ الذین ظلموا کی قید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز ظلم ہے۔ غیر مسلم اور مسلم دونوں کا حکم ایک ہے۔ علامہ نیشاپوریؒ کی نگاہ اس نکتہ پر پہنچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> جس میلان سے آیت میں ممانعت کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ظالموں کی حالت کو پسند کیا جائے۔ دوسروں کو ظالموں کے قول و فعل کی خوبی سمجھائی جائے اس کے ساتھ ظلم میں شرکت کی جائے۔ رہے دنیوی تو کسی جائز فائدے کے لیے یا نفرت کو دور کرنے کے لیے ظالموں سے تعلقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قرطبیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ
النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ
اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور اے اللہ کے رسول نماز قائم کرو اس وقت جب دن شروع ہونے کو ہو اور اس وقت جب دن ختم ہونے کو ہو۔ نیز اس وقت جب رات کا ابتدائی حصہ گزر رہا ہو[۱۳۶] یاد رکھو کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے[۱۳۷] اور صبر کرو یقیناً اللہ حسن کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے[۱۳۸]

مفردات کے معانی

طرفی طرف کا طرفین تثنیہ حالت نصبی میں مضاف ہو کر آیا ہے اس لیے نون گر گیا اس کے معنے دونوں طرف دونوں کنارے۔ طرفی النہار کو قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا۔ بالعشی والابکار۔ بالغدو والآصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غدو ہے اور دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے۔

زُلفاً یہ زلفۃ کی جمع ہے۔ رات کی گھڑیاں، ساعات شب، ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ زلف اللیل کے معنی رات کی گھڑیوں کے ہیں۔ اس کا واحد زلفۃ ہے۔ جس کے معنے ساعت منزلت اور قرب کے ہیں۔ امام لغوی لکھتے ہیں یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں تذکیر و تانیث واحد، تثنیہ اور جمع برابر ہیں۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہو۔ اور اللہ سبحانہٗ کی الٰہیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ سورہ روم میں پہلا حکم دیا گیا۔ فاقم وجھك للدين حنيفاً۔ اپنا چہرہ ہر طرف سے موڑ کر دین توحید پر سیدھا کر۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ یہی اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے اس کے بعد دوسرا حکم اس سے ملحق یہ ہے۔

واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین

اور نماز قائم کرو مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم خبر نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعے سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہونے کا اندیشہ ہے یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق کفر و شرک کا ڈر سناتے۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ ایمان کے بعد نماز ہی کا ذکر کیا ہے مثلاً ان الذین امنوا وعملوا الصالحات واقاموا الصلوٰۃ۔ اور والذین یمسکون بالکتاب واقام الصلوٰۃ۔ اور فلا صدق ولا صلّی اس انداز بیان سے وہ دراصل یہی بتانا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ چکا ہے تو اس سے عمل کا جو پہلا پودا نکلے گا وہ نماز ہوگا نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہوتی ہے بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو۔ مگر سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو۔ ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھر آئے کہ اسلام میں نماز کا یہ مقام کیوں ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سوچیے کہ خود نماز کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن عزیز بتاتا ہے کہ نماز اللہ کی یاد ہے۔ اقم الصلوۃ لذکری۔ اور یہ کہ نماز بندے کو اللہ سے قریب کر دیتی ہے اور اتنا قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت کسی بھی دوسرے عمل کے ذریعے اور کسی بھی دوسری حالت میں اسے حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ اس وقت ہر ماسوا سے کٹ کر اپنے آقا و مولیٰ کی حضوری میں پہنچا ہوتا ہے اور اس سے ہمکلامی میں مشغول ہوتا ہے۔ اللہ کی یاد، اس کا قرب اس کی حضوری اور اس کی ہمکلامی ہی دین کی روح اور بندگی کا معراج ہے۔ خدا پرستانہ عمل ایمان ہی کا ثمر ہوتا ہے۔ اور ایمان کی جڑوں کو نمی اور تازگی صرف اللہ کی یاد ہی سے ملتی ہے نماز نہ صرف یہ کہ اللہ کی یاد ہے بلکہ اس یاد کا سب سے بہتر، سب سے کامل اور سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ اس لیے نیکی اور خدا پرستی کے وجود کو نماز کے وجود پر منحصر ہونا چاہیئے۔

(۱۳۶) اے اللہ کے رسول نماز قائم کر اس وقت جب دن شروع ہوا اور اس وقت جب دن ختم ہونے کو ہو یعنی ظالموں کی طرف نہ جھکو بلکہ خدائے وحدہٗ لا شریک کی طرف جھکو۔ یعنی صبح و شام اور رات کی تاریکی میں خشوع و خضوع سے نمازیں ادا کرو کہ یہی بڑا ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی مدد حاصل کرنے کا ہے۔

نمازوں کے اوقات تدریجی تکمیل

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کا آغاز غربت، بے کسی اور مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ صرف رات کو کہیں اِدھر اُدھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھتے تھے۔

سورہ مزمّل میں جو مکّہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں آئی ہیں۔

یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا نصفہٗ او انقص منہٗ قلیلا
او زد علیہ ورتل القرآن ترتیلا انا سنلقی علیک قولا ثقیلا
ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاً و اقوم قیلا ان لک فی
النھار سبحا طویلا۔

اے کملی اوڑھ کر سونے والے تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ہم تجھ پر عنقریب بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ یعنی شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں بے شک رات کو

اُٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے بلا شبہ آپ کو دن میں آرام کی فرصت حاصل ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز تہجد کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشار) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز فجر اضافہ کی گئی۔

واصبر لحکم ربک فانک باعیننا وسبح بحمد ربک حین تقوم ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود

اور اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کیجئے بے شک آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو جس وقت رات کو تہجد کے وقت اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کی پیٹھ پھرنے کے وقت۔

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اور شاید اس وقت قریش مکہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا شروع کر دیا تھا۔ ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق نہ تھی۔ سورہ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی سورت ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے ان ہی معنے کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب ایک نماز جسے عصر کی نماز کہہ دیجئے اور بڑھتی ہے۔

واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا

صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے رب کا نام لیا کرو

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے۔ یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ابھی اصیل میں ظہر و عصر اور من اللیل میں مغرب اور عشار کی تفریق نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ کل نمازیں تین تھیں۔ ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو۔ اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا۔ جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب تین وقتوں کی تسبیح و تحمید باقاعدہ نماز کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ زیر تشریح آیت اقم الصلوۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے لفظ صلاۃ کی اقامت کا حکم

آیا ہے اس وقت مسلمانوں کی کافی تعداد تھی۔ جیسا کہ ومن تاب معک سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس آیت کے ذریعے اب دن کی تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوئی ہیں، ایک دن کے کنارے پر، یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت دوسری دن کے دوسرے کنارے دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصے میں۔ پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی نماز اور تیسری سے عشار کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال تھا۔ دوسری میں ظہر اور عصر کی اور تیسری میں مغرب اور عشار کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورہ قاف جو مکی سورت ہے اس میں ہے۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود۔

اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے فجر اور اس کے ڈوبنے سے پہلے عصر کو اپنے رب کی تحمید و تسبیح کرو اور کچھ رات گئے ہر عشار کو اس کی تسبیح کرو اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کرو۔

اس آیت میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشار کی تعیین کردی گئی زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار کہا گیا ہے۔ ابھی تفصیل طلب ہے۔ سورہ روم میں جو مکہ ہی میں نازل ہوئی ہے اس کی بھر پور طریقے پر تفصیل کردی گئی ہے۔ اس سورۃ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی پوری شکست کے بعد نازل ہوئی ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں سال سے لے کر نویں سال تک ہے۔

فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السماوات والارض وعشیا وحین تظہرون

اس آیت میں زوال کے بعد ظہر اور غروب سے پہلے عصر کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک کو عشی عصر اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات کی تصریح ہے وہ یہ ہے۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن اناء اللیل فسبح واطراف النہار۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر۔ رات کے کچھ وقت سے عشار مراد ہے اور

دن کے کناروں سے ظہر اور مغرب مراد ہے ۔

یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ زیر تشریح آیت میں طرفی النھار تثنیہ آیا ہے اور یہاں سورہ طٰہٰ میں اطراف جمع آیا ہے اور جمع کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے اس لیے دن کے تین کنارے ہونے چاہئیں ۔ دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح و شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح دوپہر اور شام پہلی صورت لی جائے تو صبح کے ذکر میں تکرار ہوجاتا ہے ۔ اور ظہر غائب ہوجاتی ہے ۔ دوسری صورت میں ظہر آجاتی ہے مگر فجر کا تکرار بھی رہتا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اطراف اگرچہ جمع ہے مگر عربی زبان میں دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے ۔ اور قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ دیکھئے ایک جگہ رب المشرقین و رب المغربین ہے دوسری جگہ رب المشارق و المغارب آیا ہے ۔ سورۃ تحریم میں فقد صغت قلوبکما سے ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو ہی دل ہوتے ہیں ۔ یہ زبان کا محاورہ ہے اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں ہے اس لیے یہاں بھی اطراف سے مراد دو ہی طرفیں ہیں ۔ یہ سب مانتے ہیں کہ دن کے دو ہی حصے ہوتے ہیں ایک صبح سے دوپہر تک ، دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے انہی دو حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں ۔ اس موضوع پر مزید بحث انشاء اللہ معالم العرفان کی پندرہویں جلد میں آرہی ہے ۔ بہرحال بتایا جارہا ہے کہ نماز کو ان اوقات میں ادا کرو تمہاری طاقت کا اصلی سرچشمہ یہی ہے ۔ نماز پڑھنے کے لیے اقامت صلوۃ کی تعبیر آئی ہے ۔ اقامت کے معنے ٹھہرنے اور درست کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی اقامت کے معنے اس کو درست رکھنے ، قائم کرنے اور اس کے حقوق کی بجاآوری کے ہیں ۔ لہٰذا اس کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان ، واجبات اور سنن کے ساتھ کرنے کے ہیں اس وجہ سے نماز میں اطمینان ، ارکان کا اعتدال ، باطنی خشوع و خضوع کی بجاآوری اقامت میں داخل ہے ۔ اس کے بغیر نماز ناقص ہے ۔ نماز کے آداب باطنی میں نمازی کا نماز میں اللہ کے سامنے باادب کھڑا ہونا ہے وقوموا للہ قانتین ۔ اسی میں ارکان اعتدال ہے ۔ قنوت کے معنے ہیں ۔ چپ رہنا ، دعا مانگنا ، کھڑے رہنا ، دیر تک کھڑے رہنا ، عاجزی کرنا یہ سارے معنے نماز میں مقصود ہیں ۔ اقامت ہی کے نتیجے میں خشوع کی کیفیت ہے اور خشوع کے تضرع ، اخلاق ، یادالہٰی اور فہم و تدبر خشوع کے لوازم ہیں قرآن میں اس کے اشارات ہیں ۔ یہی نماز کے باطنی آداب ہیں ۔

علامہ آلوسیؒ نے اقم الصلوۃ کے تین معنے کی نشان دہی کی ہے ۔ اول یہ کہ فرض نماز کی ادائیگی کرو دوسرے یہ کہ نماز کی پوری پوری ادائیگی کرو تیسرے یہ کہ نماز پر مداومت کرو ۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بتائی گئی کہ اللہ سبحانہٗ کی راہ میں شیطان اور اس کی قوتوں کی جانب سے جو مزاحمتیں ہوتی ہیں ان کے

مقابلے کے لیے روحانی طاقت نماز ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ نماز ہی بندے اور اس کے مولیٰ کے درمیان رشتہ استوار کرتی ہے اور جب بندے کا اپنے رب سے تعلق ہوجاتا ہے تو اس پر اللہ سبحانہ کی جانب سے رحمتوں اور برکتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ دل وسوسوں اور کمزوریوں سے پاک اور پورے حوصلے اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

(۱۳۷) نیکیوں سے برائیوں کا کفارہ

یاد رکھو کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے یعنی نمازوں کا قائم رکھنا اللہ سبحانہ کی یادگاری ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ اقم الصلوٰۃ لذکری یا یہ مطلب ہے۔ کہ ان الحسنات یذھبن السیأت یاد رکھنے کی چیز ہے جسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے مؤمن کو نیکیوں کی طرف خاص ترغیب ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح (۱) جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں (۲) جو نیکیاں اختیار کرے اس سے خو برائیوں کی چھوٹے۔ (۳) جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے۔ لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیئے جتنا میل اتنا صابون[۱] چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے جس طرح اس نے دنیا میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی نیک کام اتنا زبردست ہوجاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد ڈبل ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی اس نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ ان الحسنات یذھبن السیّأت۔ اس آیت گرامی کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی۔ اس معنے کی قرآن میں اور آیات بھی ہیں۔ آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو اور تمہارے نیک بننے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو اللہ سبحانہ کی یاد میں تازگی پیدا کرتی ہے اور اس کی طاقت سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفعہ کرکے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے آخر میں فرمایا ذالک

[۱] افادات شیخ الاسلام

ذکریٰ للذاکرین ۔ یعنی یہ استقامت ، اقامت صلوٰۃ ، طغیان نہ کرنے اور ظالموں کی طرف نہ جھکنے کا حکم اللہ کو یاد رکھنے والوں کے لیے نصیحت ہے دراصل یہ اس ہدایت کی قدر قیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کو معمولی بات نہ سمجھا یہ سننے اور سمجھنے والوں کے لیے بڑی گراں مایہ موعظت ہے یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ ہر شخص کے لیے آسان نہیں تھا کہ نماز راہ حق میں جہاد کا سب سے بڑا ہتھیار ہے ۔

حسنات میں نماز کا مقام

شارحین قرآن نے تصریح کی ہے کہ ان الحسنات الخ کا جملہ مقام تعلیل ہے یعنی نماز قائم کرنے کی علت یہ ہے ۔ کہ نماز حسنہ ہے اور حسنات برائیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں ۔ اسی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معلوم کی ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے معاذ برائی کے پیچھے نیکی کر ۔ نیکی برائی کو مٹا دے گی ۔ لوگوں کے ساتھ اخلاق حسنہ کے ساتھ پیش آ ۔ اور حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔ جہاں بھی ہو اللہ کی نافرمانی سے بچ ، برائی کے پیچھے نیکی کر نیکی برائی کو مٹا دیگی اور لوگوں کیساتھ اخلاق حسنہ سے پیش آ حسنات سیأت کو کیسے مٹاتی ہیں ؟ یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عامۃ الورود مثال کے ذریعے سمجھائی ہے ۔ بخاری ، مسلم ، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے یہ ارشاد نبوت پیش کیا ہے ۔

> بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے دروازے پر ایک نہر جاری ہو جس میں وہ پانچ مرتبہ روزانہ غسل کرتا ہے کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا ؟ صحابہ نے عرض کیا کہ کچھ بھی باقی نہ رہے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی حال پانچوں نمازوں کا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی وجہ سے گناہوں کو زائل کر دیتے ہیں ۔

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت میں جاری کا معنے گہرا بھی ہے ۔ جاری پانی گندگی وغیرہ سے پاک ہوتا ہے اور پانی جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی صاف بھی ہوگا ۔ اسی لیے جاری ہونا اور گہرا ہونا فرمایا ہے جتنے صاف پانی سے آدمی غسل کرے گا اتنی ہی صفائی بدن پر آئے گی ۔ اسی طرح نمازوں کی وجہ سے اگر آداب کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھی جائیں تو گناہوں سے صفائی حاصل ہو جاتی ہے ۔ جو بات اس حدیث میں آئی ہے یہی بات کئی حدیثوں میں متعدد بار آئی ہے ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچوں نمازیں درمیانی اوقات کے لیے کفارہ ہیں یعنی ایک نماز سے دوسری نماز تک جو صغیرہ گناہ ہوتے ہیں وہ نماز کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مثلاً ایک شخص

ایک کارخانہ ہے جس میں وہ کام کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بدن پر کچھ گرد و غبار اور میل کچیل لگ جاتا ہے اور اس کے کارخانے اور مکان کے درمیان میں پانچ نہریں پڑتی ہیں جب وہ کارخانہ سے گھر جاتا ہے۔ ہر نہر پر غسل کرتا ہے اسی طرح پانچوں نمازوں کا حال ہے کہ جب کبھی درمیانی اوقات میں کچھ خطا و لغزش ہو جاتی ہے تو نمازوں میں دعا و استغفار کرنے سے اللہ سبحانہ معاف فرما دیتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس قسم کی مثالوں سے اس بات کو سمجھانا ہے کہ اللہ سبحانہ نے نمازوں کو گناہوں کی معافی میں بہت طاقتور تاثیر عطا فرمائی ہے اور چونکہ مثال سے بات زرا واضح ہو جاتی ہے اس لیے مختلف مثالوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سمجھایا ہے۔

(۱۴۸) کامیابی کی کنجی صبر اور دعا ہے

اور صبر کرو یقیناً اللہ سبحانہ حسن کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کی امداد و اعانت حاصل کرتے میں دو چیزوں کا خاص دخل ہے۔ صلوٰۃ اور صبر۔ و استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ یہاں صلوٰۃ کے ساتھ صبر کا حکم فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ سبحانہ کی عبادت و طاعت میں ثابت قدم رہے اور کسی دکھ درد کی پرواہ نہ کرے تب اللہ سبحانہ کی مدد و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے یہاں کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں ہوتا ہے بلکہ اندازے سے زیادہ ملتا ہے[1] صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبورانہ درگذر کا نام نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری، اور مشکلات و مصائب کو اللہ سبحانہ کے بھروسہ پر خاطر میں لانے کا نام ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آنے پر وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ سبحانہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کرکے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے اسی لیے یہاں دونوں باتوں کو یکجا کر دیا۔ ایک طرف اقامت صلاۃ کے ذریعے اللہ کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں۔ یہود جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام حق کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے دو سبب تھے ایک یہ کہ دلوں میں گداز اور تاثیر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں ان کو برداشت نہیں کر سکتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے۔ اسی لیے قرآن نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ دعا سے دل میں اثر طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی۔ مسلمانوں کو بھی قرآن نے یہی ہدایت کی۔ یاایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلاۃ اسی لیے قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم۔

ظاہر ہے کہ صبر کا مطالبہ عموماً ناموافق اور نامناسب حالات ہی میں کیا جاتا ہے گویا شروع میں رفاقت کی زندگی اختیار کرنے والوں کو بتا دیا گیا کہ اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ صبر کے جذبے کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ اور بیدار کر کے رفاقت کو قائم کرے اور آیت میں جن رفقاء کے انتخاب کا حکم دیا ہے وہ یہ ہیں الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ خود بھی اقامت صلاۃ کے ساتھ حالات کی ناخوشگواری میں مشکلات کا صبر سے مقابلہ کرو اور رفاقت کا رشتہ بھی ان سے جوڑو جن کا اپنے رب سے تعلق ہو اور جن کا مقصد حیات یریدون وجھہٗ ہو۔ آیت میں اشارہ ہے کہ جن لوگوں میں صبر و اقامت صلاۃ کی دو صفتیں ہوں وہ حسن کار ہیں اور ان کا شمار محسنین میں سے ہے۔ آیت میں بلاغت یہ ہے کہ اوامر کے موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا لیکن نواہی کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ آپ کے ساتھیوں کو مخاطب کیا علامہ آلوسیؒ نے ٹھیک لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے بارگاہ رب العالمین میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ
اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ
كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ
اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً
وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ
خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

لہٰذا کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے اہل خیر جو لوگوں کو ملک میں فساد سے روکتے سوائے ان تھوڑے سے لوگوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا اور ظلم کار لوگ تو اسی راہ پر چلے جس میں وہ مزے اڑا رہے تھے اور وہ جرائم پیشہ تھے [۱۳۹] اور یاد رکھو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کا رب آبادیوں کو ناحق تباہ کر دے ایسی حالت میں کہ آبادیوں والے دوسروں

کو صالح بنا رہے ہوں ۱۴۰ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا اور لوگ ہمیشہ ایسے ہی مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرے رب کی مہربانی ہو۔ اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور آپ کے رب کی بات پوری ہو کر رہی کہ میں دوزخ کو جن اور انسان سب سے بھروں گا ۱۴۱

مفردات کے معانی

اترفوا ۔ اتراف سے ماضی مجہول کا جمع مذکر غائب ہے اس کے معنے خوشحال بنا دیئے گئے اترفہ المال کے معنی ہیں کہ مال و اسباب نے اس کو طغیان و فساد میں مبتلا کر دیا ۔

قوموں کی ہلاکت کے لیے اللہ کا قانون

اب تک جن قوموں کی ہلاکت کی داستان بیان ہوئی ہے ان آیات میں ہلاکتوں کے اسباب بتائے جا رہے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ ان آیات میں قوموں کی ہلاکت کے بارے میں قانون الٰہی بتایا جا رہا ہے یعنی جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے وہ صرف ان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ میں جتنی قومیں تباہ ہوئیں اور آئندہ ہوں گی سب کے لیے اللہ سبحانہ' کا ضابطہ یہی ہے ۔ زمانوں، مکانوں اور قوموں کے بدلنے سے اللہ کا قانون نہیں بدلتا ہے اُن کو جب اللہ سبحانہ' نے اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ خوشحالی کے نشہ میں مخمور ہو کر زمین میں ظلم و فساد کے رسیا ہو گئے اور ان کی اجتماعی زندگی اس قدر خراب ہو گی کہ ان میں اچھے لوگوں کا تناسب اس قدر گر گیا کہ بُرائی کو بُرائی کہنے والے ہی ختم ہو گئے اگر کچھ تھے تو وہ اس قدر کم تھے اور ان کی آواز اس قدر کمزور تھی کہ بُرائی کے طوفان کو نہ روک سکی ۔ یعنی اہل خیر و صلاح معدوم تھے شر و فساد سے روکنے والا کوئی نہ تھا یہی چیز ہے جس کی وجہ سے یہ قومیں اللہ سبحانہ' کے غضب کا نشانہ بنیں ۔

اس ارشاد میں تین باتیں بتائی گئی ہیں اوّل یہ کہ ہر اجتماعی زندگی میں ایسے نیک لوگوں کا ہونا ضروری

ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں اس لیے کہ معروف وہ چیز ہے جو مطلوب خدا ہے مگر اجتماعی زندگی امر بالمعروف سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف بُرے عناصر ہی باقی رہ جائیں اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح آتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں ہوتا اور آجاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر چند اچھے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور خوبیوں کی دعوت دیتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس کے بُرے دن قریب آگئے ہیں۔ ثالثاً یہ کسی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ جس چیز پر ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں معروف کو اپنانے والے لوگوں کا عددی تناسب کیا ہے! اگر اُس میں افراد کی عددی طاقت اتنی موجود ہو جو برائیوں کو ختم کر کے معروف پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے کافی ہو تو اس پر عمومی عذاب نہیں آتا بلکہ معروف کا کام کرنے والوں کو اصلاح کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

(۱۳۹) لہٰذا کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے اہل خیر جو لوگوں کو ملک میں فساد سے روکتے سوائے ان تھوڑے سے لوگوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا اور ظلم کار لوگ تو اسی راہ پر چلے جس میں وہ مزے اڑا رہے تھے اور وہ جرائم پیشہ تھے۔ یہ پچھلوں کا حال سُنا کر اُمت محمدیہ کو اُبھارا گیا ہے کہ ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہئیں گزشتہ قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش و عشرت کے نشے میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے با اثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی تھا انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا۔ اس طرح کفر و عصیان اور طغیان میں دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کے سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے امر بالمعروف کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سُنتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہو گئی۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں" نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی تھوڑے سے تھے سو آپ بچ گئے" حدیث صحیح میں ہے کہ جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کر بیٹھیں تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے العیاذ باللہ[1]

گویا اب ان معذب قوموں کی طرف جن کا ذکر اوپر گزرا ہے اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کیا چیز ان کی تباہی کا باعث ہوئی ہے اور آیت کا مقصد قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہی روش تم نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو فرمایا کہ ان میں ایسے لوگ باقی نہیں رہ گئے

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے جو لوگوں کو اللہ کی زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے ۔ان کی اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی۔ جو اسی سرمستی میں مگن پڑے رہے جس میں مبتلا تھے بس تھوڑے ہی لوگ ان میں ایسے نکلے جو خدا سے ڈرنے والے تھے ان کو ہم نے نجات دی باقی جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھلئے وہ اپنی مرغوبات کے پیچھے پڑے رہے ۔اور ہلاک ہوئے اس لیے کہ وہ مجرم تھے ۔

اس میں مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ تم دنیا میں فساد کو روکنے اور صلاح کو قائم کرنے آئے ہو ۔گرتوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا تمہارا کام ہے اگر تم نے اس سے غفلت کی تو تمہارا وجود دنیا کے لیے بیکار ہو جائے گا اب تمہارا فرض ہے کہ معروف کے پھیلانے اور منکر کے مٹانے میں محنت کرو ، جانوں کو تج کرو ۔رب کے ساتھ فقر واحتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں اللہ کی رضا کو مراد بنائے رکھو۔اس میں اشارہ ہے کہ برائی کو مٹانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت ہی قوموں سے عمومی عذاب کو روکتی ہے اگر اس کے لیے کام نہ کیا جائے گا تو اعمال کے نتائج ضرور ظاہر ہو کر رہیں گے ۔نتائج کے راستے میں جھوٹی آرزوئیں ، دولے اور خواہشیں کوئی روک نہیں بن سکتی ہیں ۔

قرآن نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دو درجے بتلائے ہیں ۔ایک درجہ یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی میں یا کمتر درجے میں پورے ملک میں معروف کا وزن غالب رکھا جائے اور منکرات کو مغلوب کیا جائے اس امت کا منشاء وجود یہی ہے کہ انسانی زندگی میں معروف کو پھیلائے اور برائیوں کو دور کرے اور یہ امت اسی کام کے لیے وجود میں آئی ہے اور اسی کام کی وجہ سے اسے خَیرَ اُمَّتٍ کا لقب دیا گیا اور انسانیت کیلئے بھی اس کی افادی حیثیت ہے ۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین امت ہو انسانوں کے فائدے کے لیے تمہیں وجود میں لایا گیا ہے تمہارا کام نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے ۔

اور انسانوں کی نسبت سے اسی کا نام شہادت علی الناس ہے ۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

یہ تصریحات صاف صاف بتارہی ہیں کہ یہ اُمت صرف اسی طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی اُمت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت

کی پاسبان بنائی گئی ہے اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ قرآن نے صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی تنظیم کا بھی یہی مقصد بتایا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

یہی وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ بھلائی کا حکم کریں گے برائی سے روکیں گے۔

دوسرا درجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ ہے کہ مسلمان جماعت کے افراد پر دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کی یہ تصویر پیش کی ہے وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر اور قرآن نے افراد امت کا یہ چہرہ بتایا ہے۔

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں وہ باہم بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اسی بات کو یہ حدیث بتاتی ہے جو مشکوٰۃ میں بحوالہ مسلم موجود ہے۔

مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا۔ اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیئے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے۔ پھر۔ ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آئے جن کا حال یہ تھا۔ کہ وہ کچھ کہتے جس پر عمل نہ کرتے اور وہ کچھ کرتے جس کی انہیں ہدایت نہ ہوتی پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہے۔

اس ارشاد سے دو باتوں کی راہنمائی ملتی ہے۔

ایک یہ کہ مسلم معاشرے میں جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے۔

دوسری یہ کہ اس کوشش کی عملی صورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا

ایمانی مرتبہ کیا ہے۔

زیر تشریح آیت میں مسلمانوں کو پہلے درجہ کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ اب یہ تمہارا کام ہے کہ فساد کی ہر نوع کو روکو اور صلاح کا کام کرو اور اتنا کام کرو کہ صلاح کو فساد پر غلبہ ہو جائے یعنی عمومی زندگی میں معروف عام ہو اور منکر منہ چھپا کر رہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ منکر اس وقت ختم ہوتا ہے جب اس کے مدمقابل معروف تن کر رہے۔

بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق.

ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو جاتا ہے۔

یہ کبھی نہیں ہوا کہ باطل خود بخود ختم ہو گیا ہو ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ کہ باطل کا مقابلہ حق نے کیا اور اس مقابلہ میں حق کو کامیابی ہوئی۔ ایسے ہی تم حق پر اور قریش مکہ باطل کے علمبردار ہیں۔ تمہاری کامیابی یقینی ہے تمہیں اس کا مقابلہ استقامت، اقامت صلاۃ اور صبر کی قوتوں سے کرنا چاہیئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگر ایک گروہ داعیان حق کا پیدا ہو گیا تو یہ سرزمین عذاب استیصال سے محفوظ رہے گی۔

(۱۴۰) قضاء بالحق کا قانون

اور یاد رکھو کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کا رب آبادیوں کو ناحق تباہ کرے ایسی حالت میں کہ آبادیوں والے دوسروں کو صالح بنا رہے ہوں۔ یعنی جس بستی کے لوگ اپنی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں، نیکی کو رواج دیں۔ ظلم و فساد کو ختم کریں تو خداوند قدوس کی یہ شان نہیں کہ خواہ مخواہ انہیں زبردستی پکڑ کے ہلاک کر دے۔ عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ کفر و عصیان یا ظلم و طغیان میں حد سے نکل جائیں۔[۱]

یہاں کچھ قرآن کے ترجمہ کرنے والوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس سے قرآن کے مطالب بالکل پامال ہو گئے۔ مثلاً آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے کسی ظلم کی پاداش میں جب کہ ان کے باشندے اصلاح میں سرگرم ہوں۔

علماء نے تصریح کی ہے کہ بظلم ترکیب میں یھلک کی ضمیر سے حال ہے اور مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ کسی

۱۔ افادات شیخ الاسلام

کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہے

اور یاد رکھو تیرا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے ۔ جبکہ اس کے مکین اصلاح حال کر رہے ہوں ۔

بتانا یہ ہے کہ مصلحین کا ہلاک کرنا ظلم عظیم ہے اور بلیغ انداز میں سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ظلم سے پاک ہے ۔ آیت کا مقصود صرف یہ ہے کہ قوم میں جب مجرمین اور مفسدین کی جگہ مصلحین کام کر رہے ہوں تو اللہ سبحانہٗ ان کو ناحق کبھی ہلاک نہیں کرتا ہے ۔ ایک دوسرے موقعہ پر قرآن میں ہے ۔

ذالك ان لم يكن ربك مهلك القرىٰ بظلم و اهلها غافلون ۔

اس آیت میں واقعی بظلم کی باء سببیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ باشندے غافل اور بے خبر ہوں یعنی اللہ سبحانہٗ کی یہ عادت نہیں ہے کہ بدون آگاہ اور خبردار کیئے کسی کو اس کے ظلم و عصیان پر دنیا میں ہلاک کر دے ۔ اور قاضی بیضاویؒ نے زیر تشریح آیت میں بظلم کی باء سببیہ قرار دے کر یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ظلم بمعنی شرک ہے ۔ اور مطلب یہ بتایا ہے کہ لوگوں کے عابدانہ تعلقات اللہ سبحانہٗ سے غلط ہو جائیں اور اس میں شرک بھی کر لیں تو اللہ سبحانہٗ لوگوں کو شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا ۔ اگر وہ حقوق العباد میں عدل و انصاف کو قائم کر کے باہمی حقوق کی اصلاح کر رہے ہیں ۔ لیکن محققین اس مطلب کو پسند نہیں کرتے ہیں کیونکہ شرک کی موجودگی میں اصلاح کا تصور ہی نہیں ۔ شرک سب سے بڑا فساد ہے ۔ بات وہی ہے جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ

اللہ سبحانہٗ لوگوں کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے جبکہ بستیوں میں اصلاح کرنے والے لوگ موجود ہوں ۔

مطلب یہ ہے کہ سزا جرائم پر ملتی ہے ۔ جرائم کے بغیر ناحق اللہ سبحانہٗ کوئی سزا نہیں دیتے ہیں ۔ جیسے جرائم کے بغیر سزا نہیں ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح اللہ کا قانون یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بے خبری کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا ۔ عذاب سے پہلے رسول روانہ کیا جاتا ہے جو گناہوں میں ملوث لوگوں کو آگاہ کرتا ہے صلاح حق عدل کی راہ بتاتا ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کسی قوم کو اس کی بداعمالیوں ، بداخلاقیوں ، بدمعاملگیوں اور غلط افکار اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیئے بغیر عذاب نہیں دیتا وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس سے پہلے اس کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے ۔

حافظ ابن جریرؒ نے آیت کے دو مطلب بتائے ہیں ایک یہ کہ اے اللہ کے رسول جن قوموں کی بربادیں

کی داستانیں آپ نے سنی ہیں ان کو اللہ سبحانہٗ نے ناحق ایسی حالت میں ہلاک نہیں کیا کہ وہ اعمال میں درست کار ہوں اگر ایسا ہوتا تو ان کی ہلاکت ناحق ہوتی بلکہ اللہ سبحانہٗ نے ان کو کفر میں جھوٹ، انبیاء کی تکذیب اور بدکاریوں کی وجہ سے ہلاک کیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی کو صرف شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ وہ باہمی معاملات میں عدل و انصاف کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔

(۱۴۱) ہدایت و ضلالت میں قانون الٰہی

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا اور لوگ ہمیشہ ایسے ہی مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرے رب کی مہربانی ہو اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور آپ کے رب کی بات پوری ہو کر رہی کہ میں دوزخ کو جن اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ یعنی جیسا بار بار پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا۔ اسی لیے حق کو قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف و صریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا۔ اگر فطرت سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا اسی لیے الا من رحم ربك سے متنبہ فرما دیا کہ جن پر خدا نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔ دنیا کی آفرینش سے غرض یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ہر قسم کی صفات جمالیہ و قہریہ کا ظہور ہو اس لیے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے تاکہ ایک جماعت اپنے مالک کی اطاعت و وفاداری دکھا کر رحمت و اکرام اور رضوان و غفران کا مظہر بنے جو الا من رحم ربك کا مصداق ہے اور دوسری جماعت اپنی بغاوت و غداری اس کی صفت عدل و انصاف کا مظہر بن کر حبس دوام کی سزا بھگتے۔ جس پر اللہ سبحانہٗ کی یہ بات پوری ہو لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين۔ بہر حال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔ اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب و اختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں جو اللہ سبحانہٗ کی صفات جلالیہ و جمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف و قہر کے مورد و مظہر بن سکیں۔

در کار خانہ عشق از کفر ناگزیر است\
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف و کرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج و استعداد کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے ؎

کچھ بزرگوں نے اس آیت کا مقصود یہ بتایا ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کا اختلاف ناگزیر ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ سب لوگ ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوجائیں اور حق و باطل کی کشمکش باقی نہ رہے۔ پس اس بات سے مایوس نہ ہو کہ تمام آدمی کیوں دعوت حق قبول نہیں کرتے نہ تو پہلے ایسا ہوا ہے نہ اب اس کی توقع رکھنی چاہیئے۔ بہت سے مانیں گے اور بہت سے نہیں مانیں گے تم اپنے کام میں سرگرم رہو۔

اصل بات یہ ہے کہ اس تمام کائنات کی بنیاد صفات و کمالات کے اختلاف پر ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائی جاتیں جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں۔ جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد ہے اور صفات و کمالات کے اختلاف کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہوسکتی ہیں۔ اگر صفات کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو اَن گنت اور بے شمار ہستیوں سے آج جو عالم بھرا ہوا ہے ظاہر ہے کہ کثرتوں کا یہ مجموعہ صرف ایک واحد شخص کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کرنے کی صورت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ صفات و کمالات میں باہم اختلاف رکھا جائے لیکن بایں ہمہ اختلافات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں جو صف بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلے کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان، ہم جو کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر مجانست اور مشابہت بہت ہی پائی جاتی ہے آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں بٹا ہوا ہے لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں کو تو چھوڑیئے ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جاتا ہے تو دوسرے پر حیوان کا لفظ بھی نہیں جچتا بظاہر دونوں پر ہی انسان کی کھال چڑھی ہوئی ہے۔ دونوں کے انسانی چہرے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی، صفات و کمالات کے اعتبار سے ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے مقابلے پر پاتال میں ہے۔ ایک خوبصورت ہے اور اتنا خوبصورت ہے کہ دیکھنے والوں کی نظریں بندھ جائیں۔ دوسرا اس قدر بدصورت ہے۔ کہ دیکھ کر متلی آجائے۔ ایک غبی ہے دوسرا ذہین ہے ایک چست و چالاک ہے دوسرا سست و کاہل۔ ایک فرشتہ خصلت ہے دوسرا شیطان سیرت ایک کو شاعری سے

ؔ افادات شیخ الاسلام

لگاؤ ہے ، دوسرے کو ریاضی سے ۔ کسی کا جی کاروبار کرنے کو چاہتا ہے تو دوسرا کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے ۔ اور ٹھیک جیسے جانوروں میں صفاتی اختلاف کی کمی نے ان کی زندگی کی سطح میں کوئی مخصوص فرق پیدا نہیں ہونے دیا ۔ اس کے مقابلے میں افراد انسانی میں اندرونی و بیرونی ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اسی نے زندگی کے ہر گوشہ میں ان کے مدارج کا اتنا اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر بھی ملنی مشکل ہے چونکہ مدارج و مراتب کا یہ اختلاف افراد انسانی میں ان کمالات و صفات ہی کے اختلاف کا نتیجہ ہے اس لیے اکثر پیدائشی ہوتے ہیں ۔ بہر حال صفات و کمالات کے اسی اختلاف اور اس اختلاف سے استعدادوں اور صلاحیتوں کا اختلاف نسل انسانی کے افراد میں جو پیدا ہو گیا ہے ۔ قرآن نے زیر تشریح آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ کہ اگر اللہ چاہتا تو جانوروں کی طرح انسانوں کو بھی ایک ہی امت بنا دیتا اور یہ نوع انسانی کی وہ خصوصیت ہے جس سے صرف ہدایت و ضلالت ہی کا نہیں بلکہ انسانی زندگی کا پورا نظام متاثر ہوا ہے ۔ معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گدھوں اور کتوں ، بلیوں اور چوہوں اور ان جیسے مختلف حیوانات میں پائی جاتی ہے ۔ انسانی زندگی کا نظام اس سے بالکل مختلف ہے ۔ اور اس اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی بیشی کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا ہے ۔ کوئی اونچا ہے کوئی نیچا ہے ۔ یہ قصہ تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کے صفات و کمالات کو ختم کر کے جانوروں کی طرح ہمرنگی اور یکسانی پیدا کر دی جائے کہ سب ایک راہ کو ہی اپنانے پر مجبور ہو جائیں اوروں کا پتہ نہیں لیکن قرآن میں جہاں ولو شاء اللہ لجمعہم علی الہدیٰ ۔ فرمانے کے بعد جو یہ ارشاد ہوا ہے ۔ وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ۔ یہ سب ہی امتیں ہیں مگر نوع انسانی ان سے صفات و کمالات میں جو امتیاز رکھتی ہے ۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ ہدایت قبول کرنے نہ کرنے میں ہے ۔ نوع انسانی دوسرے امتیازی کمالات کے ساتھ ارادہ و اختیار کا کمال بھی لے کر آئی ہے جس سے دوسری مخلوقات محروم ہیں ۔ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ انعام اللہ سبحانہٗ کا عطیہ ہے اور جس طرح یہ اللہ سبحانہٗ کا کارنامہ ہے اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج اور مراتب کا فرق بھی اللہ سبحانہٗ کی حکمت تکوینی کا تقاضا ہے ۔ یہیں سے یہ شبہ بھی ختم ہو جاتا ہے جو کچھ لوگوں کو ولو شاء اللہ لجمعہم علی الہدیٰ کے سمجھنے میں پیش آیا ہے وہ غلطی سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ کافروں کو اللہ سبحانہٗ ہدایت سے روکے ہوئے ہیں حالانکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود الا یہ کہ خدا خود زبردستی ان کے حلقوم میں ایمان ڈالے یعنی ان کی جبلت بدل دے اور ان کے اوصاف و کمالات کو سلب کر کے

ان مخلوقات کی طرح بنا دے جو صفات و کمالات سے عاری ہیں۔ نوع انسانی میں اوصاف و کمالات کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو انسانی زندگی میں اوصاف و کمال کی کوئی قیمت نہ رہے گویا آیت بتا رہی ہے کہ انسانوں کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کی یہ مشیت نہیں ہے کہ وہ اوصاف و کمال سے تہی دامن ہو اور دوسری مخلوقات کی طرح اس کو ایک مقرر راستہ کا پابند بنایا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو انسان اوصاف و کمالات کا گہوارہ نہ ہوتا اور دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے ارادہ و اختیار کی نعمت نہ ملتی سارے انسان فرشتوں کی طرح مسلم و مومن ہوتے اور کفر کا سرے سے کوئی امکان نہ ہوتا۔ لیکن اللہ سبحانہٗ نے انسان کے بارے میں جو چاہا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اسے انتخاب و اختیار کی آزادی ہو۔ اسے اپنی پسند کے مطابق راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے۔

قرآن دو صداقتوں کا علمبردار ہے

حقیقت یہ ہے کہ صداقتیں دو ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ تمام دنیا اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین اور بحر و برّ میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے۔ اس طرح انسان اور اس کے اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی خصوصاً اسلام کی جان ہے اگر یہ نہ ہو تو دین کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے۔ کہ ساری مخلوقات میں سے انسان کو جن اوصاف و کمالات کے ذریعے ممتاز کیا گیا ہے ان میں انسان کو اعمال کرنے نہ کرنے کے لیے ارادہ و اختیار دیا گیا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح مجبور فرض کیا جائے جیسے دوسری مخلوقات ہے۔ تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بے معنے ہو کر رہ جائیں۔ ظلم و انصاف نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنے ہو جائے۔ الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے۔ اور اس کی مشیت و ارادہ ہر خیر و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل کا کچھ نہ کچھ ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے اس پر ذمہ داری آتی ہے۔ نیکی کے کام کرنے پر اس کی تعریف اور برائی کے کرنے پر وہ قابل ملامت ہوتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ ایک

طرف وہ کہتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کی مشیت، قدرت اور نا قابل رد مشیت کے باوجود اس نے اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ و اختیار انسان کی ذمہ داری، تکلیف اور باز پرس کی بنیاد ہے۔ فرمایا فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر سب کو ایک ہی امت بنانا چاہتا تو وہ سکتا تھا۔ کہ سب انسانوں کو حیوانوں کی طرح اوصاف و کمالات سے عاری کر کے ایک حالت پر مجبور کرتا لیکن اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ انسانوں کو ارادہ و اختیار دے کر نیکی اور بدی کی دونوں راہیں اس کے سامنے کھول دی ہیں اور انہیں اختیار دیا ہے کہ جس کو چاہیں اختیار کر لیں اور اللہ نے جب اس ارادہ و اختیار کی خاطر انسانوں میں اوصاف و کمالات کا تفاوت رکھا ہے تو انسانوں میں اختلاف بھی رہے گا۔ لیکن ان میں نیکی کی راہ اختیار وہی کریں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو گی۔ یعنی جو اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ولذالک خلقھم یعنی نوع انسانی میں دوسری مخلوقات سے الگ ہو کر اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات کا جو اختلاف پایا جاتا ہے اسی اختلاف کی خاطر اللہ نے نوع انسانی کی تخلیق فرمائی ہے۔ اسی کی خاطر انسان کو ارادہ و اختیار دیا ہے اور اسی لیے انسان کی پوری زندگی ابتلائی ہے گویا نوع انسانی میں اوصاف و کمالات کا اختلاف بھی نوع انسانی کی تخلیق کی علت غائی ہے۔ علت غائی میں یہاں قصر نہیں ہے لذالک کی تقدیم قصر کے لیے نہیں بلکہ اہتمام علت کے لیے ہے۔ ایک فعل کی متعدد غایات ہو سکتی ہیں۔ اس لیے یہ آیت ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ اور لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ کے منافی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا۔ و تمت کلمۃ ربک لاملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین۔ اسی اختلاف اوصاف کمالات کے نتیجے میں قضا و قدر الٰہی میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھرا جائے گا۔ من تبعیضیہ ہے۔ یعنی اختلاف اوصاف کے نتیجہ میں جو لوگ امتحان میں فیل ہو جائیں گے۔ ان کے حق میں تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اللہ سبحانہٗ نے تخلیق آدمؑ کے وقت ابلیس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ سورۃ ص کے آخری رکوع میں اور سورہ اعراف کے دوسرے رکوع میں اس وقت کا پورا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور نسل آدم کو بہکانے کے لیے قیامت تک مہلت مانگی جواب میں اللہ سبحانہٗ نے

فرمایا۔ فالحق والحق اقول لاملئن جہنم منک وممن تبعک منہم اجمعین لفظ اجمعین یہاں اس معنے میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ تمام جن اور تمام انسان جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ شیاطین اور ان شیاطین کے پیروکار انسان سب ایک ساتھ واصل جہنم ہوں گے۔ شیطان دراصل قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے اللہ سبحانہٗ نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کیلئے کرّے پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رُکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا رہتا ہے ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہٗ شیطاناً فھو لہٗ قرین۔ ورنہ جو نصب العین کی تکمیل کرتے رہتے ہیں ان کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے۔ ان عبادی لیس لک علیہم سلطان۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تماشا گاہ عالم کی بنیاد چونکہ صفات وکمالات کے اختلاف پر ہے اسی اختلاف نے نوع انسانی میں ابتلاء کو جنم دیا ہے۔ ابتلاء وامتحان کا نتیجہ لازماً کامیابی اور ناکامی ہے۔ ناکام وہ ہیں جو شیطان کے پیروکار ہیں اور شیطان کے پیروکاروں کے لیئے ازل ہی میں اعلان ہو چکا ہے کہ لاملئن جہنم جنت ہو یا دوزخ دونوں انسانی اعمال کے نتائج کے مظاہر ہیں۔

یہاں مولانا گیلانی کی یہ بات بے حد وزنی ہے۔

جس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ چاہتا تو افراد انسانی کو بھی ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ آخر حیوانات و نباتات میں جو وحدت اس رنگ کو قائم کیئے ہوئے ہے۔ ہاتھیوں کی ایک اُمت ہے۔ طوطوں کی ایک اُمت ہے سب کا کھانا پینا رہنا سہنا اور سب کے ادراک واحساس کا ایک حال ہے۔ جس نے یہ کرکے دکھایا کیا آدمی میں اسی رنگ کو اس میں پیدا کرنے کی اس میں قدرت نہ تھی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنے یہی ہیں کہ افراد انسانی کا ظاہراً وباطناً مختلف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ بلکہ سورہ ہود کی آیت ولو شاء ربک لجعل الناس امۃ واحدۃ الخ آخری الفاظ ولذالک خلقھم۔ اسی لیے پیدا کیا ہے ان کو۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کا ایک گروہ تو یہی کہتا ہے کہ اس سے مراد انسانوں کا باہم اختلاف ہے: بیضاوی نے اسی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ الضمیر للناس فالاشارۃ الی الاختلاف یعنی خلقھم میں ھم کی ضمیر کا مرجع الناس ہے اور لذالک کا اشارہ اس صورت میں اختلاف کا طرف ہے۔ بہرحال افراد انسانی کا اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ بنانے والے نے آدمی کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ ان کا اختلاف ناگزیر ہے۔ اس کے ازالہ کا خیال قدرت سے مقابلہ کا خیال ہے۔ اس قسم کے جبلی مفاسد کے روکنے کی تدبیر ہمیشہ سے یہی ہے کہ اس کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ کر

کے بجائے نقصان کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسلام نے یہی کیا ہے۔ اس نے دین اسلام کے سرمایہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک البینات یعنی دین کے وہ اجزا جن کی تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ان کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے مثلاً قرآن اور وہ تمام چیزیں اسلام کی جو اسی راہ سے پہنچی ہیں جس راہ سے قرآن پہنچا ہے ان کے البینات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دین کے عناصر اور اجزا میں سے ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے۔ جن کا انکار عقل وفطرت کے خلاف ہے۔ ان ہی کو البینات پر متحد و متفق کر کے مسلمانوں کے اختلافی امور کا امالہ ان امور کی طرف کر دیا گیا جن کی حیثیت دین میں البینات کی نہیں ہے اور یہی وہ بات تھی کہ ابتدا ہی سے مسلمان ان امور میں مختلف ہوتے رہے۔ لیکن نہ اس اختلاف کو انہوں نے چنداں اہمیت دی اور سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مختلف ممالک میں جن بزرگوں کے خداداد کمالات کا ظہور اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوتا رہا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بروئے کار لانے میں ان اختلافات ہی کا حصہ ہے ان ہی کی تحقیق وتفتیش، تنقید وتنقیح اور ان میں تطبیق و توفیق و ترجیح کی کوششوں ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی امامت کا منصب ان کو ملا۔

اور قاضی بیضاوی نے اس آیت میں بعض ارباب نظر کا جو یہ خیال نقل کیا ہے کہ ذالک کے اسم اشارہ کے مشار الیہ اختلاف ہی ہے اور رحمت بھی۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلانات ورجحانات کے نظری اختلاف کو البینات سے ہٹا کر جن لوگوں نے غیر بیناتی پہلو کی تحقیق و ریسرچ کی طرف پھیر دیا وہ اپنے اجتہاد کے صلہ سے محروم نہیں ہو سکتے یہی اختلاف ان کے لیے ذریعہ رحمت بن گیا۔ پس اختلاف انسانوں میں خواہ اس کا تعلق دنیا سے یا دین سے قدرتی ہے اس کے ازالہ کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ
مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ
وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ
الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ع ۱۰ ۱۴ ۱۰

اے اللہ کے رسول سب انبیاء کی سرگزشتیں ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تسکین دے رہے ہیں۔ اور آپ کے پاس ان واقعات میں حق یعنی اس کے دلائل آ گئے ہیں اور اس میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے[۱۴۲] اور اے اللہ کے رسول آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے جو ایمان نہیں لاتے ہیں کہ تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم بھی کام کر رہے ہیں۔ اور نتائج کا تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں[۱۴۳] اور آسمان و زمین میں پردہ غیب کی باتوں کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملے کی چابی اسی کے پاس ہے۔ لہٰذا اے اللہ کے

رسول عابدانہ تعلقات اسی سے رکھو اور نتائج کے لیے اس پر بھروسہ کرو اور آپ کا رب آپ کے مخالفوں کے کردار سے بے خبر نہیں ہے ۔۱۴۴

واقعات حق کے دلائل ہیں

یہاں یہ بات کھول کر بتا دی ہے ۔کہ گزشتہ رسولوں کی داستانیں جو اس صورت میں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کی حیثیت دلائل کی ہے ۔ ان واقعات کا مقصد یہ نہیں ہے ۔کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں ادغان پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ اور یہ تاریخی داستانیں اس کے لیے دلائل ہیں ۔ یہ دلائل کس طرح ہیں ۔ اس طرح کہ اس کائنات میں ہر جگہ یہ حقیقت بزبان حال بول رہی ہے کہ یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح پر کام کر رہا ہے کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اپنے قانون تعلقت و فعل میں دوسروں سے ذرا بھی الگ ہو ۔ بلاشبہ بھیس بہت سے ہو گئے ہیں اور نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہیں ۔ اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے ۔ لہذا جب کائنات کے ہر گوشہ میں وحدت قانون کی بنیاد وہی اصل کام کر رہی ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی میں یہ قانون کارفرما نہ ہو ۔ بلاشبہ اعمال انسانی میں بھی یہ قانون کام کر رہا ہے ۔ عالم انسانی میں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی میں کر رہا ہے اور یہاں بھی وہی احکام ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آرہے ہیں یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات میں بھی خواص ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی قانون عالمگیر یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے ۔

(۱۴۴) اے اللہ کے رسول سب انبیاء کی سرگذشتیں ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جس کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تسکین دے رہے ہیں ۔ اور آپ کے پاس ان واقعات میں حق یعنی اس کے دلائل آگئے ہیں اور ان میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے ۔ اور بہت سے انبیاء و رسل کے قصص مذکور ہو گئے تھے ۔ اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں ۔ یعنی گزشتہ اقوام کے واقعات سُن کر پیغمبر علیہ السلام کا قلب بیش از بیش ساکن و مطمئن ہوتا ہے ۔ اور اُمت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں

جن میں نصیحت وتذکیر کا بڑا سامان ہے۔ آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعاً اس کی طرف دوڑتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر مذکر و مؤثر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جز ہو اور خوف خدا کی ذرا سی ٹھیس دل میں رکھتا ہو انہیں سُن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا باقی قصص اور بعض دوسرے مضامین کا تکرار جو قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اس پر ہم نے رسالہ القاسم کے ابتدائی دور میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کر لیا جائے۔ [1]

اس آیت میں قرآن نے تاریخی واقعات وحقائق کی جو توجیہ پیش کی ہے اس کو چار میں محدود کر دیا ہے۔

اول حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تثبیت، دوم حق کے دلائل، سوم موعظت، چہارم تذکیر۔ تثبیت کا تعلق خود ذات نبوت سے ہے۔ یعنی قوم کو اعراض وسرکشی کی حالت میں دیکھ کر آپ کا دل بیقرار ہے مضطرب اور پریشان ہے۔ دعوت کا دلولہ اور اصلاح کا عشق آپ کو مضطرب رکھتا ہے۔ لعلك باخع نفسك ان لایکونوا مؤمنین۔ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اپنی قوم کی گمراہی وضلالت، اس کی اخلاقی پستی، اس کی ہٹ دھرمی، اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کا رنگ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شب و روز کس جان گداز وجاں گسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ان تکلیفوں کا نہ تھا جو آپ کو دی جا رہی تھیں۔ بلکہ جو چیز آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آپ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ آپ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذاب الٰہی ہے۔ آپ ان کو اس سے بچانے کے لیے دن اور راتیں ایک کر رہے تھے مگر انہیں اصرار تھا کہ وہ اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر رہیں گے اسی تناظر میں یہاں بتایا جا رہا ہے۔ کہ تاریخی حقائق کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا اہم مقصد یہ ہے کہ ان سرگزشتوں کا مطالعہ وتفکر آپ کے لیے موجب تسکین ہو کہ آپ سے پہلے بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے بلکہ اعراض و سرکشی کے اس سے زیادہ مظاہرے ہوئے ہیں۔ سب نے دعوت کی ہنسی اڑائی۔ سب نے دلیلوں سے

[1] افادات شیخ الاسلام

منہ موڑا۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے سب نے جبر و تشدد سے راہ روکنی چاہی، سب نے موعظت و دعوت کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ ان باتوں کو اس لیے سنایا جا رہا ہے تاکہ ان واقعات و حقائق کے ذریعے آپ کے قلب مضطر کا سامان ہو۔ نثبت بہ فؤادك

حق کے حق ہونے کے دلائل

یہ سرگذشتیں حق کو واضح کر دیتی ہیں یعنی ان میں حقیقت و حقانیت کی دلیلیں اور روشنیاں ہیں۔ یہ واقعات بتلاتے ہیں کہ عالم مادی کی طرح عالم انسانی میں بھی اللہ کا قانون ہے جیسے ہر بات کیلئے اللہ کا قانون مقرر ہے۔ جدیث صحیح میں ہے کہ جماعتوں کی سعادت و شقاوت، حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جس طرح اللہ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں اور غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ سے ایک ہی طرح رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی ہے۔ یہ قرآن ہے جس نے عالم مادی کے ساتھ انسانوں کو عالم انسانی کے قوانین کی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کائنات اور زندگی کے مظاہر پر اس نکتہ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں۔ کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم و ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی۔ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ عالم مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادی عمل سے ناآشنا ہیں۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے۔ جنہیں تجربے، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس عالم انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو ان پر وہ وثوق اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو عالم مادی کے قوانین کی نسبت سے عام طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہ ممکن ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہ صحت کے ساتھ بلکہ ناممکن ہے بہرحال قرآن بتا رہا ہے کہ یہ واقعات، سرگذشتیں عالم انسانی میں قوانین حق کے نافذ ہونے کی دلیلیں ہیں۔ حجتیں ہیں اور براہین ہیں۔

سرگذشتیں موعظت ہیں

یہ سرگذشتیں اور تاریخی واقعات صرف عالم انسانی میں قوانین حق کے دلائل ہی نہیں بلکہ اہل

ایمان کے لیے موعظت ہیں یعنی ایسی باتیں ہیں جو سننے والوں کو عبرت دلاتی ہیں۔ نصیحت دیتی ہیں۔ عذر و نادانی سے بیدار کرتی ہیں۔ دراصل یہ وہ چیز ہے جس پر قرآن کے استدلال کی بنیاد ہے۔ قرآن انسانی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک چھٹی صدی عیسوی سے قبل کی تاریخ جسے وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ حق و باطل کی آویزش کی تاریخ ہے جس میں لازمی طور پر حق کو غلبہ ہوا ہے اور باطل کو شکست ہوئی ہے۔ قرآن کے مطابق چھٹی صدی عیسوی تک انسانی تاریخ جس انداز میں سفر کرتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر انسانوں نے جتنی آبادیاں قائم کیں ان میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اللہ کی مرضی کی نمائندگی کرنے کے لیے ایک رسول آیا اس نے انسانوں کو ان کو زندگی کا مقصد بتایا اس نے کہا کہ اللہ سبحانہٗ نے مجھے یہ پیغام دے کر روانہ کیا ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اور میں جو کچھ کہوں اسے مانو۔ اس نے بتایا کہ اگر میری بات کو پذیرائی نہ دوگے تو تباہی یقینی ہے۔ اس طرح اللہ کے رسول کا یہ چیلنج کہ زندگی و موت کا انحصار اس کی دعوت کے ماننے نہ ماننے پر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ بغیر کسی استثناء کے اس دعوے کے حق میں فیصلہ کرتی رہی ہے جب بھی کوئی رسول آیا تو کچھ لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہی اور کچھ نے نہیں مانا۔ اگر نبوت کے ماننے والوں کی تعداد اتنی ہوتی کہ وہ ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کر سکے جس میں اتحاد ایتلاف اور نظم ہو تو اس کو منکرین کے گروہ سے ٹکرایا گیا اور انہیں شکست دے کر ختم کر دیا گیا اور اگر رسول کی ہمنوائی کرنے والے بہت کم ہوتے تو اللہ سبحانہٗ نے اپنی قدرت کا اظہار کر کے نبوت کو غالب کیا۔ حجت تمام کرنے کے بعد بالآخر رسول کی زبان سے یہ چیلنج دیا گیا۔

تمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذالک وعد غیر مکذوب

یہ گویا تاریخ کی شہادت ہے اور اس میں اہل ایمان کے لیے عبرت ہے کہ پچھلی تاریخ میں جن لوگوں نے اپنے رب کو اللہ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہ واقعی اللہ کے رسول تھے اور انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی تعلیمات کو اپنائے۔

تاریخ کی یہ نوعیت اہل ایمان کو نصیحت کرتی ہے کہ اللہ کے ان وعدوں کو سمجھ سکیں جو اس نے پچھلی قوموں کے بارے میں کیے ہیں۔

تاریخ کے واقعات میں یاددہانی

یہ تاریخی واقعات اہل ایمان کے لیے تذکیر ہیں یعنی سچائی کی یاد دلاتی ہیں اور غفلت سے روکتی ہیں اوائل دعوت کی ایک غفلت یہ بھی تھی۔ کہ کمزور اور بے سروسامان تھے۔ اور تمام ملک دشمنی پر تل گیا تھا اس لیے

کبھی کبھی مایوسی کے خیال آنے لگتے تھے۔ یہ واقعات بتاتے ہیں۔ کہ تمام مادی اور عالمگیری حقیقتوں کیطرح وحی کی بھی ایک حقیقت ہے جو ماضی میں مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں ظاہر ہوئی اور آج عرب میں ظاہر ہوئی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی بھی ایک حقیقت ہے جس کی ہمیشہ تعلیم دی گئی ہدایت و ضلالت کی کشمکش کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ نمودار ہوئی۔ تصدیق رسل کے نتائج کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئی۔ اور انکار و سرکشی کے نتائج بھی دنیا کی ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ کیونکہ ان میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماضی میں جس قدر پیغمبر آئے سب کی پیغمبری میں ان کے ہمعصر مخاطبین نے شک کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابتداً یہی صورت حال پیش آئی۔ اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں آتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی نبی آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور میں ہی ان کا اختتام ہوگیا کیونکہ ان کے بعد ان کی دعوت کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرۃ اور ان کے کلام کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف حضور اقدس ؐ کا استثنا رہے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح آپ کی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے گزر کر مخودی دور میں داخل ہوگیا۔ ان واقعات نے حقیقت کھول دی ہے یہ واقعات دلیل ہیں دعوت کے کام میں معاملات کی وحدت اور ان کے عالمگیر تسلسل کو لیے۔ واقعات کی یہ وحدت جس انداز میں تذکیر کا کام کر رہی ہے۔ اس کے لیے یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے۔ کہ اس کے ذریعے سات وحدتوں کا علم لقین نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

اول یہ کہ دعوت کے معاملے میں تمام ملکوں، قوموں کی حالت یکساں رہی ہے کوئی ملک و قوم ہو لیکن واقعات بتلاتے ہیں کہ وہاں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اپنی قوم اپنے ہموطنوں کو ایک خاص انداز سے تعلیم دی۔

دوسرے۔ یہ کہ یہ تعلیم اگرچہ مختلف وقتوں، مختلف ملکوں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں میں دی گئی لیکن ان اختلافات سے تعلیم مختلف نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی رہی گویا ایک پیغام ہے جو بہت سے پیغامبروں کے ذریعے آیا ہے۔

تیسرے۔ تمام دعوتوں کی صرف تعلیم ہی یکساں نہیں رہی بلکہ تذکیر کے اصول بھی ہمیشہ ایک ہی رہے ہے۔

چوتھے۔ یہ کہ اگرچہ زمانے مختلف ہوئے، ملک مختلف ہوئے، قومیں مختلف ہوئیں، احوال وظروف مختلف ہوئے مگر جو معاملات پیش آتے وہ اپنی نوعیت میں ہمیشہ ایک رہے۔

پانچویں۔ دعوت کی پذیرائی اور ناپذیرائی کے اعتبار سے حالت ہمیشہ ایک رہی۔ جیسے ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی اور نہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک طرح کی رہی۔ جنہوں نے ہمیشہ ایک ہی طرح سے مانا جنہوں نے نہیں مانا ایک ہی طرح نہیں مانا۔

ساتویں: نتیجہ بھی ایک ہی ہمیشہ رہا کبھی ایک سے دو نہیں ہوا۔

احوال و واقعات کی ہم آہنگی بتا رہی ہے کہ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے ان کی قدامت ان کی عالمگیری۔ ان کا دائمی تسلسل۔ ان کی بے داغ وحدت ان کی واقعیت اور فطری صداقت کا اعلان کر رہی ہے۔

(۱۴۲) مخالفین کو فیصلہ کن جواب

اور اے اللہ کے رسول آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے جو ایمان نہیں لائے ہیں کہ تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم بھی کام کر رہے ہیں۔ اور نتائج کا تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اس مضمون کی آیات پہلے اسی سورت میں گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میری بات نہیں مانتے تو بہتر ہے کہ تم اپنی ضد پر جمے رہو۔ میں اپنے مقام پر مستقیم ہوں۔ نیز تم میرے لیے حوادث دھر کا انتظار کرتے رہو۔ میں تمہارے انجام بد کا منتظر ہوں۔ چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یتربصون بکم الدوائر علیھم دائرۃ السوء سلہ بتانا یہ ہے کہ منکروں سے وہی بات کہلاؤ جو ہمیشہ کہی گئی ہے۔ یعنی تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔ نتیجہ فیصلہ کر دے گا کہ حق کیا اور کدھر ہے۔ علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ آیت قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ

> جن لوگوں پر آپ کی تبلیغ و دعوت اور موعظت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس وجہ سے وہ نعمت ایمان سے ہمدوش نہیں ہوئے آپ ان کو کہہ دیجئے کہ تم اپنے طریقے پر ڈٹ کر جو کچھ کر رہے ہو کرتے رہو لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو تم کرو یا نہ کرو ہم تو اپنا فرض ضرور ادا کرتے ہی رہیں گے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے گی۔ تم ہمیں مغلوب کرنے کا انتظار کرو کہ ہم اللہ سبحانہٗ کے وعدے کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ہم کو کامیابی سے ہمدوش کر دے گا اور تمہیں ناکامیوں سے دوچار کرے گا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک دعوت دی، اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ

سلہ افادات شیخ الاسلام

میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور ہدایت کو مختلف انداز میں پیش کیا ۔ سورہ ہود قیام مکہ کے آخری دور کی سورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے انداز و اسلوب کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ مخالفین دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے ۔ وہ نبی اور نبی کے متبعین کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔ ان سے اب یہ امید باقی نہیں رہی ہے ۔ کہ تفہیم و تلقین سے راہ راست پر آجائیں گے ۔ اور اب انہیں اس انجام سے خبردار کرنے کا موقعہ آگیا ہے جو نبی کو آخری اور قطعی طور پر رد کر دینے کی صورت میں انہیں لازماً دیکھنا ہوگا ۔ فانتظروا انا منتظرون ۔ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ قریش کی مہلت اور فرصت کی آخری گھڑی تھی ۔ اور اب معجزہ ہلاکت ان کے سر پر تھا ۔ اور رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کا صدمہ تھا ۔ غالباً اس حدیث میں جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ۔ کہ کیا بات ہے آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں ۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ شیبتنی سورۃ ہود و اخواتھا ۔ مجھے سورہ ہود اور اس کی بہنوں نے یعنی اس جیسی سورتوں نے بوڑھا بنا دیا ہے ۔ یہ صدمہ اور غم کی تعبیر ہے ۔ ابن عساکرؒ کی روایت میں یہ اضافہ اس کی تائید کرتا ہے شیبتنی سورۃ ہود وما فعل بالامم قبلی مجھے سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے اور پہلی امتوں کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کے معاملہ نے بوڑھا بنا دیا ہے ۔ اس سورت میں آخری اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ نادان مذاق اڑاتے تھے ۔ بس اسی کے غم نے آپ کو بوڑھا بنا دیا تھا ۔

(۱۴۴) دانائے غیب صرف اللہ ہے

اور آسمان و زمین میں پردہ غیب کی باتوں کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ اور سارے معاملے کی چابی اسی کے پاس ہے ۔ لہٰذا اے اللہ کے رسول عابدانہ تعلقات اللہ سے رکھو ۔ اور نتائج کے لیے اسی پر بھروسہ کرو اور آپ کا رب آپ کے مخلصانہ کردار سے بے خبر نہیں ہے یعنی آپ ان کے کفر و شرک سے دلگیر نہ ہوں اپنا کام کیے جائیں اور ان کا فیصلہ اللہ سبحانہٗ کے حوالہ کریں اس سے آسمان و زمین کی کوئی بات چھپی نہیں ہے ۔ سب معاملات بنڈ پھر کر اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۔ وہاں ان کو پتہ لگ جائے گا ۔ کہ وہ کس میں پڑے ہوئے تھے ۔ آپ تو دل و جان سے اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگے رہیے ۔ اور تنہا اسی کی اعانت پر بھروسہ کیجیے وہ تمہارے مخلصانہ اعمال سے بے خبر نہیں ہے ۔ ان کے مناسب تم سے معاملہ کرے گا ۔ حدیث میں ہے کہ صحابہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد آگئے فرمایا شیبتنی سورۃ ہود و اخواتھا ۔ سورۃ ہود اور اس

کی ہیں نے مجھے بوڑھا بنا دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورۃ ہود کی جس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا وہ یہ آیت ہے۔ فاستقم کما امرت ومن تاب معك ولا تطغوا انه بما تعملون بصیر رزقنا الله سبحانه الاستقامة علی دینه وسنة نبیه صلی الله علیه وسلم تمت سورة هود بفضله۔ یہ کچھ مفسرین کی رائے ہے۔ کہ سورۃ ہود میں استقامت کے حکم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا بنا دیا ہے لیکن روایات میں صرف سورۃ ہود کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوسری سورتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ابن المنذر اور طبرانی کی روایت میں ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت آیا ہے۔ بزاز کی روایت میں ہود، واقعہ، الحاقہ، عم یتساءلون اور ھل اتٰك حدیث الغاشیه کا ذکر ہے۔ سنن سعید بن منصور میں ہود اور مفصلات سے اس کی اخوات کا ذکر ہے۔ ترمذی کی روایت میں ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون، اور اذا الشمس کا ذکر ہے۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کی ساری روایات فتح القدیر میں جمع کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ استقامت کا حکم سورۃ ہود کے علاوہ کسی سورت میں نہیں ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ استقامت کے حکم نے آپ کو بوڑھا بنا دیا کچھ بے جوڑ ہے۔ دراصل بوڑھا بنا دینا تعبیر ہے۔ غم کے زیادہ ہونے اور صدمہ کے بہت ہونے کی۔ ان سب سورتوں میں جو بات مشترک ہے وہ دنیا میں قوموں کی ہلاکت ہے۔ اور اسی بات کے صدمہ نے آپ کو بوڑھا بنا دیا کہ قریش کی سرکشی کے نتیجہ میں تاریخ دہرائی جائے گی۔ ابن عساکرؒ کی روایت میں تصریح آئی ہے وما فعل بالامم قبل یعنی پہلی امتوں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اسی بات نے آپ کو غمگین بنا دیا۔ اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ اس استدلال میں جو کچھ ہے وہ کوئی راز نہیں ہے اور یہی آلوسیؒ نے صاحب کشف کا رجحان نقل کیا ہے کہ

اس بات کے لیے ہود کی تخصیص واضح نہیں کیونکہ ہود کی اخوات میں استقامت کا ذکر نہیں ہے۔

یہ آیت ذہن میں اٹھے ہوئے اس سوال کا بھی جواب ہے کہ انتظار کی یہ گھڑیاں کب ختم ہوں گی اور اس کا بھی کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے پر منافقین کی تباہی تو ہو گی مگر اہل ایمان کا کیا بنے گا۔ حالات میں پیش رفت کیسے ہو گی! جواب میں فرمایا کہ اس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں ہے اس میں اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں ہے اس بات کو سمجھانے کے لیے قرآن نے قصر کے سارے اسالیب اختیار کیے ہیں قصر کے عربی میں ایک سے زیادہ انداز ہے۔

اول۔ انما کے ذریعے قصر ہوتا ہے۔ جیسے فقل انما الغیب لله اس کا مطلب یہی ہے کہ غیب

لہ افادات شیخ الاسلام

دانی کی صفت کا موصوف اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے ۔

دوم ۔ نفی و استثنار کے ذریعے قصر ہوتا ہے جیسے لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ ۔ یعنی دانائے غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے ۔

سوم ۔ تقدیم ما حقہ التاخیر جسے بعد میں آنا چاہیے اسے پہلے لایا جائے جیسے ایاک نعبد ۔ یہاں وللہ غیب السماوات الخ اسی کی مثال ہے ۔ اصل انداز یہاں یوں ہے وغیب السماوات والارض للہ لیکن قصر کی خاطر للہ کو پہلے لاکر ذہنوں میں یہ بات اتار دی ہے کہ دانائے غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن نے توحید عبادت کو سمجھانے کے لیے انداز اختیار کیا ہے کہیں فرمایا لا الٰہ الا اللہ اور کہیں بتایا اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم ۔ اور کہیں ارشاد ہوا انما اللہ الٰہ واحد جیسے توحید عبادت میں یہ انداز بیاں یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس میں بالذات کی قید لگا کر کسی نبی کو الٰہ مجازی یا بالواسطہ الٰہ قرار دیا جا سکے ٹھیک اسی طرح اللہ سبحانہ کی غیب دانی کی صفت میں بھی قصر کے مختلف انداز اسکی اجازت نہیں دیتے کہ مجازی اور بالواسطہ کی کسی قید کا اضافہ کیا جائے ۔ اگر ایسا ہو تو قصر کی روح پامال ہو کر رہ جائے ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے مستقبل میں کامرانیوں اور فتح مندیوں کی جو بشارت دی جا رہی ہے وہ قابل توجہ ہے ۔

جن ایام میں اس سورت کا نزول ہوا وہ دین اسلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑے صبر آزما دن تھے ۔ کفار کا غیظ و غضب شباب پر تھا ۔ اسلام کی ترقی نے انہیں بھڑکا دیا تھا ۔ وہ اسلام کے چمکتے چراغ کو بجھانے کے لیے مصروف کار تھے ۔ بے چارے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ سے تنگ ہو رہا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کے لیے ہر قدم اٹھایا جا رہا تھا بظاہر میں نگاہوں کو ہر سمت میں تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی اُمید کی کوئی کرن افق پر نظر نہ آتی تھی ۔ ان حالات میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آسمان و زمین میں سب کچھ جو پردے میں ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ۔ اور ہونے والے سارے معاملات کی چابی اللہ کے قبضے میں ہے ۔ آپ کا کام اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا ہے جو کچھ ہونا ہے وہ اسی راہ سے ہوگا ۔ تاریکیوں کے بادل کیسے چھٹے ۔ جونہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مکہ سے باہر نکل کر مدینہ پہنچے یکدم آپ کی پشت پناہی کے لیے عجیب و غریب سیاسی قوت اللہ سبحانہ نے مہیا کر دی اور اس کے ذریعے کیا عظیم تبدیلی آئی ؟ عرفات کے میدان میں وصال مبارک سے چند ماہ پہلے جس وقت آپ وداعی خطبہ دے رہے تھے اس وقت اس ملک کی آزاد حکومت کے تنہا

فرماں روا تھے۔ ملک کا حدود اربعہ یہ ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ کیا کہ شمال میں تبوک سے ایلہ تک اور جنوب میں یمن کے ساحل سے مشرق خلیج فارس تک اور مغرب میں بحر قلزم تک حکومت پھیلی ہوئی ہے۔ (التمدن الاسلامی)

خلاصہ یہ ہے کہ دوست دشمن سب کا اتفاق ہے کہ

سنہ ۱۰ھ میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو اسلام کی حکومت سارے جزیرہ عرب پر چھائی ہوئی تھی۔

ولله غيب السماوات والارض واليه يرجع الامر كله کو پڑھیئے اور دس لاکھ مربع میل زمین اس آبادی کا خیال کیجئے جو زمانہ نبوت ہی میں اسلام کے زیر نگیں آچکی تھی۔ اور زمانہ نبوت کے بعد دس بارہ سال کی تھوڑی سی مدت میں۔ خلافت صدیقی و فاروقی میں ایران، مصر، شام، الجزائر، ترکستان تک اسلام کی جو حکومت پھیل گئی۔ پھر عہد عثمانی کی فتوحات بھی۔ اس میں انسانوں کی کتنی بڑی تعداد اسلام کے احاطہ میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کے اندازے کے لیے جرجی زیدان کا وہ بیان پڑھیئے جو اس نے التمدن الاسلامی میں لکھا ہے کہ

اسلامی حکومت کے مقبوضہ میں اس زمانے کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ داخل ہو گیا تھا۔ جس میں عرب بھی تھے اور ایران کے باشندے بھی۔ ان میں کلدانی بھی تھے اور روم والے بھی۔ گاتھ قوم کے لوگ بھی تھے قبطی بھی، سوڈانی بھی، بربر بھی جو زبانیں یہ بولتے تھے ان میں عربی، فارسی، ہندی، رومی، ترکی، کردی، آرمنی نیز قبطی اور بربری کے سوا بھی زبانیں تھیں۔

جرجی زیدان نے قدیم معتبر وثائق سے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اس زمانہ میں تین کروڑ کی آبادی تو صرف مصر کی تھی۔ مجموعی طور پر پہلی صدی ہجری ممالک محروسہ کے متعلق پوری آبادی کا تخمینہ یہ لکھا ہے کہ

اسلامی قلمرو کی آبادی اپنے عنفوان شباب میں بیس کروڑ سے پچیس کروڑ تک تھی۔

اسی مصنف نے اپنے اس بیان کو اس فقرے پر ختم کیا۔

مردم شماری کی یہ تعداد وہی ہے جو اس وقت پورے یورپ کی ہے۔

بہرحال پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے بتدریج ۲۵ سے ۳۰ کروڑ تک آبادی کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا اور اسلام کا ایک قانونی حکومت کی صورت میں چھا جانا کیا ولله غيب السماوات والارض

والیہ یرجع الامر کلہ کی واقعاتی تفسیر نہیں ہے۔ اوراس کے ساتھ اس واقعہ کو بھی اگر ملا لیا جائے کہ ان اسلام میں داخل ہونے والوں کو صرف حلقہ بگوش اسلام نہیں کیا بلکہ ان کو روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام کا جدید نظام دیا تو آیت قرآنی کی معنویت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ آخری سطریں ہیں جو سورۃ ہود کی تشریح میں اس نیاز آگیں کو حوالہ قرطاس کرنے کی توفیق ہوئی۔ الحمد للہ

اتوار مورخہ ۵ شعبان المکرم ۱۴۱۱ھ
۱۳ مارچ ۱۹۹۱ء

معالم القرآن

سورہ یوسف علیہ السلام مکّی ،

رکوع ۱۲

آیات ۱۱۱

نام

اس سورۃ کا نام سورۃ یوسف علیہ السلام ہے یہ نام اس لیے ہے کہ یہ پوری سورت حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

موضوع

اس سورت کا موضوع انسانی اعمال واخلاق ہیں۔ فضائل اور رذائل دونوں پر بھرپور تبصرہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض اس کی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعے سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرتا ہے۔ اور جس کے سبب سے اس کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اُٹھتی ہے یہی عمل کی وہ روح ہے جس کے ذریعے فضائل اور رذائل لبادہ وجود پہنتے ہیں۔ سورہ یوسفؑ میں آپ چار کردار دیکھیں گے دو رذائل کا نمونہ ہیں اور دو فضائل کا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اگر فضائل کا نمونہ ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اور امراۃ العزیز رذائل کا نمونہ ہیں۔

حضرت یعقوبؑ صبر جمیل، تحمل، حلم، سکینت کا اور حضرت یوسفؑ انسانی سیرت کی فضیلت کا۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی فضیلت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اس نقطہ نظر سے سورہ یوسفؑ کا مطالعہ کرو تو تمہیں محسوس ہوگا کہ سورہ یوسفؑ ایک آئینہ ہے جس میں دونوں اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھے بھی اور بُرے بھی جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حاضر و مستقبل اس میں دیکھا اسی طرح آپکے دشمنوں نے بھی ضرور دیکھا ہوگا

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً دوہزار سال پہلے دنیا کے نقشہ کا حال یہ تھا کہ سرزمین مصر وقت کے تمدن و تہذیب کا مرکز بن چکی تھی۔ لیکن اس کے اطراف واکناف کی قومیں ابھی تمدن وحضارۃ سے آشنا نہ تھیں اور صحرا نشینی اور بدویت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مصر کے قریب تر علاقہ وہ تھا جو آگے چل کر فلسطین کے نام سے مشہور ہوا اور جسے خاکنائے سینا نے سرزمین افریقہ سے ملا دیا ہے۔ اس علاقہ کی تمام پچھلی آبادیاں مٹ چکی تھیں۔ اب محض ایک صحرائی علاقہ تھا۔ جو مویشیوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ اور مختلف بدوی قبائل وہاں وہاں بودوباش رکھتے تھے۔ انہی قبائل میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور تمدن قدیم کے ایک دوسرے مرکز یعنی سرزمین دجلہ وفرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان میں مقیم ہو گئے کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت کے مغربی جانب واقع ہے اور دریائے یردن سے سیراب ہوتا ہے۔ تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی الٰہی سے منتخب کیا تھا۔ اور اللہ سبحانہٗ نے فرمایا تھا۔

> تو جس جگہ کھڑا ہے اس کے چاروں طرف دیکھ یہ تمام ملک میں تجھے اور تیری نسل کو دوں گا۔ اور تیری نسل کو خاک کے ذروں کی مانند بنا دوں گا۔ اگر کوئی خاک کے ذروں کو گن سکتا ہے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔ (پیدائش ۱۳۔۱۵)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں مقیم ہو گئے تو وقتاً فوقتاً انہیں اور بشارتیں بھی ملتی رہیں۔ ان تمام بشارتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ سبحانہٗ نے ان کو امتوں کا پیشوا بنایا۔ نسلوں کا مورث اور بادشاہوں کا جد بنایا اور ان کی نسل کو اپنی برکتوں کے لیے چن لیا ہے۔ جب تک ان کی نسل ظلم وضلالت سے آلودہ نہ ہوگی۔ وعدہ کی برکتوں کی مستحق رہے گی۔ یہ بشارتیں اس خاندان میں اللہ کا عہد سمجھی جاتی تھیں۔ خاندان کا ہر بزرگ اسے محفوظ رکھتا اور پھر اپنے وارث کو وصیت کرتا یہ عہد دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ نسل ابراہیمی اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور اس کے لیے دعوت کا کام کرے گی دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ اسے برکت دے گا اور اس کی دعوت کامیاب ہوگی۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خبر دی گئی تھی۔ کہ تیری اولاد ایک ایسے ملک میں جائے گی۔ جو تیرا ملک نہ ہوگا وہاں کے لوگ اسے غلام بنا لیں گے اور وہ چار سو برس تک وہاں رہے۔ (پیدائش ۱۵۔۱۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حجاز میں بس گئے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کنعان میں خاندان کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بارہ لڑکے ہوئے۔

چھ لیاہ بیوی سے روبن[1]، شمعون[2]، لاوی[3]، یھوداہ[4]، اشکارا[5]، زیلون[6]،

دو بلہاسے دان[7] اور نفتالی[8]،

دو زلفہ سے جد[9]، اشر[10]،

دو راخل سے یوسف[11]، بن یمین[12]

فلسطین میں تمام علاقے کی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کی زندگی بھی بالکل بدویانہ زندگی تھی۔ مویشی چراتے تھے۔ اور ان کے گوشت، اُون اور دودھ پر گزران کرتے تھے۔

سورۃ یوسفؑ کا نزول

اس سورت کے مضامین کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس سے سورت کے قاری کو خود بخود محسوس ہوگا کہ یہ سورت بھی زمانہ قیام مکہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے بلکہ بتلانے والوں نے بتایا ہے کہ سورۃ ہود کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر یہ بات بھی ملالی جائے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے۔ کہ

ابو رافعؓ ابن مالک پہلے وہ شخص ہیں جو مدینے میں سورۃ یوسف لے کر آئے۔

ابو رافعؓ ان میں سے ہیں جنہوں نے مکہ میں عقبہ میں اسلام قبول کیا تھا تو اس سے سورۃ یوسف کا زمانہ نزول کھل کر سامنے آجاتا ہے یہ بات تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ کہ قرآن میں سورۃ یوسف کے نزول کا پس منظر کفارہ مکہ کا قصہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں کوئی امتحانی سوالنامہ ہے۔ محققین نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ تشریح و تفسیر قرآن میں اس قسم کے واقعہ کی ضرورت ہے۔ اصلی پس منظر میں خود قریش کا کردار کافی ہے۔ ان کا طرز عمل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برادران یوسف کا تھا۔ بالخصوص اس مرحلہ پر جبکہ وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ یا جلا وطن کر دیں اور یا قید کرلیں اس لیے برادران یوسف اور یوسف علیہ السلام کے تاریخی واقعہ کو چسپاں کر کے قریش کو بتایا ہے

کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو ماضی میں یوسف علیہ السلام کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر رہے تھے وہ وقت قریب آرہا ہے کہ تم اپنی سازشوں میں ناکام ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گر و گے اور حضور اقدس صلی علیہ وسلم تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا۔

روحانی صداقت اور مادی ترقی کا مقابلہ

واقعہ کی اصلی شخصیتیں دو ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ ہے۔ مادہ پرست انسانوں کی نظر کائنات اور اس کی چیزوں پر ہوتی ہے جبکہ نبوت کی نظر خود انسان پر ہوتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا گھرانہ دین حق اور توحید کی امانت رکھتا تھا۔ وحی الٰہی کی برکتوں سے مالامال تھا۔ لیکن مادی ترقیوں اور دنیوی شوکتوں میں سے کوئی بات بھی اسے میسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ شہری زندگی کی ابتدائی خصوصیات سے بھی آشنا نہ تھے۔ اس کے تمام افراد صحرا میں رہتے تھے۔ مویشی چراتے تھے اور قدرتی زندگی کی سادگی پر قانع تھے۔ لیکن مصر کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان سے محروم تھا لیکن وقت کی تمام مادی ترقیوں کا سرمایہ دار تھا۔ اس کے دارالحکومت کے لوگ لکھنے پڑھنے میں ماہر تھے۔ اس کے امراء و اشراف، حکمرانی و دانشوری میں ترقی یافتہ تھے اس کے مندروں کے کاہن حقائق اشیاء کے بھید جاننے والے تھے۔ اور اس کے حکیم علوم و صنائع کے عجائب و غرائب سکھلانے والے تھے۔ آج اثریات مصر نے ایک مدون علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کا فرعون غالباً وہ شخص تھا جسے آثار مصر میں آیونی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں مصری تمدن پوری طرح ترقی کر چکا تھا۔

جب عجیب و غریب اتفاقات نے اس صحرائی گھرانے کے ایک فرد کو مصر پہنچا دیا اور ایسی حالت میں پہنچایا جو کسی حال میں بھی عزت و کامرانی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ یہ نکلا کہ دونوں قوتوں میں مقابلہ ہوا اور بالآخر دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس دین حق کے سوا اور کچھ نہ تھا مصریوں کے پاس دین حق کے سوا اور سب کچھ تھا۔ یہ صرف دین حق کی فضیلت سے آراستہ تھے۔ وہ ہر طرح کی مادی فضیلتوں میں تفوق

رکھتے تھے ۔ بایں ہمہ ہر مقابلہ میں فتح مندی حضرت یوسف علیہ السلام کی ہی سیرت و عمل کو ہوئی ۔ اور قدم قدم پر مادی فضیلتوں کو اپنے تفوق سے دست بردار ہونا پڑا ۔ حتیٰ کہ جب مملکت کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تو اس کی نجات کے لیے مادی فضائل کی کوئی پیداوار بھی کام نہ آئی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سر کو جھکنا پڑا کہ ملک کی سلامتی کی راہ نکال دے ۔

سورۃ یوسفؑ کے مضمرات

قرآن کے دوسرے واقعات میں تکرار ہے مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن میں مکرر نہیں ہے پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ ایک ہی جگہ پیش کیا گیا ہے ۔

اس پوری داستان میں قرآن حکیم جس گہری حقیقت کو انسان کے حجلہ دماغ میں اتارنا چاہتا ہے یہ ہے کہ کوئی معاملہ کتنا ہی عجیب معلوم ہوتا ہو اور کیسی ہی عجیب حالت میں پیش آیا ہو ۔ یہ قوانین الٰہی کے قدرتی نتائج کا ظہور ہے اور حقیقت شناسوں کے لیے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے ۔ یہ سب کچھ عالم انسانی میں ایسا ہی ہوا جیسے عالم مادی میں آگ کے جلانے سے گرمی ہوتی ہے ۔ یا پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے ۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج مقرر فرما دیئے ہیں اور جب کبھی ایک خاص طرح کا عمل وجود میں آتا ہے ۔ ایک خاص طرح کا نتیجہ بھی ضرور وجود میں آجاتا ہے ۔ یہاں اشیاء کی طرح اعمال میں بھی علت کے ساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے برادران یوسفؑ نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ خاص طرح کا انسانی عمل تھا ۔ خاص طرح کے عمل کا نتیجہ بھی خاص ہی طرح ظاہر ہوا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام زندگی کی مختلف آزمائشوں میں جو کچھ کرتے رہے ہیں ۔ اس میں جھانک کر دیکھو تو تم محسوس کرو گے کہ ایک خاص سیرت کے خاص اعمال تھے اور جب اعمال ہیں تو ضروری ہے کہ جیسے اعمال ہوں ویسے ہی نتائج بھی ہوں ۔

اسی طرح اس داستان کے تمام اعمال کا مطالعہ کرو ۔ ہر سیرت ایک خاص طرح کے عمل کا آئینہ ہے اور ہر عمل ایک خاص نتیجہ تیار کر رہا ہے ۔ لہٰذا جہاں تک اعمال و نتائج کا تعلق ہے یہ تاریخ انسانیت کا الگ واقعہ نہیں بلکہ قانون الٰہی کی وہی کارفرمائی ہے جو ہمیشہ سے کارفرما ہے ۔

بلاریب یہاں واقعات کی نوعیت عجیب تھی ۔ اور ان کے نتائج بھی عجیب تھے ۔ لیکن قانون الٰہی کی نیرنگیوں کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے اس کی ہر بات عجیب ہوتی ہے اور سرتاسر اس میں شان اعجاز ہوتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ یوسف میں جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیئے ہیں۔ واقعہ کا آغاز ہی یہ کہہ کر کیا ہے۔ لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین۔ پھر خاتمہ میں یہی بات دوسرے عنوان سے دہرائی۔ لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب۔ یعنی ارباب دانش کے لیے اس میں عبرتیں ہیں نشانیاں ہیں۔ نیز متعدد آیات میں اہم واقعات کے بعد یہ تصریح کر دی کذالک نجزی المحسنین۔ انہٗ لا یفلح الظالمون۔ انہٗ من یتق ویصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین یعنی یہ سب کچھ جنے لباده پہنا۔ اعمال کا نتیجہ ہے۔ بدلا ہے۔ مکافات ہے۔

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے۔ جو بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عملی وہی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا۔ صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں ہو سکتا جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے حصے میں آیا۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہو گا جو امرأۃ العزیز کو ملا۔ جھوٹ کتنا ہی غور و فکر کے بعد تراشا جائے سچ نہیں ہو سکتا۔ سچ کتنی ہی ناگواریوں میں گھر جائے لیکن جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمران قوت ہے سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے اس کا لوہا سب کو ماننا پڑے گا۔

اس سورت میں سیرت یوسف ؑ کے مختلف مناظر پیش کیئے گئے ہیں۔ آیئے تفصیلات پڑھنے سے پہلے ان مناظر پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اور اپنے والد کے سامنے اس کا بیان۔
حضرت یوسف علیہ السلام کو والد کی ہدایت کہ خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی سازش کا حضرت یعقوب ؑ کی جانب سے اندیشہ
حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کا خواب کا پیش منظر بتانا۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے خواب کے پیش منظر میں نبوت اور تاویل الاحادیث کی بشارت۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی سازش اور بھائیوں کا حسد۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے بھائیوں کی اسکیم
حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کے لیے بھائیوں کی مشاورت مجلس مشاورت میں دو تجویزیں قتل یا ملک بدر کرنا۔
حضرت یوسف علیہ السلام کو کسی گمنام کنویں میں ڈالنے پر بھائیوں کا اتفاق
حضرت یوسف علیہ السلام کو لے جانے کے لیے بھائیوں کی حضرت یعقوب ؑ سے درخواست بھائیوں

کی حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے چرب زبانی
حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی پر حضرت یعقوب علیہ السلام کا اظہارِ غم اور بھیڑیئے کا اندیشہ
حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کا گمنام کنویں میں ڈال دینا ۔ اور اللہ سبحانہ کی جانب سے
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے سامانِ اطمینان
حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد بھائیوں کا بھیڑیئے کے حملہ کا جھوٹا افسانہ بنانا۔
حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے جھوٹا افسانہ پیش کرنا ، رونا دھونا اور قمیص پر جھوٹ
موٹ کا خون ۔
حضرت یعقوب علیہ السلام کا ان کے کذب پر مطلع ہو جانا اور صبر جمیل کا شیوا اختیار کرنا، ایک عرب قافلہ
کا کنویں سے گزرنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالنا اور خوشی منانی ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا قافلہ کے لیے تجارتی مایہ بننا اور قافلے کا ان کو مصر لے جانا قافلہ والوں
کا بازار مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا ۔
بازار میں حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کا خریدنا اور ان کے اخلاق وفضائل
سے متاثر ہونا ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کا آغاز عزیز مصر کے گھر سے ہوا ہے ۔
عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہونا اور ایک سخت آزمائش میں پڑ جانا ۔
عزیز مصر کی بیوی کی کلی ناکامی ، حیرت انگیز طریقہ الزام کا جھوٹا ثابت ہونا اور حضرت یوسف
علیہ السلام کی اخلاقی برتری ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال سیرت کا ایک اور منظر امرأۃ العزیز کی جانب سے مجلس کی آراستگی
حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے معصیت کے مقابلے میں مصیبت کو دعوت
حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کی زندگی کا آغاز اور جیل کے دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر
دریافت کرنا
حضرت یوسف علیہ السلام کا مقام نبوت اور قیدیوں کو دعوت الی اللہ ۔
بادشاہ کا خواب دیکھنا اور تعبیر کے لیے پریشانی
جیل کے قیدی کی تعبیر کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کی نشان دہی ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب کی تعبیر بتانا اور بادشاہ کو اس کی اطلاع ۔

جیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی کا سرکاری آرڈر۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا رہائی کا مژدہ سننا اور قید خانہ چھوڑنے سے انکار۔
رہائی سے پہلے عزیز مصر کی بیوی کے الزام کی تحقیقات کا مطالبہ کرنا۔
تحقیقات ہونا اور عزیز مصر کی بیوی کا اعتراف جرم اور حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت
رہائی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی دربار میں حاضری۔
بادشاہ کا حضرت یوسف علیہ السلام کا اکرام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے وزیر خزانہ بننے کا مطالبہ۔
سیرت یوسف ع کے باقی مناظر انشاءاللہ تیرہویں جلد میں آئیں گے۔

اٰیاتها ١١١ (١٢) سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ (٥٣) رکوعاتها ١٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ
بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ
الْغٰفِلِيْنَ ﴿٣﴾ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ
عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿٤﴾
قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ
كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٥﴾ وَكَذٰلِكَ
يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ
ع ٦ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦﴾

الف، لام، را یہ کھلی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ بلاشبہ ہم نے ہی اس کتاب کو عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ

تو ٹلے اللہ کے رسول اسی وحی کے مطابق جس کے ذریعے ہم نے آپ پر قرآن کی وحی کی ہے ہم آپ کو بہتر سے بہتر واقعہ سناتے ہیں۔ قرآن نازل ہونے سے پہلے آپ اس واقعہ سے بے خبر تھے[۲] تم بیان کرو اس واقعہ کو جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں[۳] حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا بیٹا اپنے اس خواب کو بھائیوں سے نہ بیان کرنا وہ تیرے خلاف کوئی سازش کرلیں گے یاد رکھ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے[۴]۔ اور بیٹے! اسی خواب کی طرح اللہ سبحانہ تجھے برگزیدگی عطا کرے گا۔ اور ہر بات کا علم عطا فرمائے گا۔ کہ باتوں کا نتیجہ کیا ہو۔ نیز جیسے تیرے بزرگوں ابراہیم و اسحٰق علیہم السلام پر اللہ اتمام نعمت کرچکا ہے۔ ایسے ہی تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کرے گا بلاشبہ تیرا رب سب کچھ جاننے والا اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے[۵]۔

تاویل الاحادیث

حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات میں ایک ۔۔ زیا ۔ گیا ۔ یں اللہ تاویل کا لفظ آیا ہے۔ شارحین قرآن نے اس پر دل کھول کر داد تحقیق دی ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت

طبع کے لیے ترجمان القرآن سے مولانا آزاد کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

عربی میں تاویل کے معنے کسی بات کے نتیجے اور مال کار کے ہیں اور باتوں کے مطلب و مقصد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس کی آیت ۳۹ میں ولما یاتھم تاویلہ کے نزدیک میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔ احادیث یعنی باتیں تاویل الاحادیث کا مطلب یہ ہوا کہ باتوں کا مطلب نتیجہ اور مال بوجھ لینے کا علم یعنی انسان میں علم و بصیرت کی ایسی قوت کا پیدا ہو جانا کہ ہر بات کے مطلب اور نتیجہ کا شناسا ہو جائے۔ امور و مہمات کے بھیدوں کا رمز شناس ہو جانا۔ ہر بات کی نبض پہچان لینی۔ ہر واقعہ کا مطلب پا لینا۔ کوئی بات کتنی الجھی ہوئی ہو لیکن اس طرح سلجھا دینا کہ ساری باتوں کی کل ٹھیک بیٹھ جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا ظہور کنعان کے صحرا میں ہوا تھا اور ایک ایسے خاندان میں جو پشتہا پشت سے صحرا کی بدویانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیدائش سے لے کر عنفوان شباب تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی نہ تو کسی طرح کی خارجی تعلیم و تربیت کا موقعہ ملا اور نہ شہری زندگی کی رسم و راہ سے واقف ہو سکے۔ جب شہری زندگی ہی سے آشنا نہ تھے، تو ظاہر ہے اجتماعی زندگی کی تمدنی خصوصیات سے کیوں کر باخبر ہو سکتے تھے۔ ملکی معاملات اور انتظامی مہمات کی تو ان کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑی ہو گی۔

بسا اوقات خاندان کے موروثی اثریات خارجی اثرات سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا خاندانی ورثہ نبوت تھا۔ شہریاری اور ملک داری نہ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توطن کنعان کے بعد سے تو شہری زندگی کا علاقہ ہی یکسر مفقود ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ جب گردش حوادث نے انہیں مصر جیسی متمدن سرزمین پہنچا دیا تو وہ نہ صرف اس کے نظم و نسق کے لیے سب سے بہتر حکمران ثابت ہوئے بلکہ ان کی کارروائی و حقائق فہمی نے مملکت کو اس کی سب سے بڑی ہولناک بربادی سے بچا لیا۔ اور ان کے فضل و کمال کے آگے سب نے سر جھکا دیا خود بادشاہ وقت کو اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک ایسے شخص میں جو چند سال ہوئے صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا تھا۔ یہ قوت علمی کیسے پیدا ہو گئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام معاملات و مہمات کی کل بٹھلانے والا ہو گیا یقیناً مبدأ فیاض کا کرشمۂ فیضان ہے۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے۔ علم تاویل الاحادیث کا سکھا دینا۔ اب جبکہ صناعی علوم کی تدوین اور فنی مصطلحات کی بناوٹوں نے طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں۔ ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے مصطلحہ الفاظ بولیں لیکن قرآن کی زبان صناعی مصطلحات کی زبان نہیں ہے۔ نہ علمی مصطلحات سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے ان ساری باتوں کے لیے

ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادا مطلب کا قدرتی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یعنی باتوں کے مطلب اور مال پالینے کا علم، تعلیم کی ساری کاوشیں، تربیت ذہنی کی ساری محنتیں، تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں کس غرض سے ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ باتوں کا مطلب سمجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ علم و دانش کا تمام تر حاصل و مقصود کیا ہے۔ یہی کہ باتوں کی کل بٹھائی آجائے۔ جس مطلب کے لیے ہم نے بے شمار علمی اصلاحیں بنائی ہیں۔ قرآن نے اسی کو بغیر کسی پیچ و خم کے اس طرح کہہ دیا جو ادا مطلب کا صاف اور قدرتی طریقہ ہے اور یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیریں بتلائی تھیں۔ اس لیے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کرنے کا علم تھا۔ بلاشبہ خواب کی بات بھی احادیث میں داخل ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک گوشہ اس کا یہ بھی تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ براہ راست علم تعبیر منام پر اس کا اطلاق ہوا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینا نبوت کے عام خصائص میں سے ہے اور ہر نبی وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خواب کی حقیقت معلوم کر لیتا ہے۔ خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سنتے ہی حقیقت معلوم کر لی تھی۔ اگر یہی بات مقصود ہوتی تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ خصوصیت سے تاویل الاحادیث کا ذکر کیا جاتا۔ یہ نبوت کے اعمال و خصائص میں سے تھی اور جب نبوت کا مقام مل رہا ہے تو لازمی طور پر اس طرح کی تمام باتوں کی قابلیت بھی مل رہی ہے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر فرمایا یجتبیك ربك ویعلمك من تاویل الاحادیث ویتم نعمته علیك۔ اس میں برگزیدگی ہے مقصود امتیاز و تفوق ہے۔ اور اتمام نعمت سے نبوت مراد ہے۔ لہٰذا تاویل الاحادیث سے کوئی تیسری چیز مقصود ہے۔ اگر خواب کی تعبیر ہی کی بات ہوتی تو وہ حصول نبوت کی بشارت میں آگئی تھی۔ علاوہ ازیں ایک نبی کے لیے تعبیر خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ خصوصیت سے اسے اللہ سبحانہ کا ایک خاص عطیہ قرار دیا جاتا۔

(۱) الف، لام، را یہ کھلی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ بلاشبہ ہم نے ہی اس کتاب کو عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔ تاکہ تم سمجھ لو۔ یعنی عربی زبان جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح، وسیع اور منضبط اور پرشوکت زبان ہے نزول قرآن کے لیے منتخب کی گئی۔ جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر کہ دنیا میں اس کے اولین مخاطب عرب ہوں گے۔ پھر عرب کے ذریعے سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی۔ اسی طرف لعلکم تعقلون میں اشارہ فرمایا کہ تمہاری زبان میں قرآن اتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم اس پیغمبر علیہ السلام کی قوم ہو اول اس کے علوم و معارف کا مزا چکھو پھر دوسروں کو چکھاؤ۔ چنانچہ

ایسا ہی ہوا۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں ۔

انزل اشرف الکتب اللغات علی اشرف الرسل بسفارۃ اشرف الملائکۃ وکان ذالک فی اشرف بقاع الارض وابتدأ نزولہ فی اشرف شھور السنۃ وھو رمضان فکمل من کل الوجوہ

سب سے اچھی کتاب سب سے اچھی زبان میں سب سے اچھے پیغمبر پر سب سے اچھے فرشتے کی وساطت سے سب سے اچھی جگہ میں اور سب سے اچھے مہینے یعنی رمضان میں نازل ہوئی۔ بس ہر پہلو سے مکمل ہے [1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے بارے میں چار باتیں بطور راہنما اصول بتائی ہیں ۔

اول قرآن کی ابانت

دوم قرآن کی قرآنیت

سوم قرآن کی عربیت

چہارم قرآن کے معانی کا سمجھنا۔

آیئے سب سے پہلے قرآن کی ابانت پر غور فرمایئے مبین کا لفظ ابان یبین سے لازم ہے یا متعدی۔ اگر لازم ہے تو ابان معنے میں بان کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کا منجانب اللہ ہونا واضح ہے ۔ یا یہ کہ جس کا معجزہ ہونا سب کو معلوم ہے اور یا یہ کہ جس کے معانی کے حقائق و دقائق اہل عرب کے لیے صاف واضح اور کھلے ہیں ۔ اور متعدی ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت و رشد کو بیان کرنے والی کتاب ہے ۔ یا جو احکام و قوانین کو پیش کرنے والی کتاب ہے ۔ زجاج کہتے ہیں کہ جو باطل کے مقابلے میں حق کو بیان کرنے والی ہے یعنی وہ کتاب جو اپنے بیان استدلال میں بالکل واضح ہے ۔ جس کی ہر بات ناقابل انکار دلائل سے آراستہ ہے ۔ جس کا انداز بحث و نظر دل نشین، طمانیت بخش اور تمام الجھنوں کو دور کرنے والا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی صداقت کی گواہی کے لیے کسی خارجی نشانی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی حقانیت و صداقت کے دلائل سورج کی طرح روشن خود اس کے اندر موجود ہیں ۔ بشرطیکہ لوگ کان کھول کر اس کو سنیں اور اس کے دلائل پر غور کریں یہ قرآن ہی کی ابانت کو بتانے کے لیے اسے دوسرے انداز میں ایجابی و سلبی انداز میں پیش کیا ہے ۔ لم یجعل لہ

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

عوجاقیما۔ نہیں رکھی اس میں کسی طرح کی کجی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ وخم کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ خود واضح اور صاف ہے۔ صاف بتاتی ہے۔ سیدھی راہ پر چلتی ہے۔ فکر ونظر کی مصنوعی ورزشوں سے جن کے دل جن کے دماغ اُلٹے پلٹے نہیں۔ ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی۔ ان کو محسوس ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لیے پیدا کیئے گئے۔ اور یہ کتاب ان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہ منفی پہلو ہے دوسرا ایجابی پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب قیم ہے، لازوال، غیر قانونی اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ قیام و بقا کی شدت اور حد سے زیادہ استواری استحکام درابانت پر قیّم کا یہ لفظ دلالت کر رہا ہے۔

قرآن کی قرآنیت

دوسری بات جوالکتاب کے بارے میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پڑھنے کی چیز ہے یعنی اس کتاب الٰہی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قرأت اور تلاوت میں تعبدی شان ہے۔ یہ ضابطۂ حیات اور روحانی ہدایت نامہ ہونے کے ساتھ افضل الاذکار بھی ہے یعنی اس کو پڑھنا بھی عبادت ہے کلام پاک چونکہ اصل دین ہے اس کی بقا راشاعت پر بھی دین کا مدار ہے۔ اس لیے اس کے پڑھنے اور پڑھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے۔ کمال اس کا یہ ہے کہ مطالب سمیت پڑھے اور ادنیٰ درجہ اس کا یہ ہے کہ فقط الفاظ سیکھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کا ماہر ان فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو میر منشی اور نیکو کار ہیں اور جو شخص قرآن کو اٹکتا ہوا پڑھتا ہے اور اس میں دقت اٹھاتا ہے۔ اس کو دوہرا اجر ہے۔ ایک اور ارشاد ہے۔ کہ حسد دو شخصوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس میں مشغول رہتا ہے اور دوسرے وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال کی بہتات عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو للّٰہ خرچ کرتا ہے۔ یہ حدیث بخاری میں بحوالہ عبداللہ بن عمرؓ آئی ہے۔ ایک اور ارشاد جو بخاری اور مسلم میں بحوالہ ابوموسیٰ اشعریؓ آیا ہے۔ کہ

> جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے وہ سنگترے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اور بو بھی اچھی ہے۔ اور جو قرآن نہیں پڑھتا اور اس کے حکموں پر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو مزے دار مگر خوشبو کچھ نہیں۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال نازبو کی طرح ہے خوشبو تو اچھی مگر مزا ناگوار اور جو قرآن

بھی نہیں پڑھتا اور عمل بھی نہیں کرتا اس کی مثال صندل کی سی ہے ذائقہ بھی کڑوا اور بُو بھی ناگوار۔

اس عامۃ الورود قدرتی مثال کے ذریعے یہ بات سمجھائی ہے کہ قرآن کے پڑھنے نہ پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ترنج اور کھجور کو کیا نسبت ہے قرآن پاک کی حلاوت سے۔

قرآن نے قرأت قرآن پر زور دے کر کہا قرآن کی حفاظت کا اللہ سبحانہ کی جانب سے انتظام کیا گیا ہے کہ قرآن کا حفظ کے ذریعے نادر طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے معلوم تاریخ میں یہ طریقہ کسی کتاب کے لیے اختیار نہیں کیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں کے دلوں میں یہ جذبہ ابھر آیا کہ وہ قرآن کے متن کو شروع سے آخر تک یاد کریں۔ یہ سلسلہ نزول قرآن سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔ قرأت قرآن کا تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس خصوصیت نے قرآن کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوام عالم کو مسخر کرے گا معلوم تاریخ کے مطابق دنیا میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس کو ماننے والوں نے اس طرح کے یاد کرنے کا اہتمام کیا ہو جس طرح قرآن کے ماننے والے ہر دور میں کرتے رہے ڈیڑھ سال کی اسلامی تاریخ میں یہ جو کچھ ہوا ہے۔ انا انزلناہ قرآنا کی تفسیر ہے۔

قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا

تیسری بات کتاب الٰہی کے بارے میں جو فرمائی گئی ہے وہ کتاب کا عربی میں ہونا ہے یعنی یہ قرآن ہونے کے لیے عربی ہونا شرط ہے۔ ترجمہ قرآن روایت بامعنے جبکہ عربی میں قرآن روایت باللفظ ہے۔ اسی لیے نظم و معنے کے مجموعہ کو قرآن بتایا گیا ہے۔ قرآن کی عربیت کے سلسلے میں شارحین قرآن تو ادھر وادیوں میں نکل گئے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب الرسالہ میں قرآن کے عربی میں ہونے سے جو بات معلوم کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اُس پر غور کیا جائے یہ طے کرنے کے بعد کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اللہ سبحانہ نے قرآن کو عربی میں نازل کر کے اس کی دعوت کو سارے جہان کے لیے بنانے کی صورت یہ مقرر فرمائی ہے۔

اللہ سبحانہ نے قرآن کو ان کی قوم کی زبان یعنی عربی میں اتارا ہے نہ کہ دوسری زبانوں میں اس لیے لوگوں پر عربی زبان کا سیکھنا اس حد تک فرض ہے جہاں تک ان

کے بس میں ہو۔ (الرسالہ)

ظاہر ہے کہ عربی زبان بھی انسانوں ہی کی زبان ہے ایک انسان دوسرے انسان کی زبان سیکھ ہی لیتا ہے۔ بہرحال مجھے بتانا یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے انزلناہُ قرآناً عربیاً۔ کے زور سے جو بات سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ

> ہر مسلمان پر فرض ہے کہ عربی زبان کو اس حد تک سیکھنے کی کوشش کرے جہاں تک اس کے بس میں ہوتا کہ وہ اس بات کی گواہی دے سکے جیسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ کی کتاب پڑھ سکے اور ان الفاظ کو بول سکے جن کا بولنا اس پر فرض ہے یعنی تکبیر اور جن تسبیحوں کا حکم دیا گیا ہے اور تشہد اور اس کے سوا دوسری چیزیں اور جو اپنی کوشش کو زبان عربی کے سیکھنے میں بڑھائے گا جو اس نبی کی زبان ہے۔ جس پر نبوت ختم ہوئی ہے اور جن پر اللہ سبحانہٗ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے بہرحال عربی سیکھنا اس پر اسی طرح فرض ہے جیسے نماز اور نماز کے اذکار کا سیکھنا۔

واقعہ یہ ہے کہ آیت قرآنی

> لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون ۔
> نہ قریب جاؤ نماز کے نشہ کی حالت میں یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہہ رہے ہو۔

پر اگر غور کیا جائے اور یہ سوچا جائے۔ کہ مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ بول رہے ہو اس کو جان لو یہ نہیں کہ منطوق کو سُن لو تو یہ چیز قابل غور ہو جاتی ہے کہ عربی جانے بغیر نماز کے قریب آدمی کو جانے کی اجازت بھی ہے۔ آپ جو کچھ بول رہے ہیں میں اسے سمجھ رہا ہوں کیا یہ کہنا اس شخص کے لیے صحیح ہو سکتا ہے جو بولنے والے کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سُن رہا ہے اور بولے ہوئے الفاظ صرف سُننے کا نام جاننا رکھتا ہے یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ دیکھئے تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سجدہ جیسے مطلوب فا سجدوا سے سجدہ کامل ہے جس میں اطمینان ہو۔ ساتوں ہڈیوں پر سجدہ ہو لیکن اگر حدیث کی تمثیل کے مطابق مرغ کے ٹھونگے مارنے کی طرح سجدہ کر کے نماز ادا کرے تو قانونی طور پر نماز کے مطالبے سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے جس سجدہ کا مطالبہ کیا ہے وہ یہی سجدہ ہے ایسے ہی

نماز میں مطالبہ تو یہی ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اسے پڑھنے والا سمجھے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو الفاظ بھی کان سنتے ہیں اور ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے جدا جدا بھی جانتے ہیں تو نماز قانونی طور پر ہو جاتی ہے کہ یہ بھی علم ما تقولون کی ایک کمزور سی صورت ہے۔

بہرحال امام شافعیؒ نے قرآناً عربیاً سے یہ بات سمجھی ہے اور خوب سمجھی ہے۔

قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا انا انزلناہ قرآناً عربیاً ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا۔ اس میں ایک بہت زیادہ وسیع اور گہری حقیقت مضمر ہے۔ اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی عربی تھی لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہو سکتی اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج، اس درجہ متمول زبان ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہو۔ جو زبان قرآن کے معانی و دقائق کی متحمل ہوگی کیونکر ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے جس عربی میں امرأ القیس نے اشعار کہے ہیں اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم اور بہت زیادہ متمدن ہونی چاہیئے جتنی اس وقت تک سمجھی گئی ہے۔

عربی زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی ہے دراصل بدنی نشوونما کے اتنے مراحل سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں ہے ہمیری اور اکادی اقوام کا تمدن نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج کلدانی اور سریانی ادبی تمول دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مراحل تھے اور اسی نے آگے چل کر عربی کا بھیس اختیار کر لیا۔ جو زبان حضارۃ و تمدن کی اتنی بھٹیوں سے پک کر نکلی ہو ظاہر ہے کہ اس کے اسماء مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہو سکتے[۱]

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ عربی زبان تمام زبانوں میں ایک حیرت انگیز استثناء ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے۔ کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر عربی زبان کا مسئلہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی رہی ہے اس کے اسالیب اور الفاظ میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے مگر یہ ارتقاء

[۱] ترجمان القرآن

اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنے کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا جس طرح چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے۔ اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت تک باقی رہے۔

قرآن کے معانی کا سمجھنا

یہ بات لعلکم تعقلون کے ذریعے بتائی گئی ہے یعنی اس کتاب مبین کا عربی زبان میں نزول اس لیے ہوا ہے تاکہ اس کے اولین مخاطب اس کو سمجھیں۔ قرآن نے اس مقصد کے لیے صرف یہی تعبیر اختیار نہیں کی بلکہ اس مقصد کے لیے قرآن نے ایک سے زیادہ انداز اختیار کیئے ہیں۔ کہیں تدبر کی دعوت ہے اور کہیں تفکر کا مطالبہ ہے یہ انداز خطاب بتا رہا ہے کہ یہاں دو بعثتیں ہیں ایک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اُمت کی بعثت۔ یہ گویا دو بعثتیں ہیں اور دونوں حضور ہی کی بعثتیں ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی اُمت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی قوم کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنے میں قرآن کی یہ آیت بھی ہے۔

لیکونوا الرسول شهیدا علیکم وتکونوا شهداء علی الناس

اسی لیے احادیث میں ہے۔ کہ آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔ فانما بعثتم مبسرین ولم تبعثوا معسرین تم آسانی کرنے والے بنا کر مبعوث ہوئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔ بہرحال

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت کو بصیغہ جمع یہ مخاطبات اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ یہ امت ہی مبعوث ہے۔ یہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں یہ کہہ کر "جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا میں ان کے اولین مخاطب عرب ہوں گے۔ پھر عرب کے ذریعے سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی" اشارا کیا ہے۔

اس آیت میں لعلکم تعقلون کہہ کر قرآن نے اپنے مخاطبوں کو یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ نبوت کا کام اللہ سبحانہٗ کے احکام کو تمہارے سامنے بیان کرنا اور تمہارا کام ان احکام کو سمجھنا اور ان پر غور و فکر کرنا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔

اور ہم نے تمہاری طرف قرآن اتارا ہے تاکہ تم جو کچھ اتارا گیا ہے اسے لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کردو اور تاکہ لوگ اس پر غور و فکر کریں۔

اور غور و فکر کے ذریعے اللہ کے بیان کردہ احکام کی گہرائی تک پہنچنے کا نام تفقہ ہے یعنی حسی معلومات پر عقل جو کام کرتی ہے وہی کام وحی کے متعلق جب عقل انجام دیتی ہے تو اسی کا نام قرآن میں تفقہ اور اصطلاح اجتہاد ہے۔ السیوطیؒ نے اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں فقہ کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے۔

فقہ ایک عقلی علم ہے جو منقول سے حاصل کیا جاتا ہے

ان کے الفاظ یہ ہیں۔ الفقہ معقول من منقول۔ فقہ احناف کی مشہور کتاب الحاوی قدسی سے لفظ فقہ کے معنے صاحب البحر الرائق نے یہ نقل کیے ہیں۔

لغت میں فقہ کے معنے واقف ہونے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں خاص قسم کی واقفیت کا نام ہے یعنی نصوص کے معانی سے اور ان کے اشاروں سے ا ان کے مضمرات سے اور ان کے تقاضوں سے واقف ہونے کا نام فقہ ہے۔

اور جن کی عقل وحی کے معلومات سے نتائج اخذ کرتی ہے۔ ان کو فقیہ کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اللہ کے دین میں عقل اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ نہیں بلکہ نتائج و احکام کا جو روغن وحی قرآنی کی معلومات میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ عقل کی مشین ان کو اپنی طاقت کی حد تک ان سے نچوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ عقل کی اسی کوشش اور محنت کا نام تفقہ اور اجتہاد ہے۔

یہاں شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ میں یہ بات بالکل برمحل ہے۔ کہ شریعت میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے وہ کتاب و سنۃ سے دلیل تلاش کرنے میں جدوجہد کرنا ہے یا اجماع یا زبان عربی کی راہنمائی میں خاص مسئلہ میں کسی ایسے حکم کو ظاہر کرنا جو اس دلیل سے معلوم ہوتا ہو جس کی تلاش میں تم نے محنت کی ہے۔ اور اپنے خیال میں اس حکم کا علم تمہیں اس دلیل سے ہوا ہے اسی کا نام اجتہاد ہے۔

اسلامی نظام میں عقل کا مقام

حسی معلومات سے متاثر ہونے کے بعد جس طرح عقل انسانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اسی ذہنی تلاطم عقلی کے ہلچل کے نتیجے میں ہماری لائبریریاں علوم و فنون کی کتابوں سے اٹی پڑی ہیں۔ تو کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ قرآنی معلومات حاصل ہونے کے بعد وہی عقل بالکل کُند اور جامد بن کر رہ جاتی ہے جو کتاب لعلکم تتفکرون اور لعلکم تعقلون کے عقلی بیداری کے پیغاموں سے لبریز ہے اسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس نے نازل ہونے کے بعد دماغوں کو مفلوج، عقلوں کو کند اور ذہنوں کو کُند کر دیا۔ للعیاذ باللہ۔ نہیں بلکہ اس نے لعلکم تعقلون کے ذریعے مسلمان کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی عقل و فہم کو کام میں لائے جہاں کسی صورت حال کی نسبت قرآن و سنت دونوں خاموش ہوں۔ وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کے استعمال کا حق دیا گیا ہے۔ جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ یعنی وحی و نبوت کی راہ سے آئی ہوئی معلومات کے استعمال صحیح اور ان سے آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کے متعلق جدید نتائج کو صحیح اصول پر مستنبط کر سکتے ہوں۔ اور اس کے مطابق امر و حکم دینے کی واقعی صلاحیت و قابلیت، ماہرانہ لیاقت و استعداد رکھتے ہوں۔ اللہ سبحانہ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرما کر

فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقہوا فی الدین

کیوں نہیں چل پڑا ہر فرقہ سے ایک گروہ دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے

اسلام میں حقداروں کے ایک مستقل باب کا افتتاح کر دیا۔ قرآن کی یہ آیت قیامت تک پیش آنیوالے دینی و قانونی حوادث کے حل کی اساسی بنیاد ہے۔ یہاں حافظ ابن حزم اندلسیؒ کا وہ بیان غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ جو انہوں نے اسی آیت کی روشنی میں اپنی کتاب الاحکام میں لکھا ہے۔

مسلمانوں کی جماعتیں خواہ وہ کسی گاؤں میں یا کسی بدوی منزل یا قلعہ میں جہاں کہیں بھی

اکٹھی ہو کر رہیں ان پر فرض ہے کہ ان میں کچھ لوگ دین کے احکام کی طلب وتلاش اور تحصیل کے لیے آمادہ ہوجائیں۔ یعنی اول سے آخر تک دین کے سارے مسائل سیکھیں ان کو پورے قرآن کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے اور احکام کی حدیثوں میں جو صحیح ہیں۔ ان میں کوئی کتاب پڑھیں۔

اسی آیت کے ذیل میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کے ہر گاؤں ہر شہر میں ایسے آدمی ہوں جنہیں پورا قرآن یاد ہو اور وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن خوانی، قرآن دانی کا دروازہ ان لوگوں کے لیے رہتی دنیا تک کھلا رہنا چاہیئے جو اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ قرآن میں یہ واجب اور فرض قرار دیا گیا کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت سے ایک گروہ وحی ونبوت کے علمی سرمائے کی سمجھ دار اور اس میں تفقہ پیدا کرنے کے لیے تیار رہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے پہلے مخاطب اور اس فرض کے سب سے پہلے مکلف وہی حضرات ہو سکتے ہیں جنہیں ہم صحابہ کرامؓ کہتے ہیں۔ اور جو لعلکم تعقلون کے اولین مخاطب ہیں۔

۲ احسن القصص

اے اللہ کے رسول اسی وحی کے مطابق جس کے ذریعے ہم نے آپ پر قرآن کی وحی کی ہے۔ ہم آپ کو بہتر سے بہتر واقعہ سناتے ہیں۔ قرآن نازل ہونے سے پہلے آپ اس واقعہ سے بے خبر تھے یعنی اس وحی کے ذریعے سے جو قرآن کی صورت میں تم پر نازل ہوئی ہے۔ ہم ایک نہایت اچھا بیان نہایت حسین طرز میں سناتے ہیں۔ جس سے تم اب تک اپنی قوم کی طرح بے خبر تھے۔ گویا واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے موجود تھا۔ مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا۔ قرآن حکیم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایسی عجیب ترتیب اور بلیغ و مؤثر انداز میں پیش کیا جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بموقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف راہنمائی کی اور قصہ کے ضمن میں علوم و ہدایت کے ابواب مفتوح کر دیئے۔ یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہان مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کر سکتا۔ صبر و استقامت دنیوی و اخروی کی کامیابی کی کلید ہے۔ حسد و عداوت کے انجام خذلان و نقصان کے سوا کچھ

نہیں۔ عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے، جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا ہے۔ اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا لیتا ہے۔ اخلاق، شرافت اور پاکدامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی بالآخر معزز بنا دیتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار حقائق ہیں جن پر اس احسن القصص کے تضمن میں متنبہ فرمایا مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں کئی روایات نقل کی ہیں۔ سب کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہود نے مشرکین کے ذریعے امتحاناً یہ سوال کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی۔ پھر بنی اسرائیل مصر میں کیسے پہنچ گئے۔ جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کرنا پڑا۔ شائد مسلمانوں کو بھی ایک مفصل تاریخی واقعہ جو بصائر و عبر سے مملو ہو سننے کا اشتیاق ہوا ہوگا۔ ادھر اس قصّے کے ضمن میں جن احوال و حوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا۔ وہ کئی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپکی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا۔ ان وجوہ سے یہ پورا واقعہ کافی بسط و تفصیل سے قرآن کریم میں بیان فرمایا تاکہ پوچھنے والوں کو معلوم ہو جائے۔ کہ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے اولاد کے شام سے مصر آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہوا ہے۔ پھر وہیں ان کی نسل پھیلی اور بڑھتی رہی تاآنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آکر فرعون اور قبطیوں کی غلامی سے انہیں نجات دلائی[1]

واقعی شان نزول کے موضوع پر روایات مختلف ہیں۔ اور ان کی تاریخی حیثیت بھی پایہ صحت سے گری ہوئی ہیں۔ علامہ شوکانیؒ نے ان روایات پر تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اس قصّے کے احسن القصص ہونے کا شارحین قرآن نے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ اس واقعہ کی خوبصورتی کو جاننے کے لیے اس پہلو پر غور کیجئے کہ یوں تو قرآن میں انبیا علیہم السلام اور ان کی قوموں کے درمیان کشمکش کے جتنے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ سب ہی عبرت و راہنمائی کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ کہ ماضی کی ان سرگزشتوں سے حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآہ ہونے کے لیے سبق حاصل کیے ہیں لیکن خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی یہ سرگزشت تو گویا ایک آئینہ ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام حالات بتا دیئے گئے۔ جو آپ کی قوم کی جانب سے پیش آنے والے تھے۔

ذرا اس پر غور فرمائیے کہ مکی زندگی میں معاندین آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شر سے محفوظ رکھا۔ مکہ چھوڑ کر آپ غارِ ثور میں نگاہوں سے اوجھل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت فرما رہے ہیں۔ مدینہ پہنچ کر آپ کو آہستہ آہستہ وہ وقار و اقتدار حاصل ہوا کہ اس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی ہے۔ اہل ایمان کی مدینہ کی طرف ہجرت اور مدینہ میں اسلامی حکومت کا قیام، اس حکومت کا ترقی کرنا اور اہل مکہ کا حلقہ بگوش طاعت ہونا۔ اہل مکہ سے آپ کا یہ کہنا۔ اذهبوا انتم الطلقاء لا تثريب عليكم اليوم۔ جاؤ تم آزاد ہو آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر سورۃ یوسف کا غور سے مطالعہ کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ ساری سرگزشت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی کاپی اور ہو بہو نقل پیش کر رہی ہے۔ بس آپ کی زندگی کی مکمل اور بھرپور تصویر ہی اس قصّہ کے احسن القصص ہونے کی وجہ ہے۔ یوں تو قرآن حکیم میں پہلے نبیوں کی پُرنور اور درخشاں زندگیوں کے ایک سے زیادہ واقعات ذکر کیے گئے ہیں جو ہر پہلو سے رشد و ہدایت کے انوار ہی انوار ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو جو احسن القصص کہا گیا ہے تو وہ قرآن میں مذکور انبیاء کے واقعات کے مقابلے پر نہیں بلکہ داستان سراؤں کے مقابلے میں ہے یعنی یہ واقعہ دنیا کے سارے واقعات کے مقابلے میں بہترین واقعہ ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اس میں عالم مادی سے ہٹ کر عالم انسانی سے بھرپور بحث کی گئی ہے۔ اس کے سارے پیچ و خم، نشیب و فراز، پیش آنے والی دشواریاں، منزل سے دل برداشتہ کرنے والے سنگین حالات، غافل کرنیوالے دلربا مناظر اور دلچسپیوں کو اتنے بھرپور انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ کسی ابہام کا نام و نشان نہیں۔ پھر اس جان گداز کٹھن اور دراز راستہ کی پامالی کے لیے راہ رو کو جس صبر، عزم، توکل، تقویٰ، عالی حوصلگی اور سیر چشمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا ذکر اس قدر دل نشین اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ سوچیئے جو واقعہ اور داستان ایسے حقائق سے لبریز ہو وہ داستان سراؤں کی داستانوں کے مقابلے میں احسن القصص نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

قدرت الٰہی سے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور یہ عجیب و غریب واقعہ کن حالات میں ظہور پذیر ہوا ایسے حالات میں جو اصل معاملہ سے کہیں زیادہ عجیب و غریب تھے۔ سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنوئیں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا۔ اور شاہراہ سے الگ۔ اتفاق سے ایک قافلہ راہ سے بے راہ ہو کر وہاں پہنچتا ہے پانی کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالتا ہے وہ اس میں بیٹھ جاتا ہے باہر آیا بھائیوں نے اسے بھاگا ہوا غلام بنا کر قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا وہ اسے مصر کے بازار میں فروخت کر رہے ہیں ایک خریدار نے خرید لیا۔ تو زر خرید غلام نے آقا کے گھر میں اپنے حسن عمل سے خواجگی کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب و غریب تھا۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب و غریب

وہ معاملہ ہے جب اس زرخرید غلام کو یک وقت دو باتوں سے دوچار ہونا پڑا نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت و کامرانی۔ اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی وہ پہلی سے بھاگا کہ اس میں معصیت تھی۔ دوسری کو اپنایا کہ اس میں اطاعت تھی پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ایسا جوان ساری باتوں سے عجیب ہے یعنی مصر کی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے خاندان کو بلا لیا عین دارالحکومت میں آباد ہوئے وہاں ان کی نسل میں اس قدر برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ یہ احسن القصص ہے دوسرے یہ کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک نہایت واضح دلیل ہے۔ دونوں باتیں الگ الگ ہیں احسن القصص کی بات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ ایک سرگزشت ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنی تمام زندگی کے نشیب و فراز کی کامیابی کی آخری منزل تک دیکھ سکتے ہیں تو اس سرگزشت سے زیادہ اچھی سرگزشت بابرکت اور قیمتی کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس میں آپ کو آپ کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ رسالت کی دلیل اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیب دانی کے مدعی نہ تھے۔ آپ نہ تو اس سرگزشت سے واقف تھے۔ اور نہ آپ کے پاس اس سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ تھا۔ یہ صرف اللہ سبحانہٗ کی وحی کا فیضان تھا کہ آپ اس سے واقف ہوئے اور اس صحت و صداقت اور ایسی وسعت و تفصیل کے ساتھ واقف ہوئے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء بھی اس سے واقف نہ تھے۔ اس پہلو سے یہ آپ کی نبوت کی ایک نمایاں اور روشن دلیل ہے کہ اگر آپ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہیں تو یہ باتیں اس احاطہ اور صحت و صداقت کے ساتھ آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔ انما اوحینا الیک ھذا القرآن سے اسی طرف توجہ دلائی ہے اور وان کنت من قبلہٖ لمن الغافلین سے اس امر واقعی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آپ کا علمی ذریعہ صرف اللہ کی وحی ہے اس سے غیب دانی خود بخود نفی ہو گئی ہے۔ کیونکہ غیب تو وہ علم ہے کہ اگر تم غیب دان ہوتے تو اس وحی الٰہی سے پہلے کبھی تو کچھ بتلاتے۔ بلاشبہ یہ وحی الٰہی کا فیضان ہے اور یہی دعوت نبوت کی صداقت کی دلیل ہے۔

(۳) حضرت یوسفؑ کا خواب

تم بیان کرو اس واقعہ کو جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی سے کہا کہ ابا جان

میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں یعنی گیارہ ستارے اور سورج وچاند میرے آگے جھک رہے ہیں۔ یہ خواب لڑکپن میں دیکھا تھا پس ہے سے

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات [1]

یہ تمہید ہے اس واقعہ کی جسے قرآن نے احسن القصص کہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک روز خواب دیکھا یہ ان کے لڑکپن کی بات ہے۔ اس خواب کو حضرت یوسفؑ نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ سے اس طرح بیان کیا۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کہ گیارہ ستارے سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب کو سب سے پہلے اپنے والد کے علم میں لانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام غیر معمولی طور پر سلیم الطبع، نیک نیت اور سعادت کی بلندیاں پر تھے۔ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام بچپن ہی سے نہایت متین، باوقار اور سنجیدگی کی نعمت سے مالا مال تھے۔ اس لیے آپ نے یہ خواب اپنے والد ماجد کو سنایا۔ انہوں نے خود ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ خواب پریشان نہیں ہے۔ بلکہ اونچے درجہ کا خواب ہے۔ والد سے خواب کا ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ خواب کو لبیب یا حبیب سے بیان کیا جائے۔ ارشاد نبوت کا شاید مأخذ یہی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ خواب دیکھو تو عقلمند صاحب الرائے یا پیار کرنے والے سے بیان کرو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی نگاہ انتخاب نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو چنا۔ جن پر ہر پہلو سے ان کو اعتماد تھا۔ خواب والد کے سامنے پیش کر رہے ہیں مگر انداز میں تواضع ہے۔ سامنے جاتے ہی بے دھڑک نہیں کہا کہ میں نے گیارہ ستارے سورج اور چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھا ہے بلکہ خواب کا ابتدائی حصہ انی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر کہہ کر ذرا ٹھہر گئے کیونکہ آنے والی بات ان کی بڑائی ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے اظہار سے ان کی تواضع طبعی رک رہی تھی۔ ذرا توقف کر کے فرمایا رأیتھم لی ساجدین۔ یہ بات رأیتھم کے تکرار سے معلوم ہو رہی ہے۔ رأیت کے تکرار میں یہی نکتہ بلاغت ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قصہ یوسف علیہ السلام کا آغاز خواب سے یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے کمالات کے لیے تمہید اور مقدمہ تھا۔ جیسا کہ حدیث عائشہؓ صدیقہؓ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کمالات کا مقدمہ رویائے صادقہ کو بتایا گیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات نبوت یعنی وحی کی تمہید سچے خواب ہیں۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے سپیدۂ صبح کی طرح اس کی نمائش ہوتی۔

یہاں بھی خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے جملہ کمالات کی تمہید ہو کر آئی ہے آیت میں سجدہ سے اصلاحی و شرعی سجدہ مراد نہیں جس کے معنی ایک متعین و معروف طریقہ پر زمین پر ماتھا ٹیکنے کے ہیں بلکہ سجدہ یہاں اپنے اصلی اور لغوی مفہوم میں ہے۔ یعنی انقیاد و اطاعت و تذلل کے مترادف آیا ہے۔

انی رأیت یعنی خواب میں دیکھا رأیت رؤیۃ میں سے ہو سکتا ہے اور رؤیا سے بھی لیکن شارحین قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں رأیت رویا سے ہے زمخشری رقم طراز ہیں۔ رأیت من الرؤیا لامن الرویتہ اور شارحین قرآن کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ لاتقصص رؤیاك۔

خواب میں ستاروں سورج اور چاند کے اس سجدے کی کیفیت کے تفصیلی ذکر سے قرآن حکیم، حدیث نبوی اور تورات سب خاموش ہیں۔ لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ یہ بیداری کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ خواب کا ہے۔ جہاں ہر وہ چیز جو تصور یا تخیل میں آسکتی ہے جسم و مثال کی صورت میں واقعہ بن کر بھی سامنے آجاتی ہے اس لیے یہاں وہ ذہنی سوالات پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو بیداری کے مشاہدے پر کیئے جا سکتے ہیں۔

یہاں کچھ شارحین قرآن نے ان ستاروں کے ناموں کی بھی ناکام کوشش کی ہے اور اس کے لیے ایک داستان بھی بنائی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں کوئی بستان نامی یہودی آیا۔ اور دریافت کیا۔ کہ جن ستاروں کو حضرت یوسف علیہ السلام نے سجدہ کرتے خواب میں دیکھا تھا۔ ان کے نام کیا ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی۔ یہودی چلا گیا حضرت جبرئیل؊ آئے آپ نے یہودی کو طلب کیا۔ آپ نے فرمایا اگر نام بتا دوں تو کیا مسلمان ہو جاؤ گے؟ اس نے مان لیا۔ فرمایا ان ستاروں کے نام یہ ہیں۔ جریان، طارق، ذیال، قابس، ذوالکفین، وثاب، عمودان، خلیق، مصبح، ضروح، قرح، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں یہ واقعہ سنن سعید بن منصور۔ مسند بزاز، مسند ابو یعلی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ ابن مردویہ، العقیلی، ابن حبان اور مستدرک کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے۔ کہ واقعہ نہیں افسانہ ہے۔ اور سارا کا سارا من گھڑت ہے۔ تمام کا مرجع سدی ہیں۔ صحیح احادیث میں کوئی حدیث اس کی مؤید نہیں ہے۔

۴ حضرت یعقوب؊ کا یوسف؊ کو حکم

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا بیٹا: اپنے اس خواب کو بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔ وہ

تیرے خلاف کوئی سازش کرلیں گے۔ یاد رکھ کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ یعنی۔ یعنی شیطان ہروقت انسان کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ وسوسہ اندازی کرکے بھائیوں کو تیرے خلاف اُکسادے گا۔ کیونکہ خواب کی تعبیر بہت واضح تھی۔ اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جو بہر حال خاندان نبوت میں سے تھے۔ ایسے واضح خواب کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں۔ اور چاند سورج والدین ہیں۔ گویا یہ سب کسی وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کے سامنے سر جھکائیں گے۔ چنانچہ سورت کے آخر میں ھٰذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلھا ربی حقا۔ کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے پیشتر ہی یہ محسوس کرتے تھے۔ کہ یوسفؑ کے ساتھ باپ کی خصوصی محبت کو دیکھ کر اس کے علاتی بھائی دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ اب انہوں نے یہ خیال کیا۔ کہ اگر کہیں یہ خواب سُن پائے تو شیطان حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑکا دے گا اور جوش حسد میں آنکھیں بند کرکے ممکن ہے وہ کوئی ایسی حرکت کر گزریں۔ جو یوسف علیہ السلام کی اذیت اور خود ان کی رسوائی اور بدانجامی کا موجب ہو اس لیے آپ نے یوسف علیہ السلام کو منع فرمادیا۔ کہ اپنا خواب بھائیوں کے رُوبرُو ذکر نہ کریں۔ یوسف علیہ السلام کا ایک حقیقی بھائی بن یامین تھا اس کے سامنے بھی ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی گو اس سے بُرائی کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ سُن کر بے احتیاطی سے دوسروں کے سامنے تذکرہ کردے۔ اور اس طرح یہ خبر لوگوں میں شائع ہو جائے[1]

ان بھائیوں کے تعلقات جیسا کہ دنیا میں اکثر سوتیلے بھائیوں میں ہوتا ہے۔ آپ سے کشیدہ تھے۔ اس کشیدگی کے صحیح اسباب کا علم تو اللہ ہی کو ہے البتہ تورات میں دو سبب بتلائے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام بچپن ہی سے سلیم الطبع تھے۔ نہ صرف یہ کہ خود شرارتوں سے الگ رہتے تھے بلکہ اپنے بھائیوں کی شرارتوں کی رپورٹ بھی اپنے والد ماجد سے کردیتے تھے۔ "یوسف ان کے باپ کے پاس ان کے بُرے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش ۳۷۔۲) دوسری بات یہ کہ حضرت یعقوبؑ کو ان کے ساتھ محبت غیر معمولی تھی۔ یہ بات بجائے خود دوسروں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اس کے بھائیوں نے یہ دیکھ کر کہ اس کا باپ اس کے سب بھائیوں سے زیادہ اسے پیار کرتا ہے۔ اس کا کینہ پیدا کیا اور اس سے محبت کی بات نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ایک وجہ تو بالکل کھلی ہوئی ہے۔ یعنی بچپن ہی سے آپ کا

[1] افادات شیخ الاسلام

سفید در شید ہونا۔ گیارہواں بھائی جو سوتیلا نہیں حقیقی تھا۔ مخالف نہ تھا۔ لیکن اس کی کم سنی کی بنا پر ممکن تھا۔ کہ بڑے بھائی اپنی سازشوں اور منصوبوں میں اس سے فائدہ اٹھالیں۔ آخر میں فرمایا۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین۔ اسے تمہارے بھائیوں کے دل میں وسوسہ ڈالنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یعقوب علیہ السلام کا یہ خیال ہی خیال نہ تھا تورات میں ہے کہ " بھائیوں نے یوسف کا خواب سن کر زبان سے بھی اپنے غصے کا اظہار کر ڈالا" تب اس کے بھائیوں نے اسے کہا کہ کیا تو سچ مچ ہمارا بادشاہ ہوگا۔ یا تو ہمارا حاکم ہوگا۔ انہوں نے اس کے خوابوں اور اس کی باتوں سے اس کا زیادہ کینہ پیدا کیا۔ آیت اس بات کی کھلی راہنمائی کرتی ہے۔ کہ شیطان کے اثر اور کینہ سے محفوظ رہنے کے لیے پیغمبرزادگی ہی کافی نہیں ہے۔ قرآن کا انداز بیان تو یہی بتا رہا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب بھائیوں کو نہیں بتایا ہے۔ اور یہی ان کی شان کے مناسب ہے۔ لیکن تورات کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کا ذکر بھائیوں سے کر دیا۔ یہ تورات کی تحریفات میں سے ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں خواب کے موضوع پر اچھی خاصی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ باتیں معالم القرآن جلد ۱۱ میں آیت ۲۴ " نوٹ ۲ " میں لکھ چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے۔ کہ رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے۔

خواب کی حقیقت

علماء نفس کہتے ہیں۔ کہ اس کی حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں۔ جب وہ سو جاتے ہیں۔ اور اس کے ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے۔ مگر چونکہ انسان عموماً عمیق اور پرسکون نیند سوتا ہے اس لیے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالت خواب کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی جب اس کی نیند گہری اور مستغرق نہیں ہوتی تو اس کو اپنی سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں۔ اسی کا نام خواب ہے۔

یہ تو فلسفہ قدیم کا فرسودہ خیال تھا۔ اب جدید زمانہ ترقی میں نفسیات کے علماء کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات جذبات اور ارادوں یا تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں۔ عالم خواب میں جب تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے۔ تو ان کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں۔ یہ شاید اس رؤیا کی توجیہہ

ہو گی۔ جن کو خواب پریشان یا اوہام دماغی کہنا زیادہ موزوں ہے۔

عرفائے روح اس خوب پریشان یا اوہام دماغی کے منکر نہیں ہے۔ لیکن رؤیا کی حقیقت ان کے نزدیک کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ روح جب تک جسم کے اندر ہے اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں۔ جسمانی و روحانی۔ اپنے جسمانی دروازے سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادے کی سطح پر رنگارنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے جہاں سے وہ عالم روحانی کی سیر کر سکتی ہے جس قدر اس کا تعلق اُنس و دلبستگی، شیفتگی اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہو گی۔ اسی قدر دوسرے کی طرف سے فراموشی و غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہو گی۔ حالت خواب میں روح کی ظاہری و جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہے۔ اور پھر روح کو جس قدر تعلقات خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوتی ہے۔ شہر ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے۔ جو روحیں کہ اس عالم جسمانی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقید نہیں ان کے لیے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں اسی کا نام مکاشفہ ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس قالبوں میں جو ارواح طیبہ ہوتی ہیں۔ وہ عالم ظاہری کی گرفتاریوں کے بعد بھی جس قدر آزاد اور بے تعلق رہتی ہیں وہ عام حد انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔ اسی لیے عالم رؤیا اور عالم مشاہدہ دونوں میں حقائق و اسرار کی بستیاں ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ بیداری تو بیداری وہ سوتے ہوئے بھی بیدار ہوتے ہیں۔ ان کے جسم سوتے ہیں۔ اور ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی ہیں۔ صحیح بخاری میں شریک بن عبداللہ کے حوالے سے حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث میں ہے۔ کہ

> وحی آنے سے پیشتر آپ کے پاس تین فرشتے آئے اس وقت آپ مسجد حرام میں تھے اور سو رہے تھے۔ ان میں سے پہلے نے کہا بھلا ان میں وہ شخص کون ہیں۔ درمیانی فرشتہ بولا جو درمیان میں لیٹے ہوئے ہیں۔ یہی سب میں افضل ہیں۔ آخری فرشتہ نے کہا اچھا جو ان سب میں بہتر ہیں ان کو لے چلو۔ اس شب تو اتنی بات ہو کر رہ گئی۔ پھر آئندہ کسی شب میں بھی فرشتے آپ کے خواب میں آئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی۔ کہ جب سوتے تو صرف آپ کی آنکھیں سوتیں۔ دل بیدار رہتا تھا۔ اور تمام انبیاء کرام کا یہی حال ہوتا ہے۔ کہ جب سوتے ہیں تو صرف ان کی

آنکھیں سوتی ہیں۔ ان کے دل بیدار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنی سپردگی میں لیا اور آسمانوں پر لے گئے۔ لے

اصل حدیث میں الفاظ تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم

موت اور نیند کم وبیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے۔ اور نیند میں عارضی ہوتی ہے۔ موت میں تمام تعلقات کے ظاہری بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں باقی رہتی ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں اسی طرف راہنمائی ہے۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا۔ یعنی اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ان کو نیند میں پورا پورا لے لیتا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

نیند میں توفی ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص شوق و ذوق کے ساتھ اپنے وطن مالوف سے سیر و تفریح کے لیے کہیں جائے اور سیر کے بعد خوش و خرم وطن واپس آجائے۔ یہ سیرگاہ عالم مثال ہے جس میں ملک و ملکوت کے عجائبات ہوتے ہیں۔

(مکتوب ۳۱ جلد سوم)

عربی زبان میں خواب کے لیے دو لفظ ہیں۔ ایک حلم جس کی جمع احلام آتی ہے۔ اس کے معنے خواب و خیال کے ہیں۔ دوسرا رؤیا یہ اس خواب کو کہتے ہیں۔ جس میں حقائق کی نمائش اور رمز شناسی ہو۔ ان دونوں

لے شریک بن عبداللہ کی یہ روایت اگرچہ صحیح بخاری میں ہے مگر محدثین نے اس میں بہت سے اوہام شمار کیے ہیں۔ ازان جملہ یہ کہ اس میں معراج کا واقعہ نزول وحی سے پہلے بتایا گیا اور اس سے زیادہ یہ کہ واقعہ اسرا کو خواب کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ شریک نے روایت میں واقعات کو گھٹا اور بڑھا کر اور آگے پیچھے کر دیا ہے۔ اس لیے آئمہ نے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے شفا میں اور امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔ کہ شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں خیر اس پر تو تفصیلی بحث انشاء اللہ معالم القرآن کی پندرھویں جلد میں آرہی ہے یہاں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی صفت تیقظ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ یہ صفت تمام نبیوں میں ہوتی ہے اصل یہ ہے کہ جن قلوب کو اللہ سبحانہ مہبط وحی بناتا ہے ان کو عالم قدس سے ایک غیر معمولی اتصال میسر ہوتا ہے اسی بیداری کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں۔

میں ایک فرق ہے۔ حلم میں وسوسہ شیطانی کا دخل ہوتا ہے جبکہ رؤیا اس سے پاک ہوتا ہے۔

رؤیا کے مشاہدات کی حقیقی اور صحیح رؤیت ان ہی کے لیے ہوتی ہے۔ جن کی روح و دل کی بینائی تیز اور بصیرت کے آنکھیں روشن اور ادراک و عرفان کے حواس لطیف ہوں اور جن کے نفس کے آئینے میں صلاح و تقویٰ کا صیقل زیادہ ہو۔

دنیا کے تمام مذاہب نے رؤیا کو خاص اہمیت دی ہے۔ قرآن نے جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی تکمیل کی ہے۔ اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے۔ معالم القرآن کی جلد گیارہ (۱۱) میں آیت لھم البشریٰ کے تحت پڑھ آئے ہو۔ کہ یہ آیت جب نازل ہوئی۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں بشارت کیا ہے۔ فرمایا وہ رؤیائے صالحہ ہے جو ایک مرد مسلم دیکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نبوت اور رسالت ختم ہو گئی ہے۔ لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی اور وہ مبشرات ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا مسلم کی رویائے صالحہ۔ یہ نبوّت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ بخاری و مسلم اور ترمذی کی متعدد روایتوں میں مختلف صحابہ سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ مومن کی رویائے صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصّہ ہے۔ اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نبوّت کا ایک حصّہ ہے۔

خواب کے بشریٰ ہونے کا مطلب

یہ بھی سمجھ لو کہ خواب کے نبوت کا ۴۶ واں حصہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ بلا شبہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے ایک مرفوع روایت ہے۔ الرؤیا الحسنۃ من الرجل الصالح جزء من ستۃ واربعین جزءً من النبوۃ۔ نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں مسلم سے مراد فاسق و فاجر نہیں بلکہ صالح اور نیک شخص مراد ہے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیک آدمی کبھی شیطانی خواب دیکھتا ہی نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو شخص بیداری میں نبوّت کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ صدق و اخلاص، امانت و دیانت داری اس کا شیوہ ہے۔ اندر باہر، دوست دشمن کسی کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اس کی فطرت پر صدق و سچائی کا پورا نقش قائم ہو چکا ہے۔ وہ سونے کے بعد بھی شیطانی تسلط و حکومت میں نہیں آیا اس لیے اس کا جو خواب ہوتا ہے وہ اکثر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص حالت بیداری میں جھوٹ اور دغا بازی کا عادی ہے وہ سونے کے وقت بھی شیطان ہی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس کے خواب بھی اکثر شیطانی اتصال و تصرف

کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے۔

الرؤیا الصالحۃ من اللہ والحلم من الشیطان

اچھا خواب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور برا شیطان کی جانب سے

خلاصہ یہ کہ انسان بحالت خواب اپنی بیداری کے حالات کے تابع ہوتا ہے اگر اتنی بات معقول ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ جس طرح انسان سونے کی حالت میں بیداری کے حالات کے تابع ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح موت کے بعد اپنی حیات کے حالات کے تابع رہے گا۔ من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ

خواب کے نبوت کا جز ہونے کا مطلب

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر سچا خواب نبوت کا جز ہے۔ بلکہ اس کا خواب نبوت کا جز بتایا گیا ہے۔ جو شریعت کی زبان میں صالح ہو۔ علامہ قرطبیؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ صالح سے مراد وہ شخص ہے کہ جو عبادات و عادات میں نبوت کے قدم بقدم ہو اطلاع علی الغیب نبوت کا خاصہ ہے۔ اس کی ابتدا، اچھے اور سچے خواب ہیں۔ اور اس کی انتہا وحی و نبوت ہے یعنی بحالت بیداری اللہ سبحانہٗ یا فرشتہ کے ساتھ مکالمہ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوت سے پہلے سچے سچے خواب دیکھتے تھے۔ چھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس کے بعد وحی آئی۔ نبوت کی مدت ۲۳ برس ہے۔ بعض علماء نے یہ دیکھ کر کہ ۶ ماہ ۲۳ سال کے مہینوں کا چھٹا حصہ ہے۔ یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں رؤیائے مؤمن کو اسی لیے چھیالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر خواب نبوت کا حصہ ہیں تو کیا خواب کو مختصر نبوت کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ قرآن و حدیث دونوں متفق ہیں۔ کہ نبوت ختم ہو چکی ہے تشریعی یا غیر تشریعی نبوت کی کوئی قسم اب باقی نہیں ہے۔

رؤیا کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہنے سے یہ سمجھنا کہ نبوت جاری ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ احادیث میں ایک طرف اگر رؤیا کو چھیالیسواں حصہ بتایا ہے تو دوسری طرف کچھ بلند اخلاقیوں کو چھبیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

التؤدۃ والاقتصاد وحسن السمت من ستۃ وعشرین جزاً من النبوۃ۔ بردباری، متانت، میانہ روی اور اچھی روش نبوت کا چھبیسواں جزء ہے۔

بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتایا کہ بیٹا اس خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا ممکن ہے کہ بھائی تمہارے خلاف کچھ کر بیٹھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سنتے ہی یہ اندازہ فرما لیا۔ کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے یا جیسا کہ القاشانی کی رائے ہے۔ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ بات الہاماً معلوم ہوئی۔ اور وجہ یہ بتائی۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین۔ یعنی کھلا ہوا دشمن شیطان تو موجود ہی ہے۔

شارحین قرآن نے اس انداز بیان سے یہ بھی معلوم کیا ہے۔ کہ کسی وقت حسد کے اندیشہ سے لوگوں سے اچھائی اور خوبی کو چھپا لینا برتری ہے۔ اس سے یہ اجتماعی قانون بھی اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ نیکی، خوبی اور حسن اگر کسی قبیح یا برائی کا ذریعہ بن جائے تو وہ قبیح اور برائی ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہُ العزیز نے اس سے یہ بھی سمجھا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ کے علاوہ کسی سے اپنے احوال بیان نہ کرنے چاہیئیں۔ اس میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی خاندان نبوت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ نبی نہ تھے۔ محققین کی یہی رائے ہے۔ کہ برادران یوسف نبی نہ تھے۔ علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ

صحابہ کرامؓ میں سے کسی سے برادران یوسف کے نبی ہونے کا نظریہ منقول نہیں ہے اور نہ ہی تابعین سے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ میں تفصیلی بحث کی ہے جس کی طرف شیخ الاسلام نے افادات میں اشارہ کیا ہے علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

قرآن و لغت بتا رہے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہ تھے۔ قرآن، حدیث آثار صحابہ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ جس کے سہارے ان کی نبوت کو شرف پذیرائی دیا جائے۔ نبی کہنے والوں کا بڑے سے بڑا استدلال یہ ہے کہ البقرہ اور سورۃ یوسف میں والاسباط آیا ہے۔ اور اسباط سے مراد اولاد یعقوب ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اسباط سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صلبی اولاد مراد نہیں ہے۔ بلکہ ذریت مراد ہے۔ ان کو بنی اسرائیل ایسے بولا جاتا ہے جیسے ذریت آدم کو بنو آدم کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ سبحانہ کا ارشاد ومن قوم موسیٰ امۃ اور وقطعنا ھم عشرۃ اسباطا امما۔ یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ کہ اسباط بنی اسرائیل کی اُمتیں ہیں۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ بنی اسرائیل میں اسباط کی وہی حیثیت ہے جو بنی اسمٰعیل میں قبائل کی ہے۔ لفظ سبط کے لغوی معنے ایک ایسے گھنے درخت کے ہیں۔ جس کی شاخیں زیادہ ہوں۔ لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو اسباط کہنا بے معنے

ہے۔ اس لفظ کے استعمال کی تاریخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے وابستہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی سے بنی اسرائیل میں انبیاء آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی نہیں ہے۔ قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ قرآن نے ذریت ابراہیمؑ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت داؤد، سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام کا ذکر کیا ہے۔ اگر یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی نبی ہوتے تو قرآن ضرور ذکر کرتا۔ نیز ارشاد نبوت میں اکرم الناس یوسف بن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم آتا ہے۔ اگر بھائی بھی نبی تھے تو اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کوئی کرامت نہیں ہے۔

اور اس پہلو پر غور فرمایئے کہ قرآن نے انبیاء کے محامد بیان کیے ہیں۔ اگر برادران یوسف نبی ہوتے تو کیا قرآن ان کی طرف ان جرائم کی فہرست بیان کرتا جو ان کے بارے میں قرآن نے پیش کی ہے۔ مثلاً والد کی نافرمانی، قطع رحمی، آزاد مسلم کو غلام بنانا اور اسے کافروں کے ہاتھ فروخت کرنا، جھوٹ بولنا اگر برادران کے نبی نہ ہونے کی کوئی بھی دلیل نہ ہو تو صرف ان جرائم سے ان کے دامنوں کا داغدار ہونا ہی ان کے نبی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔[1]

۵ حضرت یوسفؑ کو نبوت کی بشارت

بیٹے اسی طرح اللہ سبحانہ، تجھے برگزیدگی عطا کرے گا۔ اور اس بات کا علم عطا فرمائے گا کہ باتوں کا نتیجہ کیا ہو۔ نیز جیسے تیرے بزرگوں ابراہیم و اسحاق پر اللہ انعام کر چکا ہے ایسے ہی تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کرے گا۔ بلاشبہ تیرا رب سب کچھ جاننے والا اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔ یعنی جس طرح ایسا خواب دکھلایا اسی طرح محض جاذبہ رحمت سے اپنی بارگاہ قرب میں تجھ کو خصوصی انعام و مقام عطا فرمائے گا۔ چنانچہ نبوت عطا فرمائی اور طرح طرح کی ظاہری و باطنی نوازشیں کیں۔ آگے حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی بشارت دی ویعلمك من تاویل الاحادیث مثلاً تعبیر رؤیا یعنی خواب سن کر اس کے اجزاء کو ذہانت و فراست سے ٹھکانے لگا دینا۔ یا ہر بات کے موقع و محل کو سمجھنا اور معاملات کے عواقب و نتائج کو فوراً پرکھ لینا یا اللہ سبحانہ اور پیغمبروں کے ارشادات اور اقوام و امم کے قصے اور کتب نزلہ کے مضامین کی تہہ تک پہنچ جانا یہ سب چیزیں تاویل الاحادیث کے تحت میں مندرج ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد یہ بشارت بھی دی۔ کہ ویتم نعمتہ علیك وعلی آل یعقوب۔ یعنی

---

[1] روح المعانی

ظاہر ہے کہ ان اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ جب چھبیسویں حصے کو نبوت نہیں کہا جا سکتا تو چھیالیسویں جزر کو نبوت کیسے کہا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ رؤیائے صالحہ کو صرف تشبیہی لحاظ سے نبوت کا جزر کہا گیا ہے علامہ ابن ایقن کہتے ہیں کہ انبیار علیہم السلام کو غیب کی خبریں وحی کے ذریعے دی جاتی ہیں۔ اب یہ سلسلہ تو منقطع ہو گیا ہے۔ خواب کا سلسلہ باقی ہے اس اعتبار سے رؤیا کو اجزار نبوت کا حصہ شمار کیا گیا ہے۔ کچھ علمائ کہتے ہیں۔ کہ جو خواب جزر نبوت قرار دیا گیا ہے۔ وہ ہر شخص کا خواب نہیں بلکہ نبوت کا خواب ہے۔ مگر یہ جواب کچھ بے وزن ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جزر ہمیشہ اپنے کل کے مغائر ہوتا ہے۔ دیکھ لیجئے یہی کلمات جو اذان میں بولے جاتے ہیں۔ مل کر اذان کہلاتے ہیں لیکن علیحدہ ہو کر اذان نہیں کہلاتے۔ عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا انسان کے اجزار ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہتے ہیں۔ پانی اگر انسان کا چوتھا حصہ ہے مگر پانی انسان ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ خالص عقلی حقیقت ہے۔ تو پھر رؤیا اپنے کل سے الگ ہو کر نبوت کیسے ہو سکتا ہے، بات صاف ہے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کے حقیقی اجزار میں سے نہیں۔ بلکہ اس کے لوازم اور خصائص میں سے ہے کیونکہ نبوت کسی حقیقت مرکبہ کا نام نہیں ہے۔ جس کی تحصیل کی جا سکے وہ تو ایک منصب ہے۔ جس کا سرچشمہ اصطفار واجتبار خداوندی ہے۔ اس کے خصائص ولوازم کو مجازاً اجزار بولا جاتا ہے۔ یہاں حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں بڑی دقت نظر سے عجیب جدت طرازی کی ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب میں یہ حدیث نقل کی ہے "اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے" اس کے بعد یہ حدیث لائے۔ الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطان اچھے خواب اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اور بُرے شیطان کی جانب سے شارحین بخاری حیران ہیں کہ حدیث کا موضوع سے کیا جوڑ ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہاں امام بخاری رؤیائے صالحہ کے جزر نبوت ہونے کی ایک لطیف حکمت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

انما کانت جزء من اجزاء النبوۃ لانہا من اللہ بخلاف التی من الشیطان فانہا لیست من الاجزاء۔

یعنی رؤیائے صالحہ کے اجزار نبوت میں سے ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ خواب جو شیطان کی جانب سے ہو اجزار نبوت میں سے نہیں ہے۔ غالباً امام بخاری بتانا یہ چاہتے ہیں کہ جیسے وحی کی دو قسمیں ہیں۔ من اللہ اور من الشیطان ایسے ہی خواب بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ رحمانی اور شیطانی خواب رحمانی کا رشتہ نبوت سے ہے خواب شیطانی کا نبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اخروی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتیں عطا فرمائے گا۔ نبوت کے ساتھ بادشاہت میں حصہ دے گا۔ اور شوائد و محن سے نجات دے کر خوشحالی و فروغ بالی کی زندگی نصیب کرے گا۔ جیسا کہ اللہ نے تیرے والدین اسحاق و ابراہیم پر اس سے پہلے اتمام نعمت کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے تواضعاً اپنا نام نہیں لیا۔ اپنے والد حضرت اسحٰقؑ اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہم السلام کا ذکر فرمایا۔ حضرت ابراہیم کو اللہ سبحانہٗ نے اپنا خلیل اور نبی بنایا۔ اور انکے ذریعے نمرود کو ہلاک کیا۔ آگ کے شعلوں کو ان کے لیے گلزار بنایا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو نبوت عطا کی۔ پھر ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا نبی پیدا کیا۔ جس سے تمام انبیاء بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔ حدیث صحیح میں ہے۔ الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراھیم علیہم السلام۔ حضرت یعقوبؑ نے جو پیشن گوئی کی تھی۔ اس کا کچھ حصہ تو غالباً حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب سے سمجھے اور اس سے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا موزوں خواب دیکھا۔ اور کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کے خصائل و شمائل سے یا وحی الٰہی کے ذریعہ سے مطلع ہوئے ہوں گے آخر میں فرمایا ان ربك علیم حکیم۔ یعنی وہ ہر ایک کی مناسبت اور استعداد سے باخبر ہے۔ اپنی حکمت سے اسی کے مناسب فیض پہنچاتا ہے۔[1]

یہ تو ہے حضرت شیخ الاسلام کا تبصرہ۔ اب سنیئے تفصیل۔ آیت قرآنی میں بنیادی اور اہم شہادتیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دی ہیں۔ یہ ہیں۔

اوّل۔ اجتبار، دوم تعلیم تاویل الاحادیث، سوم اتمام نعمت۔ سب سے پہلے کذالك پر غور فرمایئے۔ دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جیسا اللہ سبحانہٗ نے اسحٰق و ابراہیم پر اپنی نعمتوں کا فیضان فرمایا ہے۔ ایسا ہی تجھے بھی اجتبار کی نعمت عطا فرمائے گا۔ دوسرے یہ کہ جیسے اللہ سبحانہٗ نے اس وقت رؤیا کی نعمت سے مالامال کیا ہے۔ ایسے ہی مستقبل میں تجھے اجتبار کی دولت سے ہمدوش کریگا۔ البقاعیؒ لکھتے ہیں۔

> اللہ سبحانہٗ نے اس رؤیا کی نعمت سے ہمدوش کیا ہے۔ اسی ہمدوشی کی طرح تجھے اللہ سبحانہٗ برگزیدگی عطا کرے گا اور بلند سے بلند تر مقامات کا تیری ذات کو مجمع بنائے گا۔

اور قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔

> جیسا کہ تجھے تیرے رب نے اس عظیم رؤیا سے برگزیدگی عطا فرمائی ایسے ہی تجھ کو تیرا رب نبوت اور حکومت کا شرف عطا کرے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اس خواب کے ذریعے تمہاری آئندہ عزت افزائی کی ایک جھلک تمہیں دکھا دی گئی ہے ۔ اسی طرح اور بھی عزتیں پردہ غیب میں تمہاری منتظر ہیں ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب خواب سنا تو چونکہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ نبوت کا آغاز رؤیائے صادقہ سے ہوتا ہے اور اس خواب کا ظاہر یہی بتا رہا تھا کہ یہ سچا خواب ہے اور خواب دیکھنے والے کے لیے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے ۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے ۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تمہارا رب تمہیں منصب نبوت کے لیے منتخب فرمائے گا ۔

اجتبار کے معنے

اجتبار جبی سے باب افتعال ہے ۔ اس کے معنے برگزیدہ کرنے کے ہیں ۔ اصل اس کی جبیت الشئی ہے ۔ یعنی کسی چیز کو حاصل کر لینا ۔ اسی سے عربی میں جبیت الماء فی الحوض بولا جاتا ہے ۔ اس جگہ کو جابیہ بولتے ہیں ۔ اور اسی سے بطور استعارہ خراج کو جبایہ بولا جاتا ہے ۔ اللہ سبحانہٗ کو مجتبیٰ بنانا یہ ہے کہ ایسے فیضان الٰہی کے لیے اسے مخصوص کر لیا جائے کہ بغیر محنت اور تگ و دو کے چند در چند انعامات حاصل ہو جائیں ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ مستقبل میں تجھ پر نبوت کا فیضان فرمائے گا ۔ یہ گویا نبوت کی استعداد کا فیضان ہو رہا ہے ۔ اور اس فیضان کی علامت حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ہے ۔ اسی لیے اس کے فوراً بعد ویعلمک آیا ہے ۔ یہ اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشار وحی موجب ہے ۔ کیونکہ یہاں سیاق کلام میں علم کے یکبارگی دینے کا ذکر ہے ۔ جو وحی موجب کی شان نہیں خصوصاً تاویل الاحادیث کا علم بیک وقت دیئے جانے کی تصریح ہے ۔ اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے فرمایا ۔ ذالکما مما علمنی ربی ۔ یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آکر ان کو حقیقت سے مطلع کرتی تھی ۔ بلکہ ان کے اندر خود یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیے ودیعت کر دی گئی تھی ۔ اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیار کو بچپن ہی میں علیم کا خطاب ملا ۔ وبشرناہ بغلام علیم ۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ نبی کی شان ہے ۔

تاویل الاحادیث پر ہم پہلے تبصرہ کر چکے ہیں اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے ۔

اتمام نعمت کا مطلب

ارشاد میں ویتم نعمتہٗ علیک وعلی آل یعقوب آخر تک آیا ہے ۔ اس کا مطلب

شارحین قرآن نے یہ بتایا ہے۔ کہ اتمام نعمت نبوت ہے۔ بیضاویؒ اور قرطبیؒ کا بھی یہی خیال ہے اور قرآن میں تشبیہ کما اتمہا کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ نے دین و دنیا کی ہم آہنگی کو اتمام نعمت قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن میں جس سیاق میں یہ بات کہی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تاویل الاحادیث اور اتمام نعمت دو الگ چیزیں ہیں۔ نبوت کا ذکر اجتباء میں ہو چکا ہے۔ تاویل الاحادیث کے بعد جو چیز ہے۔ وہ اقتدار ہے تحت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے جو دعا فرمائی اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

رب قد اتیتنی من الملك وعلمتنی من تاویل الاحادیث

اے میرے رب تُو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور تُو نے مجھے تاویل الاحادیث سکھائی ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نعمت اقتدار و حکومت ہے۔ اور یہ دین و شریعت کے ساتھ ملتا ہے۔ تو یہ اتمام نعمت ہے۔ نعمت تو واقعی دین و شریعت ہے اور دین و شریعت کے ساتھ جب اللہ سبحانہٗ حکومت بھی دے دیں تو یہ اتمام نعمت ہے۔ دین و آمیزش کے ساتھ دولت و حکومت سراسر رحمت ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں قرآن نے تو سلیمانؑ و داؤدؑ کا بھی یہی چہرہ پیش کیا ہے۔ بلکہ اوروں کا تو پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں کہ سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تخیلی قصہ کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھے؟ کہاں تھے؟ اور کب تھے؟ اس کی بجائے اگر یہ سوچا جاتا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول و عرض پر اقتدار بخشا گیا کہ گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک اس کی حکومت پہنچ گئی تھی۔ اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کا اقتدار تھا اور اتنی سائنسی ترقی اسے دے دی گئی تھی۔ کہ لوہے کی اینٹیں بنا کر بجائے گارے کے رنگ پگھلا کر ان اینٹوں کو جوڑ کر دیوار بنا رہا تھا۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ ایسی ایجادات و اختراعات پر اسے بھرپور قدرت حاصل تھی۔ جسے سائنس اور کیمیا کے اس دور میں بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن باوجود ان تمام سائنسی ترقیوں کے جب وہ دیوار بنا کر فارغ ہوئے تو بجائے کسی بڑائی یا کبریائی کے دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں۔ ھذہ رحمة من ربی۔ یہ میرے مالک کی مہربانی ہے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ جب دین و دنیا میں ہم آہنگی ہوتی ہے تو یہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے یہی بات جس کی بشارت مستقبل میں حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو دے رہے ہیں۔ قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہے۔ ویتم نعمته علیك.

تاکہ ان کا رب آپ پر نعمت کا اتمام کرے۔ اور یہی بات اہل ایمان سے مستقبل کے بارے میں کہی گئی۔ ولاتم نعمتی علیکم۔ اور حجۃ الوداع میں اس وعدے کو پورا کرنے کا یہ کہہ کر اعلان کیا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت میں نے تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لیے میں نے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

ان آیات کو ملانے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ اتمام نعمت سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہر جگہ، ہر خوف اور ہر مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح وحی الٰہی پر مبنی تمدن الٰہی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ نبوت کے قانونی اور سیاسی تقاضے پورے کر سکیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اور امت مسلمہ سے جن چھ آیات میں اتمام نعمت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی اتمام نعمت سے امت مسلمہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مادی، قانونی، سیاسی اور اجتماعی غلبہ مراد ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ﴿٧﴾ إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٨﴾ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ﴿١٠﴾

حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی داستان تاریخی میں ان لوگوں کے لیے جو حقیقت حال پوچھنے والے ہیں بڑی ہی عبرت و نصیحت کی نشانیاں ہیں ۔ جس وقت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ بلا شبہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کا سب سے زیادہ لاڈلا ہے ۔ حالانکہ ہم ان سے زیادہ طاقتور جماعت ہیں ۔ یقیناً ہمارے والد اس معاملہ میں غلطی پر ہیں آؤ یوسف کو مار ڈالیں یا کسی ملک میں پھینک آئیں ۔ تاکہ باپ کی توجہ کا مرکز باقی بھائی ہو جائیں ۔ اور یوسف کے بعد سارے

ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اسے گمنام کنویں میں ڈال دو اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ کر لو۔ اس طرح یوسف کو کوئی قافلہ اٹھا لے گا۔

معانی مفردات

عصبة ۔ جماعت، گروہ۔ یہ عصب سے ماخوذ ہے جس کے معنے جمع ہونے اور گھیرنے کے ہیں، علامہ زمحشریؒ لکھتے ہیں عصبۃ اور عصابۃ۔ دس اور دس سے زیادہ اشخاص کو کہتے ہیں۔ ان کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اتنے اشخاص سے سب کاموں میں قوت آجاتی ہے۔ اور وقت پڑنے پر یہ لوگ کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اور امام ابن جریر طبریؒ نے تصریح کی ہے۔ کہ نفر اور رہط کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا۔ اور مصباح میں ہے کہ عصبۃ مردوں کی جماعت ہے۔ اور اس کی جمع عصب ہے جیسے غرفۃ کی جمع غرف۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں "عصبۃ وہ جماعت ہے۔ جو ایک دوسرے کی مددگار ہو۔ نحن عصبۃ یعنی ہماری بات ایک ہے اور ہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ عصبۃ کتنے افراد کی جماعت ہے۔ اس موضوع پر ابوحیان اندلسیؒ نے البحر المحیط میں متعدد اقوال پیش کیے ہیں۔

ضلال ۔ گمراہی، راہ سے بھٹکنا، راہ سے دور جا پڑنا، کھو جانا، ضائع ہونا، گم ہو جانا، ہلاک ہو جانا۔ جمال قریشی لکھتے ہیں" ضلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہو جانا ہے۔ ضل الماء فی اللبن۔ یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا۔ کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اور اسی سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی یہ بات قرآن میں ہے۔ ان ابانا لفی ضلال مبین۔ ہمارے والد تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔

غیابۃ الجب :۔ کنویں کی تہہ کو غیابۃ اور کچے کنویں کو جُب کہتے ہیں۔ صحرائی راہوں میں جن پر قافلے گزرتے ہیں۔ اس طرح کے کنویں ہوتے تھے۔

یہ داستان عبرتوں اور نصیحتوں کا خزانہ ہے

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے۔ کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک دو لفظوں میں سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ یہاں شروع میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو تنبیہ کی ہے کہ یہ صرف ایک کہانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت سے سوالوں کے جوابات ہیں۔ جو دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دور میں بگانوں اور بیگانوں کے ذہنوں میں چٹکیاں لے رہے ہیں۔ اور سوال بھی ایک نہیں متعدد ہیں۔ حقیقت شناس کو اس میں ہر سوال کا جواب ملے گا۔ عائلی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی غرض زندگی سے متعلق جو سوال بھی آپ کے ذہن میں ابھرے گا حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان آپ کو اس کا جواب دے گی۔

ذرا آپ سوچیں کہ

اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی حسد کی چنگاری نہ بھڑکتی تو بلا شبہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں نہ ڈالتے۔ اور اگر وہ کنویں میں نہ ڈالتے تو قافلے والے کنویں کی جیل سے رہائی نہ دلاتے۔ لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے نجات مل گئی لیکن دوسری ہلاکت نمودار ہوگئی۔ لیکن اگر یہ رہائی نہ ہوتی اور قافلے والے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نہ نکالتے تو حضرت یوسف علیہ السلام بازار مصر میں نہ جاتے۔ مصر میں داخلہ ایک غلام کا داخلہ تھا۔ اگر وہ غلام نہ بنتے مصر کے بازار میں نہ جاتے اور عزیز مصر تک ان کی رسائی نہ ہوتی یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب تھا۔ لیکن اس سے عجیب تر وہ معاملہ تھا جب اس زرخرید غلام کے سامنے بیک وقت دو باتیں پیش ہوئی ہیں۔ نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی۔ اگر وہ پہلی سے بھاگ کر دوسری کو پذیرائی نہ دیتے تو جیل کے قیدی نہ بنتے اگر وہ جیل کے قیدی نہ بنتے تو بادشاہ کے ساقی سے ان کا تعارف نہ ہوتا اور تعبیر رؤیا کے فن کی نمائش نہ ہوتی اور ایک معبر کی حیثیت سے بادشاہ مصر تک رسائی نہ ہوتی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے۔ تعبیر کے لیے تگ و دو ہوتی ہے۔ ساقی حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بتاتا ہے۔ اور اس قیدی کے لیے اچانک قید خانے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ بادشاہ مصر کو تعبیر بتلاتے ہیں۔ بادشاہ کو دعوت ایمان دیتے ہیں۔ بادشاہ مصر حکومت کے کاروبار میں شرکت کی پیش کش کرتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں۔ اجعلنی علیٰ خزائن الارض۔ یہ فی الحقیقت

دین حق اور فیضان وحی کا اعلان تھا۔ یعنی آج مملکت کی نجات کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم وکار روائی کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہو۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام اس منصب پر نہ پہنچتے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی صبر کی منزل، ناتمام راہنمائی، خواب کی تعبیر شرمندہ حقیقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس واقعہ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ پوچھنے والوں کیلیے اس میں عبرتیں ہیں۔

(۶) حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی تاریخی داستان میں ان لوگوں کے لیے جو حقیقت حال پوچھنے والے ہیں بڑی ہی عبرت اور نصیحت کی نشانیاں ہیں۔ یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کرکے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت میں ہدایت اور عبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اس قصہ کو سن کر قلوب میں حق تعالیٰ شانہٗ کی عظیم قدرت وحکمت کا نقش جم جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بین ثبوت ملتا ہے۔ کہ آپ باوجود اُمی ہونے کے اور کسی کتاب ومعلم سے استفادہ نہ کرنے کے ایسے منقح ومنضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرمارہے ہیں جن کے بیان کی بجز اعلام ربانی کے کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً قریش مکہ کے لیے جو یہود کے اکسانے سے اس قصے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے۔ اس واقعہ میں بڑا عبرت آموز سبق ہے۔ کہ جس طرح حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے گھر سے نکالا۔ ازراہ حسد قتل یا جلا وطن کرنے کے مشورے کیئے۔ طرح طرح سے ایذائیں پہنچائیں۔ اہانت واستخفاف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ آخر ایک دن آیا کہ یوسف علیہ السلام کی طرح نادم ومحتاج ہو کر آئے۔ یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہٗ نے دین ودنیا کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا۔ اور انہوں نے اپنے عروج واقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریا دلی سے سب کے قصور معاف کر دیئے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برادری نے آپ کے متعلق ناپاک منصوبے باندھے دکھ پہنچائے۔ عزت وآبرو پر حملے کیئے۔ حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن جلد وہ دن آنے والا ہے جب وطن سے علیحدہ ہو کر آپ کی کامیابی اور رفعت شان کا آفتاب چمکا۔ اور چند سال بعد فتح مکہ کا وہ تاریخی دن آن پہنچا جبکہ آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گزشتہ تقصیرات پر بعینہٖ حضرت یوسف علیہ السلام والے کلمات لاتثریب علیکم الیوم۔ فرما کر قلم عفو کھینچ دیا۔[1]

حسد وبغض کا نتیجہ وہی ہے جو بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عملی کا نتیجہ وہی ہے۔ جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں رہ سکتا جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے حصے میں آیا۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہوگا جو امرأۃ العزیز کے نصیب ہوا تھا۔ جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو سچ نہیں ہوسکتا۔ سچ کتنے ہی ناموافق حالات میں اپنے کو پائے لیکن جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ علم وفضیلت ہر حال میں ایک حکمران قوت ہے۔ سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے۔ سب کو اس کا لوہا ماننا پڑے گا۔ واقعہ میں چار کردار ہیں۔ دو فضائل اخلاق کے کردار ہیں۔ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام۔ اور دو رذائل اخلاق کے کردار ہیں۔ برادران یوسف اور امرأۃ العزیز۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شخصیت میں درد وغم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر ویقین کی روح بھی چھائی ہوئی ہے۔ اور اس طرح چھائی ہوئی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غم کے طوفان اُمڈ رہے ہیں۔ لیکن صبر ویقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اس سیرت مقدسہ کا اسوہ حسنہ ہے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت آتی ہے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اگر یہ موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح وکامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ جب بھی اس کی رفتار نہیں رُکے گی۔ حوادث و واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے۔ افراد وجماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کرسکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اور وہ اعمال ونتائج کی اِس امتحان گاہ میں صرف اس لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز ودرماندگی اسے کبھی چھو نہیں سکتی۔

آئیے اس کے مقابلے میں تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیجئے۔ برادران یوسف کا کردار رذائل کا کردار ہے۔ حسد، والدین کا عقوق، بھائی سے عداوت، جھوٹ، فریب، خباثت، بددیانتی، بہتان، بدگمانی، حرص و طمع، غیظ وغضب، بغض وکینہ ظلم کا کردار ہے۔ اس کا نتیجہ ناکامی ورسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی بُرائی سیرت کی رذیلت ہے۔ اگر یہ رذیلت موجود ہو تو پھر اس کیلئے زندگی میں ویرانی اور فضیحت اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا اس کیلئے رکاوٹ ہے۔ رذائل کا دوسرا کردار امرأۃ العزیز انجام دے رہی ہے۔ دعوت عیش، بدکاری شوہر سے مجرمانہ خیانت کر رہی ہے۔ یہ جذبات کے سیلاب میں بہہ رہی ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات میں ہی ہوتی ہے۔ اس کا کردار صرف یہ نہیں ہے کہ جذبات میں بہہ جاتی ہے۔

بلکہ اسکیلیئے وہ ایک نمائش گاہ قائم کرتی ہے۔ اور اپنے جذبات کے جواز کے لیے دارالحکومت مصر کے تمام فتنہ گراں حسن کو دعوت دیتی ہے کہ ان کی متاع ضبط وتحمل کی عارت گریوں میں حصّہ لیں۔ بس اخلاقی فضائل و رذائل پر جتنے سوالات آپ کر سکتے ہیں۔ سب کا جواب سورۃ یوسف میں موجود ہے۔

السائلین: سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جس سے جس قسم کے بھی سوال کی توقع کی جا سکتی ہے۔ عربی میں یہ انداز مخاطبوں میں اشتیاق ابھارنے کے لیے ہوتا ہے جیسے عربی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

سَلِي إِن جَهِلْتِ النَّاسَ عَنَّا وَعَنْهُمُ
فَلَيْسَ سَوَاءٌ عَالِمٌ وَجَهُولُ

عربی میں اسی انداز کو قرآن نے یہاں اپنایا ہے۔ سائل کی جمع لا کر اشارہ کیا ہے کہ سوال کرنے والے متعدد ہیں۔ اور سوالوں کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک مکمل زندگی ہے۔ اور اس میں زندگی کے سارے گوشوں کے متعلق سوالوں کے جوابات ہیں۔ روحانی زندگی سے لے کر قانونی نظام تک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اُٹھے ہوئے سوالوں کا اس میں بھرپور جواب ہے۔ اس داستان میں کتنی روحانی انعامات اور باطنی علوم کی نیرنگیاں ہیں۔ جو ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوالات کا جواب ہیں۔ مثلاً حضرت یعقوب ؑ کا اپنے باطنی علم اور روحانی رفعتوں کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتانا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی روحانی قوت کے ذریعے برادران یوسف کے جھوٹ کو پکڑ لینا جب انہوں نے بھیڑیئے کی کہانی گھڑی۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی بلند روحانی قوت کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض کی بُو کو اتنی مسافت سے محسوس کر لینا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا امرأۃ العزیز کی جانب سے عیش و عشرت کی دعوت پر برہان رب دیکھنا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے علم باطنی کے کمال کی نشانی ہے۔ روحانی جوابات کے ساتھ اس واقعہ میں متعدد اخلاقی سوالات کے جواب بھی موجود ہیں۔ اخلاق میں دونوں قسم کے اخلاق پر اس واقعہ میں بھرپور تبصرہ ہے۔ فضائل میں صدق، عفت و پاکبازی، شرم وحیا، عدل وانصاف، احسان، عفو و درگذر، استقامت، حق گوئی، رفق ولطف، عہد کی پابندی، حلم وبردباری، خوش کلامی۔ اور رذائل میں زنا، جھوٹ، خباثت، بددیانتی، غداری، بہتان، بدگوئی، حسد، فخر وغرور، ظلم، بے ایمانی، غیظ و غضب، بغض و کینہ کے موضوعات پر اُٹھے ہوئے سوالات کے اس واقعہ میں متفرق سوال کرنے والوں کے جوابات ہیں۔ گویا یہ پورا واقعہ سوال کرنے والوں کے سوالات کے جوابات کا مرقع ہے۔ اور یہ تو ایک سرسری ساخاکہ ہے۔ ورنہ اگر آپ کے

ذہنوں میں عائلی زندگی، معاشرتی حالات، معاشی اتار چڑھاؤ، سیاسی نشیب و فراز اور قانونی نظام کے بارے میں سوالات اُبھریں تو سورۃ یوسف ان سوال کرنیوالوں کے جوابات کی بھی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے

قرآن جس وقت یہ بات کہہ رہا ہے یہ سوال سب کے ذہنوں میں اُبھر رہا ہے۔ کہ پورے ملک پر کفر کا غلبہ ہے۔ اس غلبہ میں یہ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس غلبہ کا کسی روز خاتمہ ہو جائے گا اور جو ذات گرامی مظلومیتوں کی تصویر بنی ہوئی اپنے مقہور و مغلوب ہمنواؤں کے ساتھ وقت کے ظالموں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم اور مصائب کا شکار رہے۔ کیا ایک دن آئے گا کہ یہ سارے ظلم پیشہ لوگ نبوت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے؟

یہ سوال سب کے ذہنوں میں چٹکیاں لے رہا تھا قرآن نے انہی سوال کرنے والوں کو یہ سرگزشت سنائی تاکہ ذہنوں میں جس قدر سوالات پیدا ہو رہے ہیں یا آئندہ پیدا ہو سکتے ہیں ان کا جواب ہو جائے اور لوگوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ سبحانہٗ کے شان قدیری کے مظاہرے کیسے ہوتے ہیں اور اس کے ارادے اور فیصلے یوں بروئے کار آتے ہیں۔

(۷) برادران یوسف کا منصوبہ

جس وقت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ بلاشبہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کا سب سے زیادہ لاڈلا ہے۔ حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارے والد اس معاملے میں غلطی پر ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف ع اور اُنکے عینی بھائی بن یامین سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت اپنے نور فراست یا الہام ربانی سمجھ چکے تھے۔ کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ اور نبوت کا خاندانی سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہونے والا ہے۔ خود یوسف علیہ السلام کا حسن صورت و سیرت اور کمال ظاہری و باطنی پدر بزرگوار کی محبت خصوصی کو اپنی طرف جذب کر رہا تھا۔ دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار تھی۔ وہ کہتے تھے۔ کہ وقت پر کام آنے والے تو ہم ہیں۔ ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے۔ جو باپ کی ضعیفی میں کام آسکتا ہے۔ ان چھوٹے لڑکوں سے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ ان ہی خیالات کے تحت اپنے والد بزرگوار کی نسبت کہتے تھے۔ کہ وہ اس معاملہ میں سخت غلطی پر ہیں اپنے نفع و نقصان کا موازنہ نہیں کرتے[1] بد دیانہ زندگی میں جب نظم حکومت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ تھا۔ حمایت ومدافعت کا سارا دارومدار خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ باعزت اور بااثر وہ خاندان سمجھا جاتا جس کے اندر حمایت اور مدافعت کے لیے اُٹھنے والے نوجوان سب سے زیادہ ہوں۔ اسی خاندان کو قوم اور قبیلہ کی سربراہی حاصل ہوتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسی ذہن کے تحت معاذ اللہ اپنے والد کی ناعاقبت اندیشی کا فتویٰ دیا۔ اور سوچا کہ جتھا کی حیثیت تو ہماری ہے۔ کام آنے والے تو ہم ہیں لیکن ہمارے والد کا حال یہ ہے کہ ان کو یوسف ؑ اور ان کے بھائی کی محبت ہے۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی ہے؟

یہ دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مشاورت ہے۔ لام تاکید تحقیق خبر کے لیے نہیں بلکہ لازم خبر کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرت یعقوب ؑ کو زیادہ محبت تھی۔ مگر سارے بھائی حسد میں یکساں نہیں تھے۔ باہم مشورہ اس لیے تھا کہ یوسف علیہ السلام کے معاملے میں سازش میں ہم آہنگی پیدا کر لی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کا نام بنیامین ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی ہیں ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لوبان ہے۔ باقی بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ماں کی جانب سے سوتیلے تھے۔ ان کی بھی باتیں مختلف ہیں۔

بنیامین کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوب ؑ ان دونوں بے ماں کے بچوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ ان کی ساری اولاد میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی ایسے تھے جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو رشد وسعادت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ یا نور نبوت کے ذریعے آپ پر منکشف ہو رہے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سُن کر انہوں نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی روحانی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس (۱۰) بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا۔ اس کا اندازہ آنے والے حالات واقعات سے ہوتا ہے پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک نیک سیرت انسان اور وہ بھی اللہ کا نبی ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ باقی بھائیوں کا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں یہ تأثر ان ابانا لفی ضلال مبین، شارحین قرآن کو اس پر حیرت ہے اور انہوں نے یہ بڑی چبھن محسوس کی ہے۔ کہ اگر بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ تو ان کی زبان سے یہ بات کیسے نکلی۔ اور اگر رسالت

کی تکذیب اس راہ سے کر رہے تھے۔ تو ایسا سوچنا بھی غلط ہے چہ جائیکہ یہ بات زبان پر لانا بشارحین قرآن نے اس کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ برادران یوسف اسے حضرت یعقوبؑ کی اجتہادی غلطی سمجھتے تھے۔ اور اس فقرے کا مطلب یہی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے۔ کہ اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جہاں کوئی ریاست موجود نہیں ہوتی۔ اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں۔ وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے۔ کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے بہت سے ہوں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ جو دشمنوں کے مقابلے میں کام آسکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بیٹوں نے کہا۔ ان ابانا لفی ضلال مبین۔ ہم جوان بیٹوں کا جتھا جو برے وقت پر ان کے کام آسکتا ہے۔ ان کو اتنا عزیز نہیں ہے جتنے کہ یہ چھوٹے بچے جوان کے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ الٹے خود بھی حفاظت کے محتاج ہیں۔ اس لیے یہاں انکار نبوت کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ باپ بیٹوں کے درمیان طبعی تعلقات کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ اسی لیے وہ ان ابانا کہہ رہے ہیں۔ اسی سے قاضی ضیاء الدین سنامی نے یہ لطیفہ استنباط کیا ہے کہ

> نبیوں کی اولاد بھی دوسرے لوگوں کی اولاد کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے سب لوگ اپنے باپ کو ابا کہہ کر پکارتے ہیں ایسے ہی نبیوں کی اولاد بھی اپنے باپ کو ابا ہی کہہ کر پکارتی ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو ابا ہی کہا ہے۔

(۸) مار ڈالنے اور ملک بدر کرنے کی تجویز

آؤ یوسف کو مار ڈالیں یا کسی ملک میں پھینک آئیں۔ تاکہ باپ کی توجہ کا مرکز باقی بھائی ہو جائیں۔ اور یوسف کے بعد تم سارے ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ۔ یعنی رشک و حسد کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ آخر آپس میں مشورہ کیا کہ یوسف کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ والد بزرگوار کی خصوصی محبت و توجہ کو ہم اپنی طرف کھینچ سکیں۔ اس لیے یوسف کا قصہ ہی یہاں سے ختم کر دیا جائے۔ خواہ قتل کر دو یا کسی دور دراز ملک کی طرف پھینک دو۔ جہاں سے واپس نہ آسکیں۔ جب وہ نہ رہیں گے تو باپ کی ساری توجہات اور مہربانیوں کے ہم ہی تنہا حقدار رہ جائیں گے۔ بنیامین کے معاملے کی غالباً ان

کے یہاں کوئی اہمیت نہ تھی۔ گویا اس کی محبت کو یوسف علیہ السلام کی محبت کا ضمیمہ سمجھتے تھے۔ سوچا یہ کہ ایک بار قتل وغیرہ کا گناہ کرنا پڑے گا اس سے فارغ ہوکر توبہ کرلیں گے اور خوب نیک بن جائیں گے۔ گویا رِند کے رِند رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔ بعض مفسرین نے وتکونوا من ھذہٖ قوما صالحین ۔ کے معنے یہ لیے ہیں کہ یوسف کے بعد ہمارے سارے کام ٹھیک ہوجائیں گے۔ کیونکہ پدر بزرگوار کا دست شفقت یوسف سے مایوس ہوکر صرف ہمارے ہی سروں پر سایہ فگن ہوگا۔ؔ واقعی شارحین قرآن نے لفظ صالحین کے دونوں معنے لیے ہیں۔ ٹھیک ہوجانے اور نیک ہونے جن لوگوں نے نیک ہونے کے معنے لیے ہیں۔ وہ مطلب یہ بتاتے ہیں کہ اس جرم کے کرلینے کے بعد ہم توبہ کرے یا اس سے زیادہ طاقتور نیکی کرکے نیک وصالح بن جائیں گے۔ اگر یہی معنے ہوں تو یہ فقرہ ان کی نفسیات کی بہترین ترجمانی کررہا ہے۔ جو برائیوں کے ارتکاب کے ساتھ ایمان اور نیکی سے کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب کبھی نفس ان کے کسی بُرے کام کا تقاضا کرتا ہے۔ تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کرکے پہلے نفس کا تقاضا پورا کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اور جب ضمیر اندر سے چٹکیاں لیتا ہے تو اسے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوششیں کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر یہ ناگزیر گناہ جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے کرگزرنے دے پھر انشاء اللہ ہم توبہ کرکے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا کہ تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

لیکن اس جملے میں ان معنے کی سکت نہیں ہے۔ فقرے کی ساخت اور اس کا ترکیبی پیوند بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سب جانتے ہیں کہ اس کا عطف پہلے جملہ پر ہے۔ اور وہ جملہ جواب امر ہے۔ جو حکم اس کا ہے وہی حکم اس کا بھی ہوگا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حالات سب ٹھیک ہوجائیں گے۔ پریشانی دور ہوجائے گی۔ جو کانٹا چبھ رہا ہے وہ نکل جائے گا۔ یہ وہ علاج ہے۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچا۔ انہوں نے اسکیم یہ بنائی۔ کہ یوسف کو یا تو قتل کردیں۔ یا کہیں دور دراز مقام میں لے جاکر پھینک دیں تاکہ ان کے باپ کی ساری توجہ انہی کی طرف ہوجائے۔ اقتلوا یوسف او اطرحوہ کی حیثیت ایک شورائی تجویز کی ہے۔ جس طرح کمیٹی یا مجلس شوریٰ میں مختلف تجویزیں اور مشورے پیش ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مختلف سمتوں سے یہ تجویزیں پیش ہورہی ہیں۔ اس مشورت سے یہ بات بالکل واضح ہورہی ہے۔ کہ برادران یوسف کو اصلی کد

ؔ افادات شیخ الاسلام

حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے۔ اس میں ان کے چھوٹے بھائی داخل نہیں۔ اور یوسف سے یہ کد سوتیلا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی اصلی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ جن کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے غیر معمولی محبّت کرتے تھے۔ اگر صرف سوتیلے ہونا اس کا باعث ہوتا تو سوتیلے تو بنیامین بھی تھے۔ عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادران یوسف کے اس کردار کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھائیوں کی اپنے والد سے چغلیاں کھاتے تھے۔ اس وجہ سے اُن کے بھائی ان سے ناراض تھے۔

⑨ ایک بھائی کے دِل میں نرم گوشہ

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اسے گمنام کنویں میں ڈال دو اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے۔ تو یہ کرلو۔ اس طرح یوسف کو کوئی قافلہ اٹھالے گا۔ یہ کہنے والا یہودا تھا۔ یعنی قتل کرنا بہت سخت بات ہے۔ اور ہمارا مقصد اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر تم یوسف کو یہاں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ اس کو بستی سے دور کسی گمنام کنویں میں ڈال دو۔ ابوحیان اندلسیؒ نے بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے۔ کہ غیابۃ الجب اس طاقچہ کو کہتے ہیں جو کنویں میں یا باؤلی میں پانی سے ذرا اُوپر بنا ہوا ہو۔ غرض یہ تھی۔ کہ ہم خواہی نہ خواہی عمداً ہلاک کرنے کا گناہ اپنے سر نہ لیں۔ ایسے کنویں میں ڈال دینے کے بعد بہت ممکن ہے کہ کوئی مسافر ادھر سے گزرے اور خبر پاکر کنویں سے نکال لے جائے اس صورت میں ہمارا مقصد حاصل ہوجائیگا۔ اور خون ناحق سے ہاتھ رنگین نہ کرنے پڑیں گے۔ گویا سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔[۱] شارحین قرآن نے واقعی اس کہنے والے کے مختلف نام بتائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کا نام یہودا ہے۔ کچھ کی رائے میں شمعون ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ روبن ہے لیکن تورات میں نام روبین ہے۔

> تب روبین نے یہ سُن کر ان کے ہاتھوں سے بچایا اور کہا کہ ہم اس کی جان نہ لیں۔ اور روبین نے ان سے یہ بھی کہا کہ خون نہ بہاؤ بلکہ اسے اس گڑھے میں جو بیابان میں ہے ڈال دو لیکن اس پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔

اور یہودا کے بارے میں تورات ہی میں ہے۔ کہ اس نے قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا مشورہ دیا۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ آیت ۲۶ میں ہے ۔

تب یہودانے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا ۔ آؤ اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اُس پر نہ اُٹھے کیونکہ وہ ہمارا بھائی اور خون ہے ۔

مطلب یہ ہے ۔ کہ اس بھائیوں میں سے ایک کے دل میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کےلیے کوئی نرم گوشہ تھا ۔ اس نے مشورہ دیا کہ قتل تو نہ کرو اگر کچھ کرنا ہی ہے ۔ تو یہ کرو ۔ کہ قافلوں کے راستوں کے کسی کنویں میں ڈال دو کوئی قافلہ گزرے گا اس کو نکال لے گا ۔ کنویں اس زمانہ میں عموماً ایسے موقعوں پر ہوتے تھے جو عام راہ گزر ہوں ۔ قافلے جب ان کنوؤں کے پاس گزرتے تو ضرور پانی بھرتے ۔ اور یہ تاریخ کی ایک معلوم حقیقت ہے ۔ کہ فلسطین کے جنوب مشرقی علاقہ میں تجارتی قافلوں کی آمدورفت ایک طرف فلسطین اور مصر ۔ اور دوسری طرف عرب و مصر کے درمیان برابر رہتی تھی ۔ چونکہ اس زمانہ میں بردہ فروشی کا عام رواج تھا ۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ یہ خیال بھی ہوا ہو ۔ کہ قافلے والے اسے غلام بنالیں ۔ یا کسی شہر میں جاکر اسے فروخت کردیں گے ۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی جان بھی بچ جائے گی اور بھائیوں کے منصوبہ کی تکمیل بھی ہوجائے گی ۔ منصوبہ یہی تھا ۔ کہ یوسف علیہ السلام کو باپ سے دور کردیا جائے تاکہ باپ کی توجہات اور چاہتوں کا وہ مرکز بن جائیں ۔ بالآخر اسی مشورہ پر سب کا اتفاق ہوگیا جیسے آگے آرہا ہے ۔

قَالُوْا
يٰٓاَبَانَا مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾
اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ
اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ
وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ
عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

(تب سب مل کر آئے) بولے اے ہمارے ابا جان کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیر خواہ ہیں۔ کل ہمارے ساتھ جانے دیجئے کھائے پیئے کھیلے کودے ہم اس کی حفاظت کریں گے۔[۱۰] باپ نے کہا کہ مجھے تو یہ غم لگ رہا ہے۔ کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ ہو۔ بولے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھیڑیا اسے کھالے حالانکہ ہماری جماعت وہاں موجود ہو اگر ایسا ہوا تو پھر ہم تو نکمے ہی رہیں گے۔[۱۱]

برادران یوسف کی سازش کا پہلا مرحلہ

یہاں قرآن کا انکشاف یہ ہے کہ برادران یوسف منصوبے کی تکمیل کی خاطر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ حضرت یوسفؑ کو سیر کے لیے ہمارے ساتھ روانہ کر دیجئے ۔ قرآن کا یہ بیان تورات سے مختلف ہے ۔ تورات کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سکم کی طرف گئے ہوئے تھے ۔ ان کے پیچھے خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تلاش میں حضرت یوسف علیہ السلام کو روانہ کیا تھا ۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کا حال جانتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے پیچھے روانہ کیا ہو ۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں روانہ کریں ۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی صحیح ہے ۔ بہر حال دو باتیں ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے ۔ ایک یہ کہ قرآن میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے ۔ جس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھائیوں کی تلاش میں یوسف علیہ السلام کو روانہ کرنا معلوم ہو ۔ بلکہ اس کا صاف اعلان ہے ۔ کہ بھائیوں نے خود اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام کو سیر کے بہانے اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی ۔ دشمنی کی حالت میں باتیں گھڑ لینا فطرت انسانی کے لحاظ سے مستبعد نہیں ہے ۔ دوسری یہ کہ تورات کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے لیکن موجودہ زمانہ میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ تفصیل انشاء اللہ آئندہ آئے گی ۔

(۱۰) تب سب مل کر آئے بولے اے ہمارے ابا جان کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیر خواہ ہیں ۔ کل ہمارے ساتھ جانے دیجئے ۔ کھائے پیئے کھیلے کودے ہم اس کی حفاظت کریں گے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے بھی باپ سے اس قسم کی درخواست کر چکے تھے ۔ مگر ان کا دل ان کے ساتھ بھیجنے پر مطمئن نہیں ہوا ۔ یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قویٰ گھر میں خالی پڑے رہنے سے بیکار ہوئے جاتے ہیں مناسب ہے کہ ہمارے ساتھ اس کو بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں بھیج دیئے ۔ وہاں جنگل کے پھل میوے خوب کھائے گا اور کھیل کود سے جسمانی ورزش بھی ہو جائے گی ۔ کہتے ہیں کہ ان کا کھیل بھاگ دوڑ ، تیر اندازی تھی اور ویسے بھی

بچّوں کے لیے مناسب حد تک کھیلنا جیسا کہ ابو حیانؒ نے کہا ہے۔ نشاط و شگفتگی کا باعث ہے بغرض یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو ساتھ لے جانے کی پُرزور درخواست کی اور پُرزور طریقہ سے اطمینان دلایا۔ ہم برابر اس کی حفاظت کریں گے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ خود یوسف کو جداگانہ طور پر ساتھ چلنے کی باپ سے اجازت لینے کی ترغیب دی[1] جو بات شیخ الاسلام نے فرمائی ہے اسی کی علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں نشاندہی کی ہے۔ عربی بلاغت کی رو سے یہ انداز کلام موقعہ انکار میں استعمال ہوتا ہے۔ انّ سے، لام سے اور جملہ اسمیہ سے کلام کو مؤکد بنا کر پیش کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ پہلے بھی یہ بات کہی جا چکی ہے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی درخواست کو رَدّ کر چکے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی علامہ آلوسیؒ کی ہمنوائی کی ہے۔

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ برادران یوسف گلے چرانے جنگل جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں قبائل کی دولت و ثروت کا بڑا مدار مویشی پر تھا۔ مرد سارا دن چراتے تھے۔ شام کو خیموں میں آکر آرام کرتے تھے۔ ایسی ہی زندگی حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کی تھی۔ یرتع و یلعب نہایت خوبصورت تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے پکنک منانے کی اختیار کی اپنے لیے نہیں کیونکہ خود تو وہ روزانہ جاتے تھے۔ بدویانہ زندگی میں جی بہلانے کے جو طریقے بہت پسندیدہ رہے ہیں ان میں پکنک کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شعرائے جاہلیت کا یہ خاص موضوع ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بھی مذکورہ بالا منصوبہ پر اتفاق رائے کر لینے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہموار کرنے کے لیے پکنک کا سبز باغ دکھانے کی کوشش کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے۔ پہلے اپنا اعتبار جتانے کے لیے کہا لاتامنّا علی یوسف۔ کیا بات ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔ ہم تو اس کے بڑے خیرخواہ ہیں۔ ہمیں تو اس سے بڑی محبت ہے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی پکنک کا پروگرام پیش کیا۔ ہمارے ساتھ جنگل روانہ کر دیجئے۔ تفریح کرے گا، کھیلے کودے گا۔ آپ پوری طرح مطمئن رہیں۔ کسی بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہم یوسف کی پوری پوری حفاظت کریں گے اور ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

(۱۱) حضرت یعقوبؑ کا غم اور اندیشہ

باپ نے کہا کہ مجھے تو غم لگ رہا ہے کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ ہو گا یعنی یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور بھی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے۔ اس پر یہ خوف مزید رہا کہ بچہ ہے تمہاری بے خبری اور غفلت میں بھیڑیا وغیرہ کوئی درندہ پھاڑ کھائے۔ لکھا ہے کہ اس جنگل میں بھیڑیئے کثرت سے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ان کو آگے چل کر بھیڑیئے کا بہانہ کرنا تھا۔ وہی ان کے دل میں خوف آیا۔ بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ اخاف ان یاکلہ الذئب فرمانا حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبر کے درجہ توکل وتفویض سے نازل بات تھی۔ اس کا جواب یہ ملا کہ لڑکوں نے گویا ان کے منہ سے بات پکڑ لی۔ جو اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ ہی واقعہ بنا کر لے آئے[1] یہ حزن وخوف طبعی ہیں طبعی حزن وخوف کا ہونا منافی کمال نہیں ہے۔ نہ نبوت کے منافی ہے۔ اور نہ ولایت کے۔ نبی ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں میں پھر اس کی برتری سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے۔ کہ وہ اللہ سبحانہ کا فرستادہ ہے۔ اور اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی تسلی کیونکر کر سکتا ہے۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دل سوزی ہی نہیں کر سکتا۔ اسباب کو نظر انداز کرنا توکل نہیں ہے۔ توکل نام ہے کسی کام کو پورا پورا ارادہ عزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے کا۔ اور یہ یقین کرنے کا کہ اگر اس میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں ضرور کامیابی دے گا۔ اگر تدبیر اور جدوجہد کوشش کا ترک کرنا ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے انبیاء ہی روانہ نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ ورسالت کے لیے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان ومال کی قربانی کا حکم دیتا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دو لفظوں میں بھائیوں کی جانب سے ہونے والی ساری داستان کی تصویر پیش کر دی۔ بھیڑیئے مویشی کے دشمن ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے بے اختیار حضرت یعقوبؑ کی زبان سے نکل گیا۔ کہ کہیں ایسا ہی حادثہ یوسف کو بھی پیش نہ آجائے۔ آیت کا مطلب یہ ہے:

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے غم اور اندیشہ اس بات کا ہے۔ کہ تم یوسف کو لے جاؤ اور تم تو اپنے کھیل کود اور دلچسپیوں میں لگ جاؤ اور تمہاری بے خبری میں اس پر بھیڑیا حملہ آور ہو جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس اندیشے کا برادران یوسف نے جو جواب دیا ہے کہ ہماری پارٹی کی موجودگی میں اگر یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم سے بڑھ کر بدبخت اور نکما کون ہوگا؟ آگے کی بات سے قرآن خاموش ہے مگر انداز اسلوب بتارہا ہے۔ کہ ان کی اس یقین دہانی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادل ناخواستہ ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور برادرانِ یوسف کے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیاب ہو گیا۔

آیت بتارہی ہے کہ پُرفریب انسان دل میں نقصان اور عداوت کا الاؤ رکھ کر اس پر اصلاح اور درستگی کا لبادہ ڈال دیتا ہے۔ یہ تعبیر بالکل ایسی ہے جیسے پہلے وانا لہٗ لنا صحون کے ذریعے دل کی عداوت کو زبانی خیرخواہی کے پردے میں چھپایا گیا ہے۔ البقاعیؒ لکھتے ہیں کہ بھائیوں کی اس سازش پر مبنی تقریر کے بعد یہ سوال خود بخود ابھرتا ہے کہ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا کہا؟ جواب مقدر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی بات کو شرف پذیرائی دیا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اسے اس طرح پیش کیا ہے۔ کہ اگر ہمارے جیسی طاقتور جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تنومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کمزور بچہ بھیڑیے کے منہ میں پہنچ جائے ایسا ہو تو کہنا چاہیئے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوْۤا
اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ
بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْۤا اَبَاهُمْ عِشَآءً
يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ
عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ
سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى
دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَ
اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ
مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

ع ۱۴

پھر جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اجازت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے بھائی لے گئے اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گمنام کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں

نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اور ڈال دینے کے بعد ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اشارہ سے بتایا کہ ایک وقت آئے گا۔ کہ تو ان کو ان کا یہ معاملہ ضرور جتائے گا۔ اور ان کو پتہ نہیں ہے کہ پردہ غیب میں کیا ہے[۱۲] اور برادران یوسف شام کو روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے[۱۳] بولے ابا جان ہم دوڑ کے مقابلے میں گئے تھے۔ اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات کو مانیں گے تو نہیں چاہے ہم سچے ہی ہوں[۱۴] اور یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔ یہ داستان سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ تمہاری من گھڑت بات ہے۔ بس اب صبر ہی بہتر ہے اور تم جو داستان بیان کر رہے ہو۔ میں اس پر اللہ ہی سے مدد کا خواہاں ہوں[۱۵] اور ایک قافلہ آگیا اور قافلے والوں نے اپنا پانی لانیوالا کنویں پر بھیجا اس نے ڈول لٹکایا۔ بول پڑا واہ واہ خوشی کی بات ہے یہ تو ایک لڑکا ہے اور پھر قافلہ والوں نے اسے تجارتی مایہ بنا کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ کو خوب معلوم ہے[۱۶]۔ اور پھر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت معمولی قیمت یعنی گنتی کے چند درہموں پر فروخت کر دیا وہ اس سے دل برداشتہ تھے[۱۷]

داستان یوسف کا ایک عجیب منظر

داستان یوسف کا یہ وہ مرحلہ ہے۔ جس میں یوسف علیہ السلام کو ہلاک کرنے کی سوتیلے بھائیوں نے منصوبہ بندی کی تھی۔ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا۔ اور اپنے اس کردار پر پردہ ڈالنے کے لیے بھیڑیئے کے حملہ کا جھوٹا قصہ بنایا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام فراست نبوت سے ان کے افسانے پر مطلع ہو گئے ساری داستان سن کر فرمایا۔ فصبر جمیل۔ حضرت یعقوبؑ کو فراست نبوت سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ کہ پچھلی بشارتیں یوسف ہی کے ذریعے پوری ہوئی ہیں اسلیئے وہ کبھی باور نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا لہذا فرمایا فصبر جمیل یعنی اس معاملہ میں حکمت الٰہی کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے لہذا میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ بغیر شکوہ و شکایت کے درد فراق جھیلتا رہوں اور اس کی کارفرمائیوں کے ظہور کا انتظار کروں۔ "صبر جمیل" میں جیسے درد و غم کی انتہا ہے ایسے ہی صبر اور یقین کی روح بھی پوری طرح کارفرما ہے اور اس طرح کارفرما ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد و غم کے طوفان اٹھ رہے ہیں لیکن صبر و یقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں اور اس پر غالب نہیں آسکتے اور یہی صورت حال اس سیرت مقدسہ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ صبر کے معنے صرف شدائد ہی کے نہیں بلکہ جیسا کہ شیخ اکبر نے لکھا ہے۔ حبس النفس عن الشکوی لا الی اللہ جی کو اللہ کے سوا شکایت سے روکنا بھی صبر جمیل ہے یعنی ایسا صبر ہو جو بڑے ہی پسندیدہ طریقے پر ہو یعنی نہ صرف شدائد جھیلے جائیں بلکہ بڑی خوبی کے ساتھ جھیلے جائیں۔ شدائد کا شکوہ نہ ہو۔ درد و الم کی شکایت زبان پر نہ آئے۔ یہاں صبر جمیل فرما کر واللہ المستعان کا اضافہ بڑی گہری معنویت رکھتا ہے۔ یعنی ایسا سکون جس نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو لوگوں کے سامنے پریشانی غم واندوہ کے اظہار سے بے نیاز بنا دیا۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش اور اس کے لیے جدوجہد کرنا اور اللہ سبحانہ کے سامنے عرض و معروض کرنا یعنی دعا کرنا صبر کے منافی نہیں ہے۔

(۱۲) پھر جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اجازت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے۔ اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گمنام کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اور ڈال دینے کے بعد ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اشارے سے بتایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تو ان کو ان کا یہ معاملہ ضرور جتائے گا اور ان کو پتہ نہیں کہ پردۂ غیب میں کیا ہے مفسرین نے بہت سے درمیانی قصے نہایت دردانگیز، رقت آمیز پیرائے میں نقل کیئے

ہیں جنہیں سُن کر پتھر کا کلیجہ بھی موم ہو جائے۔ اللہ جانے وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ قرآن کریم اپنے خاص نصب العین کے اعتبار سے اس قسم کی تفاصیل کو در خود اعتنا اور لائق ذکر نہیں سمجھتا کیونکہ ان اجزا سے کوئی اہم مقصد متعلق نہیں ہے۔ قرآن عزیز اپنے سامعین کے دلوں میں وہ رقت پیدا کرتا ہے۔ جس کا منشا رخاص ایمان وعرفان ہو۔ عام رقت جو ہر کافر ومؤمن بلکہ حیوانات تک میں طبعاً مشترک ہے۔ اس پر عام خطبا رکی طرح زور ڈالنا قرآن کی عادت نہیں ہے۔ یہاں بھی قرآن نے درمیانی واقعات حذف کر کے آخری بات بتلادی کہ برادران یوسف کو بلطائف الحیل باپ کے پاس سے لے گئے اور ٹھہری ہوئی قرار داد کے مطابق کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت ہم نے یوسف کو اشارا کیا۔ جس کی دوسروں کو مطلق خبر نہیں ہوئی۔ کہ گھبراؤ نہیں ایک ایسا وقت آیا چاہتا ہے کہ یہ سب کارروائیاں تم ان کو یاد دلاؤ گے اور اس وقت تم ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پر ہو گے کہ یہ تم کو پہچان نہ سکیں گے یا طول عہد کی وجہ سے تم کو شناخت نہ کر سکیں گے۔

یہ خدائی اشارہ خواب میں ہوا یا بیداری میں، بطریق الہام ہوا یا فرشتے کے ذریعے سے۔ اس کی تفصیل قرآن میں نہیں۔ البتہ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ وحی کا آنا چالیس برس پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت بہت کم عمر تھے واللہ اعلم [1]

آیئے اس آیت کے اجزا ر پر الگ الگ غور فرمائیے۔ پہلا فقرہ ہے۔ فلما ذھبوا بہ واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابۃ الجب یعنی جب برادران یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے اجازت لے کر اپنے ساتھ لے گئے اور سب نے اس پر اتفاق کرلیا کہ یوسف کو کسی گمنام کنویں میں ڈال دیں اور وہ ایسا ہی کر گزرے۔ اور آیت سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ اس معاملہ میں اختلاف آخر تک رہا کہ یوسف کو کنویں میں ڈالیں یا قتل کریں لیکن بالآخر کنویں والی تجویز ہی پر سب کا اتفاق اور اسی پر عمل ہوا۔ توریت میں ہے"

> اور یوں ہوا کہ یوسف جب اپنے بھائیوں کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی قبا کو یعنی بوقلموں قبا کو جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ اتار کے اسے ننگا کر دیا اور لے کے کنویں میں ڈال دیا وہ کنواں اندھا تھا۔ اس میں ایک بوند پانی نہ تھا۔

[1] افادات شیخ الاسلام

شارحین قرآن نے یہاں طویل کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن محققین کے نزدیک ان کی تاریخی حیثیت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہانیاں ہیں تو بڑی المناک اور دردانگیز لیکن لیس فیھامالهٗ سند یعول علیه لیکن ان کی پشت پر کوئی تاریخی سند نہیں ہے۔

آیت کا دوسرا جزء واوحینا الیه لتنبئنهم بامرهم هٰذا یعنی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی کی کہ مایوس نہ ہو ایک وقت آئے گا جب ان کا یہ معاملہ تو ان کو جتائے گا۔ انبیاء پر وحی آتی ہے نبوت ملنے کے بعد اور اس کے آنے کی عمر چالیس سال ہے۔ حضرت یوسفؑ کو نبوت کے ملنے کا آگے ذکر آرہا ہے۔ ولما بلغ اشدهٗ اٰتینٰه حکما وّ علما اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔ سوال یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے یہ وحی کیسی ہے۔ یہ سمجھئے پہلے وحی کے معنی سمجھ لیجئے۔ علامہ منظور افریقی نے لسان العرب میں وحی کے معنی یہ بتائے ہیں۔

اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور خیال میں ڈالنا۔

شعراء جاہلیت نے ان سب معنے میں لفظ وحی استعمال کیا ہے۔ لیکن اہل لغت کہتے ہیں۔ کہ وحی کے اصلی معنے دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں۔ کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے۔ وحیت الیه بالکلام واوحیه الیه هو ان تکلمهٗ بکلام تخفیه من غیره۔ یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔ ابو اسحاق لغوی کہتے ہیں۔ واصل الوحی فی اللغة کلها اعلام فی خفاء۔ وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں۔

قرآن میں لفظ وحی اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے

اول: فطری حکم جیسے شہد کی مکھیوں کے بارے میں ہے۔ واوحیٰ ربك الی النحل۔

دوسرے: دل میں بات ڈال دینا جیسے اذا وحیت الی الحواریین۔

تیسرے: چپکے چپکے باتیں کرنا جیسے یوحیٰ بعضهم الی بعض۔

وحی کے ان معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا۔ اس لئے اشارا کرنا، لکھنا، دل میں ڈالنا، حکم فطری، کتابت سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ بہر حال اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی اصطلاحی ہی وحی نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز خواب سے ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ

کا بیان ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا۔

حدیثوں میں طریقہ وحی کی یہ صورت بھی بتائی ہے کہ ان روح القدس نفث فی روعی۔ روح القدس نے میرے دل میں پھونکا۔ اسی لیے شارحین قرآن نے یہاں اس آیت میں ایحار کے معنے الہام اور خواب میں دکھلانے کے بتائے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ ہم نے اشارا کیا حضرت شاہ صاحب نے یہی معنے کیئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ آزمائش وقتی ہے وہ وقت آئے گا کہ تم ان بھائیوں کو ان کی کارستانیوں سے آگاہ کرو گے۔

آیت کا آخری حصہ وھم لا یشعرون ہے۔ یہ جملہ کچھ ایسے انداز سے آیا ہے کہ اس کے تین معنے ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ وحی کر رہے تھے اور یوسف کے بھائیوں کو کچھ پتہ نہ تھا۔ کہ اس پر وحی ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کو ان کے یہ کرتوت بتائے گا۔ جہاں تیرے ہونے کا ان کو بالکل پتہ نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں اور پردہ غیب میں کیا ہے؟

(۱۲) برادرانِ یوسف کے جھوٹے آنسو

اور برادران یوسف شام کو روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے یا تو گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا یا جان بوجھ کر اندھیرے میں آئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا زیادہ مشکل تھا۔ اور رات کی سیاہ چادر بے حیائی، سنگدلی اور جھوٹی آہ و بکا کی کسی حد تک پردہ داری کر سکتی تھی۔ امام اعمش نے خوب فرمایا کہ برادران یوسف کی گریہ و پکار سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشم اشکبار سے سچا نہیں کہہ سکتے۔[1] رات گئے آنے میں ممکن ہے یہ مصلحت پیش نظر ہو کہ اگر باپ کے دل میں تلاش و تحقیق کا کوئی خیال پیدا ہو تو اس کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہے۔ البقاعیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ آیت کا مدلول بتا رہا ہے کہ رونا صداقت کی نشانی نہیں ہے ایک جرم کو نباہنے کیلئے دوسرے جرائم تک فطرت بشری مجرم کو

[1] افادات شیخ الاسلام

ناگزیر طور پر لیجاتی ہے۔ بناوٹی مظلوموں کا یہ کردار ہوتا ہے۔ سمجھدار حاکم اس قسم کی فریب کاریوں کو تاڑ لیتا ہے۔ اور دھوکے میں نہیں آتا۔ کسی مقدمہ میں قاضی شریح کی عدالت میں عورت روتی پیٹتی بات کر رہی ہے۔ شریح کو اس کے دعوٰی پر اطمینان نہیں ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ جناب وہ تو رو رہی ہے۔ شریح نے فوراً کہا کہ برادران یوسف ظالم ہونے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس روتے ہی آئے تھے۔

(۱۴) برادران یوسف کی سخن سازی

بولے ابا جان ہم دوڑ کے مقابلے میں گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات مانیں گے تو نہیں چاہے ہم سچے ہی ہوں یعنی ہم نے یوسف کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہمارے کپڑے لتے وغیرہ قابل حفاظت چیزیں جہاں رکھی تھیں وہیں یوسف کو بٹھایا اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو بھاگ دوڑ شروع کی بس ذرا آنکھ سے اُوجھل ہونا تھا کہ بھیڑیئے نے یوسف کو آ دبوچا۔ اس موقع پر اتنی ذرا سی دیر میں احتمال ہی نہ تھا کہ بھیڑیا آکر یوسف کا شکار کرے گا اور یوسف کے معاملہ میں پہلے ہی سے آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اگر آپ کے نزدیک ہم بالکل سچے بھی ہوں تب بھی اس معاملہ خاص میں کسی طرح آپ ہماری بات کا یقین نہیں کر سکتے [1] برادران یوسف نے اپنے غلط کردار کے لیے عذر تلاش کرنے میں کچھ زیادہ ذہانت کا ثبوت نہیں دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے سامنے اخاف ان یاکلہ الذئب میں بھیڑیئے کے اندیشہ کا ذکر کیا اسی کو انہوں نے اپنی بات کی بنیاد بنا لیا کہ ابا نے بھیڑیئے کا ذکر تو کیا ہی تھا اسی کو اپنے لیے سپر بنا لیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بات دہرا دی۔ کہ ہم تو یوسف کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے ذرا دور نکل گئے تھے۔ آکے دیکھا کہ یوسف پر بھیڑیا حملہ کر گیا۔ بات بنانے کو تو انہوں نے بنا دی مگر چور کی ڈاڑھی میں تنکا

ان کو خود ہی محسوس ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انکی بات باور نہ کرینگے چنانچہ انکے دل کا چور لکھے منہ پر آگیا کہ ما انت بمومن لنا آپ ہماری بات کو باور نہ کرینگے ولو کنا صادقین۔ چاہے فی الواقع ہم سچے ہی ہوں انداز کلام یہی کہہ رہا ہے کہ برادران یوسف نے سخن سازی سے کام لیا ہے۔ ورنہ نہ واقع میں دوڑ کیلئے گئے اور نہ یوسف کو سامان کے پاس چھوڑا نہ بھیڑیا

[1] افادات شیخ الاسلام

آیا اور نہ یوسف پر بھیڑیا حملہ آور ہوا اور نہ بھیڑیئے نے کھایا۔ آدمی کی طبعیت ہے کہ ایک جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے ان گنت جرائم کرتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ ایک گناہ کئی گناہوں کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے جرائم کی فرضی داستان بنا ڈالی۔ شارحین قرآن نے یہاں بے محل اسلام میں استباق کی بحث چھیڑ دی ہے آیت قرآنی سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

⑮ دروغ گورا حافظہ نباشد

اور یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے یہ داستان سنکر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس میں کچھ بھی نہیں بلکہ یہ سب تمہاری من گھڑت کہانی ہے بس اب صبر ہی اچھا ہے اور تم جو داستان بیان کر رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد کا خواہاں ہوں۔ ایک بکری یا ہرن وغیرہ ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیص پر چھڑک لائے تھے۔ وہ جھوٹا خون آلود کرتہ پیش کر کے والد کو یقین دلانے لگے کہ بھیڑیئے کے زخمی کرنے سے یہ کرتہ خون آلود ہو گیا بھلا جس کو شام میں بیٹھ کر مصر سے یوسف کے کرتہ کی خوشبو آتی تھی وہ بکری کے خون پر یوسف کے خون کا کب گمان کر سکتا تھا۔ انہوں نے سنتے ہی جھٹلا دیا اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ وہ بھیڑیا بڑا ہی حلیم و متین ہوگا جو یوسف کو لے گیا اور خون آلود کرتہ کو نہایت احتیاط سے صحیح و سالم اتار کر رکھ گیا سچ ہے۔ دروغ گورا حافظہ نباشد۔ خون کے چھینٹے تو دیئے مگر یہ خیال نہ رہا کہ قمیص کو بے ترتیبی سے نوچ کر اور پھاڑ کر پیش کرتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاف طور پر فرمادیا کہ یہ سب کچھ تمہاری سازش اور اپنے دلوں سے تراشی ہوئی باتیں ہیں بہرحال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جس میں نہ کسی غیر کے سامنے شکوہ ہوگا نہ تم سے انتقام کی کوشش صرف اپنے اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر میں میری مدد فرمائے اور اپنی اعانت غیبی سے ان باتوں کی حقیقت آشکارا کر دے جو تم ظاہر کر رہے ہو کہ سلامتی کے ساتھ یوسف سے ملنا نصیب ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ کہ جس امتحان میں وہ مبتلا کیے گئے ہیں۔ وہ پورا ہو کر رہے گا اور ایک معین مدت کے بعد اس سے نجات ملے گی۔ فی الحال ڈھونڈھنے یا انتقامی کارروائی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یوسف علیہ السلام ابھی نہیں ملیں گے ہاں دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ طیش میں آکر خود حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایذا پہنچانے کی کوشش کریں۔ کذا قال الامام الرازیؒ فی الکبیر واللہ اعلم۔ بکری

کا بچہ ذبح کرنے اور اس کے خون سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو رنگین کرنے کی کہانی شاید ہمارے مفسرین نے تورات سے لی ہے۔ تورات میں ہے۔

> پھر انہوں نے یوسف کی قبا کو لیا اور ایک بکری کا بچہ مارا اور اسے اس کے لہو میں تر کیا اور انہوں نے اس بوقلموں قبا کو بھیجا اور اپنے باپ کے پاس لے آئے اور کہا کہ ہم نے اسے پایا۔ آپ اسے پہچانیے کہ یہ آپ کے بیٹے کی قبا ہے کہ نہیں اور اس نے اسے پہچانا اور کہا کہ یہ تو میرے بیٹے کی قبا ہے۔ کوئی بڑا درندہ اسے کھا گیا یوسف بے شک پھاڑا گیا۔

قرآن نے انکشاف کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھائیوں کی فسوں کاری کو نہیں مانا اور توریت کہہ رہی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھائیوں کے اس افسانہ پر مشتمل دعوے کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح قرآن نے تورات کی اس غلط بیانی کی تردید کر دی۔ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن نے خون آلود قمیص کا خصوصیت سے کیوں ذکر کیا؟ اس لیے کہ اسی سے ان کا سارا جھوٹ کھل کر منظر عام پر آتا ہے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے خیال میں بات بنائی تھی کہ یوسفؑ کی قمیص پر خون لگا کر بطور شہادت لے آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب کُرتہ دیکھا تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ کھیل دوڑ سامان پر یوسف کے چھوڑنے اور بھیڑیئے کی ساری کہانی من گھڑت ہے۔ یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک جملے سوّلت لکم انفسکم امرا کے ذریعے کہانی کے سارے گھروندے کو پاش پاش کر دیا۔ اور صبر جمیل کہہ کر اپنا واقعی مؤقف ظاہر کر دیا۔ یہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ تأثر ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں تورات اور تلمود کے بیان کو دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ قرآن تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر جمیل کی تعریف کر رہا ہے اور یہ تأثر دے رہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام صبر جمیل کا نمونہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں تورات حضرت یعقوب علیہ السلام کے تأثر کا نقشہ ایسا کھینچتی ہے جو کسی معمولی باپ کے تأثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے تورات کا بیان یہ ہے کہ۔

> تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔

اس نقشے میں حضرت یعقوب علیہ السلام وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہر باپ ایسے موقعہ پر کرتا ہے۔ لیکن قربان جایئے قرآنی بلاغت کے کہ وہ جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے

ایک ایسے غیر معمولی شخص کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار اور باوقار ہے اتنی بڑی غم انگیز خبر سُن کر بھی دامن استقامت نہیں چھوڑتا ہے ۔ اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی کہانی ہے ۔ جوان فاسد بھائیوں نے بنا کر پیش کی ہے ۔ عالی ظرف شخصیتوں کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ کرتا ہے ۔

ذرا ٹھہر جائیے سولت لکم انفسکم پر غور کیجئے اس جملہ کا انداز ہی ایسا ہے کہ بیٹوں پر سرزنش سے کہیں زیادہ رحم و تاسف پر مبنی ہے اور مخاطبوں کے لیے ایک طرح کی معذرت کا پہلو پیدا کر رہا ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا تم نے یوسف کے خلاف سازش کی ہے ۔ بلکہ فرمایا کہ تمہارے جی نے تمہارے لیے ایک بات بنا دی ہے اور اس سے تمہارے خیال میں خوشنما دکھا دیا ہے کیونکہ تسویل کے معنے یہ ہیں ۔ کسی بات کا جما دینا ۔ خوشنما بنا کر دکھانا اور اس کے لیے طمع یا خواہش کا پیدا ہو جانا ۔ لہذا گویا یہ ایک ہمدرد دل کا تاسف تھا کہ افسوس کہ تم نفس کے دام میں پھنس گئے اور اس کے دھوکہ سے نہ بچ سکے ۔ پھر ساتھ ہی ان کے طرز عمل کے لیے معذرت کے پہلو کا بھی اعتراف ہے ۔ کہ طمع نفس میں آکر ایسا کر بیٹھے ہو اور انسان نفس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے ۔

ایک کامل صابر مؤمن کی زندگی

ایک ایسے صدمہ جانکاہ میں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ناگہاں پہنچا تھا ۔ اور کسی طرح کی بات کا زبان پر نہ آنا صرف اسی جملہ کا نکلنا ۔ صبر کا کیا عظیم الشان مظاہرہ ہے یہ ممکن ہے کہ صدمہ کے فوری تاثر کے بعد ایک ضابط اور متحمل آدمی اپنے دل و زبان کی نگرانی کر سکے لیکن عین اس وقت جب صدمہ کی پہلی چوٹ لگ رہی ہو اور دل کی بے تابیاں بے اختیار زبان کی طرف اُٹھنے لگی ہوں ممکن نہیں کہ دل و زبان کی نگہداشت کی جا سکے ۔ ضابط سے ضابط دل بھی ایسی حالت میں چیخ اُٹھتا ہے ۔ مضبوط سے مضبوط طبیعتیں بھی بے اختیار ہو جاتی ہیں ۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقام صبر ایسا نہ تھا جو کسی حال میں بھی بے اختیار ہو ۔ ایسی حالت میں بھی زبان کھلتی ہے تو ایسا جملہ نکلتا ہے گویا بے حالی اور جانکاہی کا کوئی معاملہ بھی پیش نہیں آیا ہے یہی وہ صبر ہے جسے جمیل فرمایا ہے ۔

صبر اور درد و غم کا اجتماع کیسے ؟

بظاہر خیال ہوتا ہے کہ یہ تینوں باتیں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اگر صبر کامل ہے تو پھر درد و غم کی شدتیں کیوں ہیں ؟ اور اگر یقین موجود تھا تو درد و غم کو محو ہو جانا چاہیئے ۔ اسی لیے کچھ شارحین قرآن نے یہاں بڑی مشکل محسوس کی اور اس کے لیے طرح طرح کی توجیہوں کا سہارا لینا پڑا ۔ لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو صورت حال بالکل صاف ہے ۔ اور کسی توجیہہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقام صبر کا مقام تھا ۔ اور صبر اسی وقت ممکن ہے جب بے صبری کے اسباب موجود ہوں اور زیادہ سے زیادہ موجود ہوں ۔ اگر درد و غم کی ٹیس نہیں اُٹھ رہی ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جھیلنے اور اُف نہ کرنیکی حالت موجود ہے ۔ برداشت تو اسی کی برداشت ہو سکتی ہے جو آگ کی جلن محسوس کر رہا ہو لیکن زبان سے اُف نہ کرے اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کا درد و غم اسی طرح محو ہو جاتا کہ اُسکی جلن ہی باقی نہ رہے تو یہ مقام صبر کا مقام نہ ہوتا ۔ موجبات غم سے متاثر نہ ہونے کا مقام ہوتا اور یہ حالت یا تو فرشتوں کی ہو سکتی ہے ۔ یا اس شخص کی جس کے انسانی احساسات معطل ہو چکے ہوں ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام انسان تھے ۔ فرشتے نہ تھے ۔ اور اسی حیثیت سے قرآن نے ان کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے ۔ ان کی روح صبر و یقین سے معمور تھی ۔ وہ یوسف ؑ کے خواب میں اس کا مستقبل دیکھ چکے تھے ۔ وہ جانتے تھے ۔ کسی نہ کسی دن یہ جدائی ختم ہونے والی ہے ۔ تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے ۔ جس کی جدائی ایک گھڑی کے لیے شاق تھی وہ برسوں کے لیے ان سے جدا ہو گیا تھا ۔ یہ جاننے پر بھی کہ وہ زندہ و سلامت موجود ہے اس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا ۔ بلکہ اس بات کے تصوّر نے کہ وہ زندہ موجود ہے مگر مجھ سے دور ہے دردِ فراق کو اور زیادہ کر دیا تھا ۔

(۱۶) حضرت یوسف ؑ کنعانی غلام کی حیثیت سے

اور ایک قافلہ آیا ۔ قافلے والوں نے اپنا پانی لانے والا کنویں پر روانہ کیا ۔ اس نے ڈول لٹکایا ۔ بول پڑا واہ واہ خوشی کی بات ہے ۔ یہ تو ایک لڑکا ہے اور پھر قافلہ والوں نے اُسے تجارتی مایہ بنا کر چھپا لیا اور وہ جو کچھ کر رہے تھے ۔ اللہ کو خوب معلوم ہے ۔ کہتے ہیں کہ تین روز تک حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں رہے ۔ قدرت الٰہی نے حفاظت کی ایک بھائی یہودا کے دل میں

ڈال دیا۔ کہ وہ ہر روز کنویں پر آئے اور کھانا پہنچا ئے۔ ویسے بھی سب بھائی خبر رکھتے تھے۔ کہ مریں نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کا مسافر نکال لے جائے۔ تو ہمارے درمیان سے یہ کانٹا نکل جائے۔ سچ ہے۔

گل است سعدی و در چشم دشمنان خار

آخر مدین سے مصر جانے والا قافلہ اُدھر سے گذرا۔ انہوں نے کنواں دیکھ کر اپنا آدمی پانی بھرنے کو روانہ کیا اس نے ڈول ڈالا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام چھوٹے تو تھے ہی ڈول میں بیٹھ گئے اور رسی ہاتھ سے پکڑلی۔ کھینچنے والے نے ان کا حسن وجمال دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے پکارا۔ یہ تو عجیب لڑکا ہے۔ بڑی قیمت کو بکے گا ادھر کھینچنے والے نے اس واقعہ کو دوسرے ہمراہیوں سے چھپانا چاہا کہ اوروں کو خبر ہوگی تو سب شریک ہو جائیں گے۔ شاید یہ ظاہر کیا کہ یہ غلام اس کے مالکوں نے مجھ کو دیا ہے تاکہ مصر کے بازار میں فروخت کروں۔ آخر میں فرمایا۔ واللہ علیم بما یعملون۔ یعنی بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے۔ اور قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنا چاہتے تھے۔ اور خدا تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو یکدم روک دیتا لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی اس لیے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انہیں ڈھیل دی گئی [1]

اس آیت میں تین باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ کوئی تجارتی قافلہ کنویں پر آیا۔ دوسری یہ کہ پانی بھرنے والے نے پانی کے ارادے سے کنویں میں ڈول ڈالا تیسری یہ کہ ڈول میں پانی کی جگہ حضرت یوسف علیہ السلام بیٹھ گئے۔ اس سے پانی کے لیے ڈول ڈالنے والے کو خوشی ہوئی۔ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مال تجارت سمجھ کر سامان میں چھپا لیا۔ یہ تجارتی قافلہ کہاں سے آرہا تھا اور کون تھا۔

اسماعیلی تاجروں کا قافلہ

حجاز کے اسماعیلی تاجروں کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات بلسان اور مصالہ لاد کر جا رہا تھا۔ کنواں دیکھ کر انہوں نے وارد کو روانہ کیا۔ وارد کے اصلی معنے تو کسی گھاٹ یا چشمہ پر اترنے والے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے ہیں۔ عرب میں یہ دستور تھا۔ کہ جس کنویں پر اترنا ہوتا ذرا پہلے ایک آدمی اس پر بھیجتے تاکہ وہ پانی وغیرہ کا انتظام کر رکھے۔ یہاں وارد سے وہی مراد ہے اسی وارد نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ یوسف ع اسی ڈول کے سہارے کنویں سے باہر آ گئے جب قافلہ کے آدمی نے ڈول ڈالا تو یوسف علیہ السلام سمجھے کہ شاید کوئی آدمی مجھے نکالنے آیا ہے۔ اور ڈول میں بیٹھ گئے۔ ڈول کھینچنے والے نے اظہار تعجب کی جگہ اظہار مسرت اس لیے کیا۔ کہ غلامی کا رواج عام تھا اور کمسن اور خوبصورت لڑکے کا ہاتھ لگ جانا تو ایک قیمتی متاع سمجھی جاتی اور معقول قیمت وصول ہو جاتی اسی لیے فرمایا واسروه بضاعة۔ قافلہ والوں نے سوچا کہ ایک نفع کی چیز مل گئی کہیں بیچ لیں گے اور اس خیال سے کہ کہیں داہنے بائیں کوئی مدعی نہ کھڑا ہو جائے اس واقعہ کو انہوں نے راز بنانے کی کوشش کی تاکہ اس کی تشہیر نہ ہوتے دیں۔ گویا سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنویں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا اور شاہراہ سے الگ اس لیے بھائیوں کو یقین تھا کہ کوئی انسان وہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اتفاق سے ایک قافلہ راہ بھول کر وہاں آنکلتا ہے اور پانی کے لیے وارد ڈول ڈالتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح ان کی رہائی کا سامان ہو جاتا ہے۔ لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے جو تھوڑی سے دیر کی تھی نجات مل گئی۔ لیکن دوسری ہلاکت سے جو عمر بھر جاری رہنے والی تھی نمودار ہو گئی۔ معاملہ کی سادہ صورت تو یہی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسف ؑ کو کنویں میں ڈال کر چلے گئے۔ بعد میں قافلے والوں نے آکر ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ یہ قافلہ جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالا اسمٰعیلی تاجروں کا قافلہ تھا۔ یہ اہل مدین اسماعیلی عرب تھے۔ یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ اور اسمٰعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر ان کی تاجرانہ سفر کی اولین منزل ہے یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے قدامت پرست عربوں کا تجارتی قافلہ ہے۔

قصص الانبیاء عبدالوہاب کو تورات کے بیان کی وجہ سے قافلہ کے متعلق یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ انہوں نے اسماعیلی اور مدیانی کو دو جدا جدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے حضرت اسمٰعیل سے تعلق رکھتا تھا اور وطنی اعتبار سے مدیانی تھا۔ جدید نسلی وجغرافیائی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مقام کو تورات میں مدین یا مدیان کہا گیا ہے اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو ساعیر (سراۃ) بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے

بنی اسرائیل مدین اور آغاز میں اسماعیلی حجاز کہتے تھے۔ اس لیے ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

"ممالک عرب میں سب سے پہلا نام تورات میں مدیان نظر آتا ہے"۔ (تکوین ۲۵، ۲-۴)

شہر مدیان تحقیقی اور یقینی طور پر حجاز میں ساحل بحر احمر عقبہ کے سرے پر واقع تھا۔ اور اب تک اسی نام سے وہیں موجود ہے۔ قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی مدیانی لوگوں کا ذکر ہے ساتھ ہی اتحاد نام کے ساتھ اسماعیلیوں کا ذکر ہے۔ بلکہ تورات نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے۔ یہ اتحاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک پشت کے بعد تورات میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ تجارتی قافلہ نسلاً اسمٰعیلی اور وطن کے اعتبار سے مدیانی یعنی حجازی تھا۔ لہٰذا یہ دو قافلے نہیں بلکہ ایک ہی قافلہ تھا۔ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ اس لیے یہ قافلے والے حضرت اسمٰعیلؑ کے بیٹے اور پوتے ہوں گے۔

(۱۷) یوسفؑ اور غلامی

اور پھر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت معمولی قیمت پر یعنی گنتی کے چند درہموں میں فروخت کر دیا وہ اس سے دل برداشتہ تھے۔ بھائیوں کو خبر ہوئی کہ قافلے والے نکال لے گئے وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا غلام بھاگ آیا ہے۔ چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے اس لیے ہم رکھنا نہیں چاہتے تم خرید و تو خرید سکتے ہو۔ مگر سخت نگرانی رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے کہتے ہیں کہ اٹھارہ درہم یا کم و بیش میں بیچ ڈالا اور نو بھائیوں نے دو دو درہم لے لیے۔ ایک بھائی یہودا نے نہیں لیے۔ آخر میں فرمایا وہ اس سے دل برداشتہ تھے۔ یعنی اس قدر ارزاں بیچنے پر تعجب نہ کرو وہ اتنے بیزار تھے کہ مفت ہی دے ڈالتے تو مستبعد نہ تھا۔ جو پیسے مل گئے غنیمت سمجھا کچھ مفسرین کہتے ہیں۔ آیت میں اس بیع کا ذکر ہے جو قافلہ والوں نے مصر پہنچ کر کی اگر ایسا ہو تو کہا جائے گا کہ پڑی ہوئی چیز کی قدر نہ کی اور یہ اندیشہ رہا کہ پھر آکر کوئی دعویٰ نہ کر بیٹھے نیز آبق بھگوڑا ہونے کا عیب سُن چکے تھے اس لیے سستے داموں بیچ ڈالا و الظاہر ھو الاول واللہ اعلم [1]

شیخ الاسلام نے جو تشریح کی عام شارحین قرآن نے یہی تشریح کی ہے۔ مگر اس تشریح کا قرآن ساتھ نہیں دیتا ہے۔ قرآن میں شروہ کی ضمیر کا مرجع قافلہ والے ہیں۔ قرآن میں صرف ایک ہی

[1] افادات شیخ الاسلام

فروختگی کا ذکر ہے ۔ دونوں باتیں پایہ تحقیق سے گری ہوئی ہیں ۔ یہ بھی مدین والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اسماعیلی تاجروں کے ہاتھ فروخت کیا اور یہ بھی کہ برادران یوسف نے اسماعیلی قافلے کے ہاتھ فروخت کیا تلمود کا بیان ہے کہ

> مدین کے سوداگروں نے یوسف کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا ۔ پھر برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے قبضے میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا آخرکار انہوں نے بیس درہم قیمت ادا کرکے برادرانِ یوسف کو راضی کیا پھر انہوں نے بیس درہم میں یوسف کو اسماعیلیوں کے ہاتھ فروخت کیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر فروخت کیا ۔

اسی تلمودی داستان سے عام شارحین قرآن میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا تھا ۔ لیکن واضح رہے کہ قرآن اس روائیت کی تائید نہیں کرتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ اسمٰعیلی تاجروں نے مصر پہنچتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو نہایت حقیر قیمت گنتی کے چند درہم کے عوض میں بیچ دیا انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خریدنے پر کچھ رقم تو خرچ نہیں کی تھی کہ اپنی رقم وصول کرتے اور اس پر مزید نفع حاصل کرنے کی فکر ہوتی ایک چیز مفت ہاتھ آتی ہے وہ جس قیمت پر بھی بک جائے بیچنے والے کے لیے نفع ہی نفع ہے ۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي
الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ
عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱ وَلَمَّا بَلَغَ
اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۲

اور جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اسے عزت کے ساتھ رکھو عجب نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں[۱۸] اور اس راہ سے ہم نے یوسف علیہ السلام کیلئے سرزمین مصر میں قدم جمانے کا موقعہ فراہم کردیا اور یوسف علیہ السلام کی برگزیدگی کے ساتھ تاکہ ہم یوسف علیہ السلام کو باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا سکھادیں[۱۹] اور اللہ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے کردیتا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے بے خبر ہے[۲۰] اور جب یوسف علیہ السلام اپنی بھرپور جوانی کو پہنچے تو ہم نے اسے

کارفرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی دی اور ہم حُسن کاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں[۲۱]

حضرت یوسفؑ کی مصری زندگی کا آغاز

انسانی زندگی کی سب سے بڑی فضیلت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح و کامرانی ہے۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی اس کے لیے رحمت حق راہ نکال دے گی۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں پھر بھی رحمت حق اسے ناکام نہ کرے گی حوادث واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے، احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے، افراد و جماعات اسے مسخر نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اللہ کی جانب سے ہر حال میں کامیابی ہے، اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے وہ اعمال انسانی کی اس امتحان گاہ میں صرف اس لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز و درماندگی کی آلودگی اسے کبھی چھو نہیں سکتی۔ غور کیجئے کہ سترہ برس کا ایک نوخیز لڑکا باپ کی آغوش محبت سے جبراً جدا کیا جاتا ہے اور اچانک وہ اپنے آپ کو ان لوگوں میں پاتا ہے جو چند سکوں کے بدلے اسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں بھائیوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ قتل کا ارادہ کیا۔ گمنام کنویں میں اسے ڈالا۔ قافلہ والوں نے کنویں سے نکالا۔ قرآن نے بھائیوں کے کردار کی المناک صورت پیش کی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کی بے چینی، بے قراری، جزع اور فزع کی حالت کے بارے میں دور کا بھی اشارہ نہیں کیا۔ سوچو دنیا کی ایک لاکھ طبیعتیں اس موقعہ اور ایسی حالت میں کیا کرتیں مگر غور کرو کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا کیا؟ اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح انہوں نے صورت حال کا پورا پورا جائزہ لے لیا ہو اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آجائے اسے صبر و سکون سے برداشت کرنا ہے اور اسی کے مطابق کام کرنا ہے۔ بھائیوں نے باپ سے چھینا، کنویں میں بے بسی اور بے کسی کی حالت میں قید کر دیا، قافلہ والوں نے کنویں سے نکالا اور انہیں غلام کی حیثیت سے پیش کیا وہ ایک غلام کی طرح پیش ہو گئے عزیز مصر نے غلام کی طرح خریدا انہوں نے غلام کی طرح اس کی خدمت کی۔ یہ ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے پوری

زندگی کی سوگواری بن جاتی۔ ان کے لیے کوئی مصیبت ہی نہ تھی۔ باپ کی آغوش سے نکل کر اچانک ایک اجنبی مُلک میں ایک اجنبی کا غلام بن جانا ان کے لیے ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا ایک عیش چھوڑ کر دوسرا عیش اختیار کر لینا۔ نہ پچھلی بات کا ماتم ہے نہ موجودہ حالت سے جھجک، نہ گزشتہ کی یاد میں سوگواری ہوئی نہ آئندہ کے اندیشے میں بدحالی۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس، اور توکل علی اللہ کی روح عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی تو وہ منزل سامنے نہ آتی جس کی طرف ان آیات میں راہنمائی ہو رہی ہے۔

(۱۸) اور جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ اسے عزت کے ساتھ رکھو عجب نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ کہتے ہیں کہ مصر پہنچ کر نیلام ہوا۔ عزیز مصر وہاں کا مدار المہام تھا۔ اس کی بولی پر معاملہ ختم ہوا اس نے اپنی عورت زلیخا یا راعیل سے کہا کہ نہایت پیارا مقبول صورت اور ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے اس کو پوری عزت و آبرو سے رکھو۔ غلاموں کا معاملہ مت کرو۔ شاید بڑا ہو کر ہمارے کام آئے ہم اپنا کاروبار اس کے سپرد کر دیں یا جب اولاد نہیں تو بیٹا بنا لیں [1] تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح مصر تمدن و تہذیب کا گہوارہ تھا۔ یہاں کے حکمران عمالقہ میں سے تھے۔ جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان سے ایک بردی غلام کی حیثیت سے مصر میں داخل ہوئے۔ مصر کا دار الحکومت اس زمانہ میں رعمیس تھا۔ جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ یہی غالباً وہ مقام ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کی جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتائی جاتی ہے۔ مصری فوج کا ایک افسر شاہی خاندان کا ایک رئیس تھا جس کا نام فوطیفار تھا۔ تورات میں ہے کہ جس مصری نے خریدا تھا اس کا نام فوطیفار تھا اور وہ فرعون کا ایک امیر اور فوج کا سردار تھا۔ قرآن نے آگے چل کر اسے عزیز کہہ کر پکارا ہے اور آگے اسی واقعہ میں دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی یا ایھا العزیز کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بڑا عہدے دار یا صاحب منصب تھا۔ کیونکہ عزیز کے معنے ایسے با اقتدار شخص کے ہیں۔ جس کا کوئی مدمقابل نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے۔ کہ وہ شاہی خزانہ کا افسر تھا۔ یہی افسر مصر کے بازار سے گزر رہا تھا۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت پر قافلہ والوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قرآن نے سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ عزیز مصر کے معاملہ کا ذکر کیا ہے۔ کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا اکرمی مثوٰہُ کہ اسے اچھی طرح رکھنا۔ عزیز مصر نے حضرت علیہ السلام کو بحیثیت غلام خریدا تھا۔ اور مصر کے آثار و نقوش بتاتے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوتا تھا۔ وہ غلاموں کے لیے ویسے ہی سنگدل تھے جتنی سنگدل دنیا کی تمام پرانی قومیں رہ چکی ہیں۔ اس لیے اس نے اپنی بیوی سے خصوصیت سے کہا کہ یہ عام غلاموں میں سے نہیں۔ اسے عزت و احترام کا مقام دینا یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے معجزانہ کارسازی تھی کہ ایک غلام جب ایک متمدن اور صاحب شوکت رئیس کے گھر پہنچتا ہے تو پاک زندگی حلم وقار اور امانت و سلیقہ کے پاک اوصاف کی وجہ سے عزیز مصر کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر حُسنِ کردار سے اس کا دل ایسا مسخر ہو جاتا ہے کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے۔ اکرمی مثوٰہُ عسٰی ان ینفعنا او نتخذہٗ ولدا۔ یہ انقلاب حال کیونکر ہوا۔ وہ کیسی وفاداری دیانت اور راست بازی و امانت شعاری ہوگی۔ جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ ایک عبرانی غلام کو اپنے فرزند کی طرح چاہنے لگا۔ تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر ۱۸ سال تھی اور فوطیفار عزیز مصر ان کی شاندار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے چنانچہ جب وہ انہیں خرید رہا تھا۔ اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ تو غلام معلوم نہیں ہوتا مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چرا کر لائے ہو۔ تورات کا بیان ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں چھوڑ دیا چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ اس کو غلام کی طرح نہیں بلکہ عزت و احترام سے رکھنا ہے بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسی کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔

(۱۹) حضرت یوسف کی مصری زندگی میں کامرانیوں کی ابتداء

اور اس راہ سے ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو برگزیدگی دی اور تاکہ ہم یوسفؑ کو باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا سکھا دیں یعنی ہم نے اپنی قدرت کاملہ اور تدبیر لطیف سے یوسفؑ کو بھائیوں کی حاسدانہ سختیوں اور کنوئیں کی قید سے نکال کر عزیز مصر کے یہاں پہنچا دیا پھر اس کے

دل میں یوسف علیہ السلام کی محبت و وقعت القا فرمائی۔ اس طرح ہم نے ان کو مصر میں ایک معزز جگہ دی اور اہل مصر کی نظر میں ان کو وجیہ و محبوب بنا دیا تاکہ یہ چیز آئندہ ترقیوں اور سربلندیوں کا پیش خیمہ ہو۔ اور بنی اسرائیل کو مصر میں بسانے کا ذریعہ ہو۔ ساتھ میں یہ بھی منظور تھا کہ عزیز مصر کے یہاں رہ کر بڑے سرداروں کی صحبت دیکھیں تاکہ سلطنت کے رموز و اشارات سمجھنے اور تمام باتوں کو ٹھکانے پر بٹھانے کا کامل سلیقہ اور تجربہ حاصل ہو[1]۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی میں کامرانیوں کا نقطہ آغاز کا بیان ہو رہا ہے جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو گویا حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری کامرانیوں کی بنیاد پڑ گئی اور وہ میدان پیدا ہو گیا جہاں ان کے جوہر کھلنے اور بتدریج تخت مصر تک پہنچانے کا اللہ سبحانہ کی جانب سے سامان ہو گیا کذالک مکنا لیوسف فی الارض۔ اس طرح ہم نے یوسف کے مصر میں قدم جما دیئے کہ غلام ہو کر بکا تھا لیکن معزز و محترم ہو کر زندگی بسر کرنے لگا نیز اس میں یہ بھی مصلحت تھی کہ ان پر اس تاویل الاحادیث کی راہ کھول دیں۔ جس کی خبر ستاروں والے خواب میں دی جا چکی تھی۔ اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم حکومت تھی اور نہ تمدن و تہذیب کی ترقی کا کوئی نام و نشان تھا۔ کچھ آزاد قبائل تھے۔ جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے۔ اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا ہی لی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے مقابلے میں غیر منظم اور غیر ترقی یافتہ قبائل کا تھا۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو تربیت ملی تھی اس میں بدویانہ زندگی کے محاسن اور خانوادہ ابراہیمؑ کی خدا پرستی اور دینداری کے عناصر تو ضرور موجود ہیں مگر اللہ سبحانہ اس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک یعنی مصر میں ان سے جو کام لینا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے جس واقفیت جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی۔ اس کی نشوونما کا بدوی زندگی میں کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انہیں سلطنت مصر کے ایک بڑے عہدے دار کے یہاں پہنچا دیا۔ اس طرح یہ موقع فراہم ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں جو اب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں۔ اسی بات کی طرف اس آیت میں یہ اشارہ ہے۔ سوچنے کی بات ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ایک ایسے شخص میں جو ابھی چند سال ہوئے صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا یہ قوت علمی کیسے پیدا ہوگئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام مہمات کی کل بٹھانے والا ہو گیا۔ یقیناً مبداُ فیاض کے کرشمہ فیضان ہیں۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے؟ علم تاویل الاحادیث اب چونکہ علوم وضعیہ کی تدوین اور فنی اصطلاحات کے گورکھ دھندے نے ہمیں طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں۔ اس لیے ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے اصطلاحی الفاظ بولتے ہیں۔ لیکن قرآن کی زبان وضعی اصطلاحات کی زبان نہیں ہے۔ نہ علمی اصطلاحوں سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے ساری باتوں کے لیے ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادا ء مطلب کا قدرتی اور سیدھا سادھا مطلب ہو سکتا ہے۔ تاویل الاحادیث یعنی باتوں کے مطلب اور مال پا لینے کا علم، تعلیم کی ساری کاوشیں تربیت ذہنی کی ساری محنتیں تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں صرف اس لیے ہوتی تھیں کہ باتوں کی تاویل اور مطلب بوجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اس آیت میں اسی مقصد کو بتانے کے لیے لنعلمك من تاویل الاحادیث کی بلیغ معجزانہ تعبیر اختیار کی ہے اس آیت کے موضوع پر صرف یہ کہنا باقی ہے کہ آیت میں ولنعلمہ من تاویل الاحادیث کا معطوف علیہ موجود نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی نے معطوف علیہ **یتصرف فیھا بالعدل** بتایا ہے۔ مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان گزشتہ ناخوشگوار حالات میں اس لیے محفوظ رکھا گیا ہے تا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں اقتدار اعلیٰ پر پہنچ کر عدل و انصاف کا بے لاگ اسلامی نظام قائم کریں۔ اور تا کہ ہم ان کو مملکت چلانے کے لیے اللہ کے قوانین اور اس کے احکام کی تعلیم دیں اور علامہ قرطبی نے معطوف علیہ فعلنا ذالك بتایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ کام اس لیے کیا تا کہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر کا مشاہدہ کرائیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تاویل احادیث کی تعلیم دیں اور کچھ نے معطوف علیہ لنجتبیہ نکالا ہے پوری بات یوں ہے کہ اسطرح ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تا کہ ہم ان کو اپنے کام یعنی اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے برگزیدگی دیں اور تا کہ ہم ان کو احادیث کی تاویل سکھائیں۔

اسی طرح کذالك کا شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق مطلب مقرر کیا۔ ایسے ہی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر میں قدم جمانے کا موقعہ دیا۔ کیسے دیا؟ اس کے جواب میں مختلف باتیں کہی ہیں۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں۔ جیسے ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل سے اور کنویں کی قید سے بچایا اور عزیز مصر کو ان پر مہربان کیا ایسے ہی ہم نے اپنی شان

قدیری سے ان کو مصر میں اقتدار کا موقعہ فراہم کیا قاضی بیضاوی اور علامہ قرطبیؒ کی بھی یہی رائے ہے

(۲۰) اللہ سبحانہٗ کی شانِ قدیری کا مظاہرہ

اور اللہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے بے خبر ہے ۔ یعنی بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گرانا چاہا اللہ سبحانہٗ نے ان کو آسمان رفعت پر پہنچانا چاہا ۔ اکثر لوگ کوتاہ نظری سے دیکھتے نہیں ہیں کہ انسانی تدبیر کے مقابلہ میں کس طرح اللہ سبحانہٗ کا بندوبست غالب رہتا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ دیکھو اللہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کس طرح کر کے رہتا ہے بھائیوں نے نامراد کرانا چاہا تھا لیکن انہوں نے جو کچھ کیا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کی فتح و فیروزی کا ذریعہ بن گیا ۔ گویا اب جو کچھ سرگزشت بیان ہوئی ہے ۔ یہ آیت گرامی اس کا خلاصہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ارادے اور اسکی اسکیمیں اس طرح بروئے کار آتی ہیں ۔ لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے ۔ وہ اس کو نہیں جانتے ۔ بتانا یہ ہے ۔ کہ دنیا چل تو رہی ہے اللہ سبحانہٗ کے امر اور اس کے قانون کے تحت لیکن الٰہی نظام میں قانون اللہ کے تابع ہے اللہ قانون کے تابع نہیں بلکہ وہ اس پر غالب ہے ۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں

اللہ سبحانہٗ اپنے کاموں میں خود اپنے قانون پر غالب ہے ۔

لیکن لوگ صرف عالم شہادت کو جانتے ہیں عالم غیب سے بالکل بے خبر ہیں ۔ قرطبیؒ نے حکما کے حوالہ سے غالب علی امرہٖ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کو پڑھا جائے فرماتے ہیں ۔

> حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ خواب بھائیوں سے بیان نہ کرنا امر الٰہی غالب رہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کا ذکر بھائیوں سے کر دیا بھائیوں نے چاہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کر دیں امر الٰہی غالب رہا کہ یوسف علیہ السلام کی شان بلند ہوئی ۔ بھائیوں نے چاہا کہ باپ کی چاہتوں کا مرکز وہ ہوں ۔ امر الٰہی غالب رہا کہ باپ ان سے کبیدہ خاطر ہوئے ۔ مصنوعی آہ و بکا سے بھائیوں نے باپ کو دھوکا دینا چاہا امر الٰہی غالب رہا حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعقوب علیہ السلام دھوکہ میں نہیں آئے۔

بتانا یہ ہے کہ جو کام انسانی عقل بعید سمجھتی ہے اللہ سبحانہٗ ان کا سامان بھی خفی اور لطیف طریقوں سے کر دیتے ہیں۔

(۲۱) حضرت یوسفؑ پر نبوّت کا فیضان

اور جب یوسف علیہ السلام اپنی بھرپور جوانی کو پہنچے تو ہم نے اس کو کارفرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی دی اور ہم حُسن کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں یعنی جب یوسف علیہ السلام کے تمام قوی حد کمال کو پہنچ گئے تو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے عظیم الشان علم و حکمت کا فیضان ہوا۔ نہایت مشکل عقدے اپنی فہم رسا سے حل کرتے۔ بڑی خوبی و دانائی سے لوگوں کے نزاعات چکاتے، دین کی باریکیاں سمجھاتے، جو زبان سے کہتے وہ کر کے دکھاتے، سفیہانہ اخلاق سے قطعاً پاک وصاف اور علم شرائع کے پورے ماہر تھے۔ تعبیر رؤیا کا علم تو ان کا مخصوص حصّہ تھا۔ اور جو لوگ فطرت کی راہنمائی یا تقلید صالحین اور توفیق ازلی سے نوائب و حوادث پر صابر رہ کر عمدہ اخلاق اور نیک چال چلن اختیار کرتے ہیں حق تعالیٰ ان پر ایسے ہی انعامات فرماتے ہیں[۱]

آیت میں لفظ اشد جوانی کے لیے بھی اور پختہ سن و سال کے لیے بھی آتا ہے مثلاً حتیٰ اذا بلغ اشدہٗ و بلغ اربعین سنۃ۔ یہاں تک کہ پہنچ گیا اپنی جوانی کو اور چالیس سال کا ہو گیا یہی عمر نبوّت کی بتائی گئی ہے۔ اٰتیناہٗ حکما و علما۔ ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔ علم کے لغوی معنے جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً نبوت کے علوم مراد ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔ قد جاءنی من العلم ما لم یاتک میرے پاس علم کا وہ حصّہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں حضرت خضرؑ کے متعلق قرآن میں ہے۔ وعلمناہ من لدنا علما۔ ہم نے اپنے پاس سے اسے علم سکھایا ہے۔ ہر چیز اللہ سبحانہٗ کے پاس سے ہوتی ہے۔ پھر اپنے پاس سے علم کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شئے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمول کے ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ اس طرح اللہ سبحانہٗ کی جانب سے علم عطا ہونے کے معنے اس علم کے حاصل ہونے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو۔ یہی علم خداداد ہے۔ یہ علم کا ایک دائمی عطیہ نبی کی شان ہوتی ہے۔

آیت میں علم کے ساتھ حکم دینے کا بھی ذکر ہے۔ حکم کے معنے لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں۔

کسی شئے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شئے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ خواہ اس فیصلے کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

حکم کے معنے علم سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنے کے ہیں۔

ان انبیاء کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ اٰتیناہُ حکما وعلما۔ ہم نے ان کو علم اور حکم دیا۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے لفظ حکم دینوی حکومت کے معنے میں قدیم عربی میں نہیں۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ جیسے فاحکم بیننا بالحق اور فاحکم بین الناس بالحق۔ سب سے بڑھ کر کہ کتاب، حکم اور نبوت تین باتیں سورۃ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں۔ اولئک الذی اٰتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ۔ جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف اولئک کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں۔ ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، ذکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، الیسع، یونس، اور لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنے حکومت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں۔ سلیمان و داؤد علیہما السلام۔ اور چاہیں تو آپ یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کر لیجئے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن کی عربیت کے اصلی اور صریح معنے میں مستعمل ہے۔ اور اس لفظ سے اللہ سبحانہٗ کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ بہرحال حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کو منصب نبوت اور وحی کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے۔ جس کے صاف معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے

قرینوں سے علم، فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کے ہیں اور یہ لوازم نبوّت ہیں اسی لیے محققین نے اس سے نبوّت مراد لی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں یعنی النبوۃ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت دی۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ وکذالک نجزی المحسنین۔ یعنی یہ انعام جو حضرت یوسف علیہ السلام پر ہوا ہے تو یہ اس لیے ہوا کہ وہ حسن کار تھے۔ انہوں نے اللہ سبحانہٗ کے حقوق و فرائض کی پابجائی کی اور ہر امتحان میں پورے اُترے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھا ہے۔ اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگے وہ حسب و نسب اور سیرۃ و صورت میں ممتاز ہیں۔ اخلاق حسنہ سے آراستہ ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے بچپن کے خواب کو اسی آئینے میں دیکھ کر فرمایا تھا۔ کذالک یجتبیک ربک۔ یعنی یہ تمہیدیں اس لیے ہیں کہ منصب نبوت ملنے والا ہے بچپن ہی میں رؤیائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی زبان حال سے بول رہی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نبوت کا انعام ہونے والا ہے یہی زندگی کی حُسن کاری ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر انسان اپنی محنت اور کوشش سے نبی بن سکتا ہے۔ بلکہ نبی وہی ہوتا ہے۔ جس میں اللہ سبحانہٗ نبوت کے آثار و خواص اور کیفیات شروع ہی سے بالقوہ ودیعت فرماتے ہیں۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ
وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ
اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ
اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ
قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ
مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ
هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ
فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ
مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾
يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

ع ۹

اور ڈورے ڈالے خود حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات پر اس

عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور اس عورت
نے دروازے بند کر لیے اور بولی لے آ[۲۳] حضرت یوسف ع نے فرمایا اللہ
کی پناہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تیرا شوہر میرا مالک ہے اس نے مجھے عزت و
احترام کی جگہ دی ہے۔ یہ تو سرتاسر ظلم ہے اور ظلم کار لوگ کبھی بھی
کامیاب نہیں ہوتے ہیں[۲۳]۔ بلاشبہ فی الواقع اس عورت نے بدکاری
کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور یوسف علیہ السلام کے پاس اگر اس کے رب
کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی ارادہ کر ہی لیتا۔ ایسے ہی ہم ہٹاتے ہیں
یوسف سے برائی اور بے حیائی کے کام کو بلاشبہ یوسف ع ہمارے
مخلص بندوں میں سے ہے[۲۴] اور ایسا ہوا کہ دونوں دروازے کی طرف
دوڑے اسی حالت میں یوسف کی قمیص اس عورت نے پیچھے سے پھاڑ
دی۔ اسی حال میں دونوں کا عورت کے خاوند سے آمنا سامنا ہو گیا،
دروازے کے پاس۔ عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے کہا بتاؤ جو شخص
تمہارے گھر والوں سے بُرا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا
ہے کہ اسے جیل بھیج دیا جائے یا کوئی اور دردناک سزا اسے دی جائے[۲۵]
حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خود اس عورت نے مجھ پر ڈورے
ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل جاؤں۔ اور اس عورت ہی کے گھر والوں میں

سے ایک گواہ نے گواہی دی یہ کہ اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچّی ہے اور یوسف جھوٹا ہے اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچّا ہے۔ جب عورت کے شوہر نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی دیکھی تو بول پڑا کہ یہ سب تم عورتوں کا چلتر ہے اور تمہاری مکاری اور چلتر بڑا ہوتا ہے۔ اے یوسف تو اس معاملے کو نظر انداز کر اور بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے[۲۶]

حضرت یوسف کے جمال سیرۃ کا ایک اور منظر

زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں لاتی ہیں۔ پہلے مصیبتوں کا ابتلا تھا۔ اسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس اور توکل علی اللہ کی وہ روح عظیم اپنے اندر پیدا کرلی تھی کہ معصیت کا ابتلا عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے جب پیش آیا۔ تو اس کے مقابلے میں کامیاب رہے۔ مصیبت کی ابتلا میں ذہن و دماغ کی آزمائش تھی اور معصیت کے ابتلا میں جذبات کی آزمائش تھی اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا، پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا، درندوں کے مقابلے سے منہ نہیں موڑتا، تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ کشمکش کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن حضرت یوسف علیہ کی سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہ ہوسکی۔ ان کی بے داغ فضیلت پہ نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے ایک جملہ وھم بھا لولا ان رأ برھان ربہٖ میں صورت حال کی

پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ تم چشم تصور سے کام لو اور دیکھو ترغیبات کی قہر و سلطانی کا کیا حال تھا۔ اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر ربا حالات میں پیش آئی تھی۔ عمر عین عروج شباب کی عمر اور معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت، طلب کا نہیں مطلوبیت کا۔ اور طلب بھی کیسی؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مانع کوئی نہیں۔ کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردہ حائل نہیں۔ کون ہے جو ایسی حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ عفت و پاکبازی کا کون سا پہاڑ ہے جو ان بجلیوں کی تاب لا سکتا ہے لیکن ایک پہاڑ تھا۔ جسے یہ بجلیاں بھی جنبش میں نہ لا سکیں۔ یہ برہان رب اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ عصمت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلا ابتلاء مصیبت کا ابتلاء تھا۔ یہ دوسرا ابتلاء معصیت کا ابتلاء ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال سیرت یہ ہے کہ دونوں میں کامیاب رہے۔

(۲۲) اور ڈورے ڈالے خود حضرت یوسفؑ کی ذات پر اس عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف تھے۔ اور اس نے دروازہ بند کر لیا اور بولی لے آجا۔ ادھر تو الطاف غیبیہ حضرت یوسفؑ کی عجیب و غریب طریقے سے تربیت فرما رہے تھے۔ اِدھر عزیز کی بیوی زلیخا نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلۃ الاقدام موقع امتحان کا کھڑا کر دیا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال پر زلیخا مفتوں ہو گئی۔ اور دلکشی و ہوشربائی کے سارے سامان جمع کر کے چاہا کہ یوسف کے دل کو ان کے قابو سے باہر کر دے۔ ایک طرف عیش و نشاط کے سامان۔ نفسانی جذبات پورے کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں۔ یوسف علیہ السلام کا ہر وقت زلیخا کے گھر میں موجود رہنا اس کا نہایت محبت اور پیار سے رکھنا۔ تنہائی کے وقت خود عورت کی طرف سے ایک خواہش کا بے تابانہ اظہار۔ کسی غیر کے آنے جانے کے سب دروازے بند۔ دوسری طرف جوانی کی عمر، قوت کا زمانہ، مزاج کا اعتدال، تجرد کی زندگی یہ سب دواعی و اسباب ایسے تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقویٰ بھی پاش پاش ہو جاتا مگر اللہ سبحانہ نے جس کو محسن قرار دیکر علم و حکمت میں رنگین کیا ہو اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پہ پہنچایا۔ اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا داؤ چل جاتا۔ اس نے ایک لفظ کہا کہ معاذ اللہ اور شیطانی جال کے سارے حلقے توڑ ڈالے۔ کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی اس پر کس کا وار چل سکتا ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راودت ۔ اس نے پھسلایا، اس نے گفت وشنید کی، اس نے خواہش کی مراودۃ سے جس کے معنے دوسرے کو کسی کام پر جس کے کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو پھسلانے پر آمادہ کرنے اور اس کے متعلق گفت وشنید کرنے کے ہیں ۔

راغب لکھتے ہیں ۔ راودت یہ ہے کہ تمہاری اپنے بغیر سے ارادے میں نزاع اور تم اس بات کی خواہش کرو جو وہ نہیں چاہتا یا تم بسہولت اس چیز کے طالب ہو جس کا وہ بسہولت طالب نہ ہو۔ یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے اب تک وہ بھائیوں کے حسد کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا تھے ۔ اس سے وہ بچے تو ان کے سامنے ابتلاء کا دوسرا پرچہ آگیا ۔ پہلا ابتلاء مصیبت کا تھا اور یہ دوسرا ابتلاء معصیت کا ہے یہ امتحان پہلے امتحان سے کہیں زیادہ سخت ہے ۔ مصریوں میں جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا اس کی بیوی بھی حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہوگئی اور نوبت بایں جا رسید کہ ایک دن اپنے دروازے بند کرلیے ابواب جمع باب کی ہے اور غلقت تغلیق سے ہے جو باب تفعیل سے ہے جس کی خاصیت تدریج بھی ہے اور مبالغہ بھی ۔ مطلب یہ ہے کہ سارے دروازے ایک ایک کرکے خوب بند کرتی رہی اور دروازے بند کرکے بولی ھیت لك اس کے معنے ہیں کہ لے آجا ۔

(۲۳) سیرت یوسفؑ کی لازوال صداقت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی پناہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا (تین وجہ سے) اول یہ کہ تیرا شوہر میرا مربی ہے اور اس نے مجھے عزت واکرام کی جگہ دی ہے دوسرے یہ کہ سرتاسر ظلم ہے ۔ تیسرے یہ کہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کرسکتا ہوں علاوہ ازیں عزیز میرا مربی ہے جس نے مجھے ایسی عزت وراحت سے رکھا کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کردوں ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنیوالے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے ۔ نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیاء کرنا چاہیئے جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے بندوں کو ہماری خدمت کیلیے کھڑا کردیا بعض مفسرین نے انہ ربی کی ضمیر کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے[1] ان مفسرین میں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ بقاعیؒ بھی یہاں وہ فرماتے ہیں کہ

> انہٗ ربی احسن مثوای موقع تعلیل میں ہے معاذ اللہ کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس بُرے کام سے جس کی تو مجھے دعوت دے رہی ہے اللہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ میرا رب ہے۔ میری ایجاد، میری زندگی کی تدبیر اور ہر معاملہ میں میرے ساتھ حُسن کاری کی ہے۔ یہ اسی کی حُسن کاری ہے کہ تیرے شوہر کے قلب میں میرا اونچا مقام بنایا اور اس وجہ سے تیرے شوہر نے مجھ پر بھرپور اعتماد کیا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بلاشبہ اس شخص سے خیانت کروں گا جس نے مجھ پر اعتماد کیا اور میں ظلم کار بھی ہوں گا۔

اور جن لوگوں نے ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کی دعوت عیش کے جواب میں جو کچھ ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔ معاذ اللہ انہٗ ربی احسن مثوای۔ توبہ توبہ اللہ کی پناہ تیرا شوہر تو میرا آقا ہے۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ عزت واحترام کیساتھ مجھے رکھا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے حسن سلوک کے بدلہ میں یہ دوں کہ اس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں۔ یہ برائی ایسی برائی تھی کہ اسے برائی دکھلانے کے لیے کتنی ہی باتیں کہی جاسکتی تھیں۔ لیکن ان کا ذہن اسی طرف گیا کہ اس کے شوہر کے حوالہ سے بات کہی جائے اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کر کے پیش کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی سیرت کا جوہر اسی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ امانت داری، راست بازی اور ادائے فرض کی روح اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر وہی پہلے سامنے آتی تھی۔ موقعہ کی مناسبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ امراۃ العزیز کو غیرت دلانے کے لیے اس کے شوہر کے حوالہ سے بات کی جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا فقرہ بڑی نفسیاتی بلاغت رکھتا ہے۔ جذبات سے اندھی اور اللہ سبحانہٗ سے ایک بے خبر عورت کے سامنے اللہ سبحانہٗ کے حوالے سے وعظ کہنا بالکل بے معنی ہوتا۔ اس کے جذباتی ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جاسکتا تھا تو صرف اسی فقرے سے کیا جاسکتا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ پہلے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مقام کے لحاظ سے بات فرمائی معاذ اللہ۔ بعد ازیں مخاطب کی رعایت سے بات کی یعنی پہلے سبب ذاتی اور واقعی اور پھر سبب خارجی کا ذکر کیا اور لطیف انداز میں اس پر چوٹ کر دی کہ تجھے بھی اس کے حق کی رعایت کرنی چاہیئے یہ کہنا بالکل بے محل ہے کہ

یہ بات نبی کی شان سے بالکل بعید ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔

واقعی ایک گناہ سے باز رہنے میں تو یہ انداز کلام بلیغ نہیں لیکن جب مقصد باز رہنے کے ساتھ مخاطب کو گناہ سے باز رکھنا بھی ہو تو بلاغت یہی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اختیار کی۔

(۲۴) حضرت یوسفؑ کی عفت کا کمال

بلاشبہ فی الواقع اس عورت نے بدکاری کا ارادہ کرلیا تھا اور یوسف کے پاس اگر اسکے رب کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی ارادہ کرلیتا۔ ایسا ہی ہوا تاکہ ہم ہٹا دیں یوسفؑ سے برائی اور بے حیائی کے کام کو۔ بلاشبہ یوسف علیہ السلام ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے اگر اپنے رب کی قوت وقدرت نہ دیکھتا تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا۔ بعض مفسرین نے وھم بھا کو ولقد ھمت بہ سے علیحدہ کرکے لولا ان رای برھان ربہ سے متعلق کیا ہے جیسے ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علی قلبھا کی ترکیب ہے۔ اس وقت مقصود یوسف کے حق میں ہم کو ثابت کرنا نہیں بلکہ نفی کرنا ہے ترجمہ یہ ہوگا کہ عورت نے یوسفؑ کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت وحجت نہ دیکھ لیتا بعض نے لفظ ھم بھا میں ھم کو معنے میلان ورغبت لیا ہے۔ یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت ومیلان بے اختیار پیدا ہوا جیسے روزے دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ پینے کا وہ ارادہ کرتا ہے نہ بے اختیاری رغبت کچھ مضر ہے بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر وثواب کا موجب ہے اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب ودواعی قویہ کی موجودگی طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسفؑ کے دل میں کسی قسم کی رغبت ومیلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے بلکہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ اگر بندے کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا لیکن اس پر عمل نہیں کیا تو اس کی فرد حسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اس نے باوجود رغبت ومیلان کے میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا۔ بہرحال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے اور یوسفؑ کے "ھم" میں زمین وآسمان کا فرق ہے اسی لیے قرآن کریم نے دونوں کے ھم کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے ھم کی طرح یوسفؑ کے ھم

پر لام اور قد داخل کیا گیا بلکہ سیاق و لحاق میں بہت سے دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت و نزاہت پر قائم فرمائے جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں تفصیل روح المعانی اور تفسیر کبیر میں ہے [۱]

اصل بات یہ ہے کہ نحویوں نے تصریح کی ہے کہ لولا کا جواب لولا سے پہلے نہیں آتا بلکہ بعد میں آتا ہے اسی لیے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ لولا ان رای برھان ربہ کا جواب لفعل ہے جسے ربہ کے بعد محذوف ماننا چاہیئے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ کہ

اگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ فعل بد بھی کر بیٹھتے ۔

اور کچھ نے لولا کا جواب محذوف مان کر محذوف کی نشاندہی لجامعھا سے کی ہے اور کچھ نے محذوف لھم بھا مانا ہے ۔ اور علامہ آلوسیؒ نے کچھ محققین کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ

لولا کا جواب محذوف ہے جملہ میں خود اس کی دلیل ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام برہان الٰہی نہ دیکھتے تو طبعی تقاضے پر عمل پیرا ہوتے ۔ لیکن چونکہ برہان دیکھ لی اس لیے برہان کے تقاضے پر عمل پیرا ہوئے ۔

اس پر علامہ آلوسیؒ کا فیصلہ یہ ہے ۔ کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیئے 'ہم' کو ثابت کیا گیا ہے دوراز کار تاویلیں تو برداشت کی جا رہی ہیں مگر ان بزرگوں کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ یہاں لولا کا جواب مقدم ہے حالانکہ علماء کوفہ اور بڑے بڑے بصری علماء مثلاً ابوزید انصاری اور ابو العباس المبرد اس کے قائل ہیں ۔ غالباً ان بزرگوں کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر لولا کا جواب مقدم آیا ہے ۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علی قلبھا

ان سے بعید نہ تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا حال ظاہر کر دیں اگر ہم ان کا دل مضبوط کیئے نہ رہتے

اس جملے میں لولا کا جواب ان کادت لتبدی بہ جو لولا سے پہلے آیا ہے ۔ ایک دوسرے موقعہ پر ہے ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان کاد لیضلنا عن الهتنا لولا ان صبرنا علیها
بلاشبہ وہ تو ہم کو ہمارے معبودوں سے پھسلا ہی دیتا اگر ہم جمے نہ رہتے

یہاں بھی کاد لیضلنا الخ لولا کا جواب پہلے آیا ہے۔

اسی نحوی اعتراض کی بنا پر قرآن کے ہندوستان میں مطبوعہ نسخوں میں ھم بھا پر وقف ج تجویز کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہ رموز اوقاف سجاوندی کی تصریحات پر مبنی ہیں۔ ان رموز کی موجودگی میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا "عزیزہ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ بد کر چکی تھی اور یوسف علیہ السلام نے بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ بد کر لیا" ہمارے نزدیک یہ نحوی اعتراض قابل التفات نہیں۔ ہمارے نزدیک ھم بھا ہی لولا کا جواب مقدم ہے۔ اور بھا محل وقف نہیں۔ وقف حذف کر دیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا "یوسف علیہ السلام بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ بد کر لیتے اگر انہوں نے اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی۔ مصحف حکومت مصر میں بھی ھم بھا پر کوئی وقف نہیں ہے۔ علامہ اشمونیؒ نے انظالمون پر وقف کافی تجویز کے لکھا ہے کہ یہی وقف ھمت بھا پر بھی ہونا چاہیئے اس لیے کہ

> اس سے قرآن کا قاری ایک نبی کے متعلق اس سے چھٹکارا پا سکتا ہے کہ نبی معصوم ہو کر عورت کے ساتھ ارادہ بد کرے۔ یہ جملہ پہلے جملے ولقد ھمت بہ سے جدا ہو جائے گا اور ھم بھا جملہ مستانفہ ہوگا۔ کیونکہ آیت قرآنی میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کی نفی کی گئی ہے۔
>
> (منار الہدی فی بیان الوقف والابتدار)

موجودہ دور میں سعودی حکومت نے جو قرآن شائع کیا ہے اس میں بھی وھم بھا پر کوئی وقف نہیں۔

اس بات کو اپنانے کے بعد کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ امام رازیؒ کی اس تاویل کی ضرورت ہے کہ

> یہ تو ناممکن ہے کہ دونوں کا ھم ایک قسم کا ہو لہذا ضروری ہے کہ ہر ایک کے ھم کو اس قصد پر محمول کیا جائے جو اس کے مناسب ہو۔ بس عورت کے لائق یہ ہے کہ لقد ھمت بہ میں اس کے قصد کو تحصیل لذت پر محمول کیا جائے۔ اور ھم بھا خدا کے برگزیدہ بندے کے ھم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

پر محمول کیا جائے ۔ (کبیر صہ ۱۲۴ ج ۵)
اور نہ ابو حیان اندلسیؒ کو اس تاویل کا سہارا لینا پڑے گا ۔ کہ
اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی سے کہا جائے ۔ قارفت الذنب لولا ان عصمك الله ۔ تو گناہ کی لپیٹ میں آجاتا اگر تجھے اللہ نہ بچاتا ۔
اور نہ علامہ آلوسیؒ کو یہ بتانے کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا بمقتضائے طبعیت بشری عزیزہ مصر کی طرف میلان ایسا ہی تھا جیسے گرمی میں روزے دار کا ٹھنڈے پانی کی طرف میلان ہوتا ہے ۔
اور نہ علامہ شوکانیؒ کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ
یہ تو صرف بغیر ارادے کی پختگی کے جی کی بات تھی اور صرف ھم عصمت کے منافی نہیں ہے ۔
خواہ کوئی تاویل کی جائے اس نحوی قاعدے کی حمایت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کسی نہ کسی درجے ھم کو ماننا پڑتا ہے ۔ حالانکہ قرآن سرے سے ھم ہی کا انکار کر رہا ہے ۔ کیونکہ یہ منافی عصمت ہے ۔
اسی پریشانی میں پڑ کر بعض متنورین نے عصمت ہی کے معنے کو بدل دینے کی ناروا کوشش کی ہے ۔ یہ بات یاد رکھیئے کہ ھم بہا جملہ مستانفہ ہے اور لولا کا جواب مقدم ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ
یوسف ارادہ کر لیتا اگر اپنے رب کی برھان نہ دیکھتا ۔
اور اگر لولا کے جواب کو محذوف مانا جائے تو محذوف ہونے والا فعل لوگوں کی نگاہ میں عصمت یوسفؑ کے لیے ایک چیلنج بن جائے گا بلکہ جتنے منہ اتنی بولیاں بن کر دامان عصمت کو تار تار کر دے گا ۔ اور جب دامان عصمت تار تار ہو کر رہ جائے تو متنورین کو عصمت کے معنے و مفہوم پر نئے انداز میں بحث کرنے کا موقعہ ملے گا ۔
آیئے پہلے مختلف شارحین قرآن کی زبان میں فعل محذوف معلوم کیجیئے ۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں ۔
امرأة العزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مخالطت کا ارادہ کیا اور حضرت

یوسفؑ نے امراۃ العزیز سے مخالطت کا ارادہ کیا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں۔

> لولا کا جواب محذوف ہے اور پوری بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام امراۃ العزیز سے جماع کر لیتے۔

یہ ان ساری تشریحات کا معمولی سا نمونہ ہے جو لولا کا جواب محذوف مان کر لوگوں نے کی ہے اور یہ تشریح کرنے کے بعد پھر تاویلات کا دریا بہنے لگا۔ تاویل پر تاویل کی گئی یہ سب کچھ گوارا ہے مگر یہ کہنے کو کوئی تیار نہیں کہ یہاں لولا کا جواب لولا سے پہلے آیا ہے کیونکہ یہ بصری نحویوں کے بنائے ہوئے نحوی قانون کے خلاف ہے۔ علامہ طاہرؒ نے التحریر و التنویر میں یہ بات خوب لکھی ہے۔ کہ

> ھم بھا کا عطف ولقد ھمت بہ پورے جملہ پر ہے۔ جواب قسم پر نہیں ہے۔ کیونکہ اس جملے کے بعد جب جملہ شرطیہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کو نفی کے لیے لایا گیا تو شرط کی جزا اہتمام کی وجہ سے پہلے لائے۔ یہ دوسرا جملہ مستقل ہے کیونکہ اس میں شرط مسند الیہ کے ساتھ خاص ہے اصل بات یوں تھی لولا ان رای برھان ربہ لھم بھا جواب شرط کو شرط سے پہلے اہتمام کی خاطر لائے ہیں۔ اس میں بتایا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ارادہ نہیں کیا

قرآن اس آیت میں صرف یہ بتا رہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت قطعاً بے داغ ہے ان سے کسی قسم کے ھم کا صدور نہیں ہوا۔

رہا یہ سوال کہ شرط میں جس برہان کا ذکر کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں لکھا ہے کہ "برہان دلیل و حجت کو کہتے ہیں یعنی اگر حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو قلبی میلان پر چل پڑتے دلیل کیا تھی؟ زنا کی حرمت و شناعت کا وہ عین الیقین جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا وہی دلیل جو خود انہوں نے زلیخا کے مقابلے میں۔

انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون۔

کہہ کر پیش کی۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت سے حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ

انگلی دانتوں میں دبائے سامنے کھڑے ہیں بعض کہتے ہیں کہ کسی غیبی تحریر پر نظر پڑی جس میں اس فعل سے روکا گیا۔ [۱]

برہان کی یہ تشریح صرف مفروضہ پر ہے کہ لولا کی خبر محذوف ہے اور پہلے ہم کو وقف کے ذریعے لولا ان رای برھان ربہ سے جدا کر دیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جس ذات گرامی کے بارے میں ابھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دانائی اور علم عطا کیا اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو اسی طرح نیکی کا بدلہ دیتا ہے۔ آیت قرآنی پھر پڑھ لیجئے۔

ولما بلغ اشدہٗ اٰتیناہُ حکما وعلما وکذالک نجزی المحسنین

اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مقام نبوت پر فائز ہوئے کیونکہ قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم نبوت عطا کرنا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت سے پہلے مصیبت کا ابتلا پیش آیا اور اب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد معصیت کا ابتلاء پیش آیا۔ اس ابتلاء میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جس چیز نے بچایا وہ ان کا مقام عصمت ہے جو لازمہ نبوت ہے اور یہی وہ برہان ہے جسے حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا اور جسے دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس ارادے سے محفوظ و مصئون رہا اسی خداداد حکمت و علم کا اثر تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب عزیزہ مصر نے ورغلانا چاہا تو وہ بول اُٹھے معاذاللہ۔ تیرا شوہر میرا آقا ہے اس نے مجھے نہایت عزت و احترام سے رکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں امانت میں خیانت کروں ایسے نمک حرام تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے زیر بحث آیت میں مذکور ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے برہان الہی نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ بھی عزیزہ مصر سے ارادہ بد کر لیتے۔ یہ برہان الہی جسے حضرت یوسف علیہ السلام اس واقعہ سے پہلے دیکھ چکے تھے وہ بھی خداداد حکمت و علم سے یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے برتر ہے اور جس کے ذریعے سے وہ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد مقام نبوت کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ انبیاء کرام کے ان ربّانی انعامات کی فہرست پڑھیئے۔ جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست میں جو چیز

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

نظر آئے گی وہ علم نبوت ہے۔ جس کو کہیں ذکر، کہیں حکم، کہیں حکمت، کہیں تفہیم، کہیں تعلیم، کہیں ارادت کہا گیا ہے۔ ان سب الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے۔ اس سے مراد وحی اس لیے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لیے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ تو ملی ہے۔ اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے یہاں اسی کو بیان برہان رب کہا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کہنے کا یہاں کوئی وزن نہیں ہے۔ کہ برہان رب سے مراد وہ نور یزدانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کرتا ہے۔ جو خیر و شر میں تمیز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور بُرائی سے روکتا بھی ہے یہ نور اللہ تعالیٰ بخشتا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابر قوی سے قوی تر ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اتنا قوی ہوجاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے موقعہ پر وہ انسان کو نفس شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔

اس پیچدار بات کہنے کی جگہ یوں کہہ دیا جائے کہ یہ وہ نور نبوت اور عقل نبوی ہے کہ برائی کو نبی کے راستہ ہی سے ہٹا دیتی ہے اور برائی میں اس نور نبوت کے مقابلہ کرنیکی تاب ہی نہیں ہوتی۔ اگر صرف انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہوئی خیر و شر میں قوت تمیز ہوتی تو قرآن یہ نہ کہتا لنصرف عنہ السوء الخ کہ ہم برائی اور بدکاری کو ان سے ہٹا دیں۔ بلکہ یوں کہتا کہ لنصرفہ عن السوء الخ کہ ہم ان کو برائی اور بدکاری سے ہٹا دیں پہلی حالت کا نام عصمت ہے جو نور نبوت کا نتیجہ ہے دوسری حالت کا نام حفاظت ہے جو عقل بشری کا تقاضا ہے قرآن نے موجودہ اسلوب اختیار کرکے بتا دیا کہ بُرائی تو یوسف علیہ السلام کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ وہ بدی کا ارادہ کریں اس کی نوبت کیسے آسکتی تھی۔ یہ آیت نبی ہونے کی وجہ سے حضرت یوسف ؑ کی عصمت کی دلیل ہے۔ عام انسان ہونے کی وجہ سے گناہ سے محفوظ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ حالتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ گناہ کو راستہ سے ہٹا دیا جائے، دوسری یہ کہ گنہگار کو گناہ کے راستہ سے ہٹا دیا جائے یہاں قرآن نے لنصرفہ عن السوء والفحشاء کہہ کر واضح کیا ہے کہ نورِ نبوت کی وجہ سے ہم نے گناہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے راستہ سے ہٹا دیا یہ نہیں ہوا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا لیا پہلی حالت عصمت ہے دوسری حالت کا نام حفاظت ہے۔ دونوں کو ایک قدرتی مثال کے ذریعے سمجھیئے:

سڑک پر نابینا جا رہا ہے ادھر سے معصیت کی کار آرہی ہے آپ نابینا کو بچانے کے لیے ہاتھ پکڑ کر سڑک سے ہٹا دیتے ہیں یہ ہے حفاظت۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچانے کی صورت ہوتی تو قرآن کی تعبیر یہ ہوتی۔ لنصرفہ عن السوء والفحشاء تاکہ ہم یوسف کو گناہ سے بچائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ آفیسر آرہا ہے اور پیادے آگے جا کر سڑک سے ہر سواری کو ہٹا دیتے ہیں کہ راستہ میں برائی نہ ہو قرآن نے یہاں تعبیر اختیار کی ہے۔ کذالک لنصرف عنہ السوء والفحشاء۔ ایسے ہی برہان رب کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن عصمت بے داغ رہا ہے۔ تاکہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام سے بدی اور بدکاری کو دور ہٹا دیں۔

اس موقعہ پر علامہ بقاعیؒ کی یہ بات بالکل برمحل ہے۔ کہ جن لوگوں نے آیت قرآنی میں لولا کا جواب محذوف مانا ہے قرآن کا سیاق وسباق ان کی تائید نہیں کرتا ہے۔ البحر المحیط ابو حیان اندلسیؒ اور ان سے پہلے مفاتیح الغیب میں امام رازیؒ نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ یہی مفسرین میں سے محققین کی رائے ہے اور جواب شرط کو مقدم لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے پوری قوت کے باوجود ہوا ہے اور اس ارادے سے باز رکھنے والی چیز صرف علم حکمت اور مقام نبوت تھا۔ گویا کہنے والا کہہ رہا ہے یہ ثبات قدم بڑا کارنامہ ہے جواب میں بتایا گیا ہے کہ یہ لازم نبوت ہے اور یہی شان عصمت ہے۔ نبوت کی یہی شان ہوتی ہے تاکہ ہم نبی سے برائی کے ارادے اور برائی کو ہٹا دیں۔ پھر سوال ابھرا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا؟ فرمایا اس لیے ہوا کہ یوسف علیہ السلام کا شمار ان لوگوں میں ہے جن میں خیر ہی خیر ہے کسی قسم کی ملاوٹ کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا انہ من عبادنا المخلصین۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کی بھی دلیل بیان کر دی ہے۔ انہ من عبادنا المخلصین۔ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ جب شیطان کو اللہ سبحانہ نے اپنی بارگاہ سے نکالا تو اس نے کہا۔ لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین۔ میں تمام اولاد آدم کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے برگزیدہ بندوں کے۔ شیطان کو اعتراف ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں پر میرا داؤ نہیں چل سکے گا اور اللہ سبحانہ اعلان کر رہے

ہیں. کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں۔ پھر کیسے گمان ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ بد کر لیا تھا۔ یہ گویا دو شہادتیں ہو گئی ہیں۔ ایک اللہ سبحانہ کی شہادت کہ یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندے تھے۔ دوسری ابلیس کی شہادت کہ اللہ کے مخلص اور برگزیدہ بندوں کو میں گمراہ نہ کروں گا۔ یہاں امام رازیؒ نے یہ بات بھی خوب لکھی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ بد کر لیا اگر وہ اللہ کے دین کے پیروکار ہیں تو ان کو اللہ کی شہادت قبول کر لینی چاہیئے۔ اور اگر شیطان کے اتباع میں سے ہیں. تو حضرت یوسف علیہ السلام کی طہارت پر ابلیس کی شہادت قبول کر لینی چاہیئے۔

آگے چلنے سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی نزاہت سیرت اور عصمت پر قرآن کی روشنی میں ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہ نے علم و حکم سے سرفراز فرمایا۔
۲۔ یوسف علیہ السلام صرف صالح نہیں بلکہ صالح زندگی میں حسن کار ہیں اور حسن کاری کی جزا اللہ سبحانہ کے یہاں سے آپ کو ملی ہے۔
۳۔ یوسف علیہ السلام پر عزیزہ مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنے مقام بلند سے ہٹانے کے لیے ڈورے ڈالے
۴۔ عزیزہ مصر نے دروازے بند کیئے اور یوسف علیہ السلام دعوت نشاط دی۔
۵۔ یوسف علیہ السلام نے عزیزہ مصر کی دعوت کے جواب میں اللہ سبحانہ کی معاذ اللہ کہہ کر پناہ لی۔
۶۔ یوسف علیہ السلام نے عزیزہ مصر کو بتایا کہ تیرا شوہر مجھے خرید کر لایا ہے اس نے میرا احترام کیا ہے اور مجھ پر اعتماد کیا ہے میں امانت میں خیانت کر کے ظالم نہیں بن سکتا۔
۷۔ اللہ سبحانہ نے فیصلہ دیا ہے کہ عزیزہ مصر نے بدی کا بھرپور ارادہ کر لیا تھا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے نبی ہونے کی وجہ سے ارادہ نہیں کیا۔
۸۔ یہ واقعہ اور حقیقت ہے ایسا ہی ہوا ہے۔
۹۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے بدی کے ارادے اور بدکاری کو پرے ہٹا دیا تھا۔
۱۰۔ ہٹایا اس لیے تھا کہ حضرت یوسف عمہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں۔ (تلک عشرۃ کاملۃ)

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند جملوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت اور مقام نبوت کی پوری تصویر پیش کردی ہے۔ ان جملوں کو اگر تشریح کا پورا جامہ پہنایا جائے تو پوری کتاب بن جائے۔ ذرا چشم تصور سے کام لو اور دیکھو کہ ترغیبات کی قہر سلطانی کا کیا حال تھا اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر ربا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی۔ عمر عین عروج شباب کی عمر۔ معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت کا، طلب کا نہیں مطلوبیت کا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ رکاوٹ کوئی نہیں، کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں، کوئی پردۂ حجاب حائل ہونے والا نہیں۔ نبی کے سوا کون ہے جو ایسے حالات میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکے۔ یہی نبوت کا مقام عصمت ہے جو ان بجلیوں کی تاب لاسکتا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے خوب لکھا ہے۔

وایاک والھم بنیۃ تلک الشنیعۃ الی ذالک الجناب بعد ان کشف اللہ سبحانہ عن بصر بصیرتک فرایت برھان ربک بلاحجاب۔

(۲۵) طہارت نفس کا درجہ کمال

اور ایسا ہوا کہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے اسی حالت میں یوسف علیہ السلام کی قمیص اس عورت نے پیچھے سے پھاڑ دی۔ اسی حال میں دونوں کا دروازے پر عورت کے خاوند سے آمنا سامنا ہوگیا۔ عورت نے شوہر کو مخاطب کرکے کہا۔ بتاؤ جو تمہارے گھر والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے؟ کہ اسے جیل بھیج دیا جائے یا اسے کوئی اور دردناک سزا دی جائے۔ آگے یوسف علیہ السلام تھے کہ جلدی دروازہ کھول کر نکل جائیں اور پیچھے زلیخا انہیں روکنے کے لیے تعاقب کر رہی تھی اتفاقاً یوسف علیہ السلام کی قمیص کا پچھلا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں آگیا اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ کھینچا تانی میں کُرتہ پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام جُوں تُوں کرکے مکان سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ادھر یہ دونوں آگے پیچھے دروازے تک پہنچے۔ اُدھر عورت کا خاوند عزیز مصر بھی پہنچ گیا۔ عورت نے فوراً بات بنانی شروع کی۔ عورت نے الزام یوسف علیہ السلام پر رکھا کہ اس نے مجھ سے بُرا ارادہ کیا ایسے شخص کی سزا یہ ہونی چاہیئے کہ جیل خانہ بھیجا جائے یا اور کوئی سخت سزا دی جائے[1] مطلب

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ ہے کہ جب عزیز مصر نے ناجائز مطلب برآری پر اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام کمرے سے باہر ہونے کے لیے دروازے کی طرف لپکے۔ عزیزہ مصر ان کے پیچھے دوڑ پڑی۔ اس کشمکش میں یوسفؑ کے کُرتہ کا پچھلا دامن پھٹ گیا۔ قرآن میں قدرت کی تعبیر آئی ہے یعنی عزیزہ مصر نے حضرت یوسفؑ کا کُرتہ پھاڑ دیا۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قوت مدافعت نے بھی کام کیا۔ عزیزہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو روکنے کے لیے قمیص کا پچھلا حصہ پکڑا حضرت یوسف علیہ السلام نے بچنے کے لیے آگے کی طرف زور لگایا۔ اس کے نتیجے میں قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ اس سے مصری تہذیب کی جھلک بھی ٹپک رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر میں بالعموم صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی۔ جس پر ہم اپنے زمانے کے مغرب زدہ طبقوں کو دیکھتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آگیا کہ دروازہ جو کھلا تو دیکھا کہ عزیزہ مصر کا شوہر دروازے پر کھڑا ہے اس کو دیکھتے ہی سارا نشہ عشق ہرن ہوگیا جلدی سے چڑھ کر بولی کہ تمہاری بیوی کے ساتھ جو بُرائی کا ارادہ کرے یا تو وہ جیل کا قیدی بننے کا حق دار ہے اور یا اس کو کوئی اور دردناک سزا دی جائے اس طرح اس نے شوہر کی نظروں میں اپنے کو بری اور یوسف علیہ السلام کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(۲۶) حضرت یوسف کی برات کیلئے غیبی شہادت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خود اس عورت نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل جاؤں اور اس عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی یہ کہ اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یوسف سچا اور عورت جھوٹی ہے۔ جب عورت کے شوہر نے یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی دیکھی تو بول پڑا کہ یہ سب تم عورتوں کا چلتر ہے اور تمہاری فریب کاری بڑی ہوتی ہے۔ اے یوسف تو اس معاملہ کو نظر انداز کر اور اپنی بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہ کی معافی مانگ بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کو واقعہ ظاہر کرنا پڑا۔ کہ عورت نے میرے نفس کو بے قابو کرنا چاہا میں نے بھاگ کر جان بچائی۔ یہ جھگڑا ابھی چل رہا تھا کہ خود عورت کے خاندان کا ایک گواہ عجیب طریقے سے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دینے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا جو خدا کی قدرت سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت و

وجاہت عند اللہ ظاہر کرنے کو بول پڑا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ بچہ نہیں مرد دانا تھا جس نے ایسی پتے کی بات کہی۔ اگر شیر خوار بچہ تھا جیسا کہ بعض معتبر روایات میں ہے تب تو اس کا بولنا اور اس کی ایسی گواہی دینا جو انجام کار یوسف علیہ السلام کے حق میں مفید ہو خود مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی سچائی کی تھی۔ کُرتہ کا آگے پیچھے سے پھٹا ہونا شہادت سے زائد بطور ایک علامت اور قرینہ کے سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر گواہ کوئی مرد دانا تھا تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی طریقہ سے حقیقت حال پر مطلع ہو چکا تھا مگر اس نے نہایت دانائی سے ایسے پیرائے میں شہادت دی جو دفعۃً کسی کی جانبداری ہی پر محمول نہ ہو اور آخر کار یوسف علیہ السلام کی براءت ثابت کر دے جو پیرایہ اظہار واقعہ کا اس نے اختیار کیا وہ غیر جانبداروں کے نزدیک نہایت معقول تھا۔ کیونکہ اگر عورت کے دعوے کے موافق یوسف علیہ السلام نے معاذ اللہ اس کی طرف اقدام کیا تو ان کا چہرہ عورت کی طرف ہوگا تو ظاہر یہ ہے کہ کُرتہ بھی سامنے سے پھٹے اور اگر یوسف علیہ السلام کا کہنا صحیح ہے کہ عورت مجھے اپنی طرف بلاتی تھی۔ میں دروازے کی طرف بھاگا ہوں اس نے پکڑنے کے لیے میرا تعاقب کیا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہوگا کیونکہ اس صورت میں یوسف علیہ السلام اس کی طرف متوجہ نہیں تھے بلکہ ادھر سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے بہر حال جب دیکھا گیا کہ کُرتہ آگے سے نہیں پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو عزیز مصر نے سمجھ لیا کہ یہ سب عورت کا مکر و فریب ہے۔ یوسف قصوروار نہیں ہے چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا کہ زلیخا کی پُر فریب کارروائی اسی قسم کی ہے جو عموماً عورتیں کیا کرتی ہیں۔ اس نے یوسف علیہ السلام سے استدعا کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آئندہ اس کا ذکر مت کرو کہ سخت رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے اور عورت کو کہا کہ یوسفؑ سے یا خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگ یقیناً قصور تیرا ہی تھا[1] یہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی نزاہت وعصمت کی دلیل ہے۔ یوسف علیہ السلام نے جواباً فرمایا۔ کہ خود اسی نے مجھے ورغلانا چاہا تھا۔ بات کے لیے یہ انداز جو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہاں اختیار کیا ہے بڑا ہی لطیف ہے۔ ھی راودتنی عن نفسی۔ انداز خطاب سے ہٹ کر غیبت کا انداز اختیار کرنا انتہائی وقار اور انتہائی شرم وحیا کا انداز ہے۔ حاضرین میں عزیز مصر کی بیوی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور خود عزیز مصر ہے۔ یہ عزیز مملکت میں ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بڑا عہدیدار تھا۔ بیوی حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام لگا رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت مختصر الفاظ میں اصل حقیقت ظاہر کر دی کہ میرا قصور نہیں ہے یہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اب گویا یہ ایک مقدمہ بن گیا۔ عورت کا بیان کچھ، یوسف علیہ السلام کا بیان کچھ، جھوٹا کون ہے! سچا کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے میں اگر حالات وقرائن میں سے کوئی چیز مددگار ہو سکتی تھی تو کُرتہ پھٹنے کا واقعہ تھا۔ عزیزہ مصر ہی کے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے انکشاف حقیقت کا طریقہ بتلایا اسے قرآن نے شاہد کہا ہے۔ کیونکہ اس نے کُرتہ دیکھ کر حقیقت پالی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی کی شہادت دی تھی۔ اور پھر ثبوت میں کہا تھا کہ تم ہی دیکھو ان کے کُرتہ کا کیا حال ہے۔ یہ کون شخص تھا خود اس عورت کے عزیزوں میں سے تھا اس سے زیادہ قرآن نے تصریح نہیں کی۔ کیونکہ جو بات واضح کرنی تھی وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی اور راست بازی نے گھر کے تمام آدمیوں کو اُنکا معتقد بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ خود عورت کے ایک رشتہ دار نے اپنی رشتہ داری کا لحاظ نہیں کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی حمایت میں سچائی ظاہر کر دی۔ عورت کے رشتہ دار کی گواہی سُن کر شوہر کو اس پر اطمینان ہو گیا کہ دامن یوسف ؑ بے داغ ہے اس نے صاف صاف کہہ دیا انہٗ من کیدکن۔ لیکن شوہر نے معاملے کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دی کہ بیوی سے کہا۔

استغفری لذنبک انک کنت من الخاطئین

اور پھر اسی طرح آزاد و مختار چھوڑ دیا۔ جس طرح پہلے تھی۔ یہ انداز بیان اس وقت کی مصری معاشرت اور اس کے اخلاقی احساسات کی پوری طرح غمازی کر رہا ہے۔ اس وقت کی مصری معاشرت کی ٹھیک حالت ویسی ہی تھی جس کی تصویر قرآن عزیز نے پیش کی ہے۔ امراء کے طبقہ کی معاشرتی اور ازدواجی حالت عام شہریوں سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی عورتیں اپنے اعمال و تصرف میں بالکل آزاد تھیں۔ مردوں کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں پلہ ان کا ہی بھاری تھا اخلاقی حیثیت سے معاملہ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ عصمت اور بے عصمتی کی قدریں بھی باقی نہ رہی تھیں۔ لوگ سب کچھ جانتے تھے اور پھر اسے ناگزیر حالات سمجھ کر برداشت کر لیتے تھے۔ مصر کی یہ حالت برابر رہی وہ صرف نسوانی حُسن وجمال ہی میں نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں شہرہ آفاق رہا۔ قرآن میں اس کی اندرونی شہادت موجود ہے۔ عزیز مصر پر جب معاملہ کھل گیا تو جو بات اس کی زبان

سے بے اختیار نکلی وہ صرف یہ تھی۔ انہ من کیدکن ان کیدکن عظیم۔ معلوم ہوگیا کہ یہ تم عورتوں کا چلتر ہے۔ تمہارے چلتر بڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت عورتوں کے بارے میں سوسائٹی کے خیالات کیا تھے۔ اور کس طرح یہ بات دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ عورتیں مکروفریب میں طاق ہیں۔ ان کے فریب سے عہدہ برآہ ہونا آسان نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس موقع پر اس طرح کی بات بے اختیار عزیز کی زبان پر آتی۔ چلتر جو کچھ بھی کیا تھا۔ اس کی بیوی نے کیا تھا تمام عورتوں نے نہیں کیا۔ لیکن چونکہ وقت کی معاشرتی زندگی عام طور پر ایسی ہی ہو رہی تھی۔ اس لیے جب ایک عورت کا معاملہ سامنے آیا تو بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ کہ

تم سب کا یہی حال ہے۔ تمہارے مکروفریب سے اللہ کی پناہ

یہ تو قرآن کا بیان کردہ واقعہ ہے۔ آیئے یہی واقعہ تورات میں پڑھیئے اور اندازہ لگایئے کہ تورات کے مصنفین اپنے مخاطبوں کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔

جب اس عورت نے حضرت یوسف علیہ السلام کا پیراہن پکڑ کر کہا کہ میرے ساتھ ہم بستری کرو وہ اپنا پیراہن اسکے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنا پیراہن اسکے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس نے اپنے گھر کے آدمیوں کو بلا کر ان سے کہا کہ دیکھو وہ ایک عبری کو ہم سے مذاق کرنے کیلئے ہمارے پاس لے آیا ہے۔ یہ مجھ سے ہمبستر ہونے کو اندر گھس آیا اور میں بلند آواز سے چلانے لگی جب اس نے دیکھا کہ میں زور زور سے چلا رہی ہوں تو اپنا پیراہن میرے پاس چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا اور وہ اس کا پیراہن اس کے آقا کے گھر لوٹنے تک اپنے پاس رکھے رہی۔ جب اس کے آقا نے اپنی بیوی کی وہ باتیں جو اس نے اس سے کہیں سن لیں کہ تیرے غلام نے مجھ سے ایسے ایسے کیا تو اس کا غضب بھڑکا اور یوسف کے آقا نے اس کو لے کر قید خانے میں جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے ڈال دیا۔

خلاصہ اس عجیب وغریب روایت کا یہ ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم پر لباس کچھ اس قسم کا تھا کہ ادھر زلیخا نے اس پر ہاتھ ڈالا ادھر وہ پورا لباس خود بخود اتر کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہ لباس چھوڑ کر یوں ہی برہنہ بھاگ نکلے۔ ان کا لباس یعنی ان کے قصور کا ناقابل انکار ثبوت اس عورت کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے مجرم ہونے میں کون شک کر سکتا تھا۔

یہ تو ہے تورات کی روایت، رہی تلمود تو اس کا بیان ہے کہ فوطیفار نے جب اپنی بیوی سے یہ شکایت سنی تو اس نے یوسف علیہ السلام کو خوب پٹوایا پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا اور عدالت نے یوسف علیہ السلام کی قمیص کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ قصور عورت کا ہے کیونکہ قمیص پیچھے سے پھٹی ہے۔

یہ ایک نمایاں ترین مثال ہے۔ قرآن اور اسرائیلی روایات کے فرق کی جس سے مغربی مستشرقین کے اس الزام کی لغویت واضح ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل سے نقل کیئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے تو ان کی اصلاح کی ہے اور اصل واقعات دنیا کو بتلائے ہیں۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ
الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ
وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ
قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ
وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝
قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ
نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ
وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ
مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ
اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ
فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ثُمَّ
بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ ع ٦ ١٤

اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے
ڈال رہی ہے کہ اسے رجھائے۔ وہ اس کی محبت میں دل ہار

بیٹھی۔ ہم تو اسے کھلی غلطی پر سمجھتے ہیں[۲۷] جب عزیز کی بیوی نے عورتوں کی یہ پُرفریب باتیں سُنی تو اس نے عورتوں کو دعوت نامہ بھیجا۔ اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ہر ایک کے لیے ایک ایک چھری پیش کی۔ اور اس کے بعد یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آ۔ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو ششدر رہ گئیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بول پڑیں واہ واہ یہ تو انسان نہیں ضرور فرشتہ ہے بڑے مرتبے والا[۲۸] عزیز مصر کی بیوی بولی تم نے دیکھ لیا یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔ ہاں بے شک مَیں نے اس کا جی اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا اور اب اسے سُنا کے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے اور ضرور بے عزت ہو[۲۹] یوسف علیہ السلام نے سُن کر اللہ کے حضور میں دعا کی خدایا مُجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے جس کی یہ عورتیں دعوت دے رہی ہیں۔ اگر تو نے میری مدد نہ کی تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جُھک جاؤں اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو ناآشنا ہوتے ہیں[۳۰] اللہ سبحانہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

قبول کی اور ان سے عورتوں کا فریب ہٹا دیا۔ بلا شبہ وہی دعاؤں کا قبول
کرنیوالا اور سب کچھ جاننے والا ہے[۳۵] پھر ایسا ہوا کہ اگرچہ وہ لوگ یعنی
عزیز اور اس کے خاندان کے آدمی نشانیاں دیکھ چکے تھے پھر انہیں
یہی بات سمجھ میں آئی کہ ایک خاص وقت تک یوسف کو قید میں
رکھا جائے[۳۶]۔

حضرت یوسف ؑ کے جمال سیرۃ کا ایک اور منظر

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ عزیز کی بیوی کے اس عشق کا چرچا آہستہ آہستہ افسانہ بزم و انجمن بن گیا۔ شہر کی کچھ عورتوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ لیکن بس سے باہر ہے۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے اس آخری فقرے میں ملامت، شماتت اور ازعا کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال سیرۃ کا ایک اور مظاہرہ ہے۔ اور پہلے سے زیادہ عظیم ہے پہلے صرف امراۃ العزیز کا فتنہ تھا اب دارالحکومت کے تمام فتنہ گران حسن جمع ہوگئے کہ حضرت یوسف ؑ کی متاع ضبط و تحمل کی غارتگریوں میں حصہ لیں مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا۔ سب نے بیک زبان کہا

حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم

راست بازی اور حق پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کرلی۔ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے۔ لیکن اب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے قید کی سزا اس لیے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بندگی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈھتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسف ؑ کو اس لیے قید خانہ کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ عیش حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور

رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے زیادہ عظیم مظاہرہ ہے یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کا عیش مگر معصیت کی راہ میں، زندگی کی سختی راست بازی کی راہ میں تو ان کا فیصلہ قطعی یہ تھا کہ السجن احب الیٰ مما یدعوننی الیہ۔

(۲۷) اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے کہ اسے رجھائے وہ اس کی محبت میں دل ہار بیٹھی۔ ہم تو اسے کھلی غلطی پر سمجھتے ہیں یعنی شدہ شدہ شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کر دیا کہ عزیز کی عورت اپنے نوجوان غلام پر مفتون ہو گئی۔ چاہتی ہے کہ اس کے نفس کو بے قابو کر دے۔ غلام کی محبت اس کے دل کی تہہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ حالانکہ ایسے معزز عہدیدار کی بیوی کے لیے یہ سخت شرمناک بات ہے کہ وہ ایک غلام پر یوں گرنے لگے۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں وہ سخت غلطی پر ہے۔ یہ عزیز مصر کی بیوی کے بارے میں قرآن کا فیصلہ نہیں بلکہ شہر کی عورتوں کا فیصلہ ہے۔ اس عورت میں عشق و ہوس کے مختلف مراتب یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے اور قرآن عزیز نے ایک عجیب اسلوب بلاغت کے ساتھ انہیں ہر جگہ ابھارا ہے اور ہر مرتبہ کی خصوصیت واضح کی ہے۔ سب سے پہلے وہ موقع سامنے آتا ہے جب اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت عیش دی۔ اور ناکام رہی ولقد ھمت بہ، وھم بھا لولا ان را برھان ربہ۔ یہ سب سے پہلی شکست ہے کہ قرآن نے عورت کے ارادے کو ثابت کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ارادے کی نفی کی۔ دوسرے مرحلہ پر جب اس کی عشق بازی کا راز فاش ہو گیا اور شوہر سامنے کھڑا نظر آیا تو اپنی ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی جھٹ اپنا جرم دوسرے کے سر ڈال دیا اور پھر کس دوسرے کے سر؟ اسی کے سر جس کی محبت و شیفتگی کی مدعی بنی تھی۔ قالت ماجزاء من اراد باھلك سوءا الا ان یسجن او عذاب الیم۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت میں جھوٹی تھی اور معاملہ ہوس سے آگے نہ بڑھا تھا کیونکہ اگر محبت سچی ہوتی تو محبت کی راہ میں ذلت و رسوائی سے نہ ڈرتی اور خود محبوب کے سر جھوٹا الزام نہ لگاتی۔

(۲۸) عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے ضیافت کی محفل

جب عزیز کی بیوی نے عورتوں کی یہ پُر فریب باتیں سنیں۔ تو اس نے عورتوں کو دعوت نامہ

بھیجا۔ اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کی اور اس کے بعد یوسف ؑ سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آ۔ جب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ششدر رہ گئیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بول پڑیں سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ضرور فرشتہ ہے بڑے مرتبے والا۔ عورتوں کی گفتگو کو مکروفریب اس لیے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر باتیں کرتی تھیں۔ اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا۔ حالانکہ یوسف علیہ السلام کے بیمثال حُسن و جمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا۔ اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینیاں کرنے والیوں کے دلوں میں بھی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی حرکت پر آمادہ کریں جو یوسف علیہ السلام کے دیدار کا سبب بن جائے۔ یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقعہ نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا راز دار بنایا ہو اس نے راز داری کی جگہ پردہ دری اور خوردہ گیری شروع کر دی ہو۔ بہرحال ان کی گفتگو کو لفظ مکر سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔ بہرحال عزیز کی بیوی نے دعوت کر کے ان کو بلا بھیجا اور کھانے پینے کی ایک مجلس ترتیب دی جس میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں۔ چنانچہ کھانے اور میوے ان کے سامنے چن کر ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چاقو دے دیا۔ تاکہ تراشنے کے قابل چیزوں کے کھانے میں کسی کو کلفت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ یہ سب سامان درست کر کے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ ادھر نکل آئیے۔ نکلنا تھا کہ بجلی سی کوند گئی۔ تمام عورتیں یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنے سے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور مدہوشی کے عالم میں چھریوں سے پھلوں کی جگہ ہاتھ کاٹ لیے گویا قدرت نے یہ ایک مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی صداقت و نزاہت پر قائم فرما دی۔ کہ جس کے جمال بے مثال کی ذرا سی جھلک نے دیکھنے والی عورتوں کے حواس گم کر دیئے۔ بحالانکہ یوسف ؑ نے آنکھ اٹھا کر بھی انکے حُسن و خوبی کیطرف نہ دیکھا تو یقیناً واقعہ یوں ہی ہوا ہوگا کہ زلیخا اُسکے جمال ہوشربا کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی اور وہ معصوم فرشتہ کی طرح اپنا دامن عفت بچاتا ہوا صاف نکل گیا۔ حُسن و جمال اور نورانی صورت کے اعتبار سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی نے خوب کہا ہے

قوم اذا موبو کانوا ملائکۃ
حسنا وان موتلوا کانوا عفاریتا

باحیا، وپاکدامنی جو چہرہ اور چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا کہ یہ آدمی نہیں کوئی معصوم فرشتہ معلوم ہوتا ہے[۱] ان آیات میں ایک طرف اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت بیان ہورہی ہے اور عورتوں کی پوری جماعت حضرت یوسفؑ کی نزاہت، سیرت کی بلندی اوران کی پاکدامنی کا ایک زبان ہوکر اعلان کررہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ ان ھذا الا ملك کریم۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ اس دور کی مصر کی مذہبی زندگی میں ملائکہ کا تصور موجود تھا۔ یعنی وہ ایک روحانی مخلوق کو مانتے تھے۔ اگرچہ ان کے یہاں ملائکہ کی حیثیت الٰہ کی تھی اوران کے یہاں ان کی خیالی تصویروں کی پرستش ہوتی تھی۔ اس طرح یہ تشبیہ محسوس کی متخیل کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اس زمانے کی مصری معاشرت کس درجہ شائستہ ہوچکی تھی۔ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں نشست کے لیے مسندیں لگائی جاتی تھیں۔ کھانے کے لیے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی مسندوں کے اہتمام کا حال اعتدت لھن متکاء سے معلوم ہورہا ہے مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مورخوں کی شہادت سے جو حالات روشنی میں آئے ہیں۔ ان سے بھی اس متمدن معاشرت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے جن عورتوں کو بلایا ہوگا وہ امراء و رؤساء اور بڑے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوبصورت جوانی دکھا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوان رعنا پر مرنہ مٹتی تو آخر اور کیا کرتی۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو، بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ واقعی ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو عزیز کی بیوی نے کیا۔ خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو علانیہ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر اس کا خوبصورت غلام اس کی خواہش نفس کا کھلونا بننے پر راضی نہ ہوا تو وہ اسے جیل بھجوا دے گی۔

دعوت کے پس منظر میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے سنا کہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان عورتوں کو اپنی عشوہ طرازیوں، دلربائیوں اور کار فرمائیوں پر یہ ناز اور غرہ ہے تو اسکے دل کو بڑی چوٹ لگی۔ اور اس نے چاہا کہ یہ بھی ذرا یوسف علیہ السلام پر اپنے تیر آزمالیں تاکہ ان کو بھی اپنی قدرو قیمت کا پتہ لگ جائے چنانچہ عزیز مصر کی بیوی نے عورتوں کی دعوت کا سامان کیا لیکن محققین کے نزدیک اس خیال کی کوئی قدروقیمت نہیں ہے۔

دعوت میں عورتیں آئیں۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا قرآن نے ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے۔ اکبرنہ۔ یہ اکبار سے ہے۔ اکبار کے معنے کسی کو بڑا سمجھنا اور دل میں اس کی عظمت اور بڑھائی کا قائل ہونا۔ یعنی جب حضرت یوسف علیہ السلام سامنے آئے تو ان کی نورانی صورت اور ان کی تابناک پیشانی اور ان کا پاکیزہ چہرہ دیکھ کر عورتیں مبہوت ہو گئیں اور اس حیرت میں ان پر ایسی بدحواسی چھا گئی کہ بے خبری میں چاقو ہاتھ پر چل گیا جیسا کہ اکثر خیال دوسری طرف بٹ جانے کے وقت ہوتا ہے۔ سیرت و اخلاق کی پاکیزگی بجائے خود بڑی ہی دلربا چیز ہے اور جب یہ ایک جوان و رعنا میں ہو جو خوبصورت بھی ہو تو اس کی دلربائی دوچند ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی معجزہ یوسفی ہو جیسا کہ کچھ بزرگوں کی رائے ہے لیکن حالات کا طبعی تقاضا بھی یہی تھا۔ اس کے لیے مجلس کا نقشہ ذرا وضاحت کے ساتھ سامنے رکھیئے۔ دعوت وضیافت کا اہتمام شاہی پیمانے پر ہے۔ قہرمان وزیر حکومت کی بانوئے محترم ہیں۔ عشوہ و ناز سے لبریز وزیرزادیاں اور امیرزادیاں جمع ہیں۔ میووں اور پھلوں سے شغل ہو رہا ہے۔ چھری کانٹے کے رواج سے یوں بھی مصری تمدن ناآشنا نہ تھا۔ ہاتھوں میں چھریاں ہیں گپ شپ ہو رہی ہے۔ یک بیک ایک ڈرامائی انداز میں ایک نور پیکر سامنے آجاتا ہے۔ نظریں نیچی، آنکھوں پر حیا کے پردے، چہرے پر عصمت کے سہرے جن کے چہرے خود ہی دعوت نظارہ کے عادی تھے وہ آپ اس وقت تماشائی بنی ہوئی اس حسن وجمال، عصمت وعفاف کے پتلے کے نظارے میں محو۔ اور وہ نہ کسی کی طرف نظر اٹھاتا ہے نہ کسی سے دلچسپی لیتا ہے۔ ایسے بھی عجب کیا۔ جو ٹکٹکی لگ گئی ہو اور پلک جھپکانا تک بار ہو رہا ہو۔ اور چھریاں بجائے پھلوں کے ہاتھوں پر چل گئی ہوں پھر قطعن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہاتھ سب کے کٹ گئے ہوں چند کا زخمی ہو جانا بھی صیغہ جمع لانے کے لیے کافی ہے علامہ آلوسیؒ نے تصریح کی ہے کہ جرحنھا بھا فی ایدیھن من السکاکین قطعن ایدھن کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ مبہوت و حیران ہو کر بجائے پھل کاٹنے کے انہوں نے اپنے

ہاتھ کاٹ لیے ۔ مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں ۔

جس وقت یہ باہر آئے وہ عورتیں کوئی چیز مثل ترنج تراش رہی تھیں ان کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھاگئی کہ اس بے خبری میں وہ چاقو ہاتھ پر چل گیا جیسا کہ اکثر دوسری طرف خیال بٹ جانے کی وجہ سے ایسا اتفاق ہو جاتا ہے ۔

عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہی بیان کرتے ہیں کہ جمال یوسف سے مدہوش ہو کر واقعی ان کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا ۔

کچھ شارحین قرآن نے مصری عورتوں کے اس کردار کو ان کے کید ی کا حصہ بتایا ہے یعنی یہ بھی ان کی حضرت یوسف ؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک تدبیر تھی ۔ وہ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش وحواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے ۔ الا تصرف عنی کیدھن یعنی یوسف علیہ السلام نے عورتوں کی اس حالت کو مکر سے تعبیر کیا ہے اگر یہ حالت اضطراری ہوتی تو پھر وہ بے قصور نہیں ۔ ایسی حالت میں ان کے اس طرز عمل کو کید کہنے کے کیا معنیٰ ۔ بہرحال اس پر تفصیلی بحث پارے کے آخر میں زیر تفسیر فسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم میں آرہی ہے ۔

(۲۹) عصمت یوسفؑ کی پاکدامنی پر مزید بلیغ شہادت

عزیز مصر کی بیوی بولی تم نے دیکھ لیا یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم نے مجھے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ۔ ہاں بے شک میں نے اسکا جی اپنے قابو میں لینا چاہا تھا ۔ مگر وہ بے قابو نہ ہوا ۔ اور اب اسے سنا کے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو اسے ضرور قید کیا جائے گا اور وہ ضرور بے عزت ہوگا ۔ اب زلیخا کو موقع ملا کہ عورتوں کے طعن و تشنیع کا تیر ان ہی کی طرف لوٹا دے گویا اس وقت فذالک الذی لمتننی کہہ کر وہ اس شعر کا خلاصہ ادا کر رہی تھی ۔

ایں است کہ خون خوردہ دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

مجمع کا رنگ دیکھ کر زلیخا بالکل ہی کھل پڑی اور واقعہ کا صاف صاف اظہار کر دیا کہ بے شک میں نے ان کا دل لینا چاہا تھا مگر اس بندہ خدا نے ایسا مضبوط تھامے رکھا کہ کسی طرح نہ دیا۔ یہ اللہ سبحانہٗ نے شہر کی عورتوں کے مجمع میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال عصمت وعفت اور غایت نزاہت و طہارت کا اقبالی ثبوت پیش کر دیا ۔ زلیخا کا حال اس وقت وہی تھا جو کسی نے کہا ہے ۔

لاتخف ماصنعت بك الاشواق
واشرح هواك فكلنا عشاق

زلیخا کی اس گفتگو میں کچھ تو عورتوں پر اپنی معذوری اور نامرادی کا اظہار تھا تاکہ ان کی ہمدردی حاصل کر سکے ۔ اور کچھ یوسف علیہ السلام کو تحکمانہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا تھا تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر آئندہ اس مطلب برآری کے لیے آمادہ ہو جائیں حالانکہ

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را [1]

مطلب یہ ہے کہ میں یوسف ؑ کو محبت سے رام نہ کر سکی تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی جان چھوٹ گئی ۔ اب جیل کی ہوا کھائے گا اور ذلیل ہو گا یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے ۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیار حاصل تھے ۔ وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف ان کو جیل بھجوا سکتے تھے ۔ پھر یہاں تو معاملہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کی بیگم صاحبہ کا تھا ۔ کس کی مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہو سکے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں عزیز مصر کی بیوی کا یہ اعلان فاستعصم ، حضرت یوسف ؑ کی عصمت کی بہت بڑی شہادت ہے ۔ اور ایسی دلیل ہے جس سے زیادہ واضح اور صاف دلیل کوئی نہیں ۔ استعصم استعصام سے ماضی ہے ۔ اس میں علماء کی تصریح کے مطابق س اور تا مبالغہ کے لیے ہے اس نے تھام رکھا ، بچا لیا ، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کمال عصمت و نزاہت پر خود عزیز مصر کی بیوی کی شہادت ہے ۔ کیونکہ عزیزہ مصر نے خواتین مصر کی بھری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مجلس میں یوسفؑ کی موجودگی میں اعتراف کیا کہ فی الواقع میں نے یوسف علیہ السلام کو ہر طرح سے ورغلایا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بالکل بچے رہے۔ علامہ قاسمی نے یہاں یہ بات بہت اچھی لکھی ہے کہ عام شارحین قرآن نے اسرائیلی روایات کی وجہ سے ھمّ اور برھان کی معنویت کو جس انداز سے لغویت کا لبادہ پہنا کر حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کو پامال کرنے کی لایعنی اور بیکار باتیں بنائی ہیں۔ یہ آیت ان کی صاف اور کھلی تردید ہے۔

عصمت نبوّت کی خصوصیات میں سے ایک اہم اور بڑی خصوصیت ہے نبی کی بے گناہی اور معصومیّت کا مطلب یہ ہے کہ ان سے بمقتضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے۔ مگر اللہ سبحانہٗ اپنی وحی سے ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اسی قرآن نے اس عقیدے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام انبیاؑ کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کی سوانح میں شامل کر دیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے قرآن نے بار بار اجتبا حق کو پسند کرنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو سرتا سر ان کی عصمت اور گناہوں سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے محسن کا لفظ آیا ہے۔

سورۃ انعام میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وکذالک نجزی المحسنین۔ کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی کوئی اور شہادت ہو سکتی ہے۔ سورۃ انعام ہی میں اور پیغمبروں کا ذکر کر کے فرمایا کل من الصالحین۔ پھر آگے چل کر فرمایا کلا فضلنا علی العالمین۔ ہم نے ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔ پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا واجتبینا ھم وھدینا ھم الی صراط مستقیم۔ ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔ اسی لیے قرآن نے واقعہ یوسف میں بار بار ان کی بے گناہی اور عصمت کے لیے صرف اشارات ہی نہیں کیے بلکہ پوری صراحت اور زور سے فرمایا کہ انہٗ من عبادنا المخلصین۔ پھر صاف اور واضح طور پر فرمایا

کہ ہم یوسف سے بدکاری و برائی کو ہٹا دیتے ہیں۔ بدکاری تو بدکاری ہے اور بد کا ارادہ بھی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو گناہوں سے بچاتے ہیں بلکہ فرمایا کہ گناہوں کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دیتے ہیں۔ پھر عزیزہ مصر کی زبانی حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام کو نقل کیا اور ساتھ خود عزیزہ مصر کے گھر والوں میں سے حضرت یوسفؑ کی برأت کیلئے شہادت پیش فرما دی جس کی روشنی میں عزیزہ مصر نے فیصلہ دیا کہ یہ یوسف پر الزام ہے اصلی مجرم خود عزیزہ مصر ہے اب یہاں عورتوں کی محفل میں خود عزیزہ کی زبانی یہ اقرار پیش کیا کہ انا راودتہ میں نے یوسف کو ورغلایا۔ لیکن یوسف اپنی جگہ عصمت کی چٹان بنا رہا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نبوت کی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکالے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں پھر بھی اس کی رفتار نہیں رکتی ہے۔ حوادث و وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد و جماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ وہ تنہا ہوتا ہے ہر حال میں کامیاب ہوتا ہے اسکے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔

عزیزہ مصر کی یوسفؑ کو دھمکی

حضرت یوسف علیہ السلام کی استقامت کو عزیزہ مصر نے تشدد کی راہ سے زیر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونن من الصاغرین۔ اگر کہا نہ مانو گے قید میں ڈالے جاؤ گے۔ عزیز مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی ظاہر ہو گئی تھی اس لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی لیکن اس کی بیوی کا عشق ایسا نہ تھا۔ جو اس ناکامی سے سرد پڑ جاتا وہ اور زیادہ بڑھ گیا اور جب دیکھا کہ طلب و الحاح سے کسی طرح کام نہیں بنتا تو سختی پر اتر آئی اور یوسف سے کہا کہ یا تو میرا کہا مانو نہیں تو قید ہونے کی ذلت و رسوائی گوارا کرو۔

یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف

ان کو جیل بھجوا سکتے تھے۔ اور یہاں تو معاملہ ہی بڑی بیگم صاحبہ کا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ اس سے ضمناً یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ مصری معاشرت کے اس تہذیبی دور میں عورتوں کو مردوں پر ویسی ہی برتری حاصل تھی جیسے آج یورپ کی تہذیب۔ ایک طرف عزیز مصر سے ان کی بیگم حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ کہہ کر شکایت کر رہی ہے۔ ماجزاء من اراد باھلك سوءً اور ساتھ ہی اس کی سزا بھی بڑی ڈھٹائی سے تجویز کر رہی ہے۔ الا ان یسجن او عذاب الیم۔ مگر عزیز مصر کے سامنے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس الزام کے جواب میں یہ کہا۔ ھی راودتنی عن نفسی۔ اور ساتھ ہی ایک تجربہ کار دانا آدمی نے عزیز مصر کی یہ کہہ کر راہنمائی کی کہ دیکھ لیا جائے کہ اگر کرتہ آگے سے پھٹا ہو تب تو عورت سچی ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہو تو یوسف علیہ السلام سچا ہے۔ یہ بات نہایت معقول تھی اس وجہ سے عزیز مصر کو اس پر اطمینان ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ یوسف ؑ کا کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے عورت کو مجرم گردانا اور ڈانٹا کہ یہ سب تیرا فریب ہے۔ اوران کیدکن عظیم۔ اس کے باوجود عزیزہ مصر نے عزیز مصر سے الگ ہو کر عورتوں کی دعوت کی اور اس دعوت میں عورتوں کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی اور اپنے مجرم ہونے کا اعلان کیا اور بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ دھمکی دی۔ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونن من الصاغرین راست بازی اور حُسن پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کر لی۔ دنیا میں سزائیں اس لیے ملتی ہیں کہ جرم و معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو سزا اس لیے مل رہی ہے کہ جرم و معصیت سے اپنے آپ کو کیوں روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کہ عیش حیات ڈھونڈھتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کی دھمکی اس لیے دی جا رہی ہے کہ عیش حیات کو کیوں نہیں قبول کرتے۔

(۳۰) سیرت یوسف ؑ کا سب سے عظیم مظاہرہ

یوسف علیہ السلام نے سُن کر اللہ کے حضور میں دعا کی خدایا مجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے جس کی یہ عورتیں دعوت دے رہی ہیں اگر تو نے میری مدد نہ کی

تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جھک جاؤں اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو ناآشنا ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ رویہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہوگی۔ بہر حال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ اور سیدہ کا کہا ماننا چاہیئے۔ آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کا کیا فائدہ۔ کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کر رہی تھیں۔ مگر دل ہر ایک کا یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ عورت بے طرح پیچھے پڑی ہوئی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم و استقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ ابدیت میں درخواست کی کہ مجھے اس مکر و فریب سے بچایئے، اگر اس سلسلے میں قید ہونا پڑا تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو ڈر ہے کہ کہیں بے عقل ہو کر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ عصمت کا جو منشا ہے حفاظت و صیانت الہی اسی پر نظر رکھتے ہیں [1]

یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کی عیش اللہ کی نافرمانی کرکے۔ زندگی کی سختیاں اللہ کی فرماں برداری کرکے تو دونوں میں سے آپ نے جو راہ اختیار کی وہ دوسری تھی یعنی رب السجن احب الیّ الخ اے میرے آقا مجھے جیل کی سختیاں گوارا ہیں اور ان عورتوں کے نفسانی مشوروں پر عمل گوارا نہیں ہے اللہ اکبر کیا مقام ہے عصمت یوسف علیہ السلام کا بعض عرفا نے لکھا ہے کہ مصیبت کو معصیت پر ترجیح دینا صدیقین کا مقام ہے آیت بتا رہی ہے کہ کمال عبدیت یہ ہے۔ کمال تقویٰ پر بھی ناز اپنی ذات پر نہیں ہوتا۔ دعا بس اللہ سبحانہٗ سے ہی ہے کہ بس آپ ہی مجھے سنبھالے رہیئے جیسے اب تک سنبھالے رکھا ہے ورنہ میری کیا مجال ہے کہ ان ترغیبات کے ہجوم میں ثابت قدم رہ سکوں۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا عصمت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نبوت کی منافی نہیں ہے کیونکہ نبوت کی عصمت بھی اللہ کی حفاظت کا نتیجہ ہے۔ نبوت کی نظر اصل مؤثر کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو اپنی عصمت پر ناز نہیں ہوتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مقام کمال صدیقیت ہے جوان اور حسین امیرزادی اپنی طرف بلا رہی ہے اور خود بھی جوان اور حسین ہیں۔ اس پر بھی خشیہ خداوندی اس قدر غالب ہے کہ ان لذتوں کو چھوڑ کر جیل جانا پسند کرتے ہیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے عظیم مظاہرہ ہے۔ انیس بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو بدویانہ زندگی سے بہترین تندرستی اور شاندار جوانی لے کر آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور اضطراری غلامی کی منزلوں سے گزر کر دنیا کی سب سے بڑی متمدن حکومت کے دارالخلافہ میں ایک بڑے رئیس کے ہاں آگیا۔ یہاں پہلے تو خود اس امیر کی بیگم اس کے عشق کا دم بھرنے لگتی ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا چرچا ہوتا ہے اور پورے شہر کی امیر گھرانوں کی عورتیں ان پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور دوسری طرف حسن و جمال کی رعنائیاں اور دلفریبیاں ہیں ہر طرح کی تدبیریں جذبات کو بھڑکانے اور نبوت کی عصمت کو تار تار کرنے کی ہو رہی ہیں۔ نبوت جدھر جاتی ہے یہی دیکھتی ہے کہ گناہ اپنی ساری خوشنمائیوں کے ساتھ دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ یعنی گناہ اور بدکاری اس تاک میں ہے کہ نبوت کے ارادے میں برائی کی طرف میلان کب ہوتا ہے۔ اس حالت میں نبوت کی یہ عصمت جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کا منفرد مقام ہے۔ مگر ضبط نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عرفان نفس اور طہارت فکر کا مزید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی حضرت یوسف ؑ کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ میرا کارنامہ ہے اسکی جگہ بشری کمزوریوں کا خیال کرکے کانپ اٹھتا ہے اور لرزتی ہوئی زبان میں وہ اللہ سبحانہ، سے التجا کرتا ہے کہ اے میرے رب میں ایک کمزور انسان ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا سامنا کر سکوں۔ تو ہی میری مدد کر۔ فی الواقع یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ عصمت کی وجہ سے دیانت، امانت، عفت، حق شناسی اور راست روی کی غیر معمولی صفات جواب تک چھپی ہوئی تھیں وہ سب کی سب منصہ شہود پر آگئیں اور پورے زور سے کام کرنے لگیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے بارے میں یہ سوچ کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بدشگونی تھی کہ انہوں نے خود اللہ سبحانہ، سے قید خانہ کی بات کہہ دی۔ اگر جلدی میں آکر وہ ایسا نہ کہتے تو جیل کی زندگی کا ابتلا پیش نہ آتا۔ افسوس کہ یہ مقام صدیقیت سے کیسی ناآشنائی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی جو بات ان کی پاکی و عظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی وہی ان کی نظر

میں لغزش ہوگئی گویا حضرت یوسف علیہ السلام کا معصیت کے مقابلے میں مصیبت کا استقبال اور اسے خوشی خوشی اختیار کرلینا کوئی ایسی بات تھی جو نہ ہونی چاہیئے تھی ۔ اور صرف اس لیے ہوگئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جلدی کی۔

(۳۱) حضرت یوسفؑ کی دعا اور اس کی پذیرائی

اللہ سبحانہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول کی اور ان سے عورتوں کا فریب ہٹا دیا بلاشبہ وہی دعاؤں کا قبول کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے یعنی ان کو عصمت وعفت پر پوری طرح ثابت قدم رکھا کسی کا فریب نہ چلنے دیا کیونکہ اللہ سبحانہ سب کی دعائیں سنتا، قبول کرتا اور خبر رکھتا ہے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگے سے قید میں پڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دور کردیا باقی قید ہونا تھا قسمت میں۔ آدمی کو چاہیئے کہ گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہ مانگے پوری بھلائی مانگے گو ہوگا وہی جو قسمت میں ہے"، ترمذی میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگتے سنا۔ اللّٰھم انی اسألك الصبر۔ اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں آپ نے فرمایا۔ سألت اللہ البلاء فاسألہ العافیۃ۔ تو نے اللہ سے بلاء مانگی۔ کیونکہ صبر تو بلاء پر ہوگا اب تو اس سے عافیت مانگ[۱] جو بات شیخ الاسلامؒ نے لکھی ہے یہی بات کچھ شارحین قرآن نے بھی لکھی ہے۔ ان میں علامہ آلوسیؒ، قاضی بیضاویؒ، قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی بھی ہیں۔ اور یہ بات اس لیے لکھی ہے کہ ان بزرگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ سبحانہ سے جیل جانے کی دعا مانگی تھی ان کو یہ دعا نہ مانگنی چاہیئے تھی اگر وہ یہ دعا نہ مانگتے تو جیل نہ جاتے حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے ان بزرگوں کے اس خیال کو یہ کہہ کر رد کردیا

اور سجن میں جانا جزو استجابت نہیں جیسا مشہور ہے کہ قید کی دعا کی
اس لیے قید میں گئے۔ کیونکہ قید کی درخواست تو نہیں کی صرف فعل قبیح
کا سجن سے اقبح ہونا بیان کیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہمیں مولانا عثمانی اور حضرت شاہ صاحب کی جلالت قدر کے پیش نظر اگرچہ جرأت گویائی نہیں ہے۔ لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی اس عدیم النظر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کا یہ جملہ السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ ۔ ان کے علوشان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضا و تسلیم کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں ہی کا حصہ ہے۔

غور فرمایئے عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ نہیں اختیار کی جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے اپنے ممکن داؤ اور گھات حضرت یوسف علیہ السلام پر استعمال کیے پھر بھی ناکامی رہی۔ اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف علیہ السلام اسے شاد کام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحب عزیمت و استقامت ہستی اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا انسان اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا ہے کہ "خدایا میں اس عمل بد کے مقابلے میں زنداں کو ترجیح دیتا ہوں مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں" کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے۔ زنداں کے شوق کا اظہار ہے، بلاؤ مصیبت کو دعوت ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرائے میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور نڈرسی کا صحیح درجہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرتے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں مخاطب بنا لیتے بلکہ آپ نے اللہ سبحانہ کو پکارا اور ان گمراہ و بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہی۔ اسی طرح ان کی دھمکی، اور ان کی سزا بھی میرے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کا مطالبہ ہے کہ یوسف علیہ السلام مجھے یا شاد کام کرے ورنہ جیل جائے تو میں جیل کو اس کے ارادہ بد کے مقابلے میں لاکھ بار ترجیح دیتا ہوں۔ رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ۔

اب فرمایئے کہ اس اعلان حق اور اظہار استقامت کا اس دعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لیے صبر مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان بلکہ مفت میں بلاؤ مصیبت کا داعی بن رہا تھا اور یہاں امتحان سر پر ہے آزمائش

موجود ہے مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے ۔ بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقعہ پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام گڑگڑا کر جناب باری میں امراۃ العزیز سے چھٹکارا پانے کی دعا کرتے اور بس ۔ اگر ایسا ہوتا تو امتحان، آزمائش اور بلاؤ مصیبت کے وقت استقامت اعلان حق ، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلے میں اعلاء کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا ۔ عزیمت کی زندگی کون دیتا ، باطل سے بے خوفی کی تعلیم کیسے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا [1]

سوچنے کی بات ہے ۔ کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم ، اعتماد نفس اور توکل علی اللہ کی روح عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخران کی منزل مقصود ثابت ہو ۔ امراۃ العزیز کا معاملہ حضرت یوسفؑ کو اس وقت پیش آتا ہے جبکہ دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں پہلے اپنی راہ نکال چکے، مصیبتوں کی آزمائش ذہن و دماغ کی آزمائش ہوتی ہے اور امراۃ العزیز کا سارا معاملہ جذبات سے تعلق رکھتا تھا ۔ اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہے ۔ وہ سمندر کی موجوں سے نہیں گھبراتا ، پہاڑ کی چٹانوں سے ہراساں نہیں ہوتا ، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا درندوں کے مقابلے سے نہیں ڈرتا ، تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے ۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کی چادر یہاں بھی تار تار نہیں ہوئی ۔ ان کی بے داغ فضیلت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا ۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر پوری صورت حال کی تصویر کھینچ دی ہے ذرا چشم تصور سے کام لو اور دیکھو ترغیبات کی قہر و سلطانی کا کیا حال تھا اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر ربا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی ۔

امراۃ العزیز کی جانب سے چیلنج دیا جا رہا ہے ۔ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن اگر میرا کہا نہ مانو گے تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی اور ذلت و خواری سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ اس چیلنج پر جو کچھ ان کی زبان سے نکلا وہ کیا تھا ۔ رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ

---

[1] قصص القرآن

خداوندا زندگی کا عیش مگر تیری معصیت میں، زندگی کی سختیاں مگر تیری فرماں برداری میں ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا۔ کہ قید خانہ مجھے محبوب جہاں تیری رضا ہے معصیت مجھے منظور نہیں جہاں تیری ناراضگی ہے۔ جب مصیبت اور معصیت کا ابتلاء ہوتا ہے تو نبوت مصیبت کو ترجیح دیتی ہے اور یہ اور صرف یہ کہتی ہے۔ لك العتبىٰ حتى ترضىٰ۔ مجھے تو تجھے اور صرف تجھے منانا ہے تاآنکہ تیری جانب سے مجھے رضا کا پروانہ مل جائے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے عشق الٰہی کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری حق کا دستور العمل ہے۔ یہ عصمت کاملہ کا معیار ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ بات بڑی بصیرت والی ہے۔

اس دعا میں دو عبرتیں ہیں پہلی عبرت یہ ہے کہ معصیت اور مصیبت کا جب مقابلہ ہو جائے تو مصیبت کو اپنانا چاہیئے۔

دوسری عبرت یہ ہے کہ اللہ سے دعا مانگنی چاہیئے کہ شدائد میں دل کو دین پر جمائے رکھے اور دل کا میلان طاعت خداوندی پر رہے۔

اس دعا میں اللہ پر توکل و اعتماد بھی ہے اور اللہ سبحانہٗ سے ایمان و طاعت پر ثبات اور جہاد کی دعا بھی ہے اور آزمائش و امتحان میں ثابت قدمی کی جو درخواست ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا ایسی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے شدائد کے ہجوم میں بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ (استعينوا بالله واصبروا)

لہٰذا اموں کی پابجائی کیلئے جیسے تقویٰ ضروری ہے ایسے ہی مقدور پر صبر بھی ناگزیر ہے۔ یہی کردار حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے۔ بدکاری سے بچنے کے لیے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ اور دامن پر آنچ نہ آنے دی عورتوں کے بہلانے اور قید کی تکلیف پر صبر کیا عفت و عصمت پر جماؤ کے لیے اللہ سے دعا مانگی اور ان کی فریب کاریوں کو دور کرنے کے لیے اللہ پر توکل کیا۔ بہرحال طاعت خداوندی میں تکلیفوں کو برداشت کرنا اور اس عزت کی پرواہ نہ کرنا جو اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں ملتی ہے یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا کردار نہیں بلکہ تمام انبیاء کا اسوۂ حسنہ ہے۔ حضرت یوسف ؑ کو جو کچھ ملا ہے اسی کے نتیجے میں ملا ہے زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں پیدا کرتی رہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی غیر متزلزل اور بے داغ عصمت کس طرح فتمندیوں پر فتح مندیاں حاصل کرتی گئی۔

علامہ ابو السعودؒ نے اسی دعا کے سلسلے میں اپنی تفسیر میں جو بات لکھی ہے وہ بھی اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے

انبیاؑ و رسل کی سنت کے مطابق یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے جناب الٰہی میں درخواست ہے کہ بھلائیوں تک رسائی اور برائیوں سے بچاؤ کا مدار صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے۔ اللہ کے الطاف کریمانہ کے ذریعے عورتوں کی فریب کاریوں سے حفاظت ہو سکتی ہے بندے میں مدافعت کی کوئی طاقت نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے بیقرار کہتا ہے۔ بچا لو ورنہ مرجاؤں گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام میں خود تو عورتوں کی طرف میلان ہے اور جناب الٰہی میں جبری عصمت و عفت کی درخواست کر رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر یہ دعا اس وقت آئی ہے جب وہ اپنی پوری طاقت اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نچوڑ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان بیگمات کی پیدا کی ہوئی پر فتن زندگی کے مقابلہ میں جیل کی پر محن زندگی کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔ جب بندہ اس حد تک اپنی استقامت دکھلانے کے بعد اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے ڈال دیتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔

(۴۲) حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور

پھر ایسا ہوا کہ اگرچہ وہ لوگ یعنی عزیز اور اس کے خاندان کے لوگ باوجود یہ کہ نشانیاں دیکھ چکے تھے پھر بھی ان کو یہ بات سمجھ میں آئی کہ ایک خاص وقت تک یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے یعنی باوجود یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت و نزاہت کے بہت سے نشان دیکھ چکے تھے۔ پھر بھی ان کی مصلحت یہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام کو ایک مدت تک قید میں رکھا جائے۔ تاکہ عام لوگ سمجھیں کہ قصور یوسف ہی کا تھا۔ عورت بے چاری مفت میں بدنام ہوئی۔ گویا عورت نے قید کی جو دھمکی دی تھی اسے پورا کرا کے چھوڑا۔ ان لوگوں کی غرض تو یہ ہوگی کہ عورت سے یہ بدنامی زائل ہو نیز ایک مدت تک یوسف علیہ السلام اس کی نظر سے دور رہیں۔ اور عورت کا مطلب یہ ہوگا کہ شاید قید کی سختیاں اٹھا کر یوسف علیہ السلام کچھ نرم پڑ جائیں اس طرح اپنا مطلب نکال سکوں [۱]
ایک عبرانی غلام کے ہاتھوں ایک مصری امیر کی بیوی کی کتنی بدنامی ہو چکی تھی اسی کی خاطر انتظاماً یہ ضروری ہوا کہ ایک مدت تک کے لیے خود اس غلام کو عام نگاہوں سے دور رکھیں بد اللہ۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یعنی خود عزیز اور اس کے مشیروں کو محسوس ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس وقت جیل جانا حالات کی سازگاری کے لیے ضروری ہے باوجود یہ کہ انہیں یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور بے قصوری کی شہادتیں مل چکی تھیں اور خود بھی اس پر یقین کر چکے تھے۔ جیل خانہ کوئی عام نہ تھا بلکہ خاص قسم کا تھا۔ سخت اور خاص مجرموں کے لیے تھا توریت میں ہے۔

اور یوسف کے آقا نے اسے پکڑا اور ایک جگہ جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے قید میں ڈالا۔

بہر حال یوسف علیہ السلام کو جیل خانے بھیج دیا گیا اور اب حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ایک قیدی کی زندگی میں تبدیل ہوگئی لیکن یہ قید کسی جرم کی پاداش میں نہیں بلکہ راست بازی اور حق پرستی کی آزمائش نے اچانک یہ صورت اختیار کرلی۔ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے ملتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو روک نہیں سکتے لیکن عزیز مصر اور اس کے ساتھیوں نے اب حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے قید کی سزا اس لیے پیش کی ہے کہ جرم و معصیت کوئی نہیں ہے۔ سزا شواہد کے باوجود گناہ کی نہیں بے گناہی کی دی جارہی ہے اس لیے یہ سزا دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی فتح ہے اور مصری حکومت کی بہت بڑی اخلاقی شکست ہے اب حضرت یوسف علیہ السلام کوئی غیر معروف اور گمنام آدمی نہ رہے تھے سارے ملک میں اور مصر کے دارالخلافہ میں خاص و عام سب ہی ان سے واقف ہو چکے تھے جس ذات گرامی کی باعصمت اور پاکیزہ شخصیت پر ایک دو نہیں اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی رئیس زادیاں فریفتہ ہوں اور جس کے فتنہ روزگار حسن سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے ان کو قید کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا بلا ریب ان کی شہرت ہوگئی ہوگی۔ عام طور پر لوگ اس بات سے بھی واقف ہوگئے ہوں گے کہ یہ شخص کیسے بلند، مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے اور یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ اس شخص کو جیل کسی جرم کی پاداش میں نہیں بھیجا گیا بلکہ محض اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھجوادیں۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ اس طرح کچھ مدت کے بعد زلیخا کے دماغ سے یوسف علیہ السلام کا خبط بھی نکل جائے گا اور جو لوگ اس قصہ میں دلچسپی لے رہے ہیں ان کی توجہ بھی ہٹ جائے گی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میں خواب میں اپنے آپ کو شراب کے لیے انگور کا عرق نچوڑتا دیکھ رہا ہوں، دوسرے نے کہا مجھے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ بلاشبہ ہماری رائے میں آپ بڑے نیکوکاروں میں سے ہیں ۳۶ حضرت یوسفؑ نے فرمایا گھبراؤ نہیں پہلے اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم کو ملے گا میں تمہیں

خواب کی تعبیر ضرور بتادوں گا۔ اس بات کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جس کی مجھے میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہے۔ میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت والی زندگی کے منکر ہیں [۳۷]

ہر نبی کی زندگی ایک دلیل اور برہان حق ہے

قرآن عزیز کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی۔ اور جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً و فعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور اللہ سبحانہٗ کی برہان ہے اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کیلئے اور کوئی دلیل قطعی اور یقینی نہیں ہوسکتی۔ کہ اللہ سبحانہٗ ہے اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے اور اس نے جس طرح عالم ہستی کو بنایا اسی طرح اس کے لیے قوانین و آئین عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو جانتا ہے۔ قرآن کی یہ دلیل ان سب سے زیادہ روشن اور قطعی ہے۔ اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود ہی نہیں ہے حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف ان باتوں کو ہی ماننا چاہیئے جو یقینی ہوں اور ثابت شدہ یعنی تم اعتقاد کے لیے صرف امکان کو کافی نہیں سمجھتے "اثبات" کے طلبگار ہو تو جب بھی دنیا میں الکلم الطیب اور العمل الصالح سے بڑھ کر اور کون سی ثابت اور واقع حقیقت ہوسکتی ہے۔ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے جا بجا دعوت الی الوحی کو القول الثابت، الدین القیم اور الواقع اور الثابت وغیرھا سے تعبیر کیا ہے کہ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنی ذات کے اندر ایک حجت قائمہ اور آیت کاملہ ہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری زندگی صرف ایک لفظ میں بتلائی جا سکتی ہے۔ برہان، محکم، دلیل ثابت نبی ہونے کی حیثیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔ قرآن اسی لیے آپ کی زندگی کے سارے گوشوں کو پیش کرتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی کے مختلف مناظر سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی زندگی کے تمام وقائع بجائے خود ایک مستقل دلیل اور برہان حق ہیں۔ اسی لیے قرآن عزیز ان کو استشہاداً اور استدلالاً ذکر کرتا ہے۔ اور ان کو آیات سے تعبیر کرتا ہے اور اس طرح گویا زندگی کا ہر منظر دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مناظر میں یہ بات دہرائی۔ کہیں فرمایا۔ ویعلمك من تاویل الاحادیث کہیں ارشاد ہوا ولنعلمہ من تاویل الاحادیث اور کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بتایا۔ ذالکما مما علمنی ربی۔ اور کسی جگہ اسی کو دعائی پیمانہ بنا کر پیش کیا۔

رب قد اتیتنی من الملك وعلمتنی من تاویل الاحادیث

اور اس کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ ان کی سیرت و سوانح، وقائع و ایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق و سوابق کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے۔

(۳۶) اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے ان دونوں میں سے ایک نے کہا میں خواب میں اپنے آپ کو شراب کے لیے انگور کا عرق نچوڑتا دیکھ رہا ہوں دوسرے نے کہا کہ مجھے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ بلاشبہ ہماری رائے میں آپ بڑے نیکوکاروں میں سے ہیں یعنی اسی زمانے میں دو نوجوان قیدی جیل خانے میں لائے گئے جن میں سے ایک بادشاہ مصر کا نانبائی اور دوسرا ساقی شراب پلانے والا تھا۔ دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کی مروّت و امانت، راست گوئی، حُسنِ اخلاق، کثرت عبادت، معرفت تعبیر اور ہمدردیٔ اخلاق کا چرچا تھا۔ یہ دونوں قیدی حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت مانوس ہو گئے۔ اور بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔ ساقی نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں نانبائی نے کہا کہ میرے سر پر کئی ٹوکرے ہیں جس میں سے پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بزرگ

دیکھ کر تعبیر مانگی [1]

توراۃ میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈالا گیا تو قید خانہ کا داروغہ ان پر مہربان ہوگیا اور تمام قیدیوں کا انتظام ان کے سپرد کردیا وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہوگیا تھا اور خداوند نے وہاں بھی اسے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔ (پیدائش)

قرآن کی اس آیت میں اس کے اشارات موجود ہیں۔ اوّل تو دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر پوچھنا ہی اس کی دلیل ہے کہ انہیں غیر معمولی علم و فضیلت کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان دونوں کا یہ کہنا انا نراك من المحسنين۔ صاف طور پر واضح کر دیتا ہے کہ قید خانہ میں ان کا تقدّس عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جیل کی زندگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ان دو قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام ہی سے آکر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی؟ اور ان کی خدمت میں یہ نذرانہ عقیدت کیوں پیش کیا۔ انا نراك من المحسنين۔ جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص کوئی مُجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس انسان ہے سخت ترین آزمائشوں میں اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے چکا ہے۔ آج پُورے ملک میں اس سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں اس کی نظیر مفقود ہے یہی وجہ تھی کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ قید خانہ کے حکام اور اہل کار تک ان کے معتقد ہوگئے تھے۔ متقی کہیں بھی ہو۔ کسی فضا و ماحول میں ہو آثار تقویٰ ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ چند ہی روز میں ان قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پا لیے تھے۔ اور ان کے سامنے اپنے خواب عرض کیے پہلا خواب شاہی ساقی کا ہے۔ توراۃ میں ہے۔

> وہ بولے ہم نے ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر کرنے والا کوئی نہیں یوسف نے ان سے کہا۔ کیا تعبیر کی قدرت خدا کو نہیں ہے مجھ سے بیان کیجئے۔ تب سردار ساقی نے اپنے خواب یوسف سے بیان کیا اور اس نے کہا کہ دیکھ میرے خواب میں ایک تاک میرے سامنے تھی۔ اس تاک میں تین ڈالیاں تھیں ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں کلیاں نکلیں۔ ان میں پھول آئے اور اس کے سب گچھوں میں انگور پکے
اور فرعون کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھا سو میں نے ان انگوروں کو لیکر فرعون
کے جام میں نچوڑا اور وہ جام میں نے فرعون کے ہاتھ میں دیا۔

عربی زبان میں یہ اسلوب موجود ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کو اس کی غایت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگور نچوڑنے کا مقصد اگر اس سے شراب بنانا ہے تو اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ اگر ترجمہ یوں کیا جائے کہ میں شراب بنانے کی خاطر انگور نچوڑ رہا ہوں تو پھر اس میں کوئی مجاز نہیں ہے۔ دوسرا خواب شاہی طباخ کا ہے تورات میں اسکی زبان سے ہے

میں بھی خواب میں تھا اور دیکھا کہ سر پر تین ٹوکریاں روٹی کی تھیں اوپر کی
ٹوکری میں فرعون کے لیے سب قسم کا پکا ہوا سال تھا اور پرندے میرے سر پر
اس ٹوکری میں سے کھاتے تھے۔ پیدائش ۴۰۔ ۱۶۔ ۱۷

حسن وجمال کی طرح فضل وکمال بھی چھپنے والی چیز نہیں اور اس کا اثر کا فر تک محسوس کر لیتے ہیں۔ توریت میں ہے۔

وہ وہاں قید خانہ میں رہتے تھے لیکن خداوند یوسف کے ساتھ تھا۔

حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آپ بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ غمگینوں کو تسلی دیتے اور عبادت میں منہمک رہتے۔ اس فقرے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری زندگی جھلک رہی ہے۔ سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اس کا تکرار ہے۔ کہیں اللہ سبحانہٗ کا اعلان ہے۔ کذالك نجزی المحسنین۔ کہیں قیدی جیل میں کہہ رہے ہیں انا نرالك من المحسنین۔ کہیں اقتدار ملنے پر کہا جا رہا ہے۔ لا نضیع اجر المحسنین۔ اور تخت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد بھائی کہہ رہے ہیں۔ انا نرالك من المحسنین۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حسن کاری ان کی زندگی کے سارے گوشوں پر چھائی ہوئی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہی سیرت ہے جو قید خانے کی تنگ وتاریک کوٹھری کو بھی اسی طرح روشن کرتی ہے جس طرح عزیز مصر کے ایوان عزت واقبال کو روشن کر دیا۔ کیونکہ چراغ جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے روشنی ہی دے گا اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہ ہو جائے گی کہ جواہر خانہ شاہی میں رہنے کی جگہ جیل میں ڈال دیا جائے۔ تورات کی تصریح پڑھ چکے کہ جیل کا داروغہ ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ اور قید خانہ میں ان کی حسن کاری کی قیادت قائم ہو گئی تھی۔

بہرحال مصائب میں اور معاصی میں ہر جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حُسن کاری کا نمونہ قائم کیا۔ السید انورشاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز احسان کے معنے حسن پیدا کردن کرتے تھے۔ آپ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ قرآن پاک میں المحسنین کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے ہیں یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہ ہوں بلکہ ان امور کے حسن کا جو درجہ ہے اس کے حصول میں کوشاں ہوں۔ گویا محسنین وہ طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن کار ہو۔ ظاہر ہے کہ یوں سر کا بوجھ اُتارنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں۔ اس میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے لیکن اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حُسن و سلیقے کے ساتھ کیا جائے اس کے لیے سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے پھر ان حُسن کاروں اور محسنوں کو جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو جس کا قرآن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے تو اپنی محنت و مشقت اور جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن کے محسنین سے مراد ان ہی لوگوں کا گروہ ہے جن کی زندگی خالق و مخلوق کے باہمی معاملات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے اور احسان کی تشریح جو خود زبان نبوت نے پیش کی ہے۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

اللہ سے عابدانہ تعلقات اس طرح قائم کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو دیکھ نہ پاؤ تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا کوئی شعبہ حُسن کاری سے خالی نہ تھا۔ بچپن کے خواب سے شروع ہو کر بھائیوں کے ظلم و ستم، کنوئیں کی تنہائی، قافلہ والوں کی غلامی، غلام کی حیثیت سے بازار میں ان کی فروختگی، امرأۃ العزیز کی دعوت عیش مصر کے معزز گھرانوں کی عورتوں کی فریفتگی اور ان کی فریبکاری، قیدی کی حیثیت سے جیل کی زندگی، وزیر مال کی حیثیت سے اقتدار میں شرکت اور خود مختار مصر کے فرماں روا ہونے کی حیثیت سے ان کا اقتدار۔ ان میں سر تا سر حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی حُسن کاری ہی حُسن کاری ہے اور اب یگانوں اور بیگانوں کی نظر میں مُحسن ہیں۔

(۴۴) خواب کی تعبیر اور دین کی دعوت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا گھبراؤ نہیں پہلے اس کے کہ تمہیں مقررہ کھانا ملے گا میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔ اس کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جس کی میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہے میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت والی زندگی کے منکر ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے ان کو تسلی دی کہ بے شک خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روز مرہ جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تعبیر بتلا کر فارغ ہو جاؤں گا لیکن تعبیر خواب سے زیادہ ضروری اور مفید ایک چیز پہلے تم کو سناتا ہوں وہ یہ کہ تعبیر وغیرہ کا یہ علم مجھ کو کہاں سے حاصل ہوا۔ یاد رکھو کہ میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں ہوں بلکہ میرے علم کا سرچشمہ وحی اور الہام ربانی ہے جو مجھ کو حق تعالیٰ نے اس کی بدولت عطا فرمایا کہ میں نے ہمیشہ سے کافروں اور باطل پرستوں کے دین و ملت کو چھوڑ دیا اور اپنے مقدس آباؤ اجداد حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیا و مرسلین کے دین توحید پر چلا اور ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کیا ہمارا سب سے بڑا اور مقدم مطمع نظر یہی رہا کہ دنیا کی کسی چیز کو کسی درجہ میں بھی خدا کا شریک نہ بنائیں نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں نہ ربوبیت میں نہ معبودیت میں۔ صرف اسی کے آگے جھکیں، اسی سے محبت کریں۔ اسی پر بھروسہ کریں اور اپنا جینا مرنا سب اُسی ایک پروردگار کے حوالہ کر دیں بہر حال یوسف علیہ السلام نے موقع مناسب دیکھ کر نہایت مؤثر طرز پہ ان قیدیوں کو ایمان و توحید کی دعوت دی پیغمبروں کا کام یہی ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ یوسفؑ نے دیکھا کہ ان قیدیوں کے دل میری طرف متوجہ اور مجھ سے مانوس ہیں۔ قید کی مصیبت میں گرفتار ہو کر شاید کچھ نرم بھی ہوئے ہوں گے۔ لاؤ ان حالات میں فرض تبلیغ ادا کرنے میں فائدہ اٹھائیں لاؤ انکو دین کی باتیں سکھلائیں پھر تعبیر بھی بتلا دینگے۔ یہ تسلی پہلے کر دی کہ کھانے کے وقت تعبیر معلوم ہو جائیگی۔ تاکہ وہ نصیحت سے اکتائیں نہیں۔ اس آیت میں حضرت یوسفؑ کی سیرت کا کیسا عجیب منظر سامنے آتا ہے قید خانہ کی زندگی میں دعوت حق کا داعیہ ان کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت انہوں

لہ افادات شیخ الاسلام

نے نبی ہونے کی حیثیت میں دعوت کا کام شروع نہیں کیا تھا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ دعوت کا کام شروع ہو اسی کا نتیجہ ہے کہ یکایک ان کا قلب ولولہ تبلیغ سے معمور ہو گیا۔ لیکن آپ تو قید کی زندگی بسر کر رہے تھے یہاں اس تبلیغ کا مخاطب کون تھا۔ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے۔ جو طرح طرح کے جرموں کی پاداش میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی رہائی کا انتظار تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ میں بھی قیدیوں کے اندر تبلیغ شروع کر دی۔ اب مصر کا قید خانہ دعوت حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درسگاہ بن گیا۔

قید خانے میں دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے ہیں اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سن کر حضرت یوسفؑ معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے اور دوسرے کی موت قریب ہے۔ چاہتے ہیں کہ فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو اور تعلیم حق سے ان کو آشنا کر دیں۔ ممکن ہے کہ جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے۔ جس کی موت قریب ہے ممکن ہے سچائی قبول کر لے اور دنیا سے جائے تو راہ حق پر جائے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب سنتے ہی تعبیر نہیں بتائی بلکہ انکی توجہ و رجوع سے فائدہ اٹھا کر ایک دعوت کا وعظ شروع کر دیا۔ انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ وھم بالآخرۃ ھم کافرون۔ نبوت کی دعوت کے تین اہم اور بنیادی اصول ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخرہ اور ایمان بالرسالت۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت میں علمنی ربی کہہ کر سب سے پہلے دعوت، رسالت پھر ایمان باللہ اور پھر ایمان بالیوم الآخر۔

رسالت کا چہرہ آپ نے سب سے پہلے ان دونوں قیدیوں کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ تعبیر بتانے سے پہلے آپ نے اپنا مقام ظاہر کیا۔ اور بتایا کہ میرے علم کا ماخذ علم الہٰی ہے جس کی بنا پر میں تعبیر بتاؤں گا۔ اپنی رسالت کی بات حضرت یوسف علیہ السلام نے جس بلیغ انداز میں پیش کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ فی الواقع جس شخص کے دل میں تبلیغ حق کی دُھن ہو اور ساتھ ہی علیم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ دعوت کو پیش کرتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کھانا تقسیم ہونے سے پہلے پہلے میں تم کو ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ کھانے کا حوالہ دے کر خواب کی تعبیر کو کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔ اسی حوالہ سے حضرت یوسفؑ نے دین حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا انہوں نے جب دو دلوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو چاہا کہ ان کو اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچا دیں اگر وہ قبول کریں تو ان کی دنیا و آخرت

دونوں سنور جائیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی یہ بات فرمائی۔ علمنی ربی۔ میں کوئی کاہن اور نجومی یا رمال وجفار نہیں۔ میرے علم کے ڈانڈے علم الٰہی سے ملے ہوتے ہیں۔ اسی نے مجھے علم عطا فرمایا ہے یہ گویا ان کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی نبوّت کو پیش کیا ہے۔ نبی ہونے کے ناطے سے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا۔ انی ترکت ملۃ قوم۔ میں ان لوگوں کی ملّت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں۔ یہی باتیں دین کی بنیادی باتیں ہیں یعنی ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالرسالۃ۔ حضرت یوسفؑ نے سب سے پہلے اپنے مخاطبوں کے ذہن میں ان کی تخم ریزی کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس راہ کے اختیار کرنے کے لیے ان لوگوں کی راہ چھوڑنی پڑے گی جو ان پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت ہمارے لیے یہ راہنما اصول بھی بتا رہی ہے کہ دعوت حق کا فریضہ کیونکہ ادا کرنا چاہیئے۔ امیری ہو یا فقیری آزاد ہو یا قیدی، مقیم ہو یا مسافر، اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ دعوت حق کے ادا فرض سے کوئی حالت مستثنیٰ نہیں ہے۔ دیکھیئے کہ قید کی حالت میں فکر اس بات کی ہے کہ اللہ کے بندوں کے اللہ سے عابدانہ تعلقات کیسے قائم ہوں فکر اس بات کی نہیں کہ قید سے میری رہائی کیسے ہو مہلت جب ملی اور جس حال میں ملی اس کو ادا فرض کے کام میں لایا گیا اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا ہے اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے۔

اس آیت نے یہ بات بھی کھول دی ہے کہ تاویل الرؤیا ایک علم تھا جو اللہ سبحانہٗ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سکھایا تھا دو باتیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک تاویل الرؤیا دوسری تاویل الاحادیث اور دونوں کا علم اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا کیا تھا۔

آیت کا ایک اور مطلب

شارحین قرآن نے لا یأتیکما طعام ترزقانہٖ الا نبأتکما بتاویلہٖ کا مطلب ایک تو وہی ہے جو ابھی ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ میں تم کو روزانہ کا مقررہ کھانا آنے سے پہلے تم کو خواب کی تعبیر بتا دوں گا لیکن کچھ شارحین قرآن نے اس کا ایک اور مطلب بتایا ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے لا یاتیکما طعام ترزقانہ کے معنے یہ لیے ہیں کہ کبھی کھانا تمہارے پاس نہیں آتا ہے مگر میں آنے سے پہلے اس کی حقیقت پر تمہیں مطلع کر دیا کرتا ہوں یعنی آج کھانا کیا آئیگا۔ کس قسم کا ہوگا۔ پھر تعبیر بتلانا کیا مشکل گویا اول حضرت یوسف علیہ السلام نے معجزہ کی طرف توجہ دلا کر انہیں اپنی نبوّت کا یقین دلایا تاکہ آئندہ جو نصیحت کریں زیادہ مؤثر واقع فی النفس ہو۔ اس تقریر پر حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ معجزہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم۔ مگر مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ نے اپنے ترجمہ القرآن میں پہلی صورت اختیار کی ہے واللہ اعلم۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا۔ چاہا کہ پہلے ان کو دین کی بات سنا دیں پیچھے تعبیر خواب کہیں اس واسطے تسلی کر دی تاکہ نہ گھبرائیں کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتا دوں گا[1] مولانا اشرف علیؒ اور کچھ دوسرے اکابر کا رجحان اس طرف ہے کہ کھانا آنے سے پہلے وہ اس کی حقیقت بتا دیتے۔ شارحین قرآن میں سے بیشتر کا یہی خیال ہے لیکن شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کا رجحان پہلے کی طرف ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپ نے تعبیر فوراً کیوں نہ بیان کر دی۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ تاخیر اس لیے کی کہ وحی کا انتظار تھا لیکن اگر آپ انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیونکر وعدہ کرتے کہ لا یاتیکما طعام ترزقانہ الخ بلاشبہ آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جس میں اسے معجزہ بتایا جائے اور وہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا آنے سے پہلے خواب کی تعبیر بتا دوں سیاق بیان پہلی بات کے حق میں ہے دوسرے مطلب کی حد تک لفظ تاویل طعام کے ساتھ بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے۔ صاف صاف بات یہی ہے کہ تعبیر بتانے میں تاخیر قصداً کی تھی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج نے ان دونوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس توجہ سے فوراً فائدہ اٹھایا اور دین کی دعوت چھیڑ دی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ
مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾
یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ
الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ
لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے۔ ہم انبیاء کی جماعت ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ توحید کی راہ اللہ کا ایک فضل ہے۔ ہم پر اور عام انسانوں پر لیکن لوگوں کی اکثریت اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتی ؀۳۸ اے جیل خانے کے دونوں ساتھیو! اس بات پر غور کرو کہ چند در چند معبود اچھے ہیں یا اللہ جو یگانہ ہی ہے۔ اور جس کا سب

پر دباؤ ہے۔ ۳۶؎ اس ذاتِ گرامی سے ورے ورے تم نے
جن سے عابدانہ تعلقات قائم کیئے ہیں ان کی حقیقت اس سے
زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تمہارے اور تمہارے باپ
دادے کے مقرر کردہ ہیں اس بارے میں اللہ نے ان کے لیے
کوئی سند نازل نہیں کی۔ ۳۷؎ فیصلہ اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے
اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا، کسی سے عابدانہ تعلقات
نہ رکھو۔ ۳۸؎ یہی پائیدار اور صاف دین ہے لیکن اکثر لوگوں
کو اس کا علم نہیں ہے۔ ۳۹؎

ھدایت اللہ کا فضل ہے

قرآن حکیم نے ہدایت کو زمین کی زندگی کہا ہے اور گمراہی کو زمین کی موت سے تعبیر کیا ہے بہار کا جب موسم آتا ہے تو گو زمین کے ہر گوشہ کو روئیدگی اور سرسبزی سے مالا مال کر دینا چاہتا ہے مگر سب سے پہلے اس کی آمد کی برکتیں باغ و چمن میں ہی ظاہر ہوتی ہیں اور صبح کا طلوع اگرچہ دنیا کے گوشے گوشے کے لیے پیام نور ہوتا ہے مگر سورج کی پہلی کرنیں اونچی دیواروں اور بلند میناروں پر پڑتی ہیں گو بعد کو نچلے سے نچلے تہ خانے بھی روشن ہو جائیں گے۔ یہی حال عید برات اور دور فیوض و برکات سماویہ کا بھی ہے۔ اس عالم میں ہی خزاں و بہار کے موسم آتے ہیں اور دن رات کا اختلاف موجود ہے، اگرچہ بہار سعادت کا موسم سارے جہاں اور ساری زمین کے لیے موسم حیات و کامرانی ہے لیکن اس کی سب سے پہلی برکت ان دلوں اور روحوں پر ہوتی ہے جن میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگرچہ آفتاب فیضان الٰہی کی تجلی تمام بر و بحر کو ظلمت و غفلت سے نجات دلانا چاہتی ہے مگر اس کی سب سے پہلی کرنوں سے

درخشندہ ہونے کا حق صرف انہی مستعد طبیعتوں اور صاف دلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی استعداد سے اوّلیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ موسمِ بہار ہر پھُول کو لالی اور ہر پتے کو سبزی بخشتا ہے اور صبح کی تجلّی ہر ذرّے کو چمکیلا اور ہر آنکھ کو بینا بنا دے گی مگر دیکھنا یہ ہے کہ جس وقت باغ و چمن میں ہدایت کے پھُول کھل رہے تھے اس وقت اموات صحرا کا کیا حال تھا۔

(۳۵) اور میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم اسحاق اور یعقوب کی ملّت کی پیروی کی۔ ہم انبیاء کی جماعت ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں یہ ہدایت کی راہ اللہ کا ایک فضل ہے۔ ہم پر اور عام انسانوں پر، لیکن لوگوں کی اکثریت اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتی ہے۔ یعنی ہمارا خالص توحید اور ملّت ابراہیمی پر قائم رہنا نہ صرف ہمارے حق میں رحمت و فضل ہے کیونکہ خاندان ابراہیمی ہی کی شمع سے سب لوگ اپنے دلوں کے چراغ روشن کر سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگ خدا کی اس نعمت عظیمہ کی قدر نہیں کرتے، چاہیئے یہ تھا کہ اس کا احسان مان کر راہ توحید پر چلتے وہ اُلٹی ناشکری کر کے شرک و عصیان کی راہ اختیار کرتے ہیں[1]، دین کی دعوت کے موقع پر ان بزرگوں کے تذکرے سے مقصود اپنی عالی نسبی کا اظہار ہے دوسری طرف سُننے والوں کے دل میں جذبہ شوق کو اُبھارنا ہے۔ اب تک حضرت یوسف اپنے مخاطبوں کی نظر میں ایک معمولی اور گمُ نام شخص ہے۔ بخلاف اس کے ان کے آباؤ اجداد کا نام اُس وقت بحیثیت موحد و داعی دین توحید مشہور ہو چکا تھا اور ان کی شہرت حدود کنعان سے اچھی خاصی پھیل چکی تھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حضرت یوسف دین حق کی تبلیغ کر رہے ہیں، اس سے پہلے ان کی داستان حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیئے ہیں ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیتیں مختلف مرحلوں پر اُبھرتی رہی ہیں، مگر تبلیغ دین کا کوئی تذکرہ نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوّت پر گامزن ہونے کے باوجود مقام نبوّت یعنی کار نبوّت عملاً قید کی زندگی میں اُن کے سپرد ہوا ہے۔ اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر ہے، بات کو مؤثر بنانے کے لیے پہلے اہل حق سے اپنی بستگی کو ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرا دین ان بزرگوں کی پیروی ہے۔ توحید کی دعوت میں زیادہ اہمیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چونکہ لَا اِلٰہ کو . یعنی شرک کو ہے اسی لیے فرمایا . ماکان لنا ان نشرک باللہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ کے ساتھ بیان کر دیا جائے اس لیے اہم اُصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اُصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریئے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے نبوت کی دعوت میں ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریئے یعنی شرک کو پہلے بتایا جائے تمام نبیوں کی دعوت میں قرآن نے پوری وضاحت سے بتایا ہے کہ توحید کی تعلیم صرف یہ نہیں ہے کہ توحید اسے کہتے ہیں اور اس کے دلائل یہ ہیں بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شرک کیا ہے اس کے اعمال کیا ہیں اس کی علامتیں کیا ہیں اس کی مضرتیں کیا ہیں اور وہ کیوں ایک سراسر بے اصل نظریہ ہے قرآن نے نبیوں کی دعوت میں توحید کی تعلیم کے لیے جو ضابطے کا جملہ استعمال کیا ہے، اس میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں یعنی اس نے بات یوں نہیں فرمائی ہے کہ اللہ اکیلا معبود ہے بلکہ یوں فرمائی ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ اس اندازِ بیاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے امیز تصور پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک شرک کی نفی پوری طرح نہ ہو جائے اور جب شرک کی نفی ضروری ہے تو اس کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے .

شرک کے معنٰی ساجھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے . گویا شرک کی تین قسمیں ہیں .

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ سبحانہٗ کی ذات سے ہوتا ہے .

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ سبحانہٗ کی صفات سے ہوتا ہے .

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے .

دین کی دعوت سے پہلے حضرت یوسف نے اپنا تعارف کرایا اور لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی اور نام لے کر بتایا کہ میرا تعلق حضرت ابراہیمؑ اسحاق اور حضرت یعقوب سے ہے . قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ استنباط لطیف ہے جب لوگ کسی عالم کے علمی مقام سے ناواقف ہوں تو عالم کو اپنے علمی مقام سے واقف کرانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ لوگ مقام آشنا ہو کر

اس کے علمی فیوض سے پورا استفادہ کر سکیں ۔

اس سے پہلے انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا کسی موقع پر بھی انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں حضرت ابراھیم اور حضرت اسحاق کا پوتا اور حضرت یعقوب کا بیٹا ہوں۔ قافلہ والے خواہ اہل مدین ہوں یا اسماعیلی دونوں حضرت یوسف کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اہل مصر بھی حضرت ابراہیم سے ضرور واقف تھے۔ بلکہ یہاں حضرت یوسف کا انداز کہہ رہا ہے کہ تینوں بزرگوں کی شہرت مصر میں ہو چکی تھی۔ مگر حضرت یوسف نے کسی جگہ اپنے خاندان کا ذکر نہیں کیا، لیکن اب دعوت دین کی خاطر انہوں نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ میرا تعلق دعوت توحید کی اس عالمگیر تحریک سے ہے جس کی قیادت حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کر رہے تھے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اُٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سُوجھی تھی۔ بلکہ پہلے قدم پر یہ حقیقت کھول دیتا ہے کہ میں اس ازلی اور ابدی حقیقت کی دعوت دے رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔ اپنے کو انبیاء کی صف میں کھڑا کر کے سب کا نصب العین، پیش نہاد یہ بتا رہے ہیں ما کان لنا ان نشرک باللہ من شئی، یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک کریں شرک پر قدغن سب نبیوں نے لگائی ہے اور تمام نبیوں کی دعوت کا آغاز ہی شرک پر نکیر سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تکمیل مُحمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، دین وہی ہے جو پہلے سے تھا مگر اس میں کمال پیدا ہو گیا۔ ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی سب نے یہی کہا کہ اللہ سبحانہٗ ذات و صفات میں یگانہ ہے لیکن اس کی تکمیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کی کہ اللہ کو ایک جانو اس کی ذات کو یکتا اس کی شان یکتا اس کے افعال یکتا۔ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے پھر عبادتیں اتنی ہی ہوں گی کہ قلب سے یوں عبادت کرو زبان سے یوں عبادت کرو قالب سے۔

اسی طرح اور انبیاء نے شرک سے روکا لیکن مُحمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف شرک سے نہیں روکا بلکہ اسباب شرک سے بھی روکا۔

(۳۶) دعوت توحید

اے جیل خانے کے دونوں ساتھیو اس بات پر غور کرو کہ چند در چند معبود اچھے ہیں یا اللہ جو یگانہ ہی ہے۔ اور جس کا سب پر دباؤ ہے یعنی مختلف انواع و اشکال چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لوگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف و قبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے خود سوچو کہ سر عبودیت ان میں سے کس کے سامنے جھکایا جائے[۱]

ارباب کی جمع بتا رہی ہے کہ مصریوں کے عابدانہ تعلقات متعدد معبودوں سے تھے۔ مصری جیسے علوم و فنون میں ترقی یافتہ قوموں میں سے تھے۔ ایسے ہی شرک میں بھی وہ دوسری قوموں سے آگے تھے، شرک کی گمراہی میں بھی ان کا تغلب مشہور تھا۔ دُنیا نے خدا کا تعدد بہت کم کیا ہے دنیا کی گمراہی خدا کے تعدد میں نہیں معبودوں کے تعدد میں ہے، مصر والے بھی اسی گمراہی میں ترقی کر کے دُنیا کی قیادت کر رہے تھے۔

انسان کی جس قدر اُمنگیں خواہشیں اور ضرورتیں ہیں ان ہی کے مطابق انسان گمراہی میں معبود بھی بناتا ہے۔ ہوا کا معبود، بچوں کی ولادت کا معبود، ان کی صحت کا معبود۔ عزت و اقتدار کا معبود، کاروبار چلانے کا معبود، سفر کا معبود، دن کا معبود، رات کی تاریکی کا معبود۔ بتانا یہ ہے کہ جب انسان کا ایک اللہ سے عبادت میں رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس کی ہر ضرورت نت نئے معبود جنم دیتی ہے لفظ متفرقون اختلاف ضروریات کے نتیجہ میں متفرق معبودوں کو بتانے کے لیے آیا ہے۔ یعنی متفرق حاجتوں کے لیے اہلِ مصر نے متفرق الٰہ بنا لیے تھے اسی تردید میں سب نبیوں کی دعوت کا پہلا کلمہ یہ رہا ہے۔

اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ

اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرو اللہ کے سوا تمہارا الٰہ کوئی نہیں ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عمل پیدائش کا ظہور ہو رہا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ وہ تو ٹھیٹھ عقلی بات ہے لیکن اللہ سبحانہٗ سے استفادہ جس فطری جذبے کی رہنمائی میں دعا وعبادت نذر قربانی وغیرہ مختلف اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے

اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذات مبارکہ کے سوا کوئی نہیں اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے مطلب یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الٰہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے جس کے ہم دُنیا کی زندگی میں محتاج ہیں اور ان میں بھی جو آخرت کی زندگی میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا الٰہ الدنیا بھی ہے اور الٰہ الآخرت بھی۔ بلاشبہ انبیائے کرام نے حق سبحانہٗ کی الوہیت کو دنیا یا آخرت کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے عموماً اس دعوت کے مخاطب وہ ہی لوگ رہے ہیں، آیت میں۔ یاصاحبی السجن کہہ کر ان خواب کی تعبیر پُوچھنے والوں کو مخاطب کرنا بڑا بلیغ اور دل نواز خطاب ہے، بسا اوقات مصیبت کا اشتراک ساتھیوں کے دِلوں میں ہمدردی، محبّت، اخلاص اور باہمی خیر خواہی اور خیر سگالی کے جذبات نہایت زور وقوت سے اُبھار دیتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خطاب سے اپنے ساتھیوں کے ان ہی جذبات کو اُبھارا ہے تاکہ وہ ساتھیوں کی توجہات کا بھرپور انداز میں مرکز بن جائیں اور ان کی وہ بات گوش دل سے سُنیں۔ خواب سُن کر حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ دونوں ساتھیوں میں سے ایک کی رہائی قریب ہے اور دوسرے کی موت قریب ہے اب فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ تعلیم حق سے اُنھیں آشنا کردیں۔ ممکن ہے کہ جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے، اور دربار۔ شاہی میں تخم ریزی کرسکے جس کی موت قریب ہے ممکن ہے کہ سچائی قبول کرے اور دنیا سے تو راہِ حق پر جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے یہاں جیل کے ساتھیوں سے خواب سُن کر فوراً تعبیر نہیں بتائی بلکہ ان کی توجہ اور رجُوع سے فائدہ اُٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کردیا۔

انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کافرون

میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں

اور اعلان کیا کہ

اتبعت ملة آبائ ابراهيم واسحاق ويعقوب

میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم و اسحاق و یعقوب کی پیروی کی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر اگر ایک طرف یہ بتا رہی ہے کہ دعوتِ حق کا فریضہ کیونکر ادا کرنا چاہیئے اور داعی حق کے جوش و طلب دعوت کا کیا حال ہوتا ہے، تو دوسری طرف یہ تقریر یہی بتا رہی ہے اب یہ پہلا موقع ہے جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین حق کی دعوت دے رہے ہیں اس سے پہلے ان کی زندگی کے جو مناظر قرآن نے پیش کیے ہیں، ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مراحل پر نظر آتی ہیں بلکہ دعوت و تبلیغ کا ذکر اشارتاً بھی نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مراحل صرف اس مقصد کی بنیادی تربیت کے تھے اور نبوت کی دعوت کا کام یہاں سے شروع ہوتا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر ہے۔

۲ یہ بھی پہلا موقع ہے کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی اس سے پہلے وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی مصائب کی ایک سے زیادہ گھاٹیوں سے گزرے کسی موقع پر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں حضرت ابراہیم اور اسحاق کا پوتا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ مگر اب انہوں نے اپنی دعوت کی خاطر اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ میرا تعلق توحید کی اس عالمگیر دعوت سے ہے جس کے آئمہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ حق کا داعی کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اُٹھتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے بلکہ پہلے ہی قدم پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں ازلی اور ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔

۳ حضرت یوسف علیہ السلام نے جس طرح دعوت کے لیے موقع تلاش کیا اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکمت و تبلیغ ہمیں میدان دعوت میں ایک اہم سبق دے رہی ہے اس معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کا جوش ہو اور اس کا دماغ حکمت سے مالا مال ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دُھن لگی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے۔

اور اُسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے یہی فرق ہے حکیم اور موقع شناس اور ناداں مبلغ کی دعوت میں ۔

ﻫ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت حق پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے ۔ آپ نے ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کیا ہے ۔ جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے یعنی توحید ۔ اس کو وہ ایسے معقول انداز میں پیش کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا شخص اسے ملنے بغیر نہیں رہ سکتا ہے ۔ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا ایک دروازے سے مانگ لینا اچھا ہے یا چند در چند دروازوں پر دھکے کھانا سارے جہانوں کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی ۔ دعوت کا یہ کس قدر لطیف انداز ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا یہ بہت ہی بڑا انعام ہے کہ اس نے اپنے سوا ہمیں کسی کا بندہ نہیں بنایا ۔ مگر لوگ اس انعام پر اللہ کا شکر نہیں ادا کرتے ہیں ، اس فقرے میں

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

وہ اپنے مخاطبوں پر تنقید کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ ، اور دل آزاری کے کے ہر شائبہ سے پاک وہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ایک اللہ سبحانہٗ کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے مشرک اور موحد سب اس کو ملنتے ہیں ۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کے سوا اور بھی کچھ اس کے شریک ہیں تو اس کے لیے بہت بڑی طاقتور دلیل کی ضرورت ہے ۔ اگر اس کی کوئی دلیل نہیں تو صرف امانی اور خواہشوں کی وجہ سے کسی کو اپنے اُوپر خدا بنا کر مسلط کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ ایک غلام کے سامنے اگر یہ سوال رکھا جائے کہ اسے ایک آقا کی غلامی پسند ہے یا متعدد آقاؤں کی تو وہ متعدد آقاؤں کے مقابلے میں ایک کی غلامی کو ترجیح دے گا یہی انسان کی فطرت ہے ۔

(۴۷) بے حقیقت ناموں کی پوجا

اس ذات گرامی سے درے ورے تم نے جن جن سے عابدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تمہارے اور تمہارے باپ دادوں کے مقرر کردہ ہیں اس بارے میں اللہ نے کوئی سند نہیں اُتاری ہے ۔ یعنی یوں ہی

بے سند اور بے ٹھکانے نام رکھ چھوڑے ہیں۔ جن کے نیچے حقیقت ذرہ برابر نہیں ہے۔ ان ہی نام کے خداؤں کو پوج رہے ہیں ایسے جہل پر انسان کو شرمانا چاہیئے [۱]

مطلب یہ ہے کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو ان داتا کسی کو خداوند نعمت کسی کو مالک زمین کسی کو ربّ دولت یا مختار صحت و مرض اور بچے دینے والا کسی کو ان کا محافظ کہتے ہو یہ سب خالی نام ہیں ان ناموں کے نیچے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جن کا خارج میں کوئی مصداق نہیں ہے، ان کی پشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے یہ نام محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں۔ ان ناموں کا کہ کوئی بارش برسانے والا، کوئی ہوا چلانے والا، کوئی بیماریاں دُور کرنے والا، کوئی جانوروں کا محافظ، کوئی جنگ میں محافظ، کوئی مسیحؑ موجود نہیں ہے تمہارے باپ دادا جس لکیر کو پیٹتے آئے اسی لکیر کو تم بھی پیٹ رہے ہو اللہ نے اس بارے میں کوئی دلیل نہیں اُتاری ہے۔

سلطانی اور غیر سلطانی قوانین

یہاں سلطانی اور غیر سلطانی کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑی لطیف بحث کی ہے وہ اس لائق ہے کہ معالم القرآن میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جائے۔ فرماتے ہیں۔

البتہ ایک چیز جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش کی جن راہوں کے متعلق باور کرانے والے یہ جو باور کراتے رہے ہیں کہ جو کچھ تم نے جانا ہے وہی واقع میں بھی اللہ سبحانہٗ کی بتائی ہوئی قطعی راہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا باور کرانے والے اپنے تئیں اسے خیال کرتے ہیں ابھی عرض کیا گیا تھا کہ واقعی جو خدا کی بنائی ہوئی مقررہ راہ ہے اس سے اعراض یا اس کی خلاف ورزی تو خُدا کی، خُدا کی مرضی کی، خُدا کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ایک ایسی چیز کے توڑنے کی یہ کوشش ہے جس کے توڑنے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی اسلام جائز قرار نہیں دیتا لیکن عام طور پر جن نظریات و مسلمات کے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قوانین اور قدرت کے آئین ہیں۔ ظلم ہوگا اگر ہر شخص کو اس کا حق نہ دیا جائے کہ بجائے خود وہ بھی اس کی تحقیق کرے کہ واقع میں وہ خدا کی مقرر کردہ راہیں ہیں بھی یا نہیں۔ محض دوسروں کے قول پر بھروسہ کرکے ان کی ناقص معلومات کے متعلق یہ اصرار کرنا کہ انہیں خدائی قانون یقین کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ یہ عقلاً درست ہوسکتا ہے۔ اور نہ مذہباً۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات ان ہی کے نظریات کے متعلق۔

ما انزل اللہ بہا من سلطان

نہیں اتارا خدا نے اس کے لیے سلطان

کا اعلان، یا

فأتوا بسلطان مبين

لاؤ کوئی کھلا ہوا سلطان

وغیرہ کے مطالبات جو پائے جاتے ہیں ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ اور ہم اپنے معلومات وتجربات کی بنیاد پر ان کے متعلق جو نظریات و قوانین بناتے رہتے ہیں قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا غیر سلطانی قوانین نام رکھا جاسکتا ہے۔

لفظ سلطان اور نزول کی تحقیق

سلطانی قوانین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اور سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے میں موسوم کر رہا ہوں۔ اُردو میں سلطان کے معنیٰ چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں اس لیے قدرتاً لوگوں کا ذہن شائد اسی طرف منتقل ہوجائے ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے شرح کرلی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنیٰ غلبہ اور تسلّط کے ہیں چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ مگر ان آیتوں میں سلطان کا لفظ دراصل غلبہ اور استیلاء۔ تسلّط ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے یہ

تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی ۔

دوسرا لفظ جو یہاں قابل غور ہے وہ ما انزل اللہ میں انزل کا لفظ ہے ۔ انزل کا مادہ نزول ہے نزول کے معنیٰ اترنا اور انزال کے معنیٰ اتارنا ہے ۔ عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ منسوب کیئے گئے ہیں، اس لیے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے تو پہلا خیال اسی تنزیل اور انزال کے معنیٰ کی طرف چلا جاتا ہے ۔ جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں ۔ مثلاً

ما انزل اللہ بھا من سلطان : نہ اتارا خدا نے اس کے لیے سلطان ۔ کے متعلق عموماً ذھن ادھر منتقل ہو جاتا ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنکے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی یا پیغمبروں کو کوئی علم اس کے متعلق عطا نہیں ہوا، اگر اس آیت میں انزل کے یہی معنیٰ لیے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے جن کے قانون الٰہی ہونے کی تصریح قرآن میں ۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کی گئی ہو ۔ اور غیر سلطانی قوانین سے مراد وہ باتیں ہوں گی جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ محض انزل کے لفظ کی بنیاد پر اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی کون نہیں جانتا کہ قرآن میں الحدید، لوہے کے متعلق بھی یہ آیت پائی جاتی ہے ۔

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید

اتارا ہم نے لوہے کو جس میں بہت زیادہ زور بھرا ہوا ہے

ظاہر ہے کہ الحدید، یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی ۔ نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلف یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انزل کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے ۔ اب لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہ ظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دُنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقفیت اور انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے مثلاً آگ جلاتی ہے ۔ مرچ تلخ ہے ۔ سنکھیا قاتل ہے

آفتاب روشن ہے. گرم ہے. قدرت کے انہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں سلطانی قوانین قرار دیتا ہوں. اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کیساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ ہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی. اس تقسیم کے بعد اب باآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانیت اور تسلّط کی یہ کیفیت ہوگی، خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنۃ اللہ ہونا یقینی ہے اسی لیے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے. مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈھنے والے. جوتے بوئے بغیر. لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے. سنکھیا کھا کر زندگی کی اُمید رکھنے والے. خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل اختیار کرکے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبیعات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذھنی علوم ان کے تمام نظریات و مسلمات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مُسلمہ کی خلاف ورزی خدا کی سُنت یا سُلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے. اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے

جزئیات تو خیر جزئیات ہیں ان عقلی علوم و فنون کے کلیات بلکہ اساسی مقدمات تک بھی ابھی مشتبہ اور محل نظر و بحث ہیں. طبیعات کو ہی لیجئے جن پر ہزار ہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے لیکن تفصیلات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے. اور اس کا سارا معالجاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے. دوسرے میں بالکل اس کے خلاف علاج بالمثل کے نظریہ پر اصرار کیا جاتا ہے علاج کے ان دونوں متصادم و متخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی، اب فرض کیجئے کہ ایلوپیتھک طریقہ علاج کو ترک کرکے کوئی ہومیوپیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے. تو کیا اس پر یہ الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبّی تجربات اور علاجی نظریات اس وقت تک اپنے تاثیری نتائج کے لحاظ سے عموماً ایسے حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج د

معالجہ کی نفع بخشی کا بھی فکر ہو جائے تو جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ ایسے آدمی پر بھی سُنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور و فکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیش نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوس گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری یا ادلا دکبیر کی توریث، الغرض گنج سے گنج کھینچنے میں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے۔ اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا۔ کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنّت کو پھر پانا چاہتا ہے تو ان تمام راہوں کو بند کرے جن سے ملک و قوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹتی ہو۔ حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہم میں غریب ہیں۔ وہ تو خیر غریب ہی ہیں لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے۔ بزورِ شمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم و فنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بد قسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو۔ ان پر سُنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے بلکہ حکیمانہ تحقیق سائنٹیفک ریسرچ کا اقتضار تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانی مغالطوں شاعرانہ پتیروں سے دماغوں کو بالکلیہ آزاد کر کے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ جن چیزوں میں سلطانیت کا رنگ تیز نظر آتا اسی حد تک اعتماد و وثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اور جس میں جس حد تک سلطانیت کا رنگ دھیما محسوس ہوتا، اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی واشگافی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ

ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہو سکتی تھی جس کے پیدا کرنے کے لیے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اباءکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس، نہیں ہے وہ (یعنی جن چیزوں کو کفار پیدائش و تخلیق کا وسیلہ و ذریعہ خیال کرتے تھے) لیکن چند نام یا الفاظ۔ جسے رکھ لیا ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے ان کے لیے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف اٹکل کی اور ان باتوں کی جنہیں ان کا جی چاہتا ہے۔ ما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا: نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی کر رہے ہیں وہ لیکن اٹکل کی۔ اور اٹکل واقعہ سے آدمی کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔ بار بار اعادہ مختلف پیرائیہ بیان سے کیا گیا ہے ورنہ صرف اس لیے کہ جو روٹی اچھی پکاتا ہے وہ خیاطی میں بھی ضرور ماہر ہوگا۔ یا صنعتی دستکاریوں، میکانیکی اولوالعزمیوں میں جس نے حذاقت کا ثبوت دیا ہے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اجتماعی مسائل اور معاشی نظریات میں عقل غلطی کرے گویا جس کے شعر اچھے ہوتے ہیں اس کے دماغ کے ریاضیاتی نتائج کو بھی یقیناً صحیح ہونا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں کی وبا پھوٹی ہے۔ یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کو پوجا گیا ہے بڑائی کے ساتھ اس کا چرچا کیا گیا اس کی ہر بات بڑی سمجھی گئی ہے خدا ہی جانتا ہے کہ قوموں کے اس طرز عمل نے لوگوں کو کن کن چیزوں کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں بے احتیاطیوں کی بدولت قوموں اور اُمتوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی کیا۔ افترائی قوانین تک کی جکڑبندیوں میں پھڑپھڑانا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں بدھ کے دن میں مصائب کا طوفان نظر آیا غریب تیرہ کے عدد میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو واقع کر دینے کے لیے وہ کافی ہے فاتحانہ اقدام کو بدبختانہ انجام سے بدلتے ہوئے کتنوں نے

راہ کاٹنے والی غریب کالی بلّی کو دیکھا : الی غیر ذلک من الخرافات والاوھام . حالانکہ سلطانی معیار سے جانچنے کا اُصول اگر اختیار کیا جاتا تو ایک ان دیکھے فرضی دن یا تیرہ اکائیوں کے مجموعہ میں کیا واقعی یہ کرامتیں باقی رہ سکتی تھیں ۔ راہ کاٹ کر گزر جانے والی بلّی کی مجال تھی کہ کسی فرد کو نہیں ۔ بلکہ قوم کو حرمان نصیبی کے خندقوں میں میں ہمیشہ کے لیے جھونک دے ، لیکن کیا تماشا ہے کہ سُلطانی راہوں میں معاشی پیداواروں کو ڈھونڈھتے ہوئے جو ایمان وتقویٰ ، دعاء واستغفار ، صبر وشکر ، توکل وتسلیم کے مختلف ناموں سے ان تدبیروں کو بھی اختیار کرتا چلا جاتا ہے جن سے خود پیدا کرنے والے کی رضامندی حاصل ہوتی ہے ۔ حصول معاش کی راہ میں اس طرز عمل کے نتیجہ خیز ہونے پر جو بھروسہ کرتے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر وہی طبقہ ٹھہرایا جاتا ہے ۔ بلکہ کبھی کبھی سر پیٹ لیتا ہے جس نے خدا جانے کتنی غیر سلطانی راہوں کو پیدائش کی سلطانی راہ محض اس لیے باور کرلیا ہے ۔ انجن بنانے والے ، ہوائی جہاز اُڑانے والے ، ریڈیو بجانے والے یورپ کا یہی عقیدہ ہے [۱]

خیر یہ تو مولانا گیلانی کی علمی جولانیاں ہیں جو معالم القرآن کے پڑھنے والوں کے لیے فائدے سے خالی نہیں ہیں ، بات تو حضرت یوسف علیہ السلام کی تقریر پر ہو رہی تھی اس تقریر کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور وفکر کی ضرورت ہے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ دین حق کے داعی کی حیثیت سے بات کر رہے ہیں ۔ اس سے پہلے ان کی زندگی کی جو داستان قرآن نے سنائی ہے اس میں صرف اخلاق فاضلہ کے مختلف پہلو نمایاں ہیں ، مگر دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔ داعی کی حیثیت سے ان کی یہ پہلی تقریر ہے اور جیسے دعوت کے موضوع پر ان کی یہ پہلی تقریر ہے ایسے ہی اپنے تعارف میں بھی ان کا پہلا بیان ہے ۔ اس سے پہلے مصائب کے ہجوم میں اپنے بچانے کے لیے انہوں نے کہیں لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی ، کسی موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ میں حضرت ابراھیم اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا پوتا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں ۔ یہ قدم بھی انہوں نے دعوت ہی کی خاطر اپنایا کہ میں کوئی نئی نرالی دعوت پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوتِ توحید کی اس عالمگیر تحریک سے ہے جس کی قیادت ورہنمائی حضرت ابراھیم علیہ السلام

[۱] اسلامی معاشیات

حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت کے لیے جو موقع تلاش کیا ہے وہ ہی امر بالمعروف اور دعوت کے میدان میں گہری معنویت رکھتا ہے۔

دو آدمی جیل کی زندگی کے ساتھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر دریافت کر رہے ہیں آپ اسی موقع کو دعوت کیلئے مفید سمجھ کر بات کا رُخ موڑ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تعبیر تو تمہیں ضرور بتاؤں گا مگر پہلے یہ سمجھو کہ اس تعبیر رُؤیا کے علم کا مأخذ کیا ہے۔ جس کی بنا پر میں خواب کی تعبیر بتاؤں گا فرمایا اتبعت ملۃ آبائی ابراھیم واسحاق ویعقوب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دِل میں دعوت کی دُھن ہو تو کیسی خوبصورتی سے وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر لیتا ہے، یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کی زندگی کس طرح گزاری ہوگی۔ پوری زندگی دعوت کے لیے ان تھک محنت میں گزاری جو صرف میرا قیاس نہیں ہے بلکہ قرآن کا مدلول بھی ہے کہ جس شخص کی تبلیغ دین کی دُھن کا یہ حال ہے کہ دو آدمی خواب کی تعبیر دریافت کرتے ہیں وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دعوت کا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ جیل کی ساری زندگی خاموشی سے گزار دی ہوگی۔

(۳۸) عبادت صرف اللہ کی کرو

فیصلہ اللہ کے سوا کسی کا نہیں اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ یعنی قدیم سے انبیاء علیہم السلام کی زبانی یہی حکم پہنچتا رہا کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

وسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا
اجعلنا من دون الرحمٰن اٰلھۃ یعبدون

اور دریافت کر لیجئے ان لوگوں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے روانہ کیا ہے۔ کہ کیا ہم نے ان کے لیے اللہ سے ورے کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن سے

عابدانہ تعلقات قائم کیئے جائیں ۔ ؎

آیت کے مطالب پر تبصرہ سے پہلے شارحین قرآن نے اس نکتے پر بحث چھیڑ دی ہے کہ ان دو فقروں ان الحکم الا للّٰہ اور دوسرے فقرے ۔ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ ۔ میں باہم تعلق کی نوعیت کیا ہے ۔ زیادہ تفصیلی گفتگو علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں فرمائی ۔ فرماتے ہیں کہ دوسرا جملہ استیناف ہے اور ایک اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے ۔ ان الحکم الا للّٰہ پڑھنے کے بعد یہ سوال خود بخود اُبھر آتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا عبادت کے بارے میں کیا حکم ہے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ ۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی کی جائے اس کے سوا کسی کی نہ کیجائے ۔ عابدانہ تعلقات صرف اللہ کے ساتھ ہونے چاہئیں اسی سے حاجتوں میں دعا مانگنی چاہیئے اسی کیلیئے عجز و نیاز کی خاطر رکوع و سجود ہونا چاہیئے صرف اسی کو اپنی توجہات کا مرکز بنانا چاہیئے نہ فرشتے کو ۔ نہ بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کو نہ معتبدین میں سے کسی کاھن سے نہ سورج سے نہ چاند نہ ستارے سے نہ درخت سے اور نہ کسی مقدس نہر سے سب سے کٹ کر اور سب سے ہٹ کر صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہیئے ۔

کچھ کی رائے میں امر ان لا تعبدوا الا ایاہ موقع تعلیل میں ہے پوری بات یوں ہے کہ چونکہ عبادت کے موضوع پر اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیئے یا اس کی جس کی عبادت کا اللہ حکم دے ، اللہ کسی کی عبادت کا اپنے سوا حکم نہیں دیتا ہے کیونکہ اس کا حکم یہی ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جائے لیکن یہ بات تشریح قرآن میں کچھ بے وزن سی ہے کچھ شارحین قرآن نے ما انزل اللہ سے لے کر امر ان لا تعبدوا الا ایاہ تک مشرکانہ ذھن کی تردید کا حسین شاھکار قرار دیا ہے ۔ اشتراکی ذھن اگر یہ کہے کہ شرک کے موضوع پر اللہ سبحانہٗ نے حجت و دلیل آتاری ہے تو ما انزل اللہ بھا الخ سے اس مشرکانہ ذھن کو جواب دیا ہے اور اگر یہ کہے کہ ہمارے بڑے کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اس کی تردید میں فرمایا ان الحکم الا للّٰہ اگر اشتراکی ذھن بھی یہ بات بتلائے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس موضوع پر کوئی حجت اللہ کی جانب سے نازل نہیں ہوئی اور یہ بھی درست ہے کہ اس

؎ افادات شیخ الاسلام

موضوع پر اللہ کے سوا کسی کو یارائے سخن نہیں ہے مگر اللہ کی جانب سے کسی حجت کا نازل نہ ہونا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ایسا کرنا منع نہیں ہے اس کے جواب میں فرمایا امر ان لا تعبدوا الا ایاہ اس ترتیب سے اشتراکی ذہن کی ساری راہوں پر اللہ سبحانہٗ نے قدغن قائم کر دی ۔

(۳۹) دائمی اور واضح دین

یہی پائیدار اور صاف دین ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ یعنی توحید خالص کے راستہ میں کوئی ایچ پیچ نہیں سیدھی اور صاف سڑک ہے جس پر چل کر آدمی بے کھٹکے خدا تک پہنچتا ہے لیکن بہت سے لوگ حماقت یا تعصب سے ایسی سیدھی بات کو بھی نہیں سمجھتے[ف] مطلب یہ ہے کہ یہی راہ عمل تمام انسانوں کے لیے اللہ سبحانہٗ کا ٹھہرایا ہوا دین ہے ۔ یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں ہے ۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراھیم علیہ السلام نے دی تھی ۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں اسلام ہے۔ یعنی اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی فرماں برداری ۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسان کی فکری گمراہی کی جولانیاں ہیں۔ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے، عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی کے سامنے سر جھکانے سے توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ صرف اس کی ذات پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے ۔ دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسرے کو شریک کرنا اللہ کی خدائی میں شریک کرنا ہے ۔ اگر آپ دعاؤ استعانت نذر و نیاز ذکر و درود رکوع و سجود اعتماد و توکل اور اس قسم کے تمام عبادات گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال میں اللہ سے رشتہ قائم رکھیں تو یہی دین قیم ہے ، اتنی موٹی سی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی ،

[ف] افادات شیخ الاسلام

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ
اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ۭ
وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ
فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ
سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ۧ

اے جیل کے ساتھیو! (تمہارے خوابوں کی تعبیر یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک (وہ جس نے خواب میں انگور نچوڑتے دیکھا ہے وہ رہا ہو گا اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی (وہ جس نے سر پر روٹی دیکھی ہے) تو وہ سُولی چڑھایا جائے گا اور پرندا اس کا سَر نوچ نوچ کر کھائیں گے جس بات کے بارے میں تم پُوچھ رہے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے اور فیصلہ یہی ہے [۱] اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جس شخص کے بارے میں سمجھا تھا کہ بچ جائے گا اس سے کہا کہ اپنے آقا کے پاس

جب جاؤ وہاں میرا ذکر کرنا[۲] لیکن رہائی کے بعد شیطان
نے اُسے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے رُو برو حضرت
یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے لہذا حضرت یوسف علیہ السلام
کئی سال تک جیل کی زندگی گزارتے رہے[۳]۔

مفردات کے معانی

خمر شراب انگوری، اصل میں تو انگور کے کچّے پانی کا نام ہے جبکہ وہ نشہ آور ہو۔ لیکن مجازاً ہر نشیلی شراب کو خمر کہتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقم طراز ہیں۔

یہ جان لینا چاہیئے کہ آئمہ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ انگور کے کچّے پانی کا نام جب کہ وہ نشہ آور ہو خمر ہے حقیقت میں تا آنکہ خمر کا استعمال اس میں مشہور ہے لیکن دوسری شرابوں میں جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں خمر کا استعمال مجازاً ہے۔ خمر یا تو اخمار سے بنا ہے جس کے معنیٰ خمیر اُٹھنے کے ہیں چونکہ خمر میں بھی خمیر اُٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ آنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہو گیا۔ اور مخامرہ سے خمیر بنا ہے جس کے معنیٰ چھپا لینے کے ہیں اسی لیے خمار اُوڑھنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ وسواس کو گُم کر دیتی ہے۔ اور عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لیے اسے خمر کہا گیا۔ ابو عبید نے ضحاک تابعی سے اعصر خمرا کی تفسیر میں یہ بات بتائی ہے کہ خمر اہل عُمان کی زبان میں انگور کو کہتے ہیں۔ طیر پرندے، پرندہ، علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں رقم طراز ہیں۔ طائر کی جمع طیر ہے جیسے کہ صاحب اور صحب راکب اور رکب اور طیر کی جمع طیور اور اطیار بھی آتی ہے۔ ابو عبیدہ اور قطرب کی رائے ہے کہ طیر واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور ابن الانباری نے کہا ہے کہ طیر جمع ہی ہے اور اس کی تانیث بہ نسبت تذکیر کے زیادہ استعمال ہے اور واحد کے لیے طیر نہیں بلکہ طائر آتا ہے۔ اس آیت میں بہر حال جمع ہے خواہ طائر کی

جمع ہے یا طیر خود ہی جمع ہے لیکن فیکون طیرا باذن اللہ میں طیر واحد کے لیے استعمال ہوا اس سے ابو عبید اور قطرب کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

بضع، چند، کئی دس سے جو کم کر دیا جائے بضع کہلاتا ہے۔ کچھ کی رائے میں تین سے لے کر نو تک بضع میں داخل ہے۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں جو بضع سنین آیا ہے اس کے متعلق اکثر مفسرین سات برس کی مدت بتاتے ہیں اور سورہ روم میں دس سال سے کم کی مدت مراد ہے:

جیل کے دونوں ساتھیوں کے خواب کی تعبیر

دونوں قید کے ساتھیوں کو دونوں کے خوابوں کی تعبیر نہیں بتائی جا رہی ہے بلکہ ان کو سنایا جا رہا ہے کہ یہ صرف تعبیر ہی نہیں ہے بلکہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان تمہارے دونوں کے بارے میں فیصلہ یہی ہے کہ تم میں سے ایک تو شاہِ مصر کو شراب پلائے گا اور دوسرے کو سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اور پرندے اس کا سر نوچ کر کھائیں گے۔ یہ گویا ان کے ذہنوں میں اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے، اس معاملہ میں وسوسوں کا شکار نہ ہو جو کچھ بتا رہا ہوں وہ ہو کر رہنا ہے، یہاں سے پتہ لگتا ہے کہ دعوتِ حق کا فرض کیسے انجام دینا چاہیئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے کی زندگی بھی ادائے فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ قید سے رہائی کیسے ہو مہلت جب ملی دعوت ہی کے کام میں لائی گئی۔ اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی عرصہ دراز تک قیدِ حیات میں رہنے والا تھا۔ اسی طرح اس شخص کو راہِ حق دکھانے میں بھی دیر نہ کی جس کے ارد گرد موت منڈلا رہی تھی۔ کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا حق ہے دعوت کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک کلمہ حق پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر سرفراز ہونے والا ہے یکبارگی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت وجلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقع حاصل ہو گا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا اذکرنی عند ربک۔ یعنی اپنے آقا کے پاس جاؤ تو

میری اس تعلیم و دعوت کو یاد رکھیو ممکن ہے کہ پیام حق کام کر جائے۔
یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپ نے فوراً تعبیر کیوں بیان نہیں کی۔ تاخیر قصداً کی گئی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج ان دونوں کو میری طرف متوجہ کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس توجہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور دینِ حق کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ اس کا ذکر اسی مناسبت سے شروع کر دیا۔ ذالکما مما علمنی ربی انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کافرون یعنی خواب کی تعبیر میں جلدی بتاؤں گا کیونکہ اللہ سبحانہ نے مجھے اس کا علم دیا ہے۔ لیکن پہلے یہ سمجھو کہ میرے علم کا سرچشمہ کیا ہے اس طرح بات سے بات نکالتے ہوئے دینِ حق کی دعوت شروع کی۔

یا صاحبی السجن أأرباب متفرقون الخ

(۱) اے جیل کے ساتھیو! تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جس نے خواب میں انگور نچوڑتے دیکھا ہے وہ رہا ہو گا اور بدستور سابق اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی جس نے سر پر روٹی دیکھی ہے وہ سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ جس بات کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے۔ اور فیصلہ یہی ہے۔ فرض تبلیغ ادا کرنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا ہے اس کی تعبیر یہی ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائے گا۔ اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی چڑھایا جائے گا پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے قضا و قدر کا فیصلہ یہی ہے جو کسی سے ٹل نہیں سکتا۔ جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی یہ بالکل طے شدہ امر ہے جس میں تخلف نہیں ہو سکتا چنانچہ ایسا ہی ہوا ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہو گیا اور خباز نان بائی کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت ہو گئی [1] اس آیت میں فقرہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان۔ شارحین قرآن میں بہت

[1] افادات شیخ الاسلام

بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ منقول اور معقول دونوں راہوں سے اُسے موضوع بحث بنایا گیا ہے کچھ نے اس فقرے کی ماثور تفسیر یہ بتائی ہے یہ تفسیر حافظ ابن کثیر نے ابراہیم بن عبداللہ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے امام مجاہد اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے حوالہ سے اس کی تائید کی ہے حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص جھوٹا خواب بیان کر کے تعبیر دریافت کرے تو تعبیر کے ذریعے خواب کا نتیجہ ناگزیر ہو جائے گا۔ ابراہیم کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں خواب بیان کر چکے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتائی تو دونوں بول پڑے کہ ہم نے خواب میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا یہی فیصلہ ہے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو فیصلہ یہی ہے۔ لیکن ابن کثیر کی یہ روایات تاریخی اعتبار سے ضعیف ہیں۔ اس لیے ان کی بنیاد پر آیت کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ دوسرے شارحین قرآن نے بھی یہاں داد تحقیق دی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ فقرہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان۔ خواب کی تعبیر نہیں بلکہ تعبیر سے زائد بات ہے۔ یہ فقرہ دراصل استیناف بیان ہے۔ مخاطبوں کے ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوالوں کا جواب ہے۔ تعبیر سُن کر ان کے ذہنوں میں یہ سوال اُٹھا کہ کیا اس میں واقعیت ہے یا وقتی بات ہے، ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو اور اگر ہو تو پتہ نہیں کب ہو۔ اسی سوال کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بذریعہ وحی معلوم کر کے بتایا۔ قضی الامر الذی الخ تاکہ مخاطبوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے علم پر بھرپور یقین واعتماد ہو جائے مطلب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے معلوم کر کے بتایا کہ تم دونوں کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ مشہور مفسر قرآن ابوحیان اندلسی نے اسی تشریح کو اپنایا ہے فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو اللہ کی جانب سے آئے ہوئے غیبی علم کے ذریعے بتایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہے انجام یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۲) پیامِ حق بادشاہ تک

اور حضرت یوسف نے جس شخص کے بارے میں سمجھا تھا کہ بچ جائے گا اس سے

کہا کہ اپنے آقا کے پاس وہاں میرا ذکر کرنا یہاں ظن یقین کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے الذین یظنون انھم ملاقو ربھم میں، یعنی یوسف علیہ السلام کو دونوں میں سے جس شخص کی بابت یقین تھا کہ بری ہو جائے گا۔ جب وہ قید خانے سے نکلا تو فرمایا کہ اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص بے قصور قید خانے میں برسوں سے پڑا ہے۔ مبالغہ کی ضرورت نہیں میری جو حالت تم نے دیکھی ہے۔ بے کم و کاست بیان کر دینا [۱]

عام شارحین قرآن کا خیال ہے کہ اذکرنی عند ربک کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام اپنی رہائی کی تدبیر فرما رہے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ معصیت کے مقابلہ میں جیل جانے کی دعا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جناب الٰہی میں کی رب السجن الی مما یدعوننی الیہ۔ اور جیل سے رہائی کے لیے رہا ہو کر جانے والے قیدی کو سہارا بنا رہے ہیں۔

یہ بات مقام نبوت کے مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ کرنے والوں نے اس کی تاویل کی ہے۔ کہ کسی جائز مقصد کے لیے جائز تدابیر و وسائل کا اختیار کرنا توکل اور اعتماد علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔

توکل کے منافی یہ ہے کہ آدمی حالات سے دل برداشتہ ہو کر ناجائز تدابیر کے اختیار کرنے پر اُتر آئے۔ اور اس داستان کو مضبوط بنانے کے لیے ایک ارشاد نبوت کا بھی سہارا لیا ہے۔ حافظ ابن جریر نے تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام وہ بات نہ کہتے جو انہوں نے فرمائی تو جیل میں اس قدر عرصہ نہ ٹھہرتے وہ اللہ کے علاوہ دوسروں کا سہارا رہائی کیلئے تلاش کر رہے تھے، اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بیحد کمزور ہے اس کی روائتی حیثیت سفیان بن وکیع کی وجہ سے داغدار ہے اور ابراھیم بن یزید سفیان سے بھی ضعیف ہے۔ میرے خیال میں یہ معاملہ ہی دوسرا ہے۔ قید کی زندگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کی فکر نہ تھی کہ میں قید سے رہائی کیونکہ پاؤں بلکہ تمام تر

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس کی فکر تھی کہ اللہ کے بندے جہل و گمراہی سے نجات کیسے پائیں مہلت جب کبھی ملی اور جس حال میں ملی اسی مقصد کے لیے کام میں لائی گئی اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پیغام حق پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے۔ اور پھر اسی منصب پر مامور ہونے والا ہے معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسا آدمی جو خلوت و جلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقعہ ہوگا کہ پیام حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچ جائے، چنانچہ تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا۔ اذکرنی عند ربک۔ اپنے آقا کے پاس جائیو تو مجھے یاد رکھیو یعنی میری یہ تعلیم و دعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بعنوان مناسبت اس کا تذکرہ کرنا۔ ممکن ہے کہ پیام حق کام کر جائے۔ عام طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے میری سفارش کرنا لیکن جس محل میں یہ بات کی گئی ہے۔ اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے قیدیوں سے جو کچھ بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے وہ یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں ہے اس کا دور کا بھی کوئی اشارہ نہیں ہے، کہ انہوں نے اپنے قید و محن کے مصائب کا ذکر کیا ہو۔ پس مطلب یہی ہے کہ تم نے جو کچھ یہاں دیکھا سنا اور توحید کا جو علم تم نے حاصل کیا اور تعبیر رؤیا کا جو حال ہوا اور کھانا آنے سے پہلے کھانے کی خبر اور اپنی قید کے بارے میں میرا فیصلہ ضرور ذکر کرنا، یہی بات حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام نبوت کے مناسب ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسی نے بھی البحر المحیط میں اسی مطلب کو اپنا مختار اور پسندیدہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں میرے نزدیک مختار اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا تاکہ میرا ذکر اس کی ہدایت اور ایمان باللہ کا ذریعہ بن جائے جیسے دونوں قیدیوں ساقی اور نان بائی کے لیے حق کی رونمائی کا ذریعہ بنا ہے بات واضح اور صاف ہے کہ میرے مقام نبوت میری دعوت۔ میرے معجزات وحی کے ذریعے میری بتائی ہوئی باتیں بادشاہ سے کرنا شاید اس راہ سے بادشاہ کا قلب اس طرف مائل ہو جائے اور راہ حق کو

قبول کرے یہی بات علامہ بقاعی نے اپنی تفسیر نظم الدرر میں بھی لکھی ہے کہ اپنے آقا بادشاہِ مصر سے جو کچھ تم نے میرے عالی اخلاق پاکیزگی سیرت دیکھی ہے اُسے بیان کرنا:

۳ ساقی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت

لیکن رہائی کے بعد شیطان نے اُسے یہ بات بھلادی کہ اپنے آقا کے رُوبرو حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے لہذا یوسف علیہ السلام کئی سال تک جیل کی زندگی گزارتے رہے یعنی شیطان نے چھُوٹنے والے قیدی کے دل میں مختلف خیالات و وساوس ڈال کر ایسا غافل کیا کہ اُسے بادشاہ کے سامنے اپنے محسن بزرگ یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا بھی یاد نہیں رہا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال اور قید میں رہنا پڑا بمدت دراز کے بعد جب بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تب اس شخص کو یوسف علیہ السلام یاد آئے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ وقال الذی نجا منهما وادّکر بعد اُمة۔ بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی وہ القائے وساوس کا ذریعہ ہے جو نسیان کا سبب ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر نے کہا تھا۔

وما انسانیه الا الشیطان ان اذکره

لیکن ہر ایک شر میں حق تعالیٰ شانہٗ خیر کا پہلو رکھ دیتے ہیں یہاں بھی گو اس نسیان کا نتیجہ طویل قید کی صورت میں ہے تاہم حضرت شاہ صاحب کی نکتہ آفرینی کے موافق اس میں یہ تنبیہ ہوگی کہ پیغمبر کا دل ظاہری اسباب پر نہ ٹھہرنا چاہیئے بلکہ ابن جریر اور بغوی وغیرہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فانساہ الشیطان ذکر ربه کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں۔ گویا اذکرنی عند ربك کہنا ایک طرح کی غفلت تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کو عارض ہوئی انہوں نے قیدی کو کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا۔ حالانکہ چاہیئے تھا کہ سب ظاہری سہارے چھوڑ کر اپنے رب سے فریاد کرتے۔ بے شک کشف شدائد کے وقت مخلوق سے ظاہری استعانت اور اسباب کی مباشرت حرام نہیں ہے لیکن ابرار کی حسنات مقربین کی سیئات بن جاتی ہیں۔ جو بات عامۃ الناس بے کھٹکے کر سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے منصب عالی کے اعتبار سے وہی بات ایک قسم کی تقصیر بن جاتی

ہے۔ امتحان وابتلاء کے موقع پر انبیاء کی شان رفیع اسی کو مقتضی ہے کہ رخصت پر نظر نہ کریں۔ انتہائی عزیمت کی راہ چلیں چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اذکرنی عند ربک کہنا خلاف عزیمت تھا۔ عتاب آمیز تنبیہ ہوئی کہ کئی سال تک مزید قید اٹھانی پڑی اسی لیے النسار کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی واللہ اعلم بالصواب زیادہ تفصیل رُوح میں ہے [1]

شارحین قرآن نے اس آئیت کی تشریح میں جو دو راہیں اپنائی ہیں شیخ الاسلام نے دونوں ہی حسین طریقے پر پیش کردی ہیں۔

ایک تو یہ کہ ساقی کو بادشاہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا یاد نہ رہا اور شیطان کا وسوسہ اس کا سبب بنا اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں ایک عرصہ رہنا پڑا۔ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

وادکر بعد امۃ میں یہ تصریح ہے کہ ساقی کو ایک عرصہ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا یاد آیا۔ یہ بات کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی سے کیا کہا تھا اور اذکرنی عند ربک کے ذریعے وہ قیدی سے کیا کہہ رہے تھے۔ عام شارحین قرآن کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات قیدی سے اپنی رہائی کے بارے میں کہی۔ لیکن قرآن کے سیاق وسباق سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ سیاق میں اس کا اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ قیدیوں سے ان کی جو کچھ گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کی دعوت کے بارے میں۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قید ومحن کے مصائب کا ذکر کیا ہو۔ اذکرنی عند ربک موقعہ ومحل کے اعتبار سے مطلب بھی موزوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آقا کے پاس جاؤ تو میری اس دعوت وتعلیم کو ضرور یاد رکھنا اور اپنے آقا سے بعنوان مناسب اس کا تذکرہ کردینا ممکن ہے کہ پیام حق کام کرجائے۔

عام طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے موقعہ ملنے پر میری رہائی کی سفارش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرنا۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ بات فرمائی گئی ہے اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قیدیوں سے اُن کی جو گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کی دعوت کے موضوع پر ہے۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنی قید کے مصائب کا کوئی ذکر کیا ہو۔ لہٰذا اس کا مطلب وہی موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی سے کہا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے اور بس۔

کچھ شارحین قرآن نے فأنساه الشيطان ذكر ربه کی تشریح اس طرح کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شیطان نے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیا اور انہوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ بادشاہ سے ان کا ذکر کرے رہائی کی کوشش کرے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں رہے۔ یہ تفسیر بالکل مہمل ہے۔ صحیح یہی ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر اور متقدمین سے مجاہد اور محمد بن اسحاق نے بتائی ہے کہ فأنساه الشيطان ذكر ربه میں ضمیر کا مرجع رہائی پانے والا قیدی ہے نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ شیطان نے رہائی پانے والے قیدی کو اپنے آقا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلا دیا، یہ تشریح ظاہر قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اوّلاً فانساه الشيطان کی تفریع الذی ظن انه ناج پر ہے تفریع بتلاتی ہے کہ شیطان کے انساء کا عمل بطور نتیجہ اس کہنے کے بعد ہوا ورنہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہٗ یاد تھے۔ اگر ان کا یہ کہنا کہ اذكرني عند ربك قابل سزا جرم ہوتا تو تعبیر یوں ہوتی۔ وقد انساه الشيطان ذكر ربه۔

ثانیاً یہ بات حضرت یوسفؑ نے قانونِ اسباب کے تحت فرمائی ہے۔ کیونکہ آپکی رہائی بادشاہ کے حکم سے ہوئی اور بادشاہ نے رہائی کا حکم رہا ہونے والے قیدی کی زبان سے داستان سُننے کے بعد دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پیش افتادہ کے حالات سے جو نقاب کشائی فرمائی ہے۔ اس کا تعلق علمِ نبوّت سے ہے۔ اور آپ نے یہ بات اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے ہی فرمائی ہے یہی منصب نبوّت کا تقاضا ہے۔ اس پر کسی سزا کا ترتب ناقابلِ فہم ہے۔

ثالثاً یہ کہنا بالکل بے جان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تو اللہ یاد تھا۔ جب رہا ہونے والے قیدی سے بات کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ یاد نہ رہا۔ کیونکہ یہ خیال نبی کی ذات پر ایک اتہام ہے یہ بات تو

ایک معمولی ایمان سے مالا مال مومن کی شان کے خلاف ہے چہ جائے کہ پیغمبر۔

اس کی تردید خود قرآن کر رہا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام محسنین میں سے ہیں اللہ سبحانہٗ کے منتخب بندوں میں سے ہیں اور واللہ غالب علیٰ امرہٖ حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے معاملے کی باگ ڈور اللہ کے قبضے میں ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو صرف سوء اور فحشا سے محفوظ نہیں رکھا بلکہ سوء اور فحشا کو ان کے راستہ ہی سے ہٹا دیا ہے ان حالات میں عقلِ انسانی یہ باور نہیں کرتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ سبحانہٗ کو بھول گئے ہوں اور اس بھول کے نتیجے میں سات سال جیل میں رہے ہیں۔

فانا للّٰہ والی اللّٰہ المشتکی

رابعاً شیطان کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کا اعلان ہے۔

ان عبادی لیس لک علیھم من سلطٰن

اور خود ابلیس کا دعویٰ ہے کہ

لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین

سوچنے کی بات ہے کہ قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے انہٗ من عبادنا المخلصین۔ پھر بھی اس پر اصرار کیا جا رہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شیطان نے یادِ الٰہی سے بیگانہ کر دیا معاذ اللہ۔

خامساً۔ نسیان ارادی اور اختیاری نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ عقوبت گناہ نہیں ہے اور عقوبت بھی ایسی سنگین۔ قرآن نے محض سہو و نسیان سے جو مواخذہ اٹھایا ہے اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

واِمّا ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین

اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد ایسے ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھ۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ بھولنے والا مکلف ہی نہیں ہے۔ بات بھی پتے کی ہے کہ نسیان ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے اور غیر ارادی اور غیر اختیاری چیز پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ بے خیالی کی وجہ سے اگر ایسا ہو جائے تو اس پر

قانونی مواخذہ نہیں ہے۔

سادساً۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو یادِ الٰہی سے غافل بنانے کے شوق میں ایک روایت کا سہارا بھی لیا گیا ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام وہ بات نہ فرماتے جو انہوں نے کہہ ڈالی تو جیل میں قیدی کی حیثیت سے رُکے نہ رہتے۔ یعنی رہائی کے لیے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیراللہ کا سہارا تلاش کرنا۔ یہ روایت تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اسے بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دونوں تشریحوں میں ایک بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ چاہے بھلا دینے کا مفعول رہا ہونے والے قیدی کو قرار دیا جائے اور خواہ حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ قدر مشترک یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی رہائی کے جوش اور شوق میں اللہ کو بھلا بیٹھے۔ خبر نہیں کہ ان بزرگوں نے رہائی کے شوق کی کہانی کہاں سے لی ہے ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کی فضیلت کا جو منظر قرآن پیش کررہا ہے اس میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ غور فرمایئے جب بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے اور وہی رہا ہونے والا قیدی آکر یہ معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کو سناتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان ایسے موقعہ پر کیا کرتا ہے۔ دُنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا ہے جسے بغیر کسی جُرم اور گناہ کے جیل میں قیدی بنا دیا گیا ہو اور سالہا سال سے اس حالت میں بے یار و مددگار پڑا ہو یقیناً اُسے تائیدِ غیبی سمجھ کر فوراً کہتا کہ میں یہ مشکل ضرور حل کردوں گا مگر مجھے رہائی کا موقعہ دیا جائے وہ کہتا کہ پہلے رہائی پھر خواب کی تعبیر مگر آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا۔ انہوں نے خواب سُنتے ہی اس کی تعبیر بیان کردی۔ اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ اپنی رہائی کی بات کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ دُنیا نے ان کے ساتھ کچھ بھی کیا ہو وہ دُنیا کی ہدایت کے سوا اپنے پیشِ نظر کوئی مقصد نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا اور دستگیری کی۔ اگر نہ کرتے تو داعی حق نہ ہوتے۔ ان کا بے لوث جذبہ ہدایت اس خود غرضانہ مطلب براری کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک انسان کی مشکل اور ضرورت مندی اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔ اسی لیے صحیحین بخاری و مسلم کی بیان کردہ روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و ضبط کی تعریف

کی ہے۔ اور تواضع وکسر نفسی کی حدتک اسے بڑھا کر اس طرح بیان فرمایا۔
لو لبثت فی السجن ما لبث یوسف لاجبت الداعی۔
اگر میں اس قدر لمبی مدّت تک قید میں رہتا جس قدر یوسف علیہ السلام رہے تو بلانے والے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیتا۔

اسی پر بس نہیں آگے آپ پڑھیں گے کہ جب بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا مشتاق ہوا تو چاہیئے تھا کہ جوش مسرت سے اس کا استقبال کرتے کیونکہ اب رہائی خود بخود سامنے آگئی ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا اور رہائی سے صاف انکار کر دیا۔

غور کرو کہ جس کی سیرت ایسے جوہروں سے گوندی گئی ہو اور صبر و ضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خود داری اور عزت نفس کی روح اس میں رچی ہوئی ہو آپ اس کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ جانے والے قیدی سے اپنی رہائی کی بات کرے۔ یہ عزت نفس اور استقامت حق کا کیسا بلند مقام ہے۔ اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے۔ جس میں کہیں سے کوئی لچک پڑتی دکھائی نہیں دیتی جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو اس کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں۔

آیئے قرآن کے اس صاف اور بے داغ بیان کے مقابلے میں روایات کی روشنی میں حضرت یوسف علیہ السلام کا چہرہ پڑھیئے آپ کو محسوس ہو گا کہ کوئی داغ نہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت میں آپ کو نظر نہ آئے ساری سیرت داغ داغ ہے۔ اور جمال یوسف علیہ السلام کی ساری رعنائیاں بیک جنبش قلم مٹا دی گئیں۔ پڑھیئے اور داد دیجئے اس ذہن کی جس نے یہ المناک داستانیں تنہائیوں میں بیٹھ کر گڑھی ہیں۔

آیئے سب سے پہلے مشہور صوفی علامہ علاء الدین علی بن محمّد بغدادی خازن ۷۲۵ھ کی زبانی سُنیئے وہ فرماتے ہیں کہ مالک بن دینار کہتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی ساقی سے کہا اذکرنی عند ربک تو حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا گیا کہ یوسف علیہ السلام تُو نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کو کارساز بنایا اس لیے اب میں تیری قید کا عرصہ طویل کروں گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام رو پڑے اور بولے کہ یا اللہ مصائبؔ بلایا کے ہجوم نے میرے دل سے تیری یاد فراموش کرا دی تھی اس لیے میں نے یہ بات

کہہ دی کہ اذکرنی عند ربک. یہ بھی اس کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس حضرت جبریل تشریف لائے جبریل نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا اے پاک پاکوں کے فرزند تیرا رب تجھے سلام کہتا ہے اور تیرے رب کا پیغام یہ ہے کہ کیا تجھے رہائی کے لیے آدمیوں کا سہارا لیتے شرم نہ آئی قسم ہے میری عزت و جلال کی اب میں تجھے چند سال جیل ہی میں رکھوں گا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا میرے رب کی یہی خوشی ہے۔ جبریل نے ہاں میں جواب دیا اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی پرواہ نہیں ہے۔

کعب احبار کہتے ہیں کہ حضرت جبریل نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ تیرا رب کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام تیرا خالق کون ہے یوسف علیہ السلام نے کہا اللہ، پھر فرمایا کہ تجھے روزی کس نے دی یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ اللہ نے، پھر فرمایا کہ تجھے باپ کا محبوب کس نے بنایا یوسف علیہ السلام نے جواب دیا اللہ نے، پھر پوچھا کہ کنویں کی مصیبت سے کس نے بچایا حضرت یوسف علیہ السلام فرمایا کہ اللہ نے پھر پوچھا کہ تجھے تاویل الرویار کا علم کس نے دیا۔ جواب میں فرمایا اللہ نے، پھر پوچھا فحشا اور سوء سے کس نے بچایا فرمایا اللہ نے۔ ان سب باتوں کے باوجود اے یوسف علیہ السلام تو نے اپنے ہی جیسے آدمی سے مدد طلب کی۔

یہ اور اس قسم کی بے سروپا روایات کی مدد سے حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس اور استقامت حق کے بے مثال مقام کو پارہ پارہ کر دیا اور اخلاقی سیرت کی اس عجیب غریب مضبوطی کو داغ دار بنا دیا جس میں کہیں سے بھی کوئی لچک پڑتی دکھائی نہ دیتی تھی جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو اس کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں اور اس سُورج کی روشنی کہیں مدھم نہیں پڑ سکتی۔

جب روایات کے ہجوم نے جمال یوسف علیہ السلام کی ان رعنائیوں کو داغ دار بنا دیا تو اس کے دفاع کے لیے تاویل کا سہارا لیا گیا۔

کسی نے کہا کہ کشف شدائد میں بندوں سے مدد لینا کوئی گناہ نہیں ہے مگر یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام کے خلاف تھی۔

کوئی بولا اسباب ظاہرہ سے غرض محمود کے لیے استعانت و استمداد بلاشبہ جائز

ہے عصمت کے منافی نہیں مگر نبی اور صدیق کے لیے اولی اور افضل یہ تھا کہ اسباب ظنیہ سے اعراض کرتے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تدابیر اسباب یقینیہ عادیہ سے نہ تھی اس لیے عتاب آیا اس قسم کی تاویلوں سے دل کو بہلا لیا گیا حالانکہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ اُذکرنی عند ربك کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ رہا ہو کر اپنے آقا سے میری رہائی کے بارے میں ذکر کرنا بلکہ بات صاف ہے کہ رہائی پانے کے بعد اپنے مالک سے میری دعوت حق اور میری باتوں کا بھی ذکر کرنا کیونکہ قیدیوں سے ان کی جو گفتگو ہوئی ہے وہ یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں اس ساری گفتگو میں رہائی کا اشارہ تک بھی نہیں ہے لہذا اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ میری یہ دعوت اور تعلیم یاد رکھنا اور اپنے آقا سے بعنوان مناسب اس کا ذکر کرنا، ممکن ہے کہ پیام حق دل میں اتر جائے۔ یہ صرف میری رائے نہیں بلکہ مشہور مفسر قرآن ابو حیان اُندلسی نے بھی یہی موقف اپنایا ہے ان کے الفاظ ہیں۔

لیتوصل بذالك الی هدایة الملك وایمانه باالله تعالی كما توصل الی الیضاح الحق لصاحبه

تاکہ اس ذریعہ سے بادشاہ کی ہدایت اور ایمان کا سامان ہو جائے جیسا کہ جیل کے دو ساتھیوں کے حق کی وضاحت ہو گئی۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسے خلاف ظاہر قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی یہ کہہ کر ابو حیان کی تشریح کی داد دی ہے۔

نعم انه اللائق بمنصبه علیه السلام

ہاں یہی مطلب یوسف علیہ السلام کے منصب کے لائق ہے۔

علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں اسی کی ہمنوائی کی ہے فرماتے ہیں۔ "اذکرنی عند ربك ای سیدك ملك مصر بما رایت منی من معانی الاخلاق طهارة الشیم"

اپنے سردار بادشاہ مصر سے وہ باتیں ضرور بیان کرنا جو تم نے مجھ میں دیکھی ہیں یعنی اخلاقی بلندیاں اور کردار کی پاکیزگی وغیرہ۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ حتی الوسع کوشش کر رہے ہیں کہ پیغام حق جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں۔ جونہی ان کو یہ بات

معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر فائز ہونے والا ہے۔ معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت وجلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقع حاصل ہوگا کہ دعوتِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے چنانچہ جانے والے سے فرمایا اذکرنی عند ربک اپنے آقا کے پاس جاؤ تو مجھے یاد رکھنا یعنی میری یہ دعوت وتعلیم یاد رکھنا اور اپنے آقا سے مناسب موقعہ پر اس کا ذکر کرنا ممکن ہے کہ حق کا پیغام اثر کر جائے۔ لیکن جانیوالے کو حضرت یوسف علیہ السلام کی بات یاد نہ رہی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال تک جیل میں رہنا پڑا۔

کاغذ کے سات سو چالیس صفحے میرے قلم سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلہ نظر کچھ دیر آرام کرے۔ اگرچہ

رہروان را خستگی راہ نیست

عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

فی سیرت یوسف علیہ السلام کی رعنائیاں تین حصوں پر مشتمل ہیں۔

اوّل دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں مصائب ومحن کی پہلی منزل جس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر، عزم، اعتماد اور توکل علی اللہ کی روح عظیم کا نظارہ پیش کیا۔

دوم معصیت کی دعوت امرأۃ العزیز کا معاملہ۔

مصیبت کی آزمائش ذہن ودماغ کی آزمائش تھی۔ اور امراۃ العزیز کی جانب سے معصیت کی دعوت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جذبات کی آزمائش تھی۔ اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کی چٹان یہاں متزلزل نہ ہوسکی ان کی بے داغ سیرت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے عظیم مظاہرہ ہے یہ عشقِ حق کا نمونہ ہے یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب اُنکے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کا عیش مگر معصیت حق کی راہ میں زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے رب السجن احب الی فرما کر دوسری راہ اپنائی۔

سوم . حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا وہ نظارہ ہے جب کہ آپ مظلومی و بے چارگی کی زندگی سے نکل کر طاقت واختیار کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں طاقت و اختیار حکومت واقتدار ہی کے لیے مصر کا بادشاہ خواب دیکھتا ہے اور اس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ ایک ہولناک اور خوفناک حالت پیش آنے والی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اس ہولناکی سے مستقبل میں بچنے کی تدبیر یہ ہے چونکہ طاقت واقتدار کے انتقال کے لیے مصر کے بادشاہ کا خواب مقدمہ اور تمہید ہے اس لیے ہم نے اس پارے کی تشریحات کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کی زندگی پر ختم کر دیا اور تیرھویں جلد کا آغاز بادشاہ مصر کے اسی خواب سے ہو گا ۔

الحمد للہ آج مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ موافق یکم دسمبر ۱۹۹۱ء بروز یکشنبہ بوقت ۷ بج کر ۵۴ منٹ صبح پارہ دوازدھم کی تفسیر ختم ہوئی ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم